مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ المؤمنون

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ المؤمنون

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیرِ اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	ستمبر 2007ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ المومنون

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ

پہلا باب: سورۃ المومنون (آیات 1 تا 4)

قرآنی الفاظ کے مفہوم کی ایک بین مثال مذہب میں نجات کے تصور کی نفی ہے

نجات کا یہ تصور فیثا غورث کا دیا ہوا ہے

ہندوؤں، عیسائیوں اور خود اپنے ہاں، مذہبی دنیا میں نجات کا تصور

نجات کے متعلق یہ تمام کے تمام تصور باطل ہیں

قرآنِ حکیم نے انسانیت کو صراطِ مستقیم سے متعارف کرایا ہے

صراط کے بعد طبقاً عن طبقٍ کی بلند ترین منازل

زندگی کے کسی منزل پہ رک جانے کا نام جہنم ہے

انسان کے لیے قدم قدم پر اپنے سفرِ حیات کی پیمائش کرنا لازم ہے

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں فائزون کا مفہوم

انسانی نامہ اعمال کی برومندی کے سلسلہ میں زراعت کی مثال

زندگی کی کامرانی ایمان اور عمل صالح کا فطری نتیجہ ہے

زندہ قوم کے لیے زندگی کا ایک زندہ تصور

تسبیح کے مروجہ مفہوم کے بالمقابل قرآنی مفہوم

ایران کے آتش کدوں کے نزدیک گردش کا مفہوم

اپنی اپنی جگہ کائنات کی ہر شے معروفِ تسبیح ہے

نماز کے متعلق ہمارے ہاں الجھے ہوئے مسائل

صلوٰۃ کے سلسلہ میں منشائے خداوندی اور فحشا کا تصور

قلب کی تبدیلی کے بغیر معاشرے کو بدلا ہی نہیں جا سکتا

قرآنِ حکیم کے نزدیک خشوع کا مفہوم

ذہنیت کی یہ تبدیلی انسان کو خود ہی کرنا ہوگی

اربابِ اقتدار سے میری التماس

قرآنِ حکیم کے نزدیک لغویات کا مفہوم

خود ساختہ مروجہ اسلام میں قدم قدم پر تضاد

زکوٰۃ کے لیے اسلامی حکومت کا قیام از بس ضروری ہے

مملکتِ اسلامیہ زکوٰۃ لوگوں سے لے گی نہیں بلکہ انہیں زکوٰۃ دے گی

زکوٰۃ کا تو بنیادی معنی ہی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا ہے

جسمانی نشوونما کے ساتھ انسانی ذات کی نشوونما بھی

ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لیے قرآنی حدود کا تعین اور ان کی اہمیت

دوسرا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 5 تا 7)

قرآنِ حکیم کے نزدیک حفاظت عصمت کی اہمیت

جنسیات کے سلسلے میں اہلِ یورپ کے مفکرین کی ریسرچ کے باوجود ان قوموں کی حالتِ زار

ہمارے ہاں کی کیفیت: بیباکی، آوارگی اور شادی

حفاظتِ عصمت کے متعلق قرآن کا پیغام
جنسیات کے متعلق ڈاکٹر انون کے تحقیقاتی نتائج
جنسیات کے سلسلہ میں فرائیڈ کی تحقیق
شرفِ انسانیت کا جوہرِ حقیقی دراصل تخلیقی قوت کا ظہور ہے
مرد اور عورت کو مساوی حیثیت دینے کے ثمرات
ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت مشروط اجازت ہے
نزولِ قرآن کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی
قرآنِ حکیم کا غلام اور لونڈیوں کے متعلق پیش کردہ حل
قرآنِ حکیم کے نزدیک غلاموں کے حقوق
دین کے مقامِ بلند کی پہلی منزل
غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے وسیع میدان
انسان نے غلامی کی بیسیوں شکلیں ایجاد کر رکھی ہیں
مذہب کے بالمقابل دین: پیغامِ موت ہے ہر نوعِ غلامی کے لیے
دینی معاشرے میں کوئی شخص تنہائی محسوس نہیں کرے گا
خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی
غلام بنانے اور آزاد کرانے کے چکر میں ثواب کے حصول کا طریق
غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مودودیؒ کا تفسیری بیان
غلامی کے سلسلہ میں یو این او کا چارٹر ہمیں قبول نہیں
مملکتِ پاکستان میں لونڈیوں کے لیے مطالبہ
جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھنے کی بجائے تین تین ہزار لونڈیاں
آج مسلمان قوم کی حالت اور توہم پرستی کا نتیجہ
قوم کی جذباتی کیفیت کی وجۂ جواز
عصمت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا انداز باریک بینی

تیسرا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 8 تا 11)

گزشتہ سے پیوستہ
امانات، معاہدات اور عالمگیر ضابطۂ اخلاق کے مروّجہ تصورات
قرآنِ حکیم، وحی کی بنا پر ایک عالمگیر ضابطہ حیات ہے
اصل مسئلہ تو صحیح نظامِ حکومت کا ہے
چودہ سو سال پیشتر قرآن کی طرف سے پیش کردہ نظریہ میثاق کے خدوخال اور اس کی ضمانت
اسلامی حکومت کی شرطِ اوّل
سنگِ اسود کے اوپر ہاتھ رکھنا دراصل عہد پکا کرنے کا ہی معاملہ ہوتا ہے
حاکم اور رعایا کا قرآنی مفہوم
امانات لوٹانے کا قرآنی مفہوم
خدا تعالیٰ کی طرف سے نظامِ ربوبیت کا وعدہ جماعتِ مومنین کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے
خدا تعالیٰ سے بھی اس کے کیے گئے وعدہ کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے
نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے دوران کچھ مشکل گھاٹیوں کا ذکر
علامہ اقبال کے نزدیک چنگیزیت کا مفہوم
خدا اپنا وعدہ یا اپنا عہد کس طرح پورا کرتا ہے؟
علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نزدیک مملکت کے حصول کی اہمیت
قرآنی نظریہ میثاق کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت کا ماحصل
قرآنِ حکیم پیکر کی تبدیلی کے لیے جذبہ محرکہ عطا کرتا ہے
یہ پوری کائنات بطور عطیہ انسان کو مل سکتی ہے لیکن جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

چوتھا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 12 تا 14)

دینِ خداوندی اور سیکولرازم کا بنیادی فرق
انسان کی خصوصیت صرف Values (اقدار) کی بنا پر ہے

انسان اور گدھے کی طبعی مشینری میں کچھ فرق نہیں
انسان کو معاشرتی زندگی کی خاطر سوسائٹی کے قانون کی
لازمی ضرورت ہوتی ہے
انسان کا وقار تو قانون کے احترام ہی میں ہے
سوسائٹی کے غلط نظام کے باعث انسانی فکر کی ناکامی
اوراس کی مشکلات
انسانی عقل کے نزدیک مصائب وآلام کا تجویز کردہ حل
انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل وحی کی روشنی میں موجود ہے
نزولِ قرآن کے وقت دنیائے عرب کی علمی سطح اور
رحمِ مادر میں جنین کے متعلق قرآنی انکشافات
قرآنِ حکیم کا تو ایک ایک لفظ اپنی جگہ سائنٹفک ریسرچ
کی انتہا ہوتا ہے
تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں سائنسی انکشافات
انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہمارے ہاں صدیوں سے
پائے جانے والے تصورات
رحمِ مادر میں قدم قدم پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ
آج کی سائنٹفک ریسرچ کا آخری مقام
اس مادی جسم کے بعد انسان اور حیوان میں ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا
آخر کے لفظ کا مفہوم
خداتعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے روح خداوندی کا
لفظ انسان کے اختیار ارادہ کی قوت کے عطا ہونے کا نام ہے
ہمارے ہاں روحِ خداوندی کے متعلق پائے جانے
والے غلط تصورات کا نتیجہ
مقلد کا قرآنی مفہوم اور تقلید پرستی کا نتیجہ
کائنات کی کسی شے کو بھی اختیار وارادہ کی یہ قوت (روح)
عطا نہیں کی گئی
علامہ اقبالؒ کی زبانی "خلقًا آخر" کی تفسیر
نفسِ انسانی کی بنیاد پر انسان کا مقامِ بلند
لفظ اطوار کا مفہوم اور انسانی ذات
تصوف کی دنیا نے خودی کا چہرہ ہی مسخ کر دیا ہے
خودی کے لیے Personality کے لفظ کی بجائے
Psyche کا لفظ بھی مکمل نہیں
انسانی زندگی کا اصل مقصد نفس انسانی کی نشوونما کرنا ہے
نفس یا خودی کی نشوونما کے لیے اقدار کی ضرورت لازم ہے
انسانی جسم کے فنا ہونے سے انسانی ذات ختم نہیں ہوتی
ذاتِ انسانی کا جو قطرہ موتی بن جائے تو پھر وہ سمندر کا حصہ نہیں بنتا
خداتعالیٰ تو انسانی ذات کو مقامِ بلند پر فائز کرنا چاہتا ہے
ذاتِ انسانی کو مستحکم کرنے کی خاطر ارادے کا محکم ہونا لازم ہے
دنیائے تصوف نفسِ انسانی کے مقامِ بلند کی سوچ سے بہت بعید ہے
اقبالؒ کے الفاظ میں عظمتوں کے اس مقام پر ایک احتیاط کو
پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا
انسان کو تو درجہ بدرجہ بلندیوں کی ہی طرف بڑھتے جانا ہے
حقیقی عمل خدا پرستی نہیں بلکہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے
جس سے انسانی ذات میں پختگی آتی ہے
قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظریہ حیات کو نہ اپنانا'
خدا کو فراموش کرنا ہی نہیں' بلکہ اپنی ذات کو بھی بھلا دینا ہے
اپنی ذات کا انکار خدا کی ذات کے انکار سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے
پانچواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 15 تا 22)
کفر اور اسلام کا مدار انسانی ذات یا خودی کے صحیح تصور پر ہے
خدا کے صحیح تصور کے بغیر مسلم اور کافر کا فرق متعین نہیں ہوتا

آج دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ابتری کی وجہ جواز اور اس کا حل
حیوان ہمیشہ ہر جگہ مکمل شکل میں دنیا میں آتا ہے جبکہ انسان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی
حیوان کے مدمقابل انسان کے سامنے زندگی کا ایک عظیم مقصد ہوتا ہے
قدرت صرف آدمی پیدا کرتی ہے، انسان اس نے خود بننا ہوتا ہے
خلد کا قرآنی مفہوم
خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کے فرشتے مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں آدم اور انسان میں واضح فرق بیان کیا ہے
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا ہے
قرآنی اقدار پر عمل پیرائی کا نتیجہ ہر قدم پر رفعت کی شکل میں سامنے آتا ہے
نیک و بد اعمال کے نتائج انسانی ذات پر نفسیاتی اثرات کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں
انسانی ذات پر مرتب ہونے والے اثرات دو قسم کے ہوتے ہیں
جسمانی موت کے بعد زندگی کا اگلا پروسس مزید ارتقائی منازل کی طرف
انسان کے لیے ذات کے تصور سے انکاری ہونا سب سے بڑا کفر ہے
خدا کے متعلق موجودہ سائنٹسٹ کا تصور ہمارے ہاں کے تصور سے زیادہ علیٰ وجہ البصیر تھے
آج کے نوجوانوں کی پریشانی
بادشاہ کا ذہن اور بچے کا ذہن ایک ہی جیسا ہوتا ہے
خدا کا تصور قرآن کے آئینے میں
قرآنِ حکیم نوعِ آدم کا ترجمان ہے وہ انسانی زندگی کی اقدار تو دیتا ہے کسی کو ڈراتا نہیں ہے
قرآن کے نزدیک انسانی نفس کی اہمیت
انسانی ذات کے متعلق اہلِ تصوف کا نظریہ حیات
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ ماسکہ ذاتِ انسانی کا تعارف ہے
قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کا درس دیتا ہے
تبلیغ اور احسان کا مفہوم
انسان کی ہر دو قسم کی پرورش کی اہمیت اور خدا تعالیٰ کی ذمہ داری
چودہ سو سال پہلے آسمانی کرّوں کی کیفیت کا بیان
1913ء میں یورپ کی علمی سطح کی حالت
سامانِ نشوونما کے پیشِ نظر سمندر کے پانی کو کشید کرنے کی غرض سے سورج کی بھٹی کا انتظام
رزق کی فراوانی اور زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے پانی کے مہیا کرنے کا حیران کن انتظام
قدرت کی طرف سے یہ تمام نعمتیں کسی ایک فرد کے لیے نہیں ہیں بلکہ ''لکم'' (تم سب) کے لیے ہیں
دنیا کی ساری جنت 'لکم' کے ایک لفظ میں پوشیدہ ہے
جسمانی طور پر رزق کا یہ سارا نظام ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے
ایک جنین سے جسمِ انسانی، جسمِ انسانی سے نفسِ انسانی، اور اس نفسِ انسانی کی نشوونما کے بعد جہانِ فردا کی کئی ایک نئی اور طویل منازل کی طرف سفر کا آغاز
چھٹا باب: سورة المؤمنون (آیات 23 تا 26)
انسان کی زندگی کی دو سطحیں: حیوانی اور انسانی
نوعِ انسانی کی جانب سلسلۂ نبوت جاری کرنے کی غرض و غایت کیا

تھی؟
دین کی اہمیت کے سلسلہ میں قرآنی تعلیم کی جامعیت کی ایک روشن مثال
قرآنی اقدار کے اس انقلابی اقدام کی غرض وغایت
فرقہ بندی کو شرک قرار دینے کی وجہ جواز
انسانی تصورات کو قبائلی طور پر تقسیم کرنے کا ابتدائی عمل کیسے شروع ہوا؟
نام ونمود کے تصور کے تحت زندہ رہنے کا فریبِ تمنا
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
ملکیت کے تصور کے متعلق محققین کی موجودہ تحقیق
نوعِ انسانی میں اختلافات کی نوعیت اور وسعت
گھٹاٹوپ اندھیروں میں قندیلِ آسمانی کی نعمتِ عظمیٰ
انسانی معاملات کے حل کے سلسلہ میں عقل وفکر کی زبوں حالی
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی کتاب کو حاکم تسلیم کیے بغیر باہمی اختلافات ختم ہو ہی نہیں سکتے
دین کی حکمرانی میں مذہبی فرقوں کا تصور ممکن ہی نہیں
دین کے نظام کی سب سے زیادہ مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے
معاشرے میں کام کرنے والوں (یعنی کمیوں) پر کام نہ کرنے والوں کی حکومت
حضرت نوح کے دور میں بھی سب سے پہلا اختلاف دولت کے معیار پر تھا
دین کی تعلیم دینے والا کسی شخص سے معاوضے کا طلب گار نہیں ہوتا
ہر نبی کی پیش کردہ تعلیم کا مرکزی نکتہ طبقاتی فرق کو مٹانا ہوتا تھا
قرآن حکیم کی تعلیم مساوات انسانیہ کے سوا کچھ اور نہیں

ساتواں باب: سورۃ المؤمنون (27 تا 33)
انبیائے کرام کی بعثت کا اوّلین مقصد
قوموں کے جرائم کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان
طوفانِ نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں کشتی کی تیاری اور مخالفانہ ذہنیت
انسانی ذہنیت میں احترامِ آدمیت کا جذبہ اور قائداعظمؒ کا ایک واقعہ
قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل کا مفہوم
کسی چیز سے بچ جانا کافی نہیں ہوتا
قرآنِ حکیم میں ''آیات'' کا مفہوم
نوعِ انسانی میں نسلی امتیاز کی بنیاد قبیلے کی صورت میں اُبھری اور پاکستان کی مثال
بیٹے کے ڈوبنے پر حضرت نوحؑ کے استفسار پر خدا تعالیٰ کا جواب
تشکیلِ قومیت کا ابتدائی فارمولا اور غیر متبدل اصول
نسلی امتیاز کے سلسلہ میں ہمارا اپنا باہمی برتاؤ
پہلی وحی کی اصولی ہدایت اور راہنمائی
قرآن حکیم میں کوئی بات بھی مافوق الفطرت نہیں ہے
انسانی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ طبعی اسباب کی شکل میں سامنے آتا ہے
طبعی چیزوں کا اخلاقیات کے ساتھ باہمی ربط
جاپان کی مادی دنیا پر اخلاقیات کا اثر
انسانیت کے لیے سب سے بڑی نعمت اور دولت سمع وبصر ہے
خودنمائی کی ہوس کا نتیجہ قوموں کی تباہی کی شکل میں نکلتا ہے
آخر قومِ عاد کیوں تباہ ہوئی؟ لفظ جرم کا قرآنی مفہوم
صاحبِ اقتدار کے کردار کا قوم کی تمدنی زندگی پر اثر
المتکبر اور کبریائی کا حقیقی مقام

آٹھواں باب: سورۃ المؤمنون (34 تا 43)

گزشتہ سے پیوستہ
وحدتِ انسانیت کے اعتبار سے خونی رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا
تقسیمِ کار کی بنیاد پر قومیت کا تصور اور طبقاتی تفریق خلافِ قرآن ہے
قومِ عاد میں حاکم اور محکوم کی تفریق
قومِ ثمود کا ذکر: گلہ بانی کی بنا پر باہمی تفریق یعنی ایک زمیندار دوسرا مزارع
غلط نظام کے اندر ہر قسم کا مادی سہارا تباہ ہو جاتا ہے
معاشرے میں یہ کمزور اور غریب سرمایہ داروں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں
دراصل یہ مخالفت انبیائے کرام کی نہیں تھی بلکہ خدا کے پیغام کی تھی
معاشرے کی تمام ناہمواریاں دارالسلطنت میں بیٹھے چند ایک سرغنوں کی وجہ سے ہوتی ہیں
نوعِ انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل میری اور تیری کی تفریق مٹانے میں مضمر ہے
قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ایک روشن مثال
قرآن حکیم کے معاشی نظام کے متعلق حضور کی ایک حدیث
طبقاتی نظامِ حیات کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی ہے
ظہورِ نتائج کے وقت خدا کا ہاتھ کانپتا ہی نہیں
پورے کا پورا نظامِ دین انہی تفرقوں کو مٹانے کی وضاحت میں مضمر ہے
معاشرے میں طبقاتی تفریق پیدا ہونے کی وجہ اور اس کی اصلاح
انسانی سطح کا تصور ہی معاشرتی مصائب و آلام کا حل ہے
جہانِ فردا کی تصویر کشی: بآوازِ بلند اپنے جرم کا اعتراف
جرم کی سزا از خود وارد ہوتی ہے
نواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 44 تا 49)
اپنے اپنے دَور میں انبیائے کرام کی تعلیم کا خلاصہ
فرعون کا سب سے موثر حربہ، قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا
فرعونی سیاست میں سرفرازی یا حمیت کا اظہار موت کو دعوت دیتا ہے
فرعون کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار دوسروں کی روٹی پر قبضہ تھا
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت کا معاملہ اور حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت کی التجا
فرعون کی سیاست اور پروپیگنڈا کی مشینری نے انسانی جذبات کو مدہوش کر دیا تھا
فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ: ''قوم بنی اسرائیل کی آزادی''
قوم موسیٰ علیہ السلام کے روپ میں تحریک پاکستان کی کہانی تاریخ کی زبانی
ہندوؤں کی نظر میں مسلمان اچھوتوں سے بھی کم تر تصور کیے جاتے تھے
تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جناب پرویزؒ کو قائداعظمؒ کا فرمان
علامہ اقبالؒ کی نظر میں محکوم قوم کی ذہنی پستی کی حالت
جب کوئی قوم اُٹھ کھڑی ہو تو پھر خدا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے
فرعون اس لیے فرعون تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنا عبد بنا کر رکھنا چاہتا تھا
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون کی ایک سرمایہ دارانہ چال
خدا کے نور سے دیکھنے والی ہستی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو جواب
تحریک پاکستان کے سلسلہ میں نیشنلسٹ علما حضرات کی طرف سے مخالفت میں دیئے گئے دلائل
لوگوں کو مذہبی جذبات برانگیختہ کرنے والی فرعون کی ایک چال
فرعون کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سودے بازی کا مطالبہ
ہندوستان میں انگریز کے غلبہ اور ہندوؤں کے تغلب کے بالمقابل مسلمانوں میں ابھرنے والا جوہرِ مردانگی
پرویزؒ کی چشم دید گواہی اور ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف
قائداعظم کے آنسوان کی بلند ہمتی کا اظہار اور ایک نصیحت کا '' کام تیز

کردو‘‘
نوعِ انسان کے لیے قرآن حکیم کا ابدی پیغام اور ابدی اُصول
دسواں باب: **سورۃ المؤمنون** (آیات 50 تا 56)
عالم گیر سطح پر وحی کی تعلیم کا مقصد امتِ واحدہ کی تشکیل ہے
احبار و رہبان کی اصطلاحات کا مفہوم
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ’’جرم‘‘
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دورِ نبوت میں مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری کی کیفیت
ہیکل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انقلابی خطاب
قرآن حکیم نے انسانی ذہنیت کی ترجمانی کی ہے
احبار و رہبان کی ذہنیت کی بنا پر فرقہ بنتا ہے
قومیت کے معیار پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ میں فرق
انجیلوں کی کہانی، حقائق کی زبانی
ہیکل میں کاہن کے منصب کی کیفیت اور احبار و رہبان کی مخالفت کی وجہ
نظامِ سرمایہ داری کا نتیجہ
سامری کا کردار
سلطانی و ملائی و پیری کے کشتہ نے قوموں کی قوموں کو ہلاک کر دیا
نوعِ انسانی میں رنگ، نسل، وطن، زبان اور زمان و مکاں کے بعد کے باجود امت واحد کا قرآنی تصور
فرقہ بندی کی بنیادیں مستحکم رکھنے کی ایک نئی چال
گیارھواں باب: **سورۃ المؤمنون** (آیات 57 تا 65)
انبیائے کرام کی تعلیم کا مرکزی نکتہ
نوعِ انسانی کا دو گروہوں میں تقسیم ہونے کا معیار
خوف و حزن کے سلسلہ میں پیغامِ خداوندی
خوف و ہراس کے ماحول میں پرورش پانے سے بچے کی ذہنی کیفیت
عربی لغت میں خوف کے ’’معنی کسی عمل کے انجام سے آگاہ ہونا ہے‘‘
انسانی معاشرہ میں نظامِ عدل کی اہمیت
ایمان بالآخرت کی حقیقت اور اس کے نتائج
خدا کے صحیح تصور کا جاننا اور ماننا ایک بنیادی امر ہے
ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کے تراجم کا معیار
شفق کا قرآنی مفہوم
شرک کی ایک واضح تر مثال
دو لفظوں میں قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت
انسانی ذات کی نشو و نما کے قوانین صرف وحی کے ذریعے ہی ملتے ہیں
زکوٰۃ کا ادا کرنا حکومت کا فریضہ ہے
مملکت اسلامیہ اور دوسری مملکتوں میں ایک بنیادی فرق ہے
ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے دو مختلف میدانوں کی نوعیت
قرآنِ حکیم میں لفظ ’’وسعت‘‘ کی حدود کا تعین
ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہو گا
معاشرے کے مترفین کا انجام
انجامِ کار کے سلسلہ میں قرآن کا محاکاتی انداز
ظہورِ نتائج کے موقع پر انسان کی نفسیاتی کیفیت
اسلامی مملکت اور ملوکیت میں ایک بنیادی فرق
Accountability (جواب دہی) کا ذریعہ صرف قرآنِ حکیم ہے
ہر کسی کو خدا کے ہاں یہ جواب دینا ہو گا کہ کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا
بارھواں باب: **سورۃ المؤمنون** (آیات 66 تا 75)
دھاندلی اور اس کی نوعیت کا انجام
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس سالہ زندگی بطورِ شہادت سچائی کا ثبوت تھی

خودساختہ روایات پر مبنی ہماری سوچ کا معیار
طبعی طور پر آپ ﷺ کی یہ کیفیت کبھی نہیں تھی
قرآن فہمی کے لیے محاورۂ عرب کا سمجھنا ایک لازمی امر ہے
وحی کے نزدیک نوعِ انسانی میں مراتب کا معیار
دنیائے عرب میں نبی اکرم ﷺ کی خاندانی اور معاشرتی حیثیت
نبی اکرم ﷺ کا پیغام اہلِ عرب کے نام
سود وزیاں کے سلسلہ میں انبیائے کرام کی سوچ کے پیمانے اور ہمارے ہاں کی روایات
ہم نے آج بھی سیّد اور جولاہے میں امتیاز روا رکھے ہوئے ہیں
خارجی کائنات میں قانون سازی کی اہمیت کا ماحصل
انسانی سوچ کی متضاد کیفیات کا نتیجہ
دنیائے مذاہب سراپا توہم پرستیوں کا کھیل ہے
سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے اقرار اور انکار میں آخر فرق کیا ہے؟
ایمان باللہ کا حقیقی تصور اور اس کا نتیجہ
قرآنِ حکیم کا قابلِ غور وفکر پیغام
قرآنِ حکیم کے نزدیک پاگل کون ہے؟
انسانیت کی دنیا میں سب سے بڑا ظلم تکریم انسانیت کا نہ ہونا ہے
قوانینِ خداوندی سے بے اعتنائی کا نتیجہ
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا عطا کردہ مقامِ بلند
نبی کے مدعا میں "حَرَجٌ" کی کیفیت نہیں ہوتی
خیرات کے سلسلہ میں ایک حدیثِ مبارک
رزقِ حلال کے اثرات کی کیفیت صراطِ مستقیم کی شکل میں ہوتی ہے
خدا نے تو اپنے آپ کو سیڑھیوں والا خدا بھی کہا ہے
آخر انسان اس صراطِ مستقیم کو قبول کیوں نہیں کرتے؟
نبی کے زیرِ تربیت تیار ہونے والی قوم کی خصوصیت
آخرت کے لمحات دراصل حال کا ہی پرتو ہوتے ہیں
تیرھواں باب: سورة المؤمنون (آیات 76 تا 90)
مادی تصورِ حیات کا دوسرا نام سیکولر نظام بھی ہے
سیکولر نظام کا قوموں کی موت وحیات پر اثر
غلط اور متضاد تصورات کی مثال
سَنَسْتَدْرِجُهُم کا اور عذاب کا قرآنی مفہوم
غلط نظام کا تباہ کن نتیجہ
ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آنے کی صورت کیا ہوتی ہے؟
قوم وملک کی تباہی کی شکلیں
تباہ حال قوم کے خلاف ظالم قوموں کا اتحاد اور ان کا طریق کار
دنیائے انسانیت میں سب سے بڑا ظلم انسان کی تذلیل کرنا ہے
انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوت کا تذکرہ
قرآنی لفظ افئدہ کا اور شکر کا مفہوم
تقلید پرست قوموں کی زبوں حالی
قرآنِ حکیم کے غلط تراجم کی ایک واضح تر مثال
انسان اور حیوان میں صرف بصیرت کا فرق ہے
سامانِ زیست کی اس قدر فراوانی اور انسان کی غلط جذباتی کیفیت کا نتیجہ
قوموں کی موت وحیات خدا کے عطا کردہ پیمانوں کے مطابق ہوتی ہے
قرآنِ حکیم کے نزدیک خدا تعالیٰ کو ماننے کا ایک الگ تصور ہے
ہمیں بھی قرآنِ کریم میں دیئے گئے خدا کے تصور پر عملاً ایمان لانا ہوگا
روس میں مسلمانوں کے لیے مذہبی آزادی کی کیفیت
تحریکِ پاکستان کی جنگ اور علامہ اقبالؒ کا "خواب"
قرآنی ضوابط کو عملی شکل دیئے بغیر خدا پر ایمان قابلِ قبول ہی نہیں ہوتا

چودھواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 91 تا 98)
خدا تعالیٰ کے متعلق انجیل کا بیان
عیسائیت کی پیروی میں مسلمانوں کے وضع کردہ عقائد
عقیدہ حلول کے متعلق پائے جانے والے تصورات
سنی حضرات کے عقائد
لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مفتی محمد شفیع مرحوم کا فتویٰ
محی الدین ابن عربی کا نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے متعلق تصور اور ان کی تعلیم کا ماخذ
محی الدین ابن عربی کے عشق کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی
اہل تصوف کے ہاں لکھی گئی تفاسیر کی بنیاد
اہل تصوف کے نزدیک شرک خفی اور شرک جلی کی نوعیت
ان تصورات کی سند کے لیے خود ساختہ روایات کا سہارا
تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہابی اور گلابی وہابی ایک ہی ہیں
مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خودنوشت سوانح حیات کی ایک جھلک
خدا کی پرستش کا تصور ایک باطل تصور ہے
انسانی دنیا میں تصور خدا کا تجزیہ
خدا کے صحیح تصور کو سمجھے بغیر قرآنِ حکیم سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا
نبی اکرم ﷺ کی 23 سال تک کی داستانِ کشمکشِ حیات
حضور ﷺ کی ایک حسین آرزو
دین خداوندی مدافعت کا سبق دیتا ہے طمانچہ کھانے کا نہیں
انسانیت کے لیے سیاست کا واحد علاج حسنات سے ہی ممکن ہے
پندرھواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 99 تا 107)
مہلت کے وقت کی اہمیت
موت کے بعد مختلف چکروں کا تصور یونان کا پیدا کردہ ہے
زندگی کے سلسلہ میں انسانی سوچ آج بھی افلاطون، ارسطو اور فیثا غورث کے پیدا کردہ اسی چکر میں گرفتار ہے
ہندو دھرم کی ساری بنیاد آج بھی اسی چکر کے عقیدہ پر ہے
تصورِ آواگون کے برعکس، قرآن حکیم کا پیش کردہ ایک عظیم تصورحیات 'صراط المستقیم' ہے
برزخی زندگی کا تصور اور عذاب قبر کی حقیقت
برزخ ایک پردہ ہے، جہاں اہل قبور اہل دنیا کی نہ سن سکتے ہیں، نہ سنا سکتے ہیں
روزِ قیامت صنور پھونکنے کا قرآنی مفہوم
نجات کا یا عذاب کا تصور دوسروں نے مانگا ہوا ہے
زندگی تو جوئے رواں است و رواں است کے مصداق ہے
ہر دم جواں ہے زندگی
انسان کا ایک ایک سانس اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے، خدا کی ذات سفارشوں سے ماورا ہے
قرآنِ حکیم کے نزدیک نسبتوں کی حیثیت اور کیفیت
کسی انسان کا عمل دوسرے انسان کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ مکافاتِ عمل کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا اعلان
ایک روایت کی روشنی میں حضرت ابراہیم جنت کے دروازے پر
قرآنِ حکیم کے نزدیک شفاعت کی نوعیت
دورِ حاضر کی سائیکولوجی (نفسیات) کے بالمقابل قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی ذات کی وضاحت
موت کے عمل سے انسان کا تو جسم مرجاتا ہے لیکن ''میں'' نہیں مرتی
مغرب کے مفکرین کے سامنے قرآن حکیم کو قرآن کی روشنی میں پیش کرنے کا طریق
جہانِ فردا کے متعلق ہمارے قائم کردہ تصورات

قرآنِ حکیم کے نزدیک خدا کے حضور پیشی کا طریق
دنیا کی ہر وہی نوع آگے بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو
عیسائیت کے ہاں حضرت مسیح کے کفارے کا عقیدہ قرآنِ حکیم کی تعلیم کے خلاف ہے
قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل جنت کا معیار
عدل میں معافی کا تصور غلط ہے
قصہ آدم میں آدم کا اعتراف اور ابلیس کے انکار کی وضاحت
مجوسیوں کے ہاں تقدیر کا بنیادی عقیدہ
ہمارے ہاں ایمان کے سلسلہ میں تقدیر کا خودساختہ عقیدہ
جہنم کے اندر بھی غلط روش کا عمل جاری ہے

سولھواں باب: **سورة المؤمنون** (آیات 108 تا اختتام)

ظہورِ نتائج کے سلسلہ میں وقت کا دریا کبھی پیچھے کی طرف نہیں مڑتا
قانون بنانے والوں کا فریضہ
قرآنِ حکیم اواگون کے تصورات کی تردید کرتا ہے
حق بات کو سمجھنے والوں کا فریضہ اور اُن کے مصائب
سرکشی کا نشہ انسان کو مدہوش کر دیتا ہے
برزخ کی زندگی کا مفہوم اور اس کی کیفیت
قرآنی آیت کے آخر میں خدا کی دی گئی صفت کی اہمیت
آج کی دنیا میں انسانوں کا نظریہ حیات
انسانی زندگی کے متعلق مغرب کے نظریہ حیات اور قرآنِ حکیم کی راہنمائی
وحی کی بنیادی اقدار اور سوسائٹی کے قوانین کے نوعیت
انسانی زندگی اپنے اندر ایک عظیم مقصد لیے ہوئے ہے
عربوں کے ہاں ''عبث'' کا مفہوم
انیسویں صدی میں عیسائیت کے خلاف یورپ کے ردّعمل کی وجہ جواز
تخلقِ کائنات کا اصل مقصد اور اس کی غرض وغایت
یہ پوری کی پوری کائنات انسانی اعمال کے نتائج کو ہی مرتب کرنے میں مصروف کار ہے
انسان کی موجودہ زندگی نظریہ ارتقا کی ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہے
ہماری یہ تمام تر زندگی جہانِ فردا کی زندگی کا دیباچہ ہے
قرآنی الفاظ افلح اور فلاحت کی تشبیہات کا مفہوم
اس زندگی کے بعد موت جیسے حادثہ کی اہمیت
جو صدف گوہر پیدا نہ کرے اس صدف کا کوئی فائدہ نہیں ہے
خدا تعالیٰ ایک فائنل اتھارٹی کے باوجود الکریم ہے
توحید کا دوسرا نام پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی فرمارروائی ہے
انسانی دنیا میں وحی کے ایک قانون کو نافذ نہ کرنے کا نتیجہ ہر سو تباہی ہر آن تباہی ہے
دعا کا مفہوم
لفظ رحم کا قرآنی مفہوم
رزق کے ساتھ اگر Values شامل نہ کریں تو پھر رزق پورا ہی نہیں ہوسکتا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کا جمِ غفیر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی طور پر اپنے اپنے خود ساختہ نظریات وتصورات کے فریبِ نفس میں مکمل طور پر اسیر ہونے کے باعث باہمدگر جس قدر غسلِ خوں میں مصروفِ کار رہے اس کے پیشِ نظر اگر اس دور کو تاریخ کا بدترین دور متصور کیا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا دورِ حاضر کی اِس ناگفتہ بہ اور خون آلود بدنما تصویر کے اِن بدنما داغوں کو مٹانے کی خاطر نوعِ انسانی کے لیے یہ امر اشد ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ رب العلمین نے ذکر للعالمین کی شکل میں انسانوں کی اس عالم گیر برادری کے لیے جو لاریب، بین، واضح، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہ اس نسخۂ کیمیا کو ایک بار پھر آزما لے۔ کیونکہ اِس نسخۂ کیمیا کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس نے انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا شافی علاج اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے کہ جو انسانی عقل کو کسی شکل میں بھی راہِ اعتدال سے نہیں ہٹنے دیتا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ فہم و فراست اور دلیل و برہان کے چراغ روشن کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارتا چلا جاتا ہے، اور اس گم کردہ راہی کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا۔ اس سراجِ منیر کا یہی وہ محکم سہارا ہے کہ جس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

برادرانِ عزیز! بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہی وہ جذبِ دروں تھا کہ جس کی بناء پر اُس نے اس فکرِ قرآنی کو عام کرنے کی غرض سے محترم پرویز صاحب علیہ الرحمۃ کے آڈیو ویڈیو پر دیے گئے سات سو کے قریب دروسِ قرآن کو سی ڈیز سے قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد اُنہیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ جس کے تحت ربِ کریم کی مہربانی سے زیرِ نظر سورۃ فاتحہ کے علاوہ مذکورہ دروس میں سے اس وقت تک سورۃ نحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف و مریم، سورۃ طٰہٰ، سورۃ حج، سورۃ انبیاء، پارہ 29 واں اور پارہ 30 واں مکمل شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس طویل سفر کو مکمل کرنے کی غرض سے بزمِ لاہور آج بھی پوری طرح سرگرمِ عمل ہے اور خیال ہے کہ سورۃ فاتحہ سے والناس تک کا یہ طویل سفر تقریباً چالیس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔

سورۃ فاتحہ چونکہ قرآنِ حکیم کا دیباچہ ہے شاید اس کی بنیاد پر ہی علامہ اقبال نے کہا تھا کہ انسان کی موجودہ زندگی آنے والی

زندگی کا دیباچہ ہے۔

اس سورۃ میں رب العزت نے اپنی بنیادی صفات ربوبیت عالمینؑ رحمانیتؑ رحیمیتؑ اور مالکیت کو کچھ اس طرح ترتیب اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس سے انسان حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے اس کے کائناتی کنٹرول کی ہیئت اور اس کی افادیت کے سمندر سے کچھ قطروں ہی سے اپنی تشنگی بجھا سکتا ہے۔ جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اشیائے کائنات کی نشوونما کے پوشیدہ راز بتدریج اُس کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔ البتہ جہاں تک حیاتِ انسانی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خالقِ کائنات نے حضرت انسان کو اس کی موجودہ زندگی کے مقصدِ عظیم سے بڑی وضاحت اور بلیغ انداز میں آگاہ کر دیا ہے۔ بقول شاعر

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوقِ دید نکھر گیا
تیری ضوفشانیٔ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

سورۃ فاتحہ کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کے لیے ایک ایک درس مختص کیا جس کی افادیت کا اندازہ قارئین کو ان دروس کے مطالعہ سے ہی ہو سکے گا۔

برادرانِ عزیز! اس موقع پر یہ چیز بغیر کسی تامل کے علی وجہ البصیرت کہی جا سکتی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے قرآنِ حکیم کی یہ تفسیر جو قرآنِ حکیم ہی کے آئینے میں پیش کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور ہمیں یقینِ محکم ہے کہ موصوف کی عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاری کا یہ سرمایۂ حیات نوجوان نسل کے علاوہ ہر صاحبِ علم وفکر کے لیے ایک انمول خزینہ ثابت ہوگا اور اس کے مطالعہ کے بعد آخر کار انسان بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ قندیلِ آسمانی کا یہ نسخۂ کیمیا اس قدر واضحؑ لاریبؑ آسان اور ہر قسم کے تضادات سے پاک اپنے اندر ایک ایسا ملکہ لیے ہوئے ہے کہ جو دوٹوک الفاظ میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن اور مستقل طور پر نوعِ انسانی کے لیے تاحیات راہنمائی کا بنا رہے گا۔

ہر قدم پر بھٹکتی رہی زندگی
ہر قدم پر وہ آواز دیتے رہے

یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کہ اے نوعِ انسانی! تم اس ضابطہ حیات کے بلا مزد و معاوضہ مل جانے پر خوشیاں مناؤ کیونکہ یہ وہ ضابطہ حیات ہے کہ جو کچھ انسان اکٹھا کرتا ہے یہ اُس سے کہیں زیادہ قیمتی متاع ہے''۔

خدا کرے اس کرۂ ارض پر بکھری ہوئی ملتِ اسلامیہ جو اس وقت افسردہ و پژمردہ حالت میں سرگرداں ہے وہ ایک بار پھر امتِ واحدہ کے پرنور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو جائے۔ عزیزانِ من! آبِ حیات کی یہی وہ شرابِ طہور ہے کہ جس کے ساغر سے مانوس ہو کر انسان اُس حسن و جمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا جسے انسانی آنکھ کے لیے قدرت نے اپنے ہاں مستور

کر رکھا ہے۔اور پھر واقعاتی طور پر یہ باور کرلے گا کہ قرآنِ حکیم کا یہ قول یقینی طور پر حتمی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی امامت کی سزاوار نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ حتمی اعتراف ہے کہ جس کی بناء پر یہ عالمگیر برادری مصائب و آلام کی موجودہ چیخ و پکار سے آزادی حاصل کرتے ہوئے فکرِقرآنی کے مضراب سے نکلنے والی دھیمی دھیمی اور دلوں کوموہ لینے والے اُن مسحور کن نغموں کی پرکیف آوازوں سے لطف اندوز ہوسکے گی۔عزیزانِ من! انسانی زندگی کا یہی وہ حسین منظر ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے آسمانِ عالم اس انتظار میں ہے کہ یہ بھٹکا ہوا راہی اس قندیلِ رحمانی کی روشنی میں اپنا سفرِ زندگی کب شروع کرتا ہے۔

عزیزانِ من! انسانی زندگی کے سلسلہ میں خواہ یہاں کی زندگی کے لمحات ہوں یا جہانِ فردا کا دورِ حیات' ربِ کریم تو ہر دور میں انسان کے لیے رب بھی ہے' الرحمٰن بھی' الرحیم بھی' اور مالک یوم الدین بھی۔لہٰذا اس بناء پر خالقِ کائنات' کائنات کا مالک ہونے کے ناطے اس میں ہر آن اضافہ کرتا رہتا ہے۔یہ وہ صفاتِ ربِ کریم ہیں کہ جن کی ترجمانی کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

برادرانِ عزیز! آخر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور
جنوری 2007

پہلا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 1 تا 4)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝

عزیزانِ من! آج اپریل 1977 کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون سے ہوتا ہے۔ یہ 23 واں سورۃ ہے اور اسی سورۃ سے اٹھارویں پارے کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔

سابقہ سورۃ کی آخری آیات میں کہا گیا تھا کہ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو **لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** (22:77) تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں، تمہیں کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوں اور اب اس سورۃ کا آغاز ہوتا ہے۔ **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ** [1] (23:1) یعنی وہی جو وہاں **تُفْلِحُوْنَ** (22:77) کہا تھا، اب اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے۔ اس لفظ کا مفہوم میں ابھی بیان کرونگا کہ کہا کیا ہے؟ اسی کے تسلسل میں آپ دیکھتے ہیں کہ کیسا ربط ہے! نہ صرف یہ کہ قرآنِ کریم کی آیات میں ربط ہے، بلکہ یہ سورتیں جس ترتیب سے آئی ہوئی ہیں، ان میں بھی آپ دیکھیں گے کہ مفہوم کے اعتبار سے ربطِ معنوی ہے اور یہی ربط آپ میرے مفہوم القرآن میں بھی دیکھیں گے۔ اس میں یہ کتابِ مبین الحمد سے والناس تک کس طرح مسلسل مربوط کتاب جا رہی ہے: آیات میں ربط ہے، سورتوں میں ربط ہے۔ لہٰذا اب اسی اجمال کی تشریح اور تفصیل یہاں آئے گی۔ کہا ہے کہ **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ** [1] (23:1)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی ہوتا ہے کہ مومن کامیاب ہونگے اور کامیابی کے لیے ہمارے ہاں دوسرا لفظ لکھا جاتا ہے: ''نجات پالیں گے''۔

جیسا کہ میں متعدد بار، قریباً ہر درس میں، یہ کہتا چلا آ رہا ہوں اور اسے بار بار کہتا جاؤنگا، اور یہ جو درس میں بار بار کہنا ہے، یہ تکرار یا Repetition نہیں ہوتی۔ آجکل گیہوں کی کٹائی کا موسم آ رہا ہے۔ ہم جو شہر والے ہیں، انہوں نے تو کبھی گیہوں کا پودا بھی نہیں دیکھا

---

[1] آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہیں جن کی کھیتیاں پکیں گی، جن کی محنتیں ثمر بار ہوں گی، جو دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے؟ (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ ۷۷۳)

ہوگا۔ یہ تو گیہوں کا درخت ہی سمجھتے ہیں لیکن گاؤں والے جانتے ہیں کہ کٹائی کے بعد وہاں گہائی ہوتی ہے۔ وہ جو خوشے ہوتے ہیں، جن کے اندر یہ دانے ہوتے ہیں، وہ زمین پہ بچھا دیئے جاتے ہیں اور اسی دائرے کے اندر اس پر سارا دن بیل چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ نظر آئے گا کہ ان بیلوں کی یہ جو رفتار ہے، یہ جو دن بھر چلنا ہے، یہ تکرار ہے، وہ اسی دائرے میں چلتے چلے جا رہے ہیں لیکن اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خوشوں کے اندر جو دانے ہیں وہ باہر نکل آئیں، چنانچہ اس کے لیے یہ پروسیس (Process: عمل) اختیار کیا جاتا ہے یعنی بار بار اسی چیز کو سامنے لانا تاکہ چھلکا الگ ہو جائے اور اندر سے اس کا مغز یا دانے باہر آ جائیں۔ اسے درس کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم نے اسے اپنے ہاں تصریفِ آیات کا انداز کہا ہے یعنی کہا یہ ہے کہ بار بار اس کے سامنے ہم ان آیات کو لاتے ہیں تاکہ قرآن کے حقائق کا مفہوم واضح ہو جائے۔ دراصل یہ وہی چیز ہے جسے درس کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ جو کسان کا ان خوشوں کا گاہنا ہوتا ہے، اسے درس کہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب تک وہ سارا طریق اسی طرح سے نہ چلایا جائے وہ دانہ چھلکے سے الگ نہیں ہوتا، درس کا لفظ وہاں سے ہے۔ اس لیے اگر اس میں ایک ہی چیز بار بار آتی چلی جائے تو وہ تکرار نہیں کہلائے گی بلکہ چھلکوں کو الگ کرنے کا ایک طریق کہلائے گا۔ ویسے بھی درس میں تو صورت یہ ہوتی ہے کہ بہت سے نووارد حضرات ہوتے ہیں، انہوں نے پہلے ان باتوں کو سنا نہیں ہوتا۔ ان کے لیے یہ نئی بات ہوتی ہے، البتہ جو سنتے چلے آ رہے ہیں ان کے لیے یہ سندِ مقرر ہو جاتی ہے یا ان مفاہیم کی تجدید ہو جاتی ہے، اس لیے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے دو چار بزرگوں کے سوا آپ حضرات ان دروس کے نوٹس نہیں لیتے یا میرے درس کو کہیں تحریر میں نہیں لاتے تو اس لیے تجدیدِ یادداشت بھی ہو جاتی ہے۔

قرآنی الفاظ کے مفہوم کی ایک بین مثال مذہب میں نجات کے تصور کی نفی ہے

میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآنِ کریم کے کسی ایک لفظ پر بھی کھڑے ہو کر دیکھیں کہ اس نے اپنے ہاں کس کس قسم کے حقائق بیان کیے ہیں تو آپ کو اس کے مفہوم میں دو باتیں نظر آئیں گی۔ ایک تو یہ کہ دیگر مذاہب جو انسانی ذہن کے خود تراشیدہ ہیں، وہ دینِ خداوندی نہیں ہیں، وہ تو انسانوں کے وضع کردہ مذاہب ہیں۔ لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ ان مذاہب کے مقابلے میں دینِ خداوندی میں جو بنیادی تصورات دیئے گئے ہیں، ان کے مابین ایک ہی لفظ یا ایک ہی اصطلاح میں ایک واضح فرق سامنے آ جائے گا۔ لہٰذا اس سے پہلے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں فرق کتنا ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے مقابلے میں مذہب کا تصور کس قدر غلط ہے۔ دراصل قرآن حکیم کا یہ بڑا اعجاز ہے۔

قرآن حکیم نے تُفْلِحُوْنَ یا اَفْلَحَ کا جو انتخاب کیا ہے یہ وہی ہے جسے فلاحت کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر فلاحت

کے بجائے جو تصور ہے' وہ ''نجات پانا'' ہے۔ آپ کسی سے پوچھیے کہ اسکی ساری زندگی کی غایت' اس کی لِـــم' اس کا منتہا' اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ صرف یہی کہے گا کہ یہ سب کچھ صرف نجات کے حصول کے لیے ہے۔ آپ کے ہاں یہ جتنی بھی مذہب کی عبادات ورسومات ہیں' یہ جتنی بھی مناسک ومشقتیں ہیں' ریاضتیں اور قربانیاں ہیں' آخر ان سے مقصد کیا ہے؟ تو ایک لفظ میں بتایا جائے گا کہ جی! مقصد ہے نجات حاصل کر لینا' یعنی نجات کو آخری مقصد قرار دیا جاتا ہے اور جس کی نجات ہوگئی بس سمجھ لیجیے کہ اس نے سب کچھ پالیا۔ نجات کے متعلق مذاہب میں' تصور تو یہ ہے۔ نجات' ہندو دھرم میں' مکتی کو کہتے ہیں۔ عیسائیت کے ہاں سے جو اس کا ترجمہ ہوکر آیا ہے' تو وہ اسے Salvation کہتے ہیں۔ یہودیت میں بھی نجات کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی مذہب میں یہ نجات ہی کا تصور ہے جبکہ قرآن اس تصور کو ہی باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک عجیب وغریب تصور پیش کرتا ہے اور اس تصور سے آپ دیکھیں گے کہ دینِ خداوندی کیا ہوتا ہے اور انسانی ذہن کا تراشیدہ مذہب کیا ہوتا ہے؟ یہ نجات' مکتی یا Salvation ہے کیا؟ اس کے معنی ہوتے ہیں' جیسا کہ نجات کا ہمارا تصور ہے' عذاب میں ڈال دیا' وہاں سے نکال دیا تو نجات ہوگئی۔ یعنی نجات کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی مصیبت میں کوئی پھنسا ہوا ہو' اس مصیبت سے چھٹکارا ہو جائے تو اس کی نجات ہوتی ہے۔ یہ لفظ اب ہمارے ہاں عام طور پر اردو زبان میں استعمال ہونے لگ گیا ہے کہ اس عذاب سے نجات پائی' اس مصیبت سے نجات پائی یا یہ کہ صاحب! اس سے تو نجات کا کوئی طریقہ ہی نظر نہیں آتا' اور اس کے معنی ہوتے ہیں کہ انسان کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا' نجات کہلاتا ہے۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو یقیناً مسرت بھی ہوگی اور حیرت بھی کہ اس تصور میں اور جو قرآنِ کریم نے تصور دیا ہے' کس طرح زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ یہ نجات کیا ہے؟ ہندو دھرم کی مکتی کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ انسان ایک جنم لیتا ہے' اس میں بہت سے پاپ یا گناہ کرتا ہے' اس پر گناہوں کی آلائشیں لگ جاتی ہیں' پھر اس کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے کہ کچھ آلائشیں اس کی صاف ہو جائیں' کچھ صاف ہوتی ہیں' کچھ اور لگ جاتی ہیں' وہ پھر جنم لیتا ہے' پھر جنم لیتا ہے' اسے ''جون کا چکر'' کہتے ہیں۔ ایک چکر دیا جاتا ہے اور اس چکر میں تو پوچھو نہیں صاحب! تفصیل بڑی ہے کہ بتیس کروڑ دفعہ یہ جنم لیتا ہے یا کتنا لیتا ہے لیکن ایک چکر ہے جس میں وہ چلا جاتا ہے۔

نجات کا یہ تصور فیثا غورث کا دیا ہوا ہے ❶

دائرے کا یہ تصور یونانیوں کے ہاں ہے۔ فیثا غورث (500-580 ق م) ان کے ابتدائی مفکر تھے۔ انہوں نے آسمانی کرّوں پہ غور

---

❶ (Theologian) Pythagoras(c.580-500B.C)۔ وہ فلسفہ اور ریاضی دان ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی عالم (Theologian) بھی تھا۔

(Readers' Digest (1990): Universal Dictionary,London: Readers' Digest Association Ltd. ,P.1253)

کیا تو وہ انہیں گول نظر آئے۔ انہوں نے یہ فکر پیدا کی کہ زندگی دائرے کے اندر چلتی ہے۔ دائرے کا معنی ہوتا ہے کہ آپ ایک نقطے سے شروع کریں، چلتے جائیں، اتنی لمبی مسافت کے بعد پھر اسی نقطے پہ آ جائیں، یعنی آپ کوئی قدم آگے نہیں بڑھاتے، منتہا آپ کا دائرے میں اسی نقطے کے اوپر آ جانا ہے جہاں سے آپ چلے تھے۔

ہندوؤں کی مکتی کیا ہے؟ انسان پہلی دفعہ آیا تو پاک اور صاف تھا۔ یہاں دنیا میں اسے مایا وغیرہ کی یہ ساری آلائشیں لگیں، وہ اس چکر کے اندر چلتا چلا گیا اور آخر میں جا کر پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ اسے نجات یا مکتی کہا یعنی آلائشوں کے اس چکر سے چھوٹ گیا۔ دراصل یہ چکر کا تصور یا تناسخ کا تصور یونان کے حکما کا دیا ہوا ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ Transmigration of Soul (جون کا چکر) کہتے ہیں۔ وہاں کا مفکر یہ فیثا غورث (500-580 ق م) تھا۔ یہ اس کا دیا ہوا تصور ہے کہ زندگی ایک دائرے کے اندر گھومتی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس چکر کے اندر جتنی بھی اس کو آلائشیں لگتی ہیں، وہ پاک ہو کر پھر ویسا ہی ہو جائے جیسا پہلے تھا۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھیے ''جیسا پہلے تھا پھر ویسے ہی ہو جائے''۔

ہندوؤں، عیسائیوں اور خود اپنے ہاں، مذہبی دنیا میں نجات کا تصور

عیسائیت نے کہا کہ ہر بچہ اپنے اولیں ماں باپ، آدم اور حوّا کی معصیت کی آلائش اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ آدم اور حوّا نے گناہ کیا تھا، جنت سے نکالے گئے تو گناہ تو انہوں نے کیا لیکن ہر انسانی بچہ اس گناہ کی کثافت لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس کے دُور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے کفارے پر ایمان لایا جائے یعنی یہ ایمان لایا جائے کہ انہوں نے اپنی جان دیکر میرے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ یہ ہے کفارے کے معنی۔ جو اس حقیقت پہ ایمان لے آئے، وہ کہتے ہیں، کہ اس کی جہنم کے عذاب سے نجات ہو گئی، Salvation (نجات) ہو گئی۔ آلائش کے ساتھ پیدا ہوا، اس عقیدے پہ ایمان لایا، تو وہ ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ آلائش سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ پھر وہی بات ہو گئی، ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا، یعنی as you were۔ آپ کے ہاں بھی مذہب میں، دین میں نہیں، قرآن میں نہیں، تصورِ نجات ہی کا ہے: انسان پاک اور صاف پیدا ہوا، یہاں اس پر گناہوں کی آلائشیں آئیں، ان آلائشوں سے پاک صاف کرنے کے لیے اسے جہنم میں بھیج دیا گیا، وہاں اس کی یہ آلائشیں دھوئی گئیں، وہ صاف ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے یہ ''مفسرین اور مفکرین''، جہنم کی تشبیہ ہی یا تو دھوبی کی بھٹی سے دیتے ہیں، یعنی کپڑا لائے، صاف ستھرا پہننے سے اس پہ میل جم گئی، دھوبی نے بھٹی چڑھایا، پھر صاف ستھرا ہو گیا، as you were ہو گیا یا اسے Sanatorium (سینیٹوریم) قرار دیتے ہیں، انسان تندرست تھا، تپ دق (T.B) کی آلائشیں لگیں، اس مصیبت یا بیماری میں گرفتار ہو گیا، اسے Sanatorium (سینیٹوریم) بھیج دیا گیا، وہاں اس کا علاج ہوا،

اس بیماری سے اس نے شفا پائی' وہاں سے نجات حاصل کی' پھر اس کو ڈسچارج کر دیا' جیسا یہ اس بیماری سے پہلے تھا پھر ویسا ہی ہو گیا: as you were۔ یہ وہی ہے جو یونان میں دائرے (Cycle) کا تصور چلا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ساری زندگی Cyclic Order (دوری ترتیب) میں چلی۔ جس نقطے سے زندگی چلی تھی' راستے میں' یہ ساری مصیبتیں' مشقتیں' ریاضتیں' یہ سارا کچھ' بھگتنے کے بعد' زندگی نے Cycle (دائرے) کو پورا کیا اور اسی نقطۂ آغاز کے اوپر چلی گئی' as you were ہو گئی' یعنی جیسی پہلے تھی ویسی ہی ہو گئی۔ ہندوؤں کا مکتی کا دھرم تھا۔ ان کے ہاں کی جو ویدانت ہے' جسے تصوف کہتے ہیں' اس کی رو سے ان کا تصور یہ ہے کہ انسانی آتما یعنی روح پرماتما کا ایک جزو ہے' یعنی روحِ اعلیٰ کا' مکمل روح کا۔ یہ ایشور یا خدا کی روح کا ایک حصہ ہے۔ یہ آتما ہر انسان کے پیکر میں آیا ہوا ہے۔ یہ ایک حصہ ہے جو وہاں سے آیا ہے' اب پتہ نہیں کہ باقی وی اوتھے کچھ رہیا کے نہیں۔ وہ ایناں ایناں وی وچوں بھرنا شروع ہووے تو وہ اس میں آ گیا❶ اب یہ حصہ انسان کے مادی پیکر میں آ کر دلدل میں پھنس گیا۔ اب یہاں اس Material World (مادی دنیا) میں اس مادے کی کثافت کو دور کرنے کے لیے' ترکِ لذات' ترکِ لذائذ' ترکِ دنیا اور ترک در ترک کرتے چلے جایئے' یہ سارا کچھ چھوڑتے چلے جایئے تو انسانی روح پھر خدا کی روح میں جا ملے گی۔ وہ جو سادھو اور ان کے سنیاسی مشقتیں بھگتے ہیں' وہ آپ بھی کرتے چلے جایئے تو یہ آلائشیں دُور ہو جائیں گی اور آپ کی یہ آتما جو روحِ خداوندی کا حصہ ہے' پرماتما کے اندر جا کر پھر مل جائے گی' آپ کی نجات ہو گئی' یہ as you were❷ ہے۔ اے تے پرماتما دی نجات ہوئی کہ اس میں سے ایک حصہ ٹوٹا ہوا تھا' اور پھر اس وچ مل گیا❸۔ بہرحال آپ کے ہاں تصوف یہی ہے کہ روحِ خداوندی کا ایک حصہ ہے جو ہر انسان کے اندر ہے۔ آپ کے ہاں یہ ساری چیزیں دوسروں سے آئی ہوئی ہیں۔

نجات کے متعلق یہ تمام کے تمام تصور باطل ہیں

میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن کا تو تصور ہی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ سارے مراقبے' ریاضتیں' اور مشقتیں جو تصوف میں اٹھائی جاتی ہیں' اور پوچھو نہیں کہ کس قدر تکلیف دہ مشقتیں ہیں' یہ وہی ہیں جو وہاں سنیاسی اور سادھوؤں کی ہیں۔ یہ سب اس لیے اٹھائی جاتی ہیں کہ یہ جو خداوندی روح اس پیکر میں آ کے پھنس گئی ہے' اسے اس پیکر سے نجات مل جائے اور یہ پھر واصل بالحق ہو جائے۔ آپ کو

---

❶ اب یہ معلوم نہیں کہ وہاں بھی کچھ باقی بچا ہے کہ نہیں بچا۔ وہ تھوڑا تھوڑا بھی وہاں سے انسان میں بھرنا شروع ہو جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔

❷ جیسے آپ پہلے تھے' ویسے ہی اب ہو گئے۔

❸ یہ روحِ خداوندی کی نجات ہوئی کیونکہ اس میں ایک حصہ ٹوٹا تھا وہ پھر اس میں آ ملا۔

یاد ہوگا' میں یہ بتایا کرتا ہوں' کہ یہ وجہ ہے کہ ان کے ہاں یہ جتنے بزرگ ہیں' جب ان کی وفات ہوتی ہے' تو وہ اسے وفات نہیں کہتے۔ کہتے ہیں کہ حضور کا وصال ہوگیا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ وصال اور وصل کے معنی ہوتے ہیں: مل جانا۔ وصال ہوگیا یعنی ان کی روح خدا کی روح میں جا کر مل گئی ہے۔ وہ اس کو کہتے ہی وصال ہیں: اس روح کا اس کے ساتھ جا کر مل جانا۔ جب تک یہ نہیں ملتی' اس وقت تک اسے چین نصیب نہیں ہوتا۔

اس تصور کی شدت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مثنوی مولانا روم [1] کے پہلے ہی شعر کا مطلب یہ ہے کہ سوچو' بنسری کا مطلب' یہ آہ وفغاں کیوں کرتی ہے؟ اس لیے کہ یہ جہاں کی اصلاً تھی' اسے وہاں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے اور اب یہ روتی رہتی ہے۔ اسے پھر سے وہاں' جوڑ دیجیے' آہ وفغاں ختم ہو جائے گی' یہ پھر سے اصل میں مل جائے گی۔ یہ ہے زندگی کا تصور یعنی جیسے پہلے تھا ویسے ہو جانا: As you were

قرآنِ حکیم نے انسانیت کو صراطِ مستقیم سے متعارف کرایا ہے

برادرانِ عزیز! ایران کے مفکر ہوں یا مذاہب عالم کے ہوں' ہر جگہ زندگی کا Cyclic order یعنی دائری حرکت کا تصور ہے۔ قرآن کریم آیا تو اس نے صراطِ مستقیم کے الفاظ میں یہ جو سارے فکری باطل تصور تھے اور مذاہب کے خود تراشیدہ تصورات تھے' ان کی تردید کر کے' ان پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ صراطِ مستقیم دائرہ نہیں' سیدھا راستہ ہے اور سیدھے راستے پہ جب بھی آپ کا قدم چلے گا' آخر میں

---

[1] مولانا جلال الدین رومیؒ 1207ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فرید الدین عطارؒ کے زیرِ تلمیذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کیے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیامبر ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں اس مسلک کی تبلیغ کی ہے۔ علامہ اقبالؒ انہیں اپنا ''پیرومرشد'' کہہ کر پکارتے ہیں اور اپنے کلام میں اکثر و بیشتر ان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ چیز اربابِ فکر و نظر کے لیے فی الواقعہ بڑی حیرت انگیز ہے کہ علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) جو تصوف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا قرار دیتے ہیں (اور وہ فی الواقعہ اجنبی پودا ہے) اور اس فلسفہ وحدت الوجود کے امام شیخ اکبر ابن عربی کی فصوص الحکم کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں ''الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں''، وہ اسی تصوف اور وحدت الوجود کے پیغام پر رومیؒ کو اپنا پیرومرشد کس طرح تسلیم کرتے ہیں' بالخصوص جب دوسری طرف ان کا دعویٰ ہے کہ وہ (علامہ اقبالؒ) جو کچھ کہتے ہیں' قرآن کی روشنی میں کہتے ہیں۔ یہ واقعی ایک ایسا معمہ ہے جسے ہم حل نہیں کر سکتے (اور شاید کوئی بھی حل نہیں کر سکتا) ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ رومیؒ کے ہاں ایک جوش اور حرارت پائی جاتی ہے اور ان کی یہی چیز ہے جو اقبالؒ کو بھا گئی۔ یہ خصوصیت اقبالؒ کو کہیں بھی نظر آئے وہ اسے بہ نگاہِ پسندیدگی دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے مسلک یا نظریہ کو قرآنی قرار دینے کے لیے تنہا یہ چیز تو کافی نہیں ہو سکتی۔ (پرویزؒ: مجلسِ اقبال (حصہ دوم: شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق)' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1997' ص ص 21-20)

آپ جہاں کہیں بھی پہنچیں گے تو وہاں سے دُور چلے جائیں گے۔ کسی منزل پہ پہنچیں گے' نقطہ آغاز پہ واپس نہیں آئیں گے' بلکہ آگے بڑھیں گے۔ دائرے میں منتہا اسی نقطے پہ آ جانا ہے۔ جسے آپ صراط یا راستہ کہتے ہیں' اس میں تصور آگے بڑھنے کا ہے۔ صراط پہ آپ کا ہر قدم آگے جاتا ہے اور اس سفر کی انتہا وہی نقطہ آغاز نہیں ہوتا' وہاں سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہوتا ہے' اگر آپ کی منزل متعین ہو تو پھر آپ منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ منتہا آپ کا کسی منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ آپ غور فرمایئے پہلی ہی سورۃ فاتحہ کے اندر جو پہلی دعا سکھائی گئی' صراط کے ایک لفظ میں ہے۔ وہ جو دنیائے فکر اور جہانِ مذاہب میں جو ساری دنیا میں زندگی کا Cyclic (دوری) تصور چھایا ہوا تھا' عزیزانِ من! اس ایک لفظ صراط نے ان تمام تصورات کی نہ صرف تردید کی بلکہ زندگی کا ایک مثبت تصور بھی دیا کہ زندگی کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں چکر لگانے کا نام نہیں ہے' زندگی ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے' آگے بڑھنے کا نام ہے' کسی منزل تک آگے پہنچنے کا نام ہے' اس میں واپسی نہیں ہے' اسی نقطہ آغاز پہ پہنچنا نہیں ہے' آگے بڑھنا ہے' زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن حکیم نے دائرے یا چکر پر سفر کرنے کے غلط تصورِ زندگی کو ایک لفظ صراط سے واضح کر دیا۔

صراط کے بعد طبقاً عن طبقٍ کی بلند ترین منازل

آپ نے اب دیکھا کہ ایک لفظ کے استعمال سے قرآن نے کیا کچھ کہہ دیا اور پھر اس صراط کے بعد یہ کہا ہے کہ یہ **طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** (84:19). یعنی یہ صراط سیدھا بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والا بھی ہے یعنی یہ stage by stage (درجہ بدرجہ) ہے۔ اسی لیے اس نے خدا کو ذی المعارج (70:3) کہا ہے: سیڑھیوں والا خدا۔ سیڑھی میں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ سیدھی بھی ہوتی ہے اور آپ کا ہر قدم جو اٹھتا ہے وہ بظاہر تو سیدھی سیڑھی پہ ہوتا ہے لیکن پہلے قدم سے بلندی کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔ سیڑھی کے آخر پہ پہنچ کر آپ وہیں نہیں پہنچے' جہاں سے شروع ہوئے تھے' آپ پستی کی منزل کو دُور چھوڑ آئے' آپ بلندی پہ جا پہنچے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

زندگی کے کسی منزل پہ رک جانے کا نام جہنم ہے

عزیزانِ من! اگر زندگی درجہ بدرجہ' ارتقائی منازل طے کرتی آگے نہیں بڑھتی' کسی مقام پہ رک جاتی ہے' تو اس کا نام قرآن کریم کے نزدیک جہنم [1] ہے۔ اس کے لیے لفظ جحیم [1] آیا ہے۔ جحیم کے معنی ہی کسی ایک مقام پہ کھڑے ہو جانا' رک جانا ہیں۔ اگر زندگی کا وہ سارا دائرہ ختم کر کے آپ پھر اسی نقطے پہ جا کر کھڑے ہو جائیں تو قرآن کی رو سے یہ جحیم ہے۔

---

[1] جہنم اور جحیم کی تشریح و مفہوم کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص ص 275 (فٹ نوٹ 2)

انسان کے لیے قدم قدم پر اپنے سفرِ حیات کی پیمائش کرنا لازم ہے

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ 2:217) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کام تو بہت کیے' بیکار نہیں بیٹھے' بے عمل نہیں تھے' ان کے اعمال ہیں لیکن ان اعمال نے کوئی نتیجہ پیدا نہ کیا کیونکہ وہ دائرے کے اندر سفر کرتے رہے' آخر میں اسی نقطے پہ پہنچ گئے جہاں سے بات شروع کی تھی تو کہا کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217) ان کی ساری مسافت' ان کا سارا سفر' بیکار چلا گیا۔ کیا بات ہے! آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ سے یا ایک اصطلاح سے قرآن کیا کام کر جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ میں فائزون کا مفہوم

قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی لفظ آئے' کھڑے ہو جایئے۔ یہ پہلی بات ہے اور دوسری یہ بات ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے جتنے بھی باطل یعنی غلط تصورات ہیں' وہ تمام آپ کے سامنے ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ قرآن اس ایک لفظ سے کیا بات کہہ گیا ہے۔ جہاں اس نے ''نجات'' کا لفظ استعمال کیا ہے تو مومنین کے لیے اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی آنے والی مصیبت سے بچائے رکھنا' محفوظ رکھنا' مصیبت میں پھنس جانے کے بعد اس سے نکالنا نہیں' بلکہ شروع سے ہی اس سے محفوظ رکھنا'' زندگی کے متعلق قرآنِ کریم نے اپنے ہاں ایک لفظ ''فائزون'' کہا ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ فائز المرام کہتے ہیں۔ یہ لفظ فوز (ف و ز) ہے۔ اس کے معنی Achievement (حصول و تکمیل) کے ہوتے ہیں: Some thing achieved یعنی کچھ حاصل کیا' ویسے کا ویسا نہیں ہو گیا۔ ہمارے ہاں بھی فوز و فلاح کا لفظ بولتے ہیں۔ فلاح کا یہ لفظ بھی قرآن کا ہے اور گہری سوچ کا تقاضا کرتا ہے۔

انسانی نامہ اعمال کی برومندی کے سلسلہ میں زراعت کی مثال

اس سورۃ کا آغاز ہی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (23:1) سے ہوتا ہے۔ فلاح سے بات شروع ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ انسانی اعمال کے بانتیجہ ہونے کی ایک ایسی نازک حسین اور اس کے ساتھ ہی اس قدر مکمل تشبیہ ہے کہ جسے اونٹ چرانے والا بدو بھی سمجھتا تھا اور آج کا حکیم برگسان [1] بھی سمجھتا ہے۔ مثال وہ دیتا ہے کھیتی کی' زراعت کی۔ فلاحت کہتے ہی زراعت کو ہیں' کھیتی کو ہیں۔ یہ کتنی حسین' عمدہ اور بامعنی تشبیہ ہے۔ کھیتی میں کیا ہوتا ہے؟ زمین جس میں کچھ اگانے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کسان کو دے دی جاتی ہے۔ وہ زندگی' جس میں نمود کی صلاحیت ہوتی ہے' نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے' وہ انسانی زندگی ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور پھر

---

[1] برگسان' ہنری (1859-1941)' ایک فرانسیسی فلسفی

کہا جاتا ہے کہ اس کسان سے کہہ دو کہ لو یہ ہیں قوانین۔ ان کے مطابق اس زمین کو تیار کرو۔ اس میں اس طرح سے بیج ڈالو یوں اس بیج کی رکھوالی کرو' اس کو پانی دو' ہوا روشنی حرارت کی یہ ساری چیزیں مہیا کرو' تو پھر آخر میں کیا ہوتا ہے؟ کیا آخر میں وہ زمین ویسے کی ویسی رہ جاتی ہے جیسے اسے دی گئی تھی؟ نہیں' بلکہ ایک ایک دانے کے سات سات سو دانے اس کے گھر میں آتے ہیں' اس کی ساری کوشش ثمر بارو برومند ہوتی ہے' نتیجہ خیز ہوتی ہے' اس کے لیے کچھ لاتی ہے۔ کھیتی بونے سے پہلے کے کسان اور کھیتی کاٹنے کے بعد کے کسان کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایہدی کوٹھی دانیاں نال بھر جاندی اے' جیہڑی پہلاں خالی سی ❶۔

قرآنِ کریم نے انسان کی اس زندگی کے لیے اسے اچھی زمین سے تشبیہہ دی ہے' پھر اس میں جو بیج ڈالا جائے گا' اسے اس نے ایمان سے تشبیہ دی ہے یعنی اس بات کا یقین کہ یہ جو گیہوں کے دانے ہیں' ان میں یہ صلاحیت ہے کہ انہیں اگر قوانین کے تابع بویا جائے گا' رکھوالی کی جائے گی تو یہ خوشے بنیں گے اور ایک ایک خوشے میں اتنے اتنے دانے پڑیں گے۔ کسان کو یہ یقین ہو' جبھی وہ اتنی محنت کرتا ہے اور اپنے گھر میں روٹی پکانے کے لیے رکھی ہوئی گیہوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہو تو وہ کبھی یہ کرتا ہی نہیں ہے۔ جس بیج کے متعلق کوئی سمجھدار' کسی کسان سے یہ کہدے کہ نہیں اوئے! اینیں نئیں اگنا یعنی اس میں اگنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے' وہ اس پہ محنت نہیں کرتا۔ وہ اس بیج پہ محنت کرتا ہے جس کے متعلق اسے یقین ہو کہ اس میں بار آور ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ جو اس چیز کا یقین ہے اسے ایمان کہتے ہیں۔ ان بیج کے دانوں پر جو یہ خالی یقین ہے' یہ تو کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس یقین کے بعد پھر وہ جو خدا کا قانون مقرر ہے' اس کے مطابق اسے محنت کرنا پڑے گی۔ یہ جو ان قوانین کے مطابق' محنت کے کام ہیں انہیں اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔

زندگی کی کامرانی ایمان اور عمل صالح کا فطری نتیجہ ہے

عزیزانِ من! اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ❷ سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ وہ تو ایمان کے بغیر عملِ صالح کا ذکر ہی نہیں کرتا' اگر کسان کو اپنے بیج کی صلاحیتوں پر یقین ہی نہیں ہے' تو وہ اس پر محنت ہی نہیں کرے گا' پھر اعمال کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر بیج ناقص ہے' اس میں اُگنے کی صلاحیت نہیں ہے' کسان یہ کہہ کر اسے بو دے کہ کوئی بات نہیں پھر جتنا جی چاہے اس پر وہ محنت کرتا چلا جائے' اس کے وہ اعمال اعمالِ صالحہ نہیں بنتے۔ صالح تو صلاحیت سے ہے۔ یہ وہ اعمال' وہ کام ہیں جو اس بیج کی صلاحیتوں کو تکمیل تک پہنچا دیں۔ اعمالِ صالحہ کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کا وہ پروسیس' (عمل) ہے جس سے زندگی میں کیے جانے والے کام' یا اعمال برومند یا ثمر بار ہوتے ہیں۔ اسے قرآن نے ہر جگہ فلاحت' کھیتی یا زراعت سے تشبیہ دی ہے۔

---

❶ اس کی کوٹھی جو پہلے خالی تھی وہ دانوں سے بھر جاتی ہے۔

❷ خدا پر ایمان رکھنے' اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہنے والے۔

اب آپ سوچ لیجیے' عزیزانِ من! کہ پہلے اس نے زندگی کے سفر کو صراط سے تشبیہ دے کر وہ جو دائرے کا چکر' بلکہ گھن چکر تھا' کس طرح انسان کو اس سے نجات دلا دی اور پھر انسان کو ایک سیدھے راستے کے اوپر ڈال دیا' جو سیدھا بھی ہے اور بلندیوں کی طرف لے جانے والا بھی ہے۔ اس کا ہر قدم پہلے قدم کے مقابلے میں آگے ہوتا ہے اور پھر اونچا بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرمؐ کی وہ حدیث جو میں سمجھتا ہوں کہ یقیناً حضورؐ کی ہو سکتی ہے' موتی کی طرح چمکتی ہے' جس میں یہ فرمایا تھا کہ جس شخص کا آج (Today) اس کے گزرے ہوئے کل (Yesterday) کے مقابلے میں زیادہ برومند نہیں ہے' سمجھ لو کہ وہ گھاٹے میں رہا' تباہ ہو گیا۔ یعنی اگر دو دن برابر ہیں' آج کا دن (Today) کل کے دن (Yesterday) کی طرح کا ہی ہے تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ بھی تباہ ہوا۔ اس نے زندگی کا ایک دن ضائع کیا۔ اس کے آج (Today) کو اس کے گزشتہ کل (Yesterday) کے مقابلے میں زیادہ آگے بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔

زندہ قوم کے لیے زندگی کا ایک زندہ تصور

عزیزانِ من! جس قوم کو زندگی کا یہ تصور دیا جائے' آپ سوچیے کہ وہ دنیا میں کس قسم کی قوم بن جائے گی۔ ہر دن یہ محاسبہ کرنا ہے کہ گزشتہ کل کے مقابلے میں ہم زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھے ہیں یا نہیں بڑھے۔ یہ ہے کسان' جو دانہ بونے کے بعد' ہر صبح گھر سے نکلتا ہے کہ وہاں جا کر یہ دیکھے کہ کل (Yesterday) جو گزر گیا ہے' اس کے مقابلے میں آج (Today) حالت بہتر ہے یا نہیں۔ وہ سارا دن اس پہ محنت کرتا ہے' شام کو بظاہر اسی طرح خالی ہاتھوں گھر آ جاتا ہے۔ عجلت پسند انسان تو یہ کہے گا کہ اس کی مت ماری گئی' چھ مہینے سے ہم اسے دیکھ رہے ہیں' صبح رسی درانتی لے کر جاتا ہے' گھر سے اس کو روٹی پہنچائی جاتی ہے اور شام کو اسی طرح خالی ہاتھ گھر آ جاتا ہے۔ پوچھو اس سے کیا کمایا؟ یہ کیا چیز ہے جو اُسے ہر روز صبح اٹھتے ہی سارے کام کاج چھوڑ کر کھیت کی طرف لے جاتی ہے' جہاں سے شام کو اس نے بظاہر کچھ لے کر واپس نہیں آنا؟ کیا چیز ہے؟ یہ ایمان ہے کہ یہ جو میں نے دانہ بویا ہے' اس میں اُگنے کی صلاحیت ہے' بڑھنے کی' پھولنے کی' پھلنے کی' صلاحیت ہے۔ وہ روز دیکھتا ہے کہ یہ بڑھتا پھولتا پھلتا ہے یا نہیں۔ وہ غلط قسم کے جھاڑ جھنکار کو جو کچھ اِدھر اُدھر سے نکل آتے ہیں' اکھیڑ کر پھینکتا چلا جاتا ہے۔ کہیں' جسے گوڈی کہتے ہیں' وہ کرتا ہے' کہیں پانی دیتا ہے' کہیں باڑ لگاتا ہے' کہیں اس کی حفاظت کرتا چلا جاتا ہے اور روز دیکھتا چلا جاتا ہے کہ گزشتہ کل (Yesterday) کے مقابلے میں آج (Today) ایک قدم آگے ہے یا نہیں۔ جو پودا کچھ دنوں تک دیکھے کہ بڑھ نہیں رہا' وہ اسے اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے۔ زندگی کا یہ ہے وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

اب' عزیزانِ من! زندگی کے اس تصور کو پیش کیجیے۔ میں نے کہا ہے کہ گاؤں کے ایک دیہاتی زمیندار کو سمجھائیے۔ وہ اس معاملے کو آپ سے بہتر سمجھے گا جو میں سمجھا رہا ہوں اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اس دَور میں ہمارے ہاں Evolution (ارتقا) کے فلسفے کا

سب سے مشہور مفکر برگسان ❶ ہے۔ آپ برگسان کی کتابیں پڑھ کے دیکھیے وہ کس طرح ان الفاظ کی تشریح کرتا چلا جاتا ہے جو قرآن نے استعمال کیے ہیں۔ یہاں قرآن انہی الفاظ کو لایا ہے اور اسی تشبیہ کے مطابق بات سمجھاتا ہے۔ کہا کہ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (23:1) مومنون کی کھیتی بارآور ہوتی ہے لیکن اس کے لیے مومنون کی پہلی شرط یہ ہے کہ کسان کی طرح انہیں اپنے بیج کے متعلق یہ یقین محکم ہو کہ اس میں اگنے بڑھنے پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہے۔ یہ شرطِ اول ہے۔ یہی قَدۡ اَفۡلَحَ (23:1) ہے۔ یہ یقینی چیز ہے۔ اس میں یہ "قد" یہی یقین ہی تو ہے' جو اس کسان کو روز لیے لیے جاتا ہے۔ اب اگلی بات یہ آئی کہ وہ مومنون کو کسان کے زراعت کے طریق (Process) کی موٹی موٹی باتیں بتاتا ہے: دانہ یوں بوتا ہے' کسان یوں کرتا ہے' اس کو پانی یوں دیتا ہے' حرارت یوں پہنچتی ہے' یعنی یہ چیزیں آئیں گی۔

یہاں تو قرآن کے الفاظ میں سوال کیا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جن کی کھیتیاں ثمربار ہوتی ہیں۔ جواب میں کہا کہ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ ❷ (23:2)۔ اب ہمارے ہاں ایک طرف صلوٰۃ کا ترجمہ نماز ہوا' دوسری طرف خشعون خشوع وخضوع کے الفاظ آ گئے' تو ان کا مفہوم ہوا کہ نماز کے اندر سر جھکائے ہوئے' آنکھیں جھکائے ہوئے بہت انکساری کے ساتھ' مسکینی شکل بنائے ہوئے' نماز کی رکعتیں پوری کریں۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ جسے ہم نماز کہتے ہیں' یہ اجتماعات ہیں' یہ بھی صلوٰۃ کا ایک حصہ ہیں۔ اس کسان کا جو طریقِ فلاحت ہے' اس کے اندر ایک پروگرام صلوٰۃ کے اجتماعات کا بھی ہے۔ یہاں صلوٰۃ کا لفظ ہے' نماز کا نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں نماز کا لفظ نہیں آیا۔ یہ تو لفظ ہی مجوسیوں کی زبان کا ہے' ایرانیوں کی زبان کا ہے' عربی لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ صلوٰۃ ہے۔ اس کے متعلق بھی متعدد بار دروس میں یہ چیز ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ یہاں میں ایک ہی آیت پیش کرتا ہوں۔ آیت خود بتا دے گی کہ اس کا مفہوم کیا

----

❶ Bergson, Henri (1859-1941) French philosopher. The central item in Bergson's philosophy is the opposition between the life force and the material world. He also assigned an important role to intuition as opposed it the rational intelligence in man's perception of reality. Among his best known works are Time and Free- will (1889), Creatuve Evolution (1907) and the Creative Mind (1934). His philosophy asserts that the flow of time as personally experienced is free and unrestricted rather than measured as on a clock and contends that all living forms arise from a persisting natural force, the elan vital (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited. P.156)

❷ یہ وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ ہمارے ضابطۂ قوانین کے پیچھے پیچھے چلتے رہے یعنی اس کی رو سے جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں' انہیں بطیبِ خاطر سرانجام دیتے رہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔773)

ہے؟ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ (24:41) کیا تم یہ نہیں دیکھتے ہو یہ ایک ایسی چیز ہے جو محسوس طور پہ نظر آ جاتی ہے' کیا تم اس پہ غور و فکر نہیں کرتے ہو کہ ارض و سما یعنی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی ''تسبیح'' کرتا ہے اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی۔

تسبیح کے مروجہ مفہوم کے بالمقابل قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب پھر یہاں لفظ تسبیح آ گیا۔ اب اس کے مفہوم (Exposition) کے لیے ایک ٹیپ ❶ (Tape) اور چاہیے اور مزید وقت بھی چاہیے۔ ''سبح'' کے معنی ہوتا ہے ''کسی مقصد کے حصول میں پوری پوری توانائی صرف کر کے سرگرداں رہنا''۔ یہ جو دانے پھیرنے والی تسبیح ہے' اسلام میں تو اس کا تصور ہی نہیں۔ یہ تصور عربوں میں بھی نہیں تھا۔ ہاں البتہ بدھوں ❷ کے ہاں یہ چیز تھی۔ کبھی فرصت ہوگی تو میں یہ بھی عرض کرونگا۔ کیا عرض کروں قرآن تو نصاب کی چیز ہے' یہ تو پڑھانے کا ہے۔ ان بُدّھوں کے ہاں یہ جو دائرہ تھا' اس کے لیے انہوں نے اپنے ہاں دانے کی یہ منکا بنائی تھی۔ ان کے ہاں یہ تسبیح تھی۔ یہ وہاں سے عیسائی راہبوں نے لی اور جب عیسائیت کا تصوف ❷ ہمارے ہاں سامنے آیا تو وہاں سے ہمارے ہاں یہ چیز آئی' ورنہ یہ دانے پھیرنے والی تسبیح' تو میں نے کہا ہے کہ اسلام تو ایک طرف رہا' عربوں کے ہاں' قبل از اسلام' بھی یہ نہیں تھی۔ سبح کے معنی ہوتا ہے ''کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری توانائی صرف کر کے انتہائی کوشش کرنا'' یہ جو تیراک تیرنے میں اپنا پورا ہاتھ مارتا ہے' اس کو تسبیح کہتے ہیں' یہ جو گھوڑا دوڑتے وقت' تیرنے والے کی طرح اس انداز سے چلتا ہے کہ اس کے پورے پاؤں آگے بڑھے ہوتے ہیں اس کو بھی تسبیح کہتے ہیں۔ ''سبح للہ'' کے معنی ہیں: کائنات کی ہر شے خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے حصول کے لیے پوری توانائیوں سے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سورج کس طرح سے نکلتا ہے خواہ سردی کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔ یہ وہی ہے جسے شاعر نے کہا ہے کہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح اٹھتا ہے کانپتا خورشید

وہ سردی خواہ کتنی ہی کانپنے والی کیوں نہ ہو' وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پنج اک منٹ ہور رضائی وچ سولین دے' بڑا سیک ہیگا۔ ❸ وہ اگر کسی ایک

---

❶ A Tape recording

❷ اس کی مزید تشریح کے لیے یہ بھی ملاحظہ کیجیے:: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکھف و مریم' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص ص 212-213۔

❸ پانچ ایک منٹ رضائی میں مزید سو لینے دو۔ اس میں تو بڑی ہی مزید ار تپش ہے (اور باہر ٹھنڈک)۔

دن بھی یہ کہہ دے یعنی تسبیح خداوندی کے اندر کوئی خلل واقع ہو جائے' تو یہ کائنات تہس نہس ہو جائے۔

ایران کے آتش کدوں کے نزدیک گردش کا مفہوم

عزیزانِ من! ''گردش میں ہے'' میں یہ جو گردش کا لفظ تھا' یہ اصل میں دوری گردش (Circular Motion) کے معنوں میں تھا۔ یہ ہماری کم بختی ہے کہ جب ہمارے ہاں کی یہ شاعری ایران کے آتش کدوں سے ہو کر گزری تو اس نے ان تصورات کو مجوسی بنا دیا۔ اب اس میں گردش کے معنی تقدیر کے ہو جاتے ہیں جس میں یہ سب کچھ کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہ آج کل کی گردش ہی خراب ہے۔ ان ایرانیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جو آسمان کے ستاروں کی گردش ہے' اس سے انسانوں کی تقدیریں وابستہ ہوتی ہیں۔ گردش کا یہ لفظ ان معنوں میں آ گیا' ورنہ اگر یہ لفظ قرآن کے معنوں میں آتا تو یہ بڑے صحیح معنوں میں آتا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کُچھ نہ کُچھ گھبرائیں کیا ❶
(غالب)

اپنی اپنی جگہ کائنات کی ہر شے معروفِ تسبیح ہے

بات سبح للّٰہ کی ہے' بات صلوٰۃ کی ہے جس میں ہر شے اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پورے جوش وخروش اور جذب و انہماک سے سرگرمِ عمل ہے اور آگے کل کا لفظ ہے یعنی کائنات کی ہر شے۔ پھر اس کائنات کی ہر شے کے بارے میں کہا کہ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ** . (24:41) وہ ہر شے جانتی ہے: **صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ** (24:41) اپنی اپنی ''صلوٰۃ'' کو بھی اور اپنی اپنی ''تسبیح'' کو بھی۔ غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ کائنات کی ہر شے کیا جانتی ہے؟ وہ جانتی ہے کہ اس کے ذمے کونسا فریضہ تفویض کیا گیا ہے' اس کے کونسے فرائض منصبی ہیں؟ اور تسبیح یہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے مجھے کس طرح سے سرگرمِ عمل رہنا چاہیے' کائنات کی ہر شے یہ جانتی ہے۔ قرآن کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ جو شخص جونسا راستہ اختیار کرے اسی کے مطابق اس کے اعمال کے نتائج مرتب ہوں۔ اس مقصد کے لیے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض وسما) کی ساری مشینری' سرگرم عمل ہے کہ ان اعمال کے نتائج پیدا کرے (11:7;53:31)۔

---

❶ دن رات یعنی ارض وسما انسانی اعمال کو نتیجہ خیز بنانے میں محو گردش ہیں۔ کسی بھی دن یہ نتائج سامنے آ ہی جائیں گے۔ اسمیں گھبرانے کی کیا بات؟ اسکی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2003' ص ص 148-144۔

نماز کے متعلق ہمارے ہاں الجھے ہوئے مسائل

یہ فرائض کس طرح سرانجام دیئے جائیں؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ آج کل نماز کے متعلق ایک بڑا مسئلہ چل رہا ہے۔ ہمارے ہاں مذہب میں تو سارے مسئلے ہی مسئلے ہوتے ہیں۔ نماز کے متعلق مسئلہ یہ چل رہا ہے کہ کونسی نماز قرآن کے مطابق ہے۔ بہت بڑی بات ہے جو یہ متعین کیا جائے کہ کونسی نماز' کونسی صلوٰۃ' قرآن کے مطابق ہے لیکن جب بھی یہ جواب ان مولویوں کے بس میں پڑ جائے تو وہاں تو پھر یہ بات ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہ بحث چل نکلی کہ کیا پانچ وقتوں کی نماز ہے یا تین وقتوں کی نماز ہے اور یہ کہ نماز میں دو رکعتیں ہیں یا چار رکعتیں ہیں یا ایک ہی رکعت ہے اور پھر یہ بھی کہ کیا ایک رکعت میں دو سجدے میں یا ایک سجدہ؟ اب اس کے اوپر ساری لٹھم لٹھا ہو رہی ہے کہ یہ قرآن کے مطابق ہے اور وہ قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن سے پوچھیے کہ کونسی صلوٰۃ ہے جو منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ اب منشائے خداوندی تو ہم اللہ میاں سے جا کر پوچھنے سے رہے کہ جی! ہم نے یہ نمازیں پڑھ لی ہیں۔ فرمائیے' جناب کی منشا کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔ یہ تو بات ہی نہیں ہے۔ اس نے خود بتا دیا ہے کہ منشائے خداوندی کے مطابق کونسی صلوٰۃ ہے۔ یہ جسے ہم منشائے خداوندی کہتے ہیں' یہ الفاظ ہمارے ہیں' اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ ہے وہ فریضہ' جو ہم نے تمہارے ذمے عائد کیا ہے۔ اگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ ہماری منشا کے مطابق ہو رہا ہے اور اگر یہ نتیجہ نہیں نکلتا تو ہماری منشا کے مطابق نہیں ہو رہا۔ اسے خود دیکھ لیا کرو۔ اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ کہ اس کا کیا جواب ملتا ہے۔

صلوٰۃ کے سلسلہ میں منشائے خداوندی اور فحشا کا تصور

منشائے خداوندی تو قرآن نے اپنے ہر حکم کے ساتھ بتا دیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر وہ نکلتا ہے تو خدا کی منشا کے مطابق ہے۔ اگر وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو خدا کی منشا کے مطابق نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ منشائے خداوندی یا صلوٰۃ کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے؟ اس نے کہا ہے کہ **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ**(29:45) اگر تم نے پہلی ہی یعنی اوّلیں نگاہ میں یہ دیکھنا ہو کہ یہ صلوٰۃ کا منشا پورا ہو رہا ہے یا نہیں تو یاد رکھو! صلوٰۃ کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں ہر ''فحشا'' اور ''منکر'' سے روک دے گی۔ ''فحشا'' ایک بڑا جامع لفظ ہے۔ ویسے ہمارے ہاں تو یہ ''فحش'' کا لفظ آ گیا اور اس کے معنی میں وہی عریانیت کی چیز آ گئی' جس کے خلاف روز جہاد ہوتا رہتا ہے۔ یہ جو فحشا ہے میں اس کو یہ نہیں سمجھتا۔ فحشا کے معنی ہوتا ہے ''سب کچھ سمیٹ کر اپنے لیے ہی رکھ لینا بخیلی کو بھی فحشا کہتے ہیں'' اور چونکہ عربوں کے ہاں یہ بدترین خصلت تھی اس لیے اگر یہ چیز کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو وہاں ہر بدترین بات کے لیے یہ لفظ آیا اور وہاں سے یہ فحش کا لفظ ہے۔ اسکی بنیاد فحشا ہے۔ اس کے معنی بخل کے ہیں۔ پہلے تو صلوٰۃ اس چیز سے روکے گی کہ تم سب کچھ سمیٹ کر اپنے لیے رکھو اور اسے عام

نہ ہونے دو، اس کو روکے رکھو، جب کہ اس کے برعکس صلوٰۃ تمہارے اندر اتنی وسعتِ قلب پیدا کردے گی کہ تم پوری پوری محنت سے کماؤ اور انسانیت کی فلاح کے لیے اس کو کھلا چھوڑ دو۔ اس میں دوسرا لفظ ہے ''والمنکر'' یہ ہر وہ بات ہے جسے قرآن نے ناجائز قرار دیا ہے، قابلِ نفرت قرار دیا ہے، اسے المنکر کہا ہے۔ صلوٰۃ اس سے روک دیتی ہے۔ اگر صلوٰۃ یہ کچھ کرتی ہے تو یہ ہے قرآنی صلوٰۃ اور اگر یہ صلوٰۃ یہ کچھ نہیں کرتی تو وہ قرآنی صلوٰۃ نہیں ہے۔ مسئلے کا تو حل یہاں مل گیا۔ قرآن نے خود ہی ان سے یہ پوچھا کہ کیا اب وہ پانچ وقتوں کی بجائے تین وقتوں کی، دو رکعتوں کی یا ایک سجدے والی صلوٰۃ یہ کچھ کرتی ہے؟ اسکی اصل جانچ کا معیار تو یہ تھا۔

دل ہے مسلمان میرا نہ تیرا
تُو بھی نمازی، میں بھی نمازی!

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

قلب کی تبدیلی کے بغیر معاشرے کو بدلا ہی نہیں جا سکتا

جی! یہاں بات ہو رہی ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (23:2)۔ فرائض منصبی، جو خدا نے عائد کیے ہیں، کی بات ہو رہی ہے۔ اب مومن کے اعمال کی یا یوں کہیے کہ مومن کی صفات یا خصوصیات بیان ہو رہی ہیں کہ وہ کس طرح ان فرائض کی سر انجام دہی کرتا ہے۔ ایک سر انجام دہی قانون کے ڈر سے ہوتی ہے۔ مثلاً تھانیدار کے خوف سے، پکڑے جانے کے ڈر سے، اس سے بچ نکلنے کے تو ہزار راستے نکل آتے ہیں یعنی ادھر آپ کوئی ایک قانون بنایئے تو دوسری طرف قانون توڑنے والے اُسی وقت یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اس قانون سے نکلنے کے راستے کونسے ہیں۔

عزیزانِ من! یاد رکھیے کہ صرف قانون کی رو سے، آپ کسی معاشرے کے اندر بھی صداقت، امانت، دیانت اور یہ تمام چیزیں نہیں پیدا کر سکتے۔ اگر مکینکی طور پر (Mechanically) آپ کسی سے یہ کرانا چاہیں گے تو صرف وہ لوگ جو سزا سے ڈریں یا جنہیں سزا سے بچنے کے طریقے نہ آتے ہوں، وہ اس پہ کاربند ہونگے، جنہیں یہ کچھ آتا ہوگا وہ تو ڈریں گے ہی نہیں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ قانون تو صرف ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے، جن میں یہ چیز نہ پیدا ہوگئی ہو۔ یہ وہ ہیں جنہیں سماج دشمن عناصر (Anti-State Element) کہتے ہیں۔ سوسائٹی کو ان کے ان مظالم سے محفوظ رکھنا مقصود ہو، تو ان کو پکڑ کر سزا دی جاتی ہے۔ لیکن جو پورا معاشرہ ہے اس کے اندر اس سے تغیر نہیں واقع ہوتا۔ لہٰذا جو قوانین خداوندی ہیں یا یوں کہیے کہ اس نے جو فرائض عائد کیے ہیں، ان سے صحیح نتیجہ اس صورت میں پیدا ہوگا جب انہیں مکینکی طور پر سر انجام نہ دیا جائے بلکہ وہ تمہارے دل کا تقاضا بن جائیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک خشوع کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ جو آپ پیاس کے وقت پانی پیتے ہیں، وہ کسی قانون کے ڈر سے، قانون کی رو سے، یا تھانیدار کے ہنٹر کے ڈر سے نہیں پیتے یا کسی سزا کے خوف سے نہیں پیتے یا لوگوں کو دکھانے کے لیے نہیں پیتے۔ وہ تو جنگل کی تنہائیوں میں بھی اگر آپ کو پیاس لگتی ہے تو لگتی چلی جاتی ہے، اس کا تقاضا ہوتا ہے، وہ شدت اختیار کر جاتی ہے تو آپ پانی پیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ جو کیفیت ہوتی ہے کہ ان قوانین کی اطاعت یا ان فرائض منصبی کی ادائیگی، آپ کے دل کا تقاضا بن جائے تو اسے خشوع کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ** (23:2) فرائض منصبی کی ادائیگی ان کے دل وقلب کا تقاضا بن جاتی ہے، یہ اندر سے ان کی زندگی کا تقاضا ہو جاتا ہے، یہ اندر سے ابھرتی ہے۔ اب اس کے لیے نہ کسی سپاہی کی ضرورت ہے نہ کسی حوالات کی، نہ کسی عدالت کی، نہ کسی جیل خانے کی، یہ تقاضا تو اندر سے ابھرتا ہے۔ کس قدر حسین انداز میں قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ ایک آیت کا حوالہ (4:65) ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ جو اسلامی نظام ہے اس کے اندر قوانینِ خداوندی کی ادائیگی کے سلسلہ کی کیا کیفیت ہوگی یا ان قوانین کی رو سے یہ جو فیصلہ دیا جائے گا ان پر عمل پیرا ہونے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ **فَلَا وَ رَبِّکَ** (4:65)۔ عجیب انداز ہے بات کہنے کا! **فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ** (4:65) اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون، اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ **حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ** (4:65) جب تک یہ اپنے ہر اختلافی یا نزاعی معاملے میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا، ثالث) نہ بنائیں اور تم وہ فیصلہ قرآن کے مطابق، وحی کے مطابق، صادر کرو۔ ہر قانون یہ کہتا ہے کہ رعایا اسی صورت میں پُر امن ہو سکتی ہے کہ اگر اس میں کوئی جھگڑا ہو تو وہ عدالت سے آ کر فیصلہ لے۔ یہ مکینکل چیز ہے لیکن سنیے، فرق کہاں پڑتا ہے؟ یہاں لفظ خٰشِعُوْنُ کی تشریح ہو رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ تو جو فیصلہ بھی دے **ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ** (4:65) یہ لوگ اس فیصلے کے خلاف اپنے دل میں گرانی بھی محسوس نہ کریں، اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں (24:62;33:36)۔ اس طرح **وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا** (4:65) اور یوں اس کے سامنے جھکیں کہ یہ جسم ہی نہ جھکے بلکہ ان کا یہ دل بھی اس کے سامنے جھکے اور اس فیصلے کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ اگر گرانی محسوس کر لی تو خدا کہتا ہے: تیرے خدا کی قسم، یہ مومن نہیں کہلا سکتے۔ جس دن کسی کسان نے یہ محسوس کر لیا کہ ساری دنیا میں مجھے ہی کیا مصیبت پڑی ہوئی ہے کہ میں صبح اٹھتا ہوں، سردی کے کپکپاتے جاڑے میں، اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں، اور روز جا رہا ہوں۔ وہ جو اس قسم کے کسان ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اس بیتابی

میں ہوں انہیں کچھ نہیں ملتا۔ اس کے دل میں جس دن بھی یہ بات پیدا ہوگئی' تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس کے نتیجہ میں اس کی کھیتی جل جائے گی اور یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ اس نے اس قانون کو بطیّب خاطر قبول ہی نہیں کیا' اس کا اس پر ایمان ہی نہیں تھا۔ چنانچہ یہ امر ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ (23:2) ان فرائض کی سرانجام دہی ان کے دل کا تقاضا بن جائے اور دل ان کے ساتھ جھکے۔

ذہنیت کی یہ تبدیلی انسان کو خود ہی کرنا ہوگی

اب سوال یہ ہے کہ دل کا یہ جھکاؤ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے' اور یہ بہت ہی اہم چیز ہے کہ آج ساری دنیا اس کا اقرار کر رہی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (13:11) اللہ کے ہاں سے بھی کسی قوم کی حالت میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی جب تک وہ قوم خود بھی اپنی حالت کو نہ بدلے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! اور تو اور' خدا بھی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (13:11) جب تک وہ قوم اپنی ذہنیت کے اندر خود تبدیلی نہ پیدا کر لے' اپنے اندر خود نفسیاتی تغیر (Change) نہ پیدا کر لے بلکہ اس کے متعلق تو یہاں تک کہہ دیا کہ خدا بھی یہ نہیں کرتا۔

یہ جو اندر کی تبدیلی ہے' اصل تو یہ ہے۔ اسے ہی دل کا تقاضا کہا گیا ہے۔ یہ ہے خٰشِعُوۡنَ (28:2) اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان احکام کی بجا آوری میں اپنے دل میں گرانی تک محسوس نہ کرو۔ یہ ہوگی ذہنیت کی تبدیلی۔ اس کے بغیر یہ جو اتنا کچھ ہمارے ہی ہاں نہیں' عزیزانِ من! بلکہ ساری دنیا میں کیا جا رہا ہے' اگر آپ ان قوانین کو دیکھیں تو یہ اتنے عظیم اور اتنے بلند نظر آتے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں اور اس کے بعد اس قوم کا نقشہ دیکھیں تو دنیا بھر کے جرائم وہاں پائے جاتے ہیں اور پھر یہ کیفیت ہر جگہ ہو رہی ہے۔ آخر کار یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ دُور نہیں جائیے' آپ اپنے ہاں تو روز بیٹھ کر یہ رونا روتے ہیں' مرثیہ پڑھتے ہیں' ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ پھر صاحب! کیا تدبیر اختیار کی جائے اور پھر تدبیر بھی سارے بیٹھ کر مکینکلی ہی سوچتے ہیں کہ جی! ٹھیک ہے کہیے یہ قانون کچھ زیادہ سخت کر دیا جائے۔ یہ قانون اور پاس کر دیا جائے' یعنی او پہلے قانون اچ کیڑے پئے ہوئے نے [1]۔ لہٰذا کیے جاؤ:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

---

[1] گویا اس پہلے قانون میں کیڑے پڑ گئے تھے۔

صرف یہ کیے جاؤ۔ یہی خبطِ دوا ہے' تغیرِ نفس نہیں ہے۔

اربابِ اقتدار سے میری التماس

عزیزانِ من! ان چیزوں کا حقیقی حل ذہنیتوں کی تبدیلی ہے اور یہ میں تیس سال سے کہتا چلا آ رہا ہوں۔ یہاں تمام اربابِ حکومت سے' میری سلام دعا تھی۔ میں یہ کہتا چلا آ رہا تھا کہ بابا! یہ جو اپنی ابھرنے والی نئی نسل ہے' اس کو سنبھالو' اس کی ذہنیت میں صحیح تبدیلی پیدا کرو' اسے تعلیم صحیح دو۔ تقسیمِ ہند یا تشکیلِ پاکستان کے زمانے میں جو بچے پانچ پانچ دس دس پندرہ پندرہ سال کے تھے' وہ ابھی ابتدائی تعلیم میں تھے۔ تیس برس کے بعد وہ پینتیس چالیس سال کے ہوگئے۔ آج کی قوم وہی ہے اور انہی کے ہاتھوں آپ نالاں ہیں۔ یہ کیوں دن بدن سرکشی بڑھتی چلی جا رہی ہے؟ وہ صرف اس لیے کہ تغیرِ نفس نہیں ہے' ہم نے ذہنیت نہیں بدلی' ہم قانون پہ قانون بنائے چلے جا رہے ہیں' جب کہ بات تو ذہنیت بدلنے کی تھی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک لغویات کا مفہوم

عزیزانِ من! یہاں **خَاشِعُوْنَ** (23:2) کہا تھا کہ وہ ہمارے ضابطہ حیات کی صداقت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں' اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں' اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ **وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ** (23:3) ان کی توانائیاں ایسے کاموں میں ضائع نہ ہوں جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ نیز وہ ان تمام امور سے مجتنب رہیں جو انہیں قرآن کی طرف آنے سے روک دیں' وہ ہر طرح کی لغویات سے پرہیز کریں۔

اب اس آیت میں ان کی اگلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لغو سے اعراض برتیں گے۔ یہ ہمارے ہاں جو لفظ ''لغو'' ہے' وہ بھی عام استعمال ہوتا ہے۔ کن معنوں میں ہوتا ہے؟ ''یہ بڑی لغو بات ہے'' اور آگے بڑھیں گے' ان سے پوچھیں گے تو لغویات میں پڑیں گے۔ پھر جب مذہب پرست طبقہ آتا ہے تو یہاں تک بات ہوتی ہے کہ یہ تاش کھیلتے ہیں' شطرنج کھیلتے ہیں' چوسر کھیلتے ہیں تو یہ ساری باتیں لغویات ہوجاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ دو ہی درس پہلے تو یہ بات آئی تھی۔ پھر تجدیدِ یادداشت کردوں کہ (26: 41) میں یہ کہا گیا تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ قرآن پیش کرتے تھے تو یہ جو مخالفینِ قرآن تھے' وہ اپنے لوگوں سے کہتے تھے کہ اگر یہ تعلیم کسی کے کانوں میں پڑ گئی' یا اسے کسی نے سن لیا تو پھر ہماری خیر نہیں' پھر ہم ان لوگوں کے اوپر غالب نہیں آ سکتے۔ لہٰذا اس کا طریقہ یہ ہے کہ **لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ** (41:26) دیکھنا! تم کہیں قرآن کو نہ سن لینا۔ اس لیے ایک تو تم خود بھی اس کو نہ سنو اور دوسرا یہ کہ **وَالْغَوْا فِیْهِ** (41:26) جہاں دیکھو کہ کوئی شخص قرآن کی بات پیش کرتا ہے' وہاں شور مچا دو' کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ لغو کہتے ہیں کہ جیسے یہ چڑیاں اور کوے

کائیں کائیں چیں چیں کرتے ہیں' اس قسم کا کچھ بیہودہ شور مچا دینا کہ وہ آواز کان میں نہ پڑے۔ تو ہر وہ شے جو قرآن کی آواز کو کسی کے کان تک نہیں پڑنے دے' وہ لغو ہے۔ قرآن کی رو سے مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اس بات سے اعراض برتتا ہے جو قرآن کی آواز میں حائل ہونے والی ہو۔ یہاں کہا ہے کہ وہ ایسے لغو سے اعراض برتیں گے۔

عزیزانِ من! آگے یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ❶ (23:41)۔ چلیے جی! ابھی ابھی صلوٰۃ کی بات ہو رہی تھی اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج اس کا مفہوم کیا سے کیا ہو گیا ہے اور اس کے بعد جب وہاں سے ذرا آگے نکلے ہیں تو زکوٰۃ کا یہ لفظ آ گیا۔ صلوٰۃ تو رہ گئی آپ کے ہاں صرف مسجد میں' پانچ وقت میں' یا یہ اہلِ قرآن کے نزدیک تین وقت میں جا کے' کچھ وہ کر لینا۔ زکوٰۃ کیا ہو گئی؟ جتنا مال جی چاہے جمع کرو' اس میں سے ان کے مقرر کیے ہوئے نصاب ❷ اور شرح کے مطابق نکال کے خیرات دیدو۔ یہ زکوٰۃ ہو گئی۔

خود ساختہ مروجہ اسلام میں قدم قدم پر تضاد

اب جس چیز کا نام اسلامی اور غیر اسلامی رکھا جا رہا ہے اس میں اسلامی اسے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو زکوٰۃ ہے' اسے اپنے طور پہ خیرات کر دیا جائے۔ ایک نے کہا کہ اس کا یہ صحیح طریقہ نہیں۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ بیت المال میں جمع ہو' اسے حکومت اکٹھا کرے۔ یہ حکومت کی آمدنی ہے' حکومت کے خزانے میں جائے۔ دوسرا کہنے لگا کہ نہیں صاحب' خزانہ تو دنیاوی حکومتوں کا ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت میں بیت المال ہوتا ہے۔ اس سے کہا گیا کہ مال کے معنی دولت اور بیت کے معنی گھر یعنی جہاں دولت رکھی جائے۔ یہی تو خزانہ ہوتا ہے۔ کیا خزانے کے اندر سانپ رکھے جاتے ہیں؟ کہنے لگے کہ نہیں' خزانہ میں نہیں' ادھر بیت المال میں رکھا جائے۔ آپ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! کس طرح کا یہ کھیل کھیلا جاتا ہے' یعنی وہی مال بیت المال میں رکھا جائے تو اسلامی ہے' خزانہ حکومت میں رکھا جائے تو غیر اسلامی ہے۔ بات وہی رہے کہ روپیہ جتنا جی چاہے' دولت جتنی جی چاہے' اکٹھی کرتے چلے جاؤ بس اس میں سے ان کی مقرر کردہ ادا کر دو۔ میں نے پھر دوبارہ لفظ دہرایا ہے: ''ان کی مقرر کردہ''۔ قرآن کریم میں تو زکوٰۃ کا یہ تصور ہی نہیں۔ جب یہ تصور ہی نہیں تو یہ کہ اس کا اتنا نصاب ❷ ہو' اتنی شرح ہو اور پھر اس پہ یہ اتنے مسائل کے طومار ہوں' عجیب سا لگتا ہے۔

---

❶ اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوعِ انسان کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 773)

❷ زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم کی رو سے جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ (عام طور پر اڑھائی فیصد) خدا کی راہ میں دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے' نصاب کہتے ہیں اور جس نسبت سے اس میں زکوٰۃ نکالی جائے' اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے:
(1) چاندی ساڑھے باون تولہ (2) سونا ساڑھے سات تولے (3) اونٹ 5 پانچ راس (4) گائے تیس راس (5) بکریاں چالیس راس وغیرہ وغیرہ (حوالہ پرویزؒ (1989ء)' نظامِ ربوبیت لاہور: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' ص۔ 415۔

اس پر تو ذہن میں بار بار قائداعظم محمد علی جناح (1948-1976) کی یاد آ جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہ تصور قرآن میں ہے ہی نہیں۔ میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ قائداعظمؒ سے جو باتیں ہوتی رہی ہیں کبھی وقت ملا تو شاید اکٹھی بھی عرض کروں۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ اسلامی اقتصادیات (اکنامکس) پہ گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو اڑھائی پرسنٹ کی مقرر کردہ شرح ہے اسمیں بھی عجیب کیفیت ہے۔ میں یہاں یہ واضح کردوں کہ یہ چیزیں خود ہی ان کے ذہن میں آیا کرتی تھیں۔ کیفیت یہ ہے کہ سونا ساڑھے سات تولے ہو تو' اس پہ زکوٰۃ ہے اور چاندی ساڑھے باون تولے ہو تو اس پہ زکوٰۃ ہے۔ ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت تو ذرا دیکھیے کہ کہاں پہنچتی ہے۔ ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کچھ نہیں رہتی۔ غریبوں کے پاس تو یہی ساڑھے باون تولے والا نصاب ہوگا اور وہ جو ساڑھے سات تولے والا ہے تو اگر وہ` سات تولے تک بھی ہوگا تب بھی آج ❶ ساڑھے تین ہزار روپے ویسے ہی ہو جائیں گے۔ وہ تو سونے والوں کو معاف ہے۔ اس کے برعکس ساڑھے باون تولے والا غریب جس کے پاس ڈیڑھ سو کے قریب ہے اس پہ تو زکوٰۃ فرض ہوئی۔ مرے نوں ماریں شاہ مدار ❷ اس غریب پہ تو وہ شرحِ زکوٰۃ لگی۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو نصاب اور شرح ہے تو کیا' وہ ان Finances (مالیات) کی رو سے اس اسلامی مملکت کا جو کاروبار یا نظام ہے' چل سکے گا؟ میں نے کہا کہ جی! یہ نصاب' یہ شرح اور یہ اس قبیل کی چیزیں تو قرآن میں ہیں ہی نہیں۔ اس پر کہنے لگے: ''سچ بات' ٹھہر جا' بات سمجھ میں آ گئی''۔ یہ میرے ساتھ پاکستان بننے کے چند ہی دنوں بعد کی بات ہے۔

زکوٰۃ کے لیے اسلامی حکومت کا قیام ازبس ضروری ہے

بہرحال سورۃ الحج کی 41 ویں آیت ہے' اسے دیکھیے تو سہی کہ قرآن حکیم میں زکوٰۃ کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ زکوٰۃ کی موجودہ صورت تو یہ ہے کہ انگریز کے زمانے میں بھی زکوٰۃ نکالتے تھے اور بانٹتے تھے' کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ آج ہندو کی حکومت میں بسنے والا مسلمان بھی جس کا جی چاہے' زکوٰۃ نکالے اور بانٹے یعنی اس میں یہ شرط ہی نہیں ہے کہ آپ کے ہاں کوئی اسلامی نظام ہو' اسلامی حکومت ہو۔ کچھ بھی' اپنے طور پہ ہی ہو' زکوٰۃ نکلتی ہے۔ اگر یہی چیز زکوٰۃ ہے تو پھر اس کے لیے تو شرط نہیں ہے کہ خود مسلمانوں کو تمکن حاصل ہو' ان کی اپنی حکومت ہو' انہیں اقتدار حاصل ہو۔ یہ تو شرط ہی نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے: ''بات تو سمجھ میں آ گئی''۔

---

❶ یاد رہے کہ یہ کوئی 1947 کی بات ہے۔

❷ (مثل) مصیبت زدہ کو اور ایذا پہنچانا۔

مملکتِ اسلامیہ زکوٰۃ لوگوں سے لے گی نہیں بلکہ انہیں زکوٰۃ دے گی

قرآن کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) انہیں زمین پر حکومت ملے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی' تو پھر یہ کیا کریں گے؟ کہا کہ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) . پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے۔ یہاں وہ لفظ صلوٰۃ آ گیا۔ شرط یہ ہوئی کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ (22:41) اگر انہیں حکومت مل گئی تو پھر' پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ نماز ہی پڑھنے والی بات کے لیے تو حکومت شرط تھی نہیں۔

عزیزانِ من! یہ سوچنے والی بات ہے کہ قرآن نے یہ کیا کہا ہے کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو پھر وہ یہ یہ کریں گے۔ نظر آیا کہ یہ کچھ اپنی حکومت میں کرنے کی بات ہے۔ بہر حال اَقَامُوا الصَّلٰوةَ کو تو چھوڑ دیجیے کیونکہ ابھی اپنی حکومت تو قائم نہیں ہوئی۔ اگر ان کی ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اپنی حکومت قائم ہوجائے تو حکومت لوگوں سے یہ زکوٰۃ وصول کرے اور بیت المال کے اندر داخل کرے۔ اسے اسلامی کہا جاتا ہے۔ لوگوں سے یہ زکوٰۃ لے۔ اسے بہر حال الگ رکھے۔ یہ ہے جسے کہا جاتا ہے کہ اسلامی یوں بنے گی یعنی لوگوں سے زکوٰۃ لے اور الگ رکھے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ان کی حکومت قائم ہوجائے گی تو کیا ہوگا؟ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ . (22:41) یہ زکوٰۃ دیں گے۔ ہیں؟ یہ زکوٰۃ دیں گے؟ عزیزانِ من! قرآن حکیم کی آیات کے حوالے آپ کے سامنے موجود ہیں جو میں پیش کیے چلا جا رہا ہوں۔ قرآن میں تو ایک لفظ بھی اپنے خیال کے مطابق کہنا میرے نزدیک شرک ہے۔ اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے۔ اس کے لیے قرآن کی آیتیں شرط ہیں۔ کہا کہ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی تو زکوٰۃ دیں گے۔ اب پھر آ جایئے درس والی آیت پر یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ (23:4)۔ الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے کہا ہوا ہے' عزیزانِ من! قرآن کے چھوٹے چھوٹے نسخے ہی ساتھ لے آیا کریں۔ اگر قرآن کے الفاظ سامنے ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہا ہے کہ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ [1] (23:4)۔ یعنی یہ اس کی ترکیب ہوئی کہ: هُمْ فَاعِلُوْنَ کس لیے؟ للزکوٰۃ۔ اب بات صاف ہوگئی کہ فَاعِلُوْنَ کے معنی کام کرنا ہے۔ جب ان کو تمکن ملے گا' زمین میں حکومت قائم ہوگی' تو ان کا پورا کاروبار' یہ پروگرام' ان کے فَاعِلُوْنَ کا ہے۔ کاہے کے لیے ہے؟ للزکوٰۃ۔ یہاں یہ ''ل'' نافع ہے۔ کاہے کے لیے ہوگا؟ یہ سارا زکوٰۃ کے لیے ہوگا۔ وہاں (22:41) میں کہا تھا کہ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی تو زکوٰۃ دیں گے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ سارا کاروبار اس حکومت کا ہے اور اس کا منتہا زکوٰۃ دینا ہوگا۔

---

[1] اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہوگئے' جس سے تمام نوعِ انسان کو نشو و نما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 773)

زکوٰۃ کا تو بنیادی معنی ہی نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما کا بہم پہچانا ہے

یہ حکومت اپنے فنانسز (مالیات) میں، اپنی آمدنی میں، دیکھ لے گی کہ کتنا روپیہ سال بعد جمع ہوگیا اور اس میں سے بھی اڑھائی پرسنٹ نکال کے پھر کیا کرے گی: پاکستان والے سعودی عریبیہ کو دیں گے، عریبیہ والے ہمیں بھیج دیں گے جس طرح کہ قربانی کا گوشت جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! قرآن کو کھڑے ہو کے سوچیے۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوۡنَ** (23:4)۔ وہ مقصود یہ ہے کہ الزکوٰۃ دیں گے۔ یہ سارا کاروبار زکوٰۃ کے لیے ہوگا اور زکوٰۃ کے بنیادی معنی اور خود قرآنِ کریم کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ''نوعِ انسان کے لیے نشو ونما کا سامان بہم پہنچانا''۔ بالفاظ دیگر اسلامی مملکت کا مقصود ومنتہا ہی انسانیت کو زکوٰۃ بہم پہنچانا ہے۔ لہٰذا اس مملکت کا کاروبارِ حیات قرآن کے الفاظ میں **هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوۡنَ** (23:4) ہے۔ اس کے تمام افعال زکوٰۃ کے لیے ہونگے جب کہ اس کے برعکس دنیا کی جو اور حکومتیں قائم ہونگی ان کا مقصد صرف لینا لوٹنا، کھسوٹنا، ہوگا لیکن یہ مملکتِ اسلامیہ جو ان لوگوں کے ہاتھوں سے جب قائم ہوگی تو ان کا مقصودِ مملکت دینا ہوگا۔ تو مقصود اقامت صلوٰۃ ہوا کہ قرآن کی رو سے یہ جتنے بھی فرائض منصبی عائد کیے جاتے ہیں انکا دل کی گہرائیوں سے، طلب وتقاضے کی رو سے، پورا کیے چلے جانا۔ یعنی مقصد اس تمکن کا ہوا، نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا۔

جسمانی نشو ونما کے ساتھ انسانی ذات کی نشو ونما بھی

قرآن کی رو سے اب نشو ونما صرف جسمانی نشو ونما ہی نہیں ہے بلکہ انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما بھی ہے اور انسانی ذات کی نشو ونما بھی اور اس قسم کی نشو ونما کا حصول صرف اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ گویا اس مملکت کی پہلی چیز تو یہ ہوگی کہ اس کی حدود کے اندر حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ (45/A.D 581-644) کے الفاظ میں ''اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا، تو اس کی باز پرس خلیفۃ المسلمین سے ہوگی''۔ دیکھا زکوٰۃ بہم پہنچانے کا طریقہ کس طرح ادا ہو رہا ہے! نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس بستی میں ایک فرد نے بھی رات اس طرح بسر کی کہ وہ بھوکا سوگیا اور باقی جو تھے وہ سیر ہو کر سوئے، تو اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیتا ہے۔ غور فرمایا کہ اسکی کیا تشریح ہوئی؟ یہ کہ **وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوۡنَ** ان کا سارا پروگرام، مملکت کا نظم ونسق اور کاروبار کا طریق کار، اقامتِ صلوٰۃ ہے اور مقصود ومنتہا پوری نوعِ انسانی کے لیے سامانِ نشو ونما بہم پہنچانا ہے۔

ذاتِ انسانی کی نشو ونما کے لیے قرآنی حدود کا تعین اور ان کی اہمیت

اس نشو ونما کے لیے، جسے میں نے کہا ہے کہ اس میں خود انسانی ذات کی نشو ونما بھی ہے، انسان کے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کی

جاتی ہیں۔ انہیں بیباک نہیں چھوڑا جاتا۔ انسانی صلاحیتوں اور اسکی استعداد کو اگر حدود اور قیود میں نہ رکھا جائے' انہیں بیباک چھوڑ دیا جائے' تو یہ سرکش ہو جاتی ہیں۔ اسے شیطان یا ابلیس کہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھا جائے تو پھر یہ انسان اپنے اندر ایسا تغیر پیدا کر لیتا ہے کہ دوسروں کی نشو و نما اس کی اپنی ذات کا تقاضا ہو جاتا ہے۔ وہ نشو و نما کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کئی دفعہ میں نے مثال دی کہ پہاڑوں سے اترنے والا پانی' دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ دریا ساحلوں کے اندر بہتا ہے۔ نہریں کناروں کے اندر بہتی ہیں۔ یہ ہر جگہ سامانِ نشو و نما کے پھیلانے کا ذریعہ بنتا چلا جاتا ہے' ممد حیات ہوتا ہے اور اگر اس کے کنارے اور ساحل ٹوٹ جائیں تو اسے سیلاب کہتے ہیں۔ وہی پانی تباہیاں لے آتا ہے۔ بات تو صاف ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس پر کچھ حدود عائد کی جائیں اور یہ حدود سب سے پہلے تو اپنے آپ پہ عائد کی جائیں۔ ان حدود میں قرآن نے جو اگلی بات کہی ہے' وہ ہے جہاں انسانی جذبات کی شدت کی انتہا ہوتی ہے' وہاں پہنچ کر قرآن حکیم نے ایک حد کا ذکر کیا ہے جبکہ باقی حدود اس کے تابع آ جاتی ہیں۔ وہ ہے جنسی جذبے کی تسکین۔

آج کے درس میں سورۃ المؤمنون کی صرف پہلی چار ہی آیات ہو گئیں۔ عزیزان من! پانچویں آیت سے ہم آئندہ اتوار کو لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 5 تا 7)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝

عزیزانِ من! آج اپریل 1977ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (23:5)۔

اس سورۃ کا آغاز پچھلے درس سے ہوا تھا۔ اِسکی ابتدا یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (23:1) مومنین کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی، ان کی کوششیں بارآور ہونگی، ان کی جدوجہد نتیجہ خیز ہوگی، انہیں Acheivements حاصل ہونگی۔ ''مومنون'' کہنے کے بعد، اس سورۃ میں آگے ان کی چندایک خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں پہلی خصوصیت یہ تھی کہ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (23:2) وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، یعنی اس کی رو سے جو فرائض اُن پر عائد ہوتے ہیں، یہ انہیں بطیبِ خاطر سرانجام دیتے رہے۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (23:3) اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ ان کی توانائیاں ایسے کاموں میں ضائع نہ ہوں جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ نیز وہ ان تمام امور سے مجتنب رہے جو انہیں قرآن کی طرف آنے سے روکنے والے تھے (41:26)۔ انہوں نے ہر طرح کی لغویات سے پرہیز کیا۔ اور تیسری خصوصیات یہ بتائی کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (23:4) اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوعِ انسانی کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ یہ خصوصیات تو سابقہ درس میں ہمارے سامنے آگئی تھیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک حفاظت عصمت کی اہمیت

اسی تسلسل میں اب آگے بھی دو چار اور خصوصیات بیان کی جارہی ہیں۔ ویسے تو مومنین کی خصوصیات یا ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سورۃ کے شروع کی چندایک آیات

ہی ان کی چند ایک بڑی نمایاں یا بنیادی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور آج ہمارے سامنے پانچویں آیت میں ان کی جو خصوصیت آتی ہے وہ یہ ہے **وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ** (23:5)۔اس آیت کے عام ترجمے میں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ''اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں''۔اس سے مفہوم یہی ہے جسے عصمت کی حفاظت کہا جاتا ہے۔عصمت کی حفاظت کا تصور کچھ ایسا عام ہے کہ اس کے متعلق کچھ سوچنے یا غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔بگڑے ہوئے معاشرے میں بھی اس کی اہمیت بہرحال باقی رہتی ہے اور معاشرے میں بھی ہوتی ہے لیکن یہ چیز اس سے پہلے کبھی سامنے نہیں آئی تھی اور ہمارے ہاں تو اب تک بھی یہ نہیں آئی کہ یہ کیوں ضروری ہے۔میں محتاط الفاظ میں ہی گفتگو کرونگا' ساتھ میری بیٹیاں بہنیں بھی ہوتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ عصمت کی حفاظت' اس کی اہمیت تو ہمارے ذہنوں میں ہے اور یہ بڑا ہی نازک (Touchy) اور اہم مقام ہے لیکن اس پر کبھی Scientific (سائنسی) نقطۂ نگاہ سے یا آج کے Psychology (علم نفسیات) کے نقطۂ نگاہ سے کبھی تحقیق نہیں کی گئی کہ یہ کیوں ضروری ہے۔عام طور پہ تو یہی تصور دیا گیا ہے کہ فیملی یونٹ کے لیۓ' عائلی زندگی کے لیۓ' ہوم لائف کے لیۓ میاں بیوی کے تعلقات کا پابندیوں کے اندر رکھنا نہایت ضروری ہے۔میاں بیوی کے ہی تعلقات عائلی زندگی میں آتے ہیں لیکن آگے بڑھیے تو یوں کہیے کہ جنسی اختلاط کے متعلق پابندیاں ضروری ہیں۔ذہن میں اتنا ہی تھا کہ فیملی لائف کے لیے ایک ضروری چیز ہے۔یہی بات آج تک سمجھی جاتی تھی۔

جنسیات کے سلسلے میں اہلِ یورپ کے مفکرین کی ریسرچ کے باوجود ان قوموں کی حالتِ زار

ہمارے دور کے ان ممالک میں' اس کے متعلق خاص طور پر جو ریسرچ (تحقیق) ہوئی ہے اور جو ہو رہی ہے' اُس میں جہاں یہ چیز عجیب بھی ہے اور دلچسپ ستم ظریفی کی بھی ہے کہ ریسرچ اتنی ہو رہی ہے اور انہی ممالک میں جنسی تعلقات کی بیباکیاں اتنی عام ہو رہی ہیں گویا وہاں کوئی پابندی باقی رہی ہی نہیں ہے۔یعنی وہی لوگ اس پہ ریسرچ کر کے بتا رہے ہیں کہ یہ کتنی ضروری چیز ہے اور وہی اقوام ہیں کہ وہاں جو کچھ پابندیاں پہلے تھیں وہ انہیں بھی اڑاتے چلے جا رہے ہیں اور اب تو وہ اس انتہا تک پہنچ گئے ہیں جہاں حیوانی زندگی بھی نہیں ہے۔اس سے یہ نظر آتا ہے کہ قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ کے متعلق بھی یہ کہا اور تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ کوئی یونہی جاہل قومیں یا وحشی قومیں نہیں تھیں۔قرآن بتاتا ہے کہ وہ بڑی مہذب قومیں تھیں اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ ان کی تہذیب بہت بلندیوں تک پہنچی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہوگئیں جو ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ ایک مہذب قوم' ایک ایسی قوم جو اپنے دوسرے معاملات میں اس قدر علم و بصیرت سے کام لیتی تھی ان کے ہاں یہ اس قسم کی خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں لیکن آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یورپ میں اس قسم کی تحقیقات میں، وہاں کے سائنٹسٹ (سائنسدان)، وہاں کے سائیکالوجسٹ (ماہرین علم نفسیات) بلکہ سوشیالوجسٹ (ماہرین علم سماجیات) بھی اس ریسرچ (تحقیق) میں بہت آگے ہیں اور وہ بتا رہے ہیں کہ اس کی کتنی اہمیت ہے اور یہ وہی اقوام ہیں جو اپنی سوسائٹی میں پہلے سے چلی آنے والی، روایتاً وراثتاً، پابندیوں کو بھی اڑاتے چلے جاتے ہیں اور انتہا تک پہنچ چکے ہیں حالانکہ انہی کے ہاں کے ریسرچ اسکالر (علمائے تحقیق) یہ بتا رہے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا یعنی وہاں یہ بات ذہنی نہیں رہی۔ ہمارے ہاں تو یہ کچھ ذہنی طور پر ہے کہ تحقیق کے اس بدکرداری پہلو کو ہی معیوب سمجھا جاتا ہے اور خاص طور پر اس قسم کی تحقیق لڑکیوں اور عورتوں میں قابلِ برداشت بھی نہیں ہے۔ ہم لوگ تو اس لیے اس کو اہمیت دیتے ہیں لیکن وہ قومیں اس طرح ذہنی طور پہ اسے اہمیت نہیں دے رہی ہیں، وہ تو ریسرچ کر رہے ہیں اور پھر اس کے بعد بتا رہے ہیں کہ یہ کتنی اہم چیز ہے لیکن اس کے باوجود وہاں بیباکیاں عام ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہیں۔ جس قوم میں مثلاً برطانیہ میں Homo-sexuality (ہم جنسیت) قانوناً جائز قرار پا جائے تو وہاں صورتِ حال کیا ہوگی۔ آپ اندازہ لگائیے کہ سابقہ تاریخ میں وہ قومِ لوط تو بس ایک قوم تھی۔ ان کے شہر سدوم (Sodom) [1] کے نام سے Sodomy کا لفظ اس جنسی بدنہادی کے لیے چلا آ رہا ہے اور آج تک تاریخ میں کوئی دوسری من حیث القوم ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جن کے ہاں یہ چیز یوں رائج ہو۔ اس کے بعد یہ چیز صرف آج ان اقوام میں مل رہی ہے جو اپنے ہی ہاں کی ریسرچ سے اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ جنسیت کے لیے یہ پابندیاں کتنی ضروری ہیں۔ انسانی اندازِ زیست کی یہ عجیب ستم ظریفی سی نظر آتی ہے کہ جہلا کے ہاں، وحشی قبائل کے ہاں، تو اب تک بھی وہ پابندیاں چلی آ رہی ہیں، جو ان کے ہاں پہلے سے وراثتاً موجود تھیں اور وہ ترکے میں ان کو ملی ہیں لیکن یہ قوم ہے کہ ریسرچ کے بعد وہاں پہنچ گئی ہے جہاں ان کے ہاں ریسرچ (تحقیق) کرنے والے کہہ رہے ہیں کہ تباہ ہو جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے۔ قرآن نے اس پہ بڑا زور دیا ہے اور عزیزانِ من! آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ ریسرچ (تحقیق) وہ لوگ کر رہے ہیں اور قرآن نے جو اس کو اہمیت دی ہے اس بات کی وجہ آج تو سمجھ میں آ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے کیوں اتنی اہمیت دی گئی ہے؟ قرآن نے تو ہر مقام پہ اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ [2] (23:5). اور پھر یہ سب سے بڑی بات ہے جو بطور خصوصیت مومنین میں بتائی گئی ہے۔

---

1. لواطت کاروں کی بستی
2. انہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 773)

ہمارے ہاں کی کیفیت: بیبا کی' آوارگی اور شادی

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں اس کی اہمیت تو ہے لیکن یہ اہمیت بھی عورتوں اور لڑکیوں کے معاملے میں ہی ہے۔ مردوں کے معاملے میں ایسی اہمیت نہیں ہے۔ گھر میں اگر بیوی میاں سے یہ کہتی ہے کہ بھئی! لڑکا جوان ہو رہا ہے' کچھ بیباک ہو رہا ہے' اس کی کچھ فکر کرنی چاہیے' شادی وادی کرنی چاہیے' دیکھیے یہ آوارہ ہوتا جا رہا ہے' راتوں کو اتنے اتنے بجے گھر آیا کرتا ہے۔'' وہ ٹال کے کہہ دیندا: اے کوئی گل نہیں۔ اس عمر اچ ایہو جیا کچھ ہوندا ہی ہوندا ہیگا۔ او تھے تے ہوندا ہی ہوندا ہیگا۔ ❶

اور لڑکی کے متعلق اگر کہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کونے میں بیٹھی ایک خط لکھ رہی تھی' خواہ وہ اپنی سہیلی کو ہی لکھ رہی ہو' محلے بھر میں چرچا ہو جاتا ہے۔ اس کی حفاظت کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہے میں اپنے ہاں کا پرانا محاورہ سنایا کرتا ہوں۔ جوان لڑکی کی ماں سے یہ کہا گیا کہ بہن! تُوں کدی اوندی جاندی نہیں ہیگی۔ بہناں! میں کی کتھے آواں جاواں؟ کا کیاں جوان ہو گیاں نیں' تے تہانوں پتہ اے پئی...... اے میری بیٹیاں تے سمجھ رہی ہیں' اتنی سی پنجابی تو سمجھ لینی چاہیے: نی بہناں تہانوں پتہ ہیگا اے۔ اے تے آٹے وانگ ہویاں نیں نا۔ اندر رکھے تے چوہیاں دا ڈر' اے باہر رکھے تے کاواں دا ڈر۔ اے ایس واسطے اونکل نہیں ہوندا۔ یعنی لڑکیاں دے متعلق تے اے کیفیت کہ اندر بھی ڈر' باہر بھی ڈر' اور لڑکے کے متعلق وہ جو کہہ رہی ہے' تو اس پر وہ کہتا ہے: کوئی گل نہیں۔ ایس عمر تے' اے ہوندا ہی ہوندا اے ❷۔

حفاظتِ عصمت کے متعلق قرآن کا پیغام

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے جہاں جہاں حفاظتِ عصمت کا ذکر کیا ہے' اس میں ویسے تو دونوں کے لیے ذکر کیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کا جہاں بھی ذکر کیا ہے پہلے مردوں کا کیا ہے' اس کے بعد عورت کا کیا ہے۔ اس سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ اس کی نگاہ کہاں تک جاتی تھی۔ معاشرت کے لحاظ سے ہی سہی' سوسائٹی کے اعتبار سے ہی سہی' لڑکیوں اور عورتوں کی عصمت کی اہمیت تو بہر حال کچھ برقرار

---

❶ وہ اس بات کو ٹال دیتا ہے۔ کہتا ہے: یہ کوئی بات ہی نہیں ہے' اس عمر میں یہ کچھ ہوتا ہی ہوتا ہے۔ ہاں اس عمر میں یہ کچھ تو ہوتا ہی ہوتا ہے۔

❷ اے بہن! تو نے آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کبھی کہیں آتی جاتی ہی نہیں (وہ کہتی ہے کہ) اے بہن! کہاں آؤں جاؤں؟ لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ...... میری بیٹیاں تو سمجھ رہی ہیں' اتنی سی پنجابی تو سمجھ ہی لینا چاہیے: اے بہن! آپ کو یہ معلوم ہے۔ یہ تو بمثل آٹا ہوتی ہیں۔ اندر رکھو تو چوہیوں کا ڈر اور باہر رکھو تو کوؤں (Crows) کا ڈر۔ اس لیے نکالا نہیں جاتا۔ یعنی لڑکیوں کے متعلق تو یہ کیفیت کہ اندر بھی خوف و ہراس اور باہر بھی۔ اور لڑکے کے متعلق بیوی یہ کچھ کہہ رہی ہے تو میاں صاحب کہتے ہیں: کوئی بات نہیں۔ اس عمر میں تو یہ ہوتا ہی ہوتا ہے۔ یا للعجب!

رہتی ہے۔ تصور جو شروع میں گزرتا ہے، وہ مردوں کے متعلق گزرتا ہے اور اس کو کچھ اہمیت نہیں دی جاتی۔ قرآنِ حکیم نے جہاں بھی یہ حکم دیا ہے اس میں پہلے مردوں کو مخاطب کیا ہے حتیٰ کہ وہ جو حکم ہے کہ باہر نکل کر چلو تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو، ہمارے ہاں تو اسکی پابندی صرف لڑکیوں سے، عورتوں سے ہی کرائی جاتی ہے کہ برقعہ اوڑھ کر چلو، یا کم از کم اتنی بڑی چادر ہو کہ وہ پلو نیچے تک ہو یعنی جسے آپ نگاہوں کی عصمت کہیں گے کہ بیباک نہ ہونے پائیں وہ پابندی عورتوں کے اوپر عائد کی جاتی ہے۔ مردوں کے متعلق ہمارے ہاں یہ کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن میں جہاں ''ابصار'' (24:30-31) کہا ہے اس میں ایک بڑی عجیب چیز ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ مومنین سے، مردوں سے یہ کہو کہ وہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیا کریں۔ وہ جو ترجمہ ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ نگاہوں کو جھکا کے رکھیں تو یہاں نگاہوں کا جھکانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ چلیں، تو یوں کر کے چلیں۔

یہ بیباک ہونا عجیب چیز ہے۔ مردوں سے پہلے کہا ہے کہ اے رسول! ان سے کہو کہ باہر چلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں اور اس کے بعد اگلی آیت میں عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ عورتوں کو بھی یہ کہو کہ وہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس کی اہمیت ویسے تو مرد اور عورت دونوں کے لیے رکھی ہے لیکن جہاں جہاں اس کا حکم آیا ہے وہاں پہلے مردوں سے کہا گیا ہے اور اس کے بعد عورتوں کا ذکر آیا ہے تو گویا اس کی اتنی اہمیت ہے۔ پھر اس کے لیے لفظ حٰفظون کا آیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ پہ غور کرنے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسکی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک لفظ حفاظت آیا ہے اور دوسرا لفظ اس کے ساتھ ''احصان'' آیا ہے۔ اس سے محصنین اور محصنات ہے۔ ان دونوں کے حفاظت کے معنی ہیں یعنی کسی چیز کو Preserve (محفوظ) کرنے کے ہوتے ہیں، یعنی ایسے محفوظ کرنا کہ وہ چیز Preserved (محفوظ) رہے۔ احصان کے معنی بھی کسی چیز کو ایسا محفوظ کرنا، Preserve (محفوظ) کرنا ہے جیسے قلعے کے اندر فوج ہوتی ہے۔ یہ قلعہ بند ہو جانے والی بات ہے یعنی اتنی شدت کی حفاظت۔ اس کے لیے قرآن اسطرح کی حفاظت کرنے کا کہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس کے لیے قرآن یہ کہتا ہے کہ اس کو Preserve (محفوظ) رکھنا چاہیے۔ وہ کیا چیز ہے جس کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ وہ فروج ہے۔ ''فروج'' کا ترجمہ ہی جنسی توانائی ہونا چاہیے، Sexual Energy ہونا چاہیے۔ اس انرجی یعنی توانائی کو محفوظ رکھنا چاہیے قرآن کے حفاظت [1] اور احصان کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ اس کو محفوظ رکھنے کی تاکید کر رہا ہے۔ اسی لیے جہاں قرآن یہ دو الفاظ لایا ہے وہ اس Preserve (محفوظ) رکھنے کے معنی کو واضح کرنے کے لیے لایا ہے گویا سورۃ النسآء کی 24 ویں آیت جہاں جنسی اختلاط کی اجازت ہے، وہ بذریعہ نکاح ہے۔ وہاں کہا ہے کہ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ (4:24) مومنین وہ ہیں جو اس توانائی کو Preserve (محفوظ) رکھتے ہیں [2]۔ اس میں پہلا لفظ تو

---

[1] یہاں لفظ ہے حٰفظون (23:5)۔ اسی سے حفاظت کا لفظ ہے۔

[2] یونہی اسے بہا نہیں دیتے (غیر مسفحین)

وہی محصنین ہے، وہی احصان ہے جو میں نے ابھی کہا ہے یعنی محفوظ رکھنے والے قلعہ بند رکھنے والے اور مُسٰفِحِیْنَ کا (مادہ س ف ح' سفح) معنی ہوتا ہے' یونہی کسی چیز کو بہا دینا' جب کہ محفوظون کے معنی ہی اس کے Preserve (محفوظ) رکھنے کے ہیں۔ یہاں سے مغرب کے ریسرچ کرنے والوں کو یہ نکتہ ملا کہ یہ تو انسان کے اندر ایک ایسی انرجی ہے جس کو Preserve (محفوظ) رکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے انسان کی ہر توانائی' ہر صلاحیت' کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے استعمال کے لیے بھی قرآن نے بتایا اور ان ریسرچ اسکالر نے بھی بتایا لیکن اس کو Preserve (محفوظ) رکھنے کی تاکید کی ہے کہ یہ ایک خاص مقصد ہے جس کے لیے اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے' ورنہ اس کو Preserve (محفوظ) رکھا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے Preserve (محفوظ) رکھنا کیا ہوتا ہے؟

جنسیات کے متعلق ڈاکٹر انون کے تحقیقاتی نتائج

آپ کو یاد ہے میں آپ کو انون ❶ کی کتاب ❷ کا ایک حوالہ دیا کرتا ہوں۔ اگرچہ میں نے اس کے بعد اس Subject (مضمون) پر اور کتابیں بھی دیکھی ہیں اور سائیکولوجی (علم نفسیات) میں تو اب بہت سی کتابیں آ رہی ہیں۔ انون (J.D. Unwin) نے تو سوشیالوجی (علم سماجیات) کے Point of view (زاویہ نگاہ) سے ریسرچ کی تھی۔ اس کی کتاب کا نام Sex and Culture (جنس اور کلچر) ہے۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ ان لوگوں کی ریسرچ (تحقیق) ہے جو گوشوں' زاویوں' حجروں اور کمروں میں بیٹھ کر نہیں کرتے۔ یہ محقق ایک بہت بڑا فاضل ہے۔ اس نے پوری عمر اس ایک Subject (مضمون) کو لے کر دنیا بھر میں' جہاں بھی Primitive (انسانی ترقی کے ابتدائی مرحلوں کے) قبائل (Tribes) بستے ہیں' ان پر تحقیق کی ہے۔ یہ وہ پرانے وحشی قبائل ہیں جو مہذب دنیا سے بہت دور ہیں' جن کے ذہن ابھی تک تہذیب وتمدن سے متاثر نہیں ہوئے۔ پہلے تو اس نے اُن کے ہاں ریسرچ (تحقیق) کی کہ وہاں جن قبائل نے اپنی اس انرجی (توانائی) کو Preserve (محفوظ) رکھا ہے ان کی کیا کیفیت ہے

---

❶ انون (Unwin): کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر J.D. Unwin کا نام ان محققین میں شامل ہے جنھوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں' جنوبی امریکا کے جنگلوں' قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گزار دی۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انھی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے۔ انھی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں' کبھی ان کی شاخوں کے اوپر' کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات اپنی شادیاں بھی کیں اور اسطرح انھی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور یوں ان کے متعلق براہِ راست معلومات فراہم کیں۔ یہ ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر انون (J.D. Unwin)۔

❷ Unwin, J.D., M.C. Ph.D. (CANTAB.)1934. Sex and Culture- London Oxford University: Humphrey Milfor.

اور جنہوں نے ان پابندیوں میں ڈھیل دیدی تھی ان کی کیا کیفیت ہوئی۔ عزیزانِ من! اس نے دنیا کے اکثر قبائل کے اندر جا کر' ان کے ہاں رہ کر' ان کی تہذیب' ان کی معاشرت' ان کے تمدن کا مطالعہ کیا اور اس کے موجودہ نتائج دیکھے اور پھر ان سارے کے سارے 80 معاشروں ❶ (Societies) کے مشاہدات کے بعد وہ مہذب دنیا کی طرف آیا اور پھر سولہ مہذب (Civilized) قوموں کے متعلق اسی طرح سے یہ کچھ دیکھا اور اس ریسرچ (تحقیق) کے بعد وہ جس نتیجے پہ پہنچا' عزیزانِ من! وہ آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ قرآن نے حفاظتِ عصمت کے متعلق جو کچھ کہا تھا' آپ اسے بھی سامنے رکھیے۔ اس کے بعد میں مختصر الفاظ میں اس کی ریسرچ (تحقیق) کے نتائج پیش کرتا ہوں۔ میں نے اپنے ہاں ''سلیم کے نام'' خطوط میں بھی یہ لکھا ہے ❷ اور 1974ء کی کنونشن میں جنسی بدنہادی پر میرا ایک خطاب بھی تھا' اس کا پمفلٹ بھی بعد میں چھپا تھا۔ اس میں بھی میں نے تصریحاً لکھا ہے۔

انون (J.D. Unwin) کی اس کتاب میں کہا یہ گیا ہے کہ ''میں (انون) اپنی اس ریسرچ (تحقیق) کے بعد نتائج کے لحاظ سے ان آبادیوں کو تین حصوں (گروہوں/قوموں) میں تقسیم کرتا ہوں''۔ انہوں نے کہا ہے کہ ''جس گروہ' قبیلہ یا قوم نے شادی سے پہلے کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی' وہ تہذیب و تمدن کی پست ترین سطح پر تھا اور صرف اس آزادی پر جس قوم یا گروہ نے تھوڑی بہت پابندیاں عائد کی تھیں' وہ تمدن کی سطح کے درمیانی درجے پر تھا اور تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت حفاظت عصمت کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ ان کے ہاں شادی کی یہ شرط ہوتی تھی''۔ لہٰذا جن قبائل نے اپنے ہاں یہ پابندیاں عائد کی تھیں' انون کہہ رہا ہے کہ وہ تمدن کی بلند ترین سطح پر تھے۔ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ جن اقوام نے اپنے ہاں جنسی تعلقات یعنی جنسی اختلاط کی پابندیوں میں' ذرا سی گرفت ڈھیلی کی' وہ اپنے تمدن کی سطح کو زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک برقرار رکھ سکیں اور اس کے بعد زوال پذیر ہوگئیں۔ موصوف اپنی اس کتاب کے اندر اس انرجی کا نام جنسی توانائی رکھتا ہے اور اس کے تحفظ کے لیے Preservation یا Protection کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے لیے قرآن کریم نے محافظین کا لفظ استعمال کیا ہوا ہے۔ وہ صرف Restrictions یا

---

❶ ڈاکٹر انون کی کتاب Sex and Culture کے صفحہ 617 تا 618 پر (Appendix 1) میں ان 80 معاشروں (Societies) کے نام درج ذیل عنوانات/ممالک کے تحت درج ہیں: میلانیشیا (Melanesia) (7 قبائل) نیوگنی (New Guinea) (6 قبائل)' افریقہ (21 قبائل)' امریکا (29 قبائل)' اوشینیا (5 قبائل)' آسام (7 قبائل) اور متفرق (5 قبائل)۔ جو قارئین ان کا تفصیلی مطالعہ چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا خود مطالعہ کریں۔ یہ کتاب پہلی دفعہ 1934ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی تھی۔

❷ پرویزؒ: سلیم کے نام جلد سوم...... چھتیسواں خط: جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر۔ ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1986' ص ص 161-135۔

پابندیوں کا ذکر نہیں کرتا، وہ اس کو ''جینوں سانبھ کے رکھن والی گل کیندے آں [1] نا'' کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسانوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے قومی تحفظ کے لیے، ان کی تہذیب اور تمدن کی بقا کے لیے، ان کے عروج کے لیے، یہ کتنی بنیادی چیز ہے! جسے یہ جنسی توانائی کہتے ہیں، وہ کتنی اہم ہے۔ اسے تو بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

جنسیات کے سلسلہ میں فرائیڈ کی تحقیق

ہمارے اس دور میں یہ کچھ تو سوشیالوجی (سماجیات) کے Point of view (نکتۂ نگاہ) سے ہوا کہ تہذیب، تمدن اور کلچر پہ جنسیات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں سائیکالوجی (علم نفسیات) کے نکتۂ نظر سے بھی اس موضوع پر ریسرچ (تحقیق) کی گئی۔ اس میں فرائیڈ [2] کا نام بہت آگے ہے۔ وہ تو دنیائے قدیم اور دنیائے جدید میں Sex (جنسیات) کے معاملے میں امام سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر Pioneer (السابقون الاولون) کی طرح اس کے نتائج میں بعد میں کچھ غلطیاں اور خامیاں بھی پائی گئیں لیکن ریسرچ تو اس نے ساری عمر بڑی کی۔ انون (J.D.Unwin) نے یہ لکھا تھا کہ نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ اب سنیے کہ یہ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ فرائڈ (1856-1939) نے کہا کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے نیز محاسبہ خویش کی صلاحیت بھی۔ یعنی اس توانائی کو Preserve (محفوظ) کرنے سے، اس کی حفاظت کرنے سے، قوم میں فکر و عمل کی قوتیں بڑھ جاتی ہیں اور محاسبہ خویش کرنے کی صلاحیت بھی نشو و نما پاتی ہے۔ غور کیجیے جس چیز کو ہم اتنی اہمیت دیتے چلے آ رہے ہیں وہ تو اس لیے ہے کہ معاشرے میں ہمارے ہاں یہ ایک تصور ہے کہ یہ ایک بڑی ضروری قدر ہے۔ ہم نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے اور اس طرز پر اس کا یہ ثمر بھی ملتا ہے۔

برادرانِ عزیز! انہی بنیادوں پر فرائیڈ (1856-1939) نے یہ لکھا تھا کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوتی ہے کہ لوگوں نے اپنے جذبات کی تسکین میں ایثار اور قربانی سے کام لیا اور یہ عمارت دن بدن اوپر اٹھتی گئی کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب ان پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تو یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں، جسے Sublimation (عملِ تصعید) کہتے ہیں، یعنی انہیں پست مقصد کی بجائے بلند مقصد کے لیے استعمال کرنا۔ یہ توانائی سائیکالوجی (علم نفسیات) کی اصطلاح میں Sublimation

---

1. جسے ہم سنبھال کر رکھنے والی شے کہتے ہیں۔
2. Signund Freud (1856-1939)

(تصعید) کہلاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے جو حصولِ لذت ہے' وہ بڑا پست مقصد ہے۔ اس سے ہٹ کر اگر اسے Preserve (محفوظ) کر دیا جائے' تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ توانائی پھر بڑے بلند مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔ اس طرح افراد کی یہ فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر' ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے' جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ قرآن کے دو الفاظ سنتے چلے جائیے کہ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (23:5) [1] وہ انسان کی جنسی توانائی کی حفاظت کرتے ہیں' انہیں Preserve رکھتے ہیں۔ عزیزانِ من! انون (J.D.Unwin) کی کتاب کے آخری الفاظ [2] اسی نتیجے پر ہیں۔

---

[1] وہ اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

[2] قارئین کی سہولت کے لیے اس کتاب کے آخری الفاظ درج کیے جاتے ہیں:

If, on the other hand, a vigorous society wishes to display its productive energy for a long time, and even for ever it must recreate itself, I think, first, by placing the sexes on a level of complete legal equality, and by altering its economic and social organization in such a way as to render it both possible and tolerable for sexual opportunity to remain at a minimun for an extended period, and even for ever. In such a case the face of the society would be set in the Direction of Cultural Process; its inherited tradition would be continually enriched; it would achieve a higher culture than has yet been attained; by the action of human entropy its tradition would be augmented and refined in a manner which surpasses our present understanding.

(Unwin, J.D.: Sex and Culture, Oxford University Press, London: Humphrey Milford, 1934, P.432)

اردو پڑھنے والے قارئین کی سہولت کے لیے اس کا رواں ترجمہ درج ذیل ہے:

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اسکی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک' بلکہ ابدالآباد تک' قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک' بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشاں مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں' اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائینگی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔

شرفِ انسانیت کا جوہرِ حقیقی دراصل تخلیقی قوت کا ظہور ہے

تخلیقی توانائیاں (Creative Energies)' جو ڈاکٹر انون (J.D. Unwin) کہہ رہا ہے' بڑی چیز ہے۔ یہ جو Creativity ہے یعنی تخلیقی توانائی ہے' یہی تو شرفِ انسانیت ہے۔ حیوان کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اسمیں تو عملِ تولید ہے۔ اس میں Procreation ہوتی ہے یعنی جنسی اختلاط سے اسی قسم کا آگے ایک اور بچہ پیدا کر دینا۔ اس سے آگے اسکا کوئی قدم ہی نہیں بڑھتا' کوئی نئی چیز وجود میں نہیں آتی جبکہ تخلیق یہ ہوتی ہے کہ وہ جو Given (دیا ہوا) میٹریل (مواد) موجود ہو' جو سامان موجود ہو' اس سے ایک نئی چیز پیدا کرنا۔ یہ Creation (تخلیق) کہلاتا ہے۔ Creation (تخلیق) تو خدا کے لیے مخصوص ہے لیکن قرآنِ کریم نے تو انسانوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ خدا کو اس نے احسن الخالقین کہا ہے کہ تخلیق میں وہ دوسرے خالقوں کے مقابلے میں حسین ترین تخلیق کرنیوالا ہے۔ وہ دوسرے خالقوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور یہ صرف انسان ہے جو یہ Creation یا تخلیق کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہیے کہ یہ صلاحیت صرف انسان کو دی گئی ہے۔ یہ چیز اوپر خدا کو حاصل ہے اور نیچے انسان کو حاصل ہے اور جو قوم تخلیق نہیں کرتی یا جس قوم میں تخلیقی صلاحیتیں نہیں ہوتیں' وہ انسانی سطح پہ نہیں ہوتی' حیوانی سطح پہ ہوتی ہے۔ Procreation (تولید) تو اس میں ہوتی ہے' یہ حیوانی سطح کی چیز ہے۔ اسی لیے خدا نے اپنے متعلق کہا کہ لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ❶ (112:3). خدا کے ہاں تولید کی بات نہیں' وہ خالق ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا شامل ہے۔ تولید تو حیوانی زندگی کا ایک عمل ہے جب کہ انسانی سطح پر تخلیق یا Creation ہوگی۔ اسی لیے اقبال رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

جس قوم میں تخلیقی قوت نہیں ہوتی اسی کو تو کافر اور زندیق کہا جاتا ہے۔ اس کا شمار زندہ قوموں میں ہو ہی نہیں سکتا۔

مرد اور عورت کو مساوی حیثیت دینے کے ثمرات

عزیزانِ من! انون (Unwin) کہتا ہے کہ اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں برومند ہوں بلکہ ابدالآباد تک قائم بھی رہیں اور آگے بھی بڑھتی رہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقِ نو کے لیے کیا کرے؟

---

❶ اس نے تمام ذی حیات کو عملِ تخلیق (Creation) سے پیدا کیا ہے' نہ کہ تولید کے ذریعے (By Procreation)۔ (عملِ تولید میں' پیدا کرنے والے کا ایک حصہ مولود میں آ جاتا ہے' اور اسطرح والد پیدا کرنے والا' خود ناقص رہ جاتا ہے۔ تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا)۔ نہ اس نے اسطرح کسی کو پیدا کیا ہے' نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1496 تا 1497)

اس کے لیے کہا کہ پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے۔ آپ دیکھیے کہ یہ قرآن کی آیتوں کے ترجمے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا کرے جن سے معاشرے میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرے کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تمدن اور تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا کہ جس مقام پر آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ یہ وہی مسئلہ ہے جس کے متعلق ہم آپ مہذب معاشروں میں ذکر کرنا بھی کچھ معیوب سا ہی سمجھتے ہیں یا کم از کم مذموم سمجھتے ہیں اور اگر کہیں اس کی اہمیت ہے تو صرف اتنی کہ یہ اہمیت ابھی قائم ہے۔ مردوں کی اہمیتِ عصمت تو ختم ہوگئی ہے لیکن کم از کم عورتوں کے معاملے میں باقی ہے۔ ہم بھی انہی سے ڈیمانڈ کرتے ہیں' کیونکہ اس سے زیادہ تو ہم نے اس کے متعلق کبھی بھی سوچا نہیں کہ یہ بات ہے کیا؟ آپ اندازہ لگایئے کہ ریسرچ کرنے والوں میں ایک طرف فرائیڈ (1856-1939ء) ہے' جو نفسیاتی زاویہ نگاہ سے تحقیق کر رہا ہے تو دوسری طرف انون (Unwin) ہے جو Sociological point of view (سماجی زاویہ نگاہ) سے دیکھ رہا ہے۔ وہ دونوں ہی اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھنا اور ان کے استعمال کے لیے ایسے حدود مقرر کرنا جن میں ذرا سی بھی بے باکیاں نہ ہونے پائیں' اقوام کے عروج کے لیے ازبس ضروری ہیں۔ انون (Unwin) کہتا ہے کہ ایسا کرنے سے یہ قوم تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے جن کا تصور بھی اس وقت ہمارا ادراک نہیں کر سکتا۔

اب آپ اس بات پہ غور کیجیے کہ صدرِ اول میں' جو ہم چند دنوں کے اندر دیکھتے ہیں کہ اس قوم نے' مومنین نے' چند دنوں کے اندر ہی اندر دنیا کے اندر کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا' وہ آخر کس بات کا نتیجہ تھا یعنی حضرتِ عمرؓ کے زمانے (13-24AH بمطابق 634-644/645AD) تک مملکت کی جو وسعت تھی اس زمانے کے اعتبار سے اس کی آبادی اتنی تھی جتنی آج یورپ کی ساری آبادی ہے۔ اس کے اسباب و خصوصیات یہ تھے جو قرآن بتا رہا ہے۔ یعنی ان مومنین کی یہ خصوصیات تھیں جو ان کے اندر پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں یہ خصوصیتِ کبریٰ موجود تھی کہ انہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا۔ قرآن نے تولید کی خاطر خود ہی اس کے مواقع کا تعین کر دیا اور وہ الفاظ ہیں **اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ** ❶ (23:6)۔ یعنی اپنی جنسی

---

❶ انہوں نے (اپنی جنسی توانائیوں کو) صرف اپنی بیویوں پر صرف کیا یا اُن لونڈیوں پر جو (انسدادِ غلامی کے متعلق قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے 47:4) ان کی ملک میں آ چکی تھیں (لیکن جنہیں نکاح کے بعد بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جا چکا تھا)۔ ان سے زنا شوئی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 773 تا 774)۔

توانائیوں کا استعمال اپنی ازواج تک رکھا۔ یعنی اس میں مردوں اور بیویاں سے کہا جائے گا کہ خاوند اپنی جنسی توانائیوں کو ازواج تک رکھیں یا اپنی جنسی توانائیوں کو اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ (23:6) تک محدود رکھیں تو یہ قابلِ ملامت بات نہیں ہے۔ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ کی تشریح ابھی کرتا ہوں۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا کہ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعَادُوْنَ [1] (23:7)۔ اس کے علاوہ اگر ان جنسی توانائیوں کو کسی طرح صرف کیا تو وہ یوں سمجھیے جیسے وہ دریا سیلاب بن جاتا ہے 'ساحل توڑ دیتا ہے' اپنے کناروں میں محدود نہیں رہتا' حدود فراموش ہو کر سیلاب بن جاتا ہے۔ اس لیے اپنی جنسی توانائیوں کو ازواج اور ''ماملکت'' تک محدود رکھو۔

ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت مشروط اجازت ہے

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ یہ جنسی اختلاط' تولید (Procreation) کے لیے نہایت ضروری ہے اور منشائے خداوندی ہے کہ نسلِ انسانی آگے بڑھتی جائے' تولید کے لیے خاوند اور بیوی' کا جنسی اختلاط ضروری ہے۔ اس کے لیے پہلے تو یہیں تک رہیے۔ قرآنِ کریم نے Monogamy (وحدت زوج) کا اصول [1] بتایا ہے۔

ایک بیوی ایک خاوند' یہ اس کا اصولی قاعدہ ہے۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی تعداد قرآن کا اصولی قاعدہ نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک مقام پر ایک سے زائد کا کہا ہے۔ یہ اس مدنی زندگی میں ہے' جہاں یہ کمیونٹی' مسلمانوں کا یہ معاشرہ' ایک بڑا ہی مختصر سا تھا' مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں سات آٹھ برس تک مسلسل جنگ ہوتے رہے اور جنگوں میں تو مرد ہی ضائع ہوتے ہیں۔ عورتوں کی تعداد بڑھ گئی۔ پھر مکے اور دیگر مقامات سے عورتیں جو اسلام لے آئی تھیں' وہ اپنے گھر بار اور خاوندوں کو چھوڑ کر مدینے میں آ گئیں۔ عورتوں' بیواؤں اور یتیم بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ یہ جو مختصر سی کمیونٹی تھی اس کے پاس ان کی حفاظت کا کوئی حل نہیں تھا۔ اس لیے جو Monogamy (وحدتِ زوج) کا اصول تھا کہ ان کے ہاں ایک بیوی ہو' وہ اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ تو قرآنِ کریم نے اس مشکل مسئلے کے حل کے لیے' صرف اس کی اجازت دی کہ...... اگر تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو جائے کہ یہ جو بے شوہر کی عورتیں ہیں خواہ وہ بیوہ ہوں' کنواری لڑکیاں ہوں' یتیم ہوں' قرآن میں ان سب کے لیے یتامیٰ کا یہ لفظ آتا ہے کہ ان کی حفاظت کا کوئی اور منصفانہ حل تمہارے ذہن میں نہ آئے' کوئی سوسائٹی ایسا حل نہ رکھتی ہو' تو ہمارا وحدتِ زوج کا' ایک بیوی کا جو قانون ہے' اس میں' یہ جوان مردوں کی پہلی بیویاں ہیں' ان کی باہمی رضامندی سے' کچھ Relaxations (رعایت) کی جا سکتی ہیں' یہ صرف اس مسئلے کے حل کے لیے اجازت

---

[1] جو کوئی اس کے علاوہ' جنسی تعلق کی کوئی صورت اختیار کرے تو وہ قانون شکنی ہو گی اور حدودِ خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے 24:2)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن القرآن' ص 774)

[2] ملاحظہ کیجیے: (4:3)

دی جاسکتی ہے۔ایک سے زیادہ بیویوں کی یہ اجازت سارے قرآن میں صرف ایک مقام پہ ایک آیت میں آئی ہے' عزیزانِ من! یہ آیت شروع ہوتی ہے: وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا ❶ (4:3) اگر تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو جائے کہ معاشرہ میں عورتوں کی اس قدر بہتات ہوگئی ہے کہ وحدتِ زوج (Monogamy) کے اصول سے یہ معاشرتی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو اس کے لیے اجازت دی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی لے لو۔ یہ ہے جی' سارے قرآن میں یہ ایک جگہ' اور اس میں بھی ایک دوسری شرط پیش کی جاتی ہے: یہ بھی ساتھ ہی دیکھ لیں کہ تم اس باب میں عدل قائم کرسکنے کے قابل ہو یا نہیں؟ اگر نہیں' تو کہا کہ پھر وہی ایک بیوی کا اصول یاد رکھو۔ یاد رکھو! اگر تم عدل قائم نہیں رکھ سکتے تو اس صورت میں بھی Relaxation (رعایت) نہیں ہے۔ بہرحال' یہ تھی ازواج کے متعلق قرآن کی رو سے پہلی چیز۔

اس کے بعد اب ہم اپنے معاشرے کیطرف آتے ہیں جس کی سند پھر شریعت سے ملنے لگ گئی۔ وہاں چار بیویاں تو کھلے بندوں ہوگئیں اور پھر جس بیوی کو جس وقت کوئی مرد چاہے' خاوند چاہے' بغیر کوئی وجہ بتائے ہوئے نیلام کرنے والوں کی طرح' ایک دو تین کہے' اسے طلاق ہوئی۔ وہ ہوگئی ختم۔ اب رہ گئیں تین' تو چوتھی اور لے آئے۔ رابرٹ بریفو (R.Briffault) نے ایک کتاب لکھی۔ اس کا نام ہے: The Making of Humanity (نوع انسان کی تشکیل)۔ کیا کتاب ہے یہ! اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: The Mothers (مائیں) ❷ یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس میں وہ عورتوں کے مسائل کو لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھو'

---

❶ (لیکن یتیموں کا مسئلہ' ان کے مال و اسباب کی حفاظت ہی سے طے نہیں ہو جاتا۔ بات اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں' مثلاً جنگ کی وجہ سے' کہ معاشرہ میں مرد ضائع ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے' لڑکیاں) زیادہ رہ جائیں' بالخصوص زیادہ بے شوہر عورتیں 4:127)۔ اور اس مسئلے کا کوئی خاطر خواہ' منصفانہ حل نہ ملتا ہو یا کہیں انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ایسے حالات میں تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر' تم ان بے شوہر عورتوں سے حسبِ پسند (جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں (4:19) نکاح کرلو۔ (اس مقصد کے لیے ''ایک مرد ایک بیوی'' کے قانون میں استثناء (Exception) کی جاتی ہے۔ اس صورت میں' جب بھی حالات کا تقاضا اور معاشرہ کا فیصلہ ہو تم) دو دو' تین تین' چار چار' بیویاں تک (نکاح میں لا سکتے ہو) لیکن اگر تم دیکھو کہ تم' اس طرح مختلف افراد خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے' تو پھر اُسی ''ایک بیوی'' والے قانون پر کاربند رہو۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم اس سے قبل' اپنے نکاح میں لا چکے ہو (کیونکہ اس کے بعد تو غلام اور لونڈیوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا ہے)۔ بے انصافی (یا کثرتِ اولاد کے بوجھ) سے بچنے کے لیے' یہ راہ زیادہ قرین صواب ہے۔
(یاد رکھو۔ یہاں جس عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے' اس سے مراد مختلف بیویوں میں سلوک و برتاؤ کا عدل ہے' نہ کہ جذبات کا عدل۔ اس لیے کہ جذبات میں مساوات اور یکسانیت رکھنا' نفسیاتی محال ہے' جس کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ 4:19)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص176)

❷ The Mothers میں بریفو کے یہ الفاظ غور طلب ہیں:

"It is practically impossible to frame any definition of marriage"

یہ بھی ذہین میں رکھیے کہ

when he (Briffault) speaks of marriage being instituted by a mythical legislator,he seems to use marriage as a synonym for exogamic regulations (R. Briffault:The Mothers,pp 523,75)

یہ جو اس قسم کی مصنوعی پابندیاں ہوتی ہیں' ان کا فائدہ کیسے اٹھایا جاتا ہے۔ اس نے بڑی ریسرچ کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں نے ایک کرد کو دیکھا۔ وہ مسلمان تھا۔ ایک وقت میں اس کی چار بیویاں ہوتی تھیں۔ اس دوران میں وہ چالیس بیویاں تک کر چکا تھا۔ یہاں ہمارے ہاں بھی تحقیق کی ہو تو پتہ چلے۔ ہاں' تو چار مستقلاً ہیں اور ان کی تبدیلیوں کی یہ کیفیت ہے۔ غور کیجیے قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اپنی جنسی توانائی کی حفاظت کرتے ہیں' ہمیشہ بلند رہیں گے اور یہاں یہ حالت ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی

اب آگے آتا ہے: **مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرے میں' جیسا کہ اس زمانے میں دیگر اقوام میں بھی یہ بات عام تھی' غلام اور لونڈیاں موجود تھیں۔ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدی مردوں کو تو وہ غلام بنا لیتے تھے اور عورتوں کو لونڈیاں پھر یہ کہ ان کی فروخت بھی ہوتی تھی۔ یعنی کسی دوسرے ملک کے اندر بنائی گئی لونڈیاں یہاں آتی تھیں اور نیلام ہوتی تھیں' نیز یہ کہ ان کو خرید لیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانے میں عربی معاشرے کی ایک مسلم بات تھی۔

قرآنِ حکیم کا غلام اور لونڈیوں کے متعلق پیش کردہ حل

جب اسلام آیا تو آپ غور کیجیے کہ گھروں کے اندر تو یہ لونڈیاں موجود ہیں اور باہر غلام بھی موجود ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم نے پہلے تو یہ حکم دیدیا کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا ہی نہیں جاسکتا' انہیں تو چھوڑنا ہوگا' خواہ دشمن کی قوم کے ساتھ معاہدہ کرکے' تبادلے میں لے کر' زرِ فدیہ لے کر' بہرحال انہیں چھوڑو۔ [1] اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو قرآن کہتا ہے کہ **فَاِمَّا مَنًّا** (47:4) یہ انسان ہیں' انسانیت کی بنیادوں پر' احسان رکھ کر' ان کو چھوڑ دو۔

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن میں یہی ایک آیت ہے۔ انہیں ہر حال میں چھوڑنا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک انہیں رکھو' مہمان بنا کر رکھو۔ اس کے بعد دشمن کی قوم کے ساتھ معاملہ کرو۔ اس معاملے میں ذہن یہاں تک ہی جاسکتا ہے کہ ٹھیک ہے' جا کر اپنے قیدیوں کا تبادلہ کرو' ورنہ اس کے لیے ان سے زرِ فدیہ لو لیکن قرآن ایک قدم آگے اٹھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے لیے تو یہ چیز کسی شکل میں بھی قابلِ برداشت نہیں کہ تم انسانوں کو کسی طرح سے بھی محبوس کرکے' بند کرکے' یوں رکھو۔ اگر یہ صورت پیدا نہیں ہوتی تو پھر انہیں

---

[1] آیت (47:4)- پھر (جیسے حالات کا تقاضا ہو' اس کے مطابق) انہیں یا تو معاوضہ لے کر رہا کردو (یعنی زرفدیہ لے کر یا اپنے قیدیوں کے تبادلہ کے طور پر) اور یا محض احسان رکھ کر (38:40)۔ تا آنکہ خود لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے (یعنی ملک میں ہر طرف امن وامان ہو جائے)۔ (پرویزؒ مفہوم القرآن' ص-1185)

احساناً چھوڑ دو۔ یہ ہے جی! جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کی ایک آیت۔ یہ سورۃ محمد ﷺ کی چوتھی (47:4) آیت ہے۔ اب یہ رہا کہ معاشرے میں اس وقت جو غلام اور لونڈیاں موجود تھیں تو ان کو تو Overnight (شباشب) نکالا ہی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس سے معاشرے کے اندر جو معاشی نظم و نسق تھا' اس کا توازن بگڑ جاتا' وہ وہاں خاصی تعداد میں تھیں' ان کو باہر نکال کے کہاں بھیجا جاتا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک غلاموں کے حقوق

قرآنِ کریم محض جذبات کی کتاب نہیں ہے۔ وہ Facts (حقائق) کو پیش کرتی ہے' Reality (حقیقت) کا حال بتاتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو اس وقت تمہارے ہاں موجود ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جنہیں تم نے لونڈیاں بنا کر رکھا ہے' ان کو بیویوں کا درجہ دو کیونکہ ان کے ہاں پہلے ہی بیوی اور لونڈی میں بہت فرق تھا۔ لونڈی تو بیوی ہوتی نہیں تھی۔ وہ تو جنسی خواہش کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ پہلی چیز تو یہ ہوئی۔ اب اس کے بعد آپ قرآنِ کریم میں دیکھیے بار بار حکم ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو' غلاموں کو آزاد کرو۔ تو اگر کسی سے کہیں ذرہ بھر بھی لغزش یا سہو ہو جاتے تو کہا جاتا ہے کہ ایک غلام آزاد کرو۔ اگر کہیں کسی نے جھوٹی قسم کھا لی تو کہا کہ ایک غلام آزاد کرو۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کو آزاد کرتے وقت اتنا کچھ دو کہ یہ اپنا آزاد ذریعہ معاش قائم کر سکیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے سہو اور لغزش کے لیے بھی یہی کہا کہ غلام آزاد کرو۔ آپ قرآن میں دیکھیں کہا ہے کہ **فَكُّ رَقَبَةٍ**[1] (90:13) غلام آزاد کرو۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے جامع طور پہ تو عزیزانِ من! یہ دو الفاظ ہیں: **فَاِمَّا مَنًّا** (47:4) یا محض احسان رکھ کر آزاد کرو۔ سورۃ محمد ﷺ کی اس آیت سے پوچھیے کہ کیا دنیا کے کسی مہذب سے مہذب قانون میں بھی یہ بات بتائی گئی ہے؟ دین کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یاد رکھو! دین تو پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے کے[2] متبادل ہے' یہ تو پہاڑ کی گھاٹی کا سا راستہ ہے۔ جب آپ اس پر جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں آپ کا کتنا زور لگتا ہے۔

---

[1] جہاں دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے' اُسے اس سے آزاد کرائے۔ یعنی سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم' مطیع' زیر دست نہ رہے۔ ہر ایک گردن اٹھا کر چلے۔ ہر ایک کو جسمانی' ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو۔ (اُس پر قوانین خداوندی کے سوا کسی کی پابندی نہ ہو)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 451 تا 452)

[2] ان نکات کی مکمل تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان تیسواں پارہ (مکمل) سورۃ البلد' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006۔

دین کے مقامِ بلند کی پہلی منزل

قرآن نے کہا ہے کہ یہ دین کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ **الْعَقَبَةَ** (90:11) ہے یعنی یہ **فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ** (90:11) ہے۔ گویا یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کا نام ہے۔ پھر قرآن مجید نے خود ہی سوال کرتے کہا ہے کہ **وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ** (90:12) یہ پہاڑ کی گھاٹی کیا ہے؟ سنیے' عزیزانِ من! یہ جو ابتدا میں ہی ایثار' قربانی' محنت' مشقت اور اپنے اوپر یہ ساری پابندی کی جو چیزیں کہی تھیں' ان کی ابتدا کس چیز سے کی؟ میں نے کہا ہے کہ عرب معاشرے میں یہ غلام اور لونڈیاں موجود تھیں۔ غلام وہ ہے جس کی محنت کا معاوضہ آپ کو کچھ نہیں دینا پڑتا یعنی وہ ساری عمر آپ کا کام کرتا رہے گا' آپ اسے اس کا کچھ معاوضہ نہیں دیں گے۔ آپ سوچیے کہ یہ کتنی عجیب اور مشکل بات ہے کہ وہ کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا' کہیں جا نہیں سکتا' اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا اور اسے کوئی معاوضہ دینا نہیں پڑتا۔ جس قسم کا روٹی کپڑا آپ جی چاہے اسے دیں' حیوانوں سے بھی بدتر اس سے کام لیں۔ غلاموں کی یہ حیثیت ہے۔ ادھر گھروں کے اندر جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے لونڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کو بھی کچھ دینا نہیں پڑتا' ان کا کوئی حق ہی نہیں ہے' ان کا بیویوں جیسا ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ سنیے اس دین کی اس گھاٹی کی پہلی منزل کیا گنائی گئی ہے؟ کہ یہ محض خالی نفل پڑھ لینے کا نام نہیں ہے' دین ایک گھاٹی ہے' مشقت طلب ہے' قربانیاں چاہتا ہے۔ پہلی چیز کیا ہے؟ کہا کہ **فَکُّ رَقَبَةٍ** (90:13). پہلی چیز تو یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو۔ یہ ہے دین کا پہلا قدم' عزیزانِ من! دو ایک قدم اور بھی گنا دوں' اس گھاٹی کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دین تو پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔ اس گھاٹی کا پہلا قدم **فَکُّ رَقَبَةٍ** ہے۔

غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے وسیع میدان

قرآن نے رقبۃ جو بتایا ہے وہ یہی نہیں ہے کہ تمہارے ہاں کے جو غلام ہیں انہیں رہا کرو۔ عزیزانِ من! وہ کہتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی قوم کا کوئی غلام ہے' اس کو آزاد کرانا اس جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ اسے **فَکُّ رَقَبَةٍ** کہا ہے یعنی غلامی کو Abolish (ختم) کرنا۔ ابتدا تو اپنے گھر سے ہوگی۔ یہ نہیں کہا کہ تمہارے ہاں کے جو غلام ہیں ان کو آزاد کرو۔ یہ تو دین کا پہلا قدم ہے۔ مومن نے تو دنیا سے غلامی کو ختم کرنا ہے اور میں اس کے بعد آگے بڑھوں گا کہ غلامی کی وہی ایک نوعیت جو اس زمانے میں تھی' آج وہی نہیں رہی۔ اُس زمانے کی غلامی (Slavery) کو پھر قوموں نے منسوخ بھی کیا ہے اور اس میں تو آپ جانتے ہیں کہ امریکہ میں غلامی کے خلاف کتنی جنگ ہوئی تھی۔ بڑی لمبی جنگیں ہوئیں اور اس کے بعد کہیں جا کر انہوں نے غلامی کو Abolish (ختم) کیا اور اب یو این او کے چارٹر میں بھی یہ چیز موجود ہے۔

انسان نے غلامی کی بیسیوں شکلیں ایجاد کر رکھی ہیں

جن قوموں نے غلامی کی اس شکل کو مٹایا ہے' انہوں نے ہی غلام بنانے کی اپنے ہاں اس سے بدتر غلامی کی بیسیوں شکلیں ایجاد کر رکھیں ہیں۔ وہاں تو پھر بھی غلام کو ہر وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ میں غلام ہوں' بھاگ جانے کی خواہش بیدار ہوتی تھی۔ انہوں نے ایسی لطیف سی شکلیں بنائی ہیں کہ اگر وہ پنجرے سے اس پرندے کو باہر نکالتا ہے تو یہ خود پنجرے کے اندر آتا ہے' پھر آکر چونچیں مارتا ہے اور اگر کوئی نہیں پکڑتا تو آوازیں دیتا ہے کہ اندھے نظر نہیں آتا' میں یہاں بیٹھا ہوں' تجھے نظر نہیں آتا' پکڑ مجھے۔

مذہب کے بالمقابل دین: پیغامِ موت ہے ہر نوعِ غلامی کے لیے

عزیزانِ من! قرآن نے فَکُّ رَقَبَۃٍ کہا اور اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں یوں ہے: ''موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے''۔ دین کی گھاٹی کا یہ پہلا قدم فَکُّ رَقَبَۃٍ ہے۔ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑے ہو کر بول رہا ہے۔ ذہن میں آتا تھا کہ اگر مذہب والے سے پوچھتے کہ صاحب! دین کا پہلا رکن کیا ہے' تو آپ کو پتہ ہے کہ وہ کیا بتاتا؟ وہ تو اسلام کے پانچ ارکان بتائے گا۔ قرآن حکیم تو پہلا رکن فَکُّ رَقَبَۃٍ بتا رہا ہے اور وہ اس لیے کہ دین تو انسانیت کی آزادی کے لیے آیا تھا۔ اس فَکُّ رَقَبَۃٍ (90:13) کے بعد دین کا اگلا قدم سن لیجیے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ (90:14) معاشرے میں اگر کسی وقت بھی کھانے پینے کی چیزوں کی کچھ تنگی پیدا ہو جائے تو دین کا اگلا قدم یہ ہے کہ تم ان لوگوں کے رزق کا' ان کی معیشت کا' انتظام کرو کہ جو خود اپنا انتظام نہیں کر سکتے تاکہ کوئی بھوکا نہ سونے پائے۔ یہ دوسرا قدم ہے۔

عزیزانِ من! مجھے نماز روزے کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ میں تو قرآن کی آیات پیش کر رہا ہوں۔ جو آپ کو دین کی گھاٹیاں بتا رہا ہے کیونکہ یہی تو دین کی گھاٹیاں اور منازل ہیں۔ میں پھر عرض کر دوں' یہ نہ کہیے گا کہ میں اہمیت کے اعتبار سے ان کا انکار کر رہا ہوں۔ یہ جو نفل پڑھ لینا ہے' اس میں تو گھاٹی چڑھنے والی کوئی بات نہیں اور ہمارے ہاں کے جو یہ کاروباری ہیں وہ تو جب نذر مانگتے ہیں' تو عام طور پہ تو نذر ہی یہ ہوتی ہے کہ ''میں دیگ پکا کے کھوا دیواں گا۔ میں اپنے غریباں دا اے کراں گا۔ میں تے چادر چڑھاواں گا اور اگر پیسیوں کا معاملہ ہوئے' تے پھر او کیندے نیں پئی: یا اللہ! مینوں اے پیسے مل جان تے میں سو نفل پڑھانگا' پیسا ای نہ لگے۔ اونوں وی ٹھینگاں وکھاندے نیں [1]۔ اس نے تو ان چیزوں کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ لہٰذا فَکُّ رَقَبَۃٍ (90:13) پہلا قدم ہے کہ کوئی محتاج نہ رہے۔

---

[1] میں دیگ خیرات کروں گا۔ میں ان غریبوں کے لیے یہ کچھ کرونگا۔ میں تو چادر چڑھاؤں گا۔ اور اگر پیسوں کا معاملہ درپیش ہو تو پھر یہ کہیں گے: یا اللہ! اگر مجھے یہ پیسے مل جائیں تو سو نفل ادا کروں گا (تاکہ ان پر) کوئی رقم ہی خرچ نہ ہو۔ اُسے بھی ٹرخا دیتے ہیں۔

دینی معاشرے میں کوئی شخص تنہائی محسوس نہیں کرے گا

ہوتا یہ ہے کہ جس دور میں مستبد قوتیں، رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے کر عوام کے لیے بھوک اور درماندگی کو عام کر دیں تو معاشرہ میں ان لوگوں کے رزق کے لیے ایک دوسرا قدم اٹھائیں، عزیزانِ من! اور وہ دوسرا قدم ہے: یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ (90:15). میں تو جب ان آیات کے دو دو الفاظ پہ غور کرتا ہوں تو پوچھو نہیں کہ میری کیا کیفیت ہوتی ہے۔ عربی زبان میں یتیم کے معنی یہی نہیں ہوتا کہ جس بچے کے ماں باپ جب وہ چھوٹے چھوٹے ہوں تو مر جائیں۔ یتیم کے معنی ہوتا ہے "جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے"۔ قرآن کہتا ہے: یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ (90:15). وہ جو اتنی آبادی کے اندر رہتا ہوا بھی، اپنے آپ کو یتیم یعنی تنہا محسوس کرتا ہے، اس کی تنہائی کا دُور کرنا دین کا فریضہ ہے۔ یہ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ لا ریب یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کی مثالوں کے لیے تو کہیں باہر جا کر ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں۔ معاشرہ تو اتنا وسیع ہے۔ اس کے باوجود کیا ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو یہاں تنہا محسوس نہیں کرتا؟ اس لیے کہا کہ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ❶ (90:15). ہم میں سے آج جس پہ مصیبت پڑتی ہے تو اس مصیبت زدہ کو Exploit (سلب ونہب) کرنے والے تو بیسیوں مل جائیں گے لیکن اس کی تنہائی میں آ کر یہ کہنے والا کوئی نہیں ہے کہ تم تنہا نہیں ہو، کوئی بات نہیں، گھبراؤ نہیں۔

دین کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ جو دوسرے انسانوں سے قریب ہوتے ہوئے بھی تنہا محسوس کرے یہ ان کے رزق کی فکر کرے تاکہ وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ پائیں۔ اور یہ کہا کہ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ (90:16) ایسا شخص جو بیچارہ دن بھر دھول اور مٹی کے اندر لپٹا رہے، اتنی محنت اور مشقت کرے کہ سر سے پاؤں تک مٹی مٹی ہو جائے اور اس کے باوجود مسکین رہے، یہ اس کی روٹی کا انتظام کرے۔ قرآن صرف Work provide (کام مہیا) کرنا ہی نہیں بتاتا۔ دین کا تقاضا یہ ہے کہ کام تو ہر ایک کو کرنا ہوگا۔ وہ تو اس کا سامانِ زیست Provide (مہیا) کرنا ہے۔ یہاں ذا مقربۃ اور ذا متربۃ دو دو لفظ ہیں، عزیزانِ من! یعنی یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ اور پھر اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ (90:15-16) وہی مسکین نہیں ہے جو معذور رہے، کام کاج کرنے کے قابل نہیں ہے، بیچارہ چارپائی پہ پڑا رہتا ہے۔ یہ وہ ہے جو صبح سے شام تک، مشقت کرتا ہے پھر بھی مسکین ہی رہتا ہے۔ یہ ہے ذَامَتۡرَبَۃٍ میں سمجھتا ہوں کہ ذَامَتۡرَبَۃٍ کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو یوں ہے کہ آپ سرتوں پیراں تک، مٹی مٹی، کسے مزدوراں نوں ویکھو تے سہی، شام دے قریب، حالت کی ہوئی ہوندی اے؟ ❷

---

❶ وہ نظام ان لوگوں کے رزق کی فکر کرے جو معاشرہ میں ہزارہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص422)

❷ آپ شام کو کسی مزدور کو سر سے پاؤں تک مٹی میں لتھڑے ہوئے دیکھو تو سہی کہ اسکی کیا حالت ہو چکی ہوتی ہے؟

یہ ذَا مَتْرَبَةٍ (90:16) ہے اور اس کے باوجود جو کچھ اس کو دیا جاتا ہے اس سے وہ مسکین ہی رہتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے دین کی گھاٹی کا پہلا قدم فَكُّ رَقَبَةٍ (90:13) بتایا یعنی غلاموں کو آزاد کرنا۔ سارے قرآن میں جیسا کہ میں نے کہا ہے جہاں جہاں آپ دیکھیں گے وہ کہتا ہے کہ سب سے بڑی نیکی ہی یہ ہے کہ ان کے رزق کا انتظام کرو۔

خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی

اللہ نے فرمایا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے مشرق کی طرف منہ کر لیا یا مغرب کی طرف۔ ہمارے ہاں جو ساری شریعت ہے وہ یہیں سمٹ کر آ گئی، جبکہ نیکی یہ ہے کہ مال کی کشش اور محبت کے باوجود اسے انسانیت کی بہبود کے لیے خرچ کرے (2:177)۔ میں اس تفصیل میں نہیں جا رہا کہ کس کس کام کے لیے خرچ کریں۔ جہاں کہیں بھی کوئی غلام ہو، محکوم ہو، اس کو غلامی سے آزاد کرنے کے لیے خرچ کرو۔ یہ نیکی ہے۔ آپ سوچیے کہ جو قرآن یہ بات کہے گا کہ تمہارے ہاں جتنے غلام ہیں سب سے پہلے تو ان کو بتدریج آزاد کرو تا کہ معاشرے کا توازن نہ بگڑے۔ تو اسی بنا پر آئندہ کے لیے اس نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

غلام بنانے اور آزاد کرانے کے چکر میں ثواب کے حصول کا طریق

غلام تو کسی کو بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ جو اس وقت غلام ہیں، انہیں رفتہ رفتہ، بتدریج، آزاد کرتے جاؤ اور دنیا میں جہاں کہیں غلامی ہے، اس کو Abolish (ختم) کرنا، تمہارا فریضہ ہو گیا، چہ جائیکہ قرآن کسی سے یہ کہے کہ تم جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا کرو، اور مردوں کو غلام بنایا کرو یعنی کیا یہ کرو کہ ایک طرف ان کو غلام بنا کے لایا کرو، پھر قرآن کے یہ جو احکام ہیں، ثواب لوٹنے کے لیے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے، ان کو آزاد کیا کرو۔ اتنے میں کوئی اور جنگ چھیڑ لیا کرو، پھر وہاں سے غلام اور لونڈیاں لے آیا کرو اور پھر ثواب کی خاطر انہیں رہا کیا کرو۔ اندازہ لگائیے آپ کے ہاں، عزیزانِ من! شریعت کی یہ ایسی بحثیں ہیں جن پہ سب متفق ہو گئے ہیں۔

غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مودودیؒ کا تفسیری بیان

یہ عجیب بات ہے کہ جس چیز پر یہ سب متفق ہوتے ہیں اس کے متعلق ہمارے مولانا اسلم جیراجپوریؒ (1879-1955) نے فرمایا تھا کہ تاریخ میں آپ دیکھیے کہ جب بھی یہ مختلف فرقوں کے لوگ متفق ہوں گے تو باطل پہ متفق ہوں گے۔ یہ اس پہ متفق ہیں کہ جنگ کے قیدی مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاتا ہے۔ مردوں والی بات تو بہت دبے ہوئے کہتے ہیں، لونڈیوں کی بات بہت اچھل

اچھل کر کہتے ہیں۔ پوری تفسیر [1] مودودیؒ (1979-1903) صاحب کی تشریحاً بھری پڑی ہے: جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے' سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے' ان کے ساتھ نکاح کی ضرورت بھی نہیں' ان کی تعداد بھی متعین نہیں۔ بیویوں کی تو پھر بھی متعین کر لی ہے: چار بیویاں۔ ان کی تو تعداد بھی متعین نہیں ہے۔ کہا ہے کہ انہیں وہ سپاہی' میری بچیاں اور بیٹیاں معاف کریں' میں کیا کروں' انہیں وہ سپاہی اپنے استعمال میں لائیں گے۔ انسان کے لیے یہ الفاظ بتا رہے ہیں۔ ان کی نگاہ میں کیا قدر ہے عورت کی۔ یہ اسے Commodity (تجارتی مال) سمجھتے ہیں اور جب جی بھر جائے تو کسی دوسرے کو تحفۃً بھی دے سکتا ہے اور فروخت بھی کر سکتا ہے۔ آج یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے جس کے ترجمے دنیا میں دوسری زبانوں میں ہو رہے ہیں۔

غلامی کے سلسلہ میں یو این او کا چارٹر ہمیں قبول نہیں

یو این او (UNO) میں جب یہ چارٹر پیش ہوا تو اس چارٹر میں بنیادی حقوقِ انسانی (Basic Human Rights) کے سلسلہ میں لکھا تھا: Abolition of Slavery یعنی غلامی کا انسداد۔ انہوں نے یہ بھی اپنے چارٹر میں لکھا تھا کہ اسے جرم قرار دینا چاہیے۔ یہ قانوناً جائز نہیں قرار دینا چاہیے۔ یو این او کی اس میٹنگ' محفل' میں جہاں یہ چارٹر Discuss (زیر بحث) ہو رہا تھا' نام نہیں لینا چاہتا آپ کے مسلمانوں کے ایک ممتاز ترین...... نمائندے نے وہاں کہا تھا کہ ہم اس چارٹر پہ دستخط نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف جاتا ہے۔ دنیا بھر کے کفار اس کے اوپر دستخط کر رہے تھے۔ اسلام کا نمائندہ یہ کہہ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کے تقاضوں نے پھر اپنے ہاں یہ کرنے پہ انکو بھی مجبور کر دیا اور یہ پرانی بات ہے۔ اب یو این او میں کہاں جائیے۔

مملکتِ پاکستان میں لونڈیوں کے لیے مطالبہ

آپ کے سامنے یہ آپ کی سنٹرل پارلیمنٹ اسمبلی موجود ہے۔ 1973ء کے فروری کے سیشن میں جب آپ کا یہ آئین Discuss (زیر بحث) ہو رہا تھا تو اس میں بھی غلامی کا انسداد ایک شق ہے' اس میں آپ کی جمعیت العلماء کے ایک رکن مولوی نعمت اللہ صاحب نے وہاں کھڑے ہو کر یہ تقریر کی تھی کہ اگر آپ لوگ اس قسم کا یہ بل دھاندلی سے پاس کرنا ہی چاہتے ہیں تو کم از کم اتنی اجازت دیدی جائے کہ ایک لونڈی تو رکھ سکیں۔ اسمبلی میں آپ کے ہاں تقریر موجود ہے۔ یہ کل [2] کی بات ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

[2] 1973ء کے فروری کے سنٹرل پارلیمنٹ اسمبلی کے سیشن میں۔

عزیزانِ من! یہ آپ کے ہاں تفسیر میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ آپ کے ہاں علما کی طرف سے ڈیمانڈ ہو رہی ہے' حالانکہ عربی زبان کا مقتدی بھی جانتا ہے کہ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ کا ترجمہ ہوتا ہے کہ ''جس کے دائیں ہاتھ مالک ہو جائیں''۔ یہ عربی کا ایک محاورہ ہے۔ جہاں جہاں قرآن میں ملکت کا یہ لفظ آیا ہے۔ یہ Past Tense (زمانہ ماضی) میں آیا ہے' ماضی کے صیغے میں آیا ہے کہ جب پہلے سے ان کے ہاں کوئی غلام اور لونڈیاں بن چکے ہوں' یہ ان کے متعلق ہے جو کہا جا رہا ہے۔ ہر جگہ یہ کہا گیا ہے۔ آئندہ کے لیے تو اس نے ایک آیت میں کہہ دیا کہ تم غلام اور لونڈیاں بنا ہی نہیں سکتے۔ اب قرآنِ کریم میں کہا گیا تھا کہ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ (23:5) مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قوم اپنی جنسی توانائیوں کو Preserve (محفوظ) رکھے گی تا کہ دنیا میں اس قوم کے تمدن اور تہذیب کے یہ دعوے بلندی تک پہنچ جائیں۔ جسے یہ کہا گیا تھا' آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ جی' ٹھیک ہے عصمت کی حفاظت ہم کرتے ہیں لیکن چونکہ قرآن نے کہہ دیا ہے کہ بیویوں کے اوپر اور بیویاں لائی جا سکتی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کی حد و شمار ہی نہیں' یہ تو پوری کی پوری لونڈیاں ہیں۔

آپ کے ہاں کی تاریخ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ جن سلاطین کو' جنہیں آپ ''خلفا'' کہتے ہیں جیسے خلفائے عباسیہ وغیرہ (132-656AH بمطابق 750-1258AD)' ان میں سے بھی وہ جنہیں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے متقی و پرہیز گار تھے' مثلاً ہارون الرشید (170-193AH بمطابق 786-809AD) اور مامون الرشید (170-208AH بمطابق 786-809AD) ان میں سے ایک ایک کے محل میں تین تین ہزار لونڈیاں تھیں۔ اب آپ سوچیے کہ جنسی توانائی کی حفاظت کرنے کی تاکید جس قوم کو کی گئی تھی' اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو شریعت کی رو سے اپنے ہاں جائز' حلال اور طیب قرار دے رہی ہے' تو کیا اس سے جنسی توانائی محفوظ رہے گی؟

جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھنے کی بجائے تین تین ہزار لونڈیاں

آپ ایک بار پھر انون (J.D.Unwin) ہی کے الفاظ پر آ جائیے اور یہاں آ کر تو پوچھو نہیں کہ وہ کیا کچھ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قوم کی کیفیت یہ ہو کہ وہ عملاً جنسی توانائی کو محفوظ نہ رکھے' سنیے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس قوم میں علم و بصیرت تو ہوتی ہے' لیکن وہ اپنے معاملات کو طے کرنے کے لیے کبھی علم اور بصیرت سے کام نہیں لیتی۔ ❶ یہ جنسی توانائی ایک شدید ترین جذبہ ہوتا ہے۔ جب اس کو

---

❶ ڈاکٹر انون (Unwin) کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

The People possess the power of reason, but they do not apply it to the world of their experience. Thus they do not inquire into the causes of things; they accept without question that assembly of activities which we call Nature(P.345).

اپنے اعصاب پہ سوار کرلیا جائے تو اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں وہ ساری کی ساری قوم ہی جذباتی ہوجاتی ہے۔آپ کے ہاں مسلمان کی قوم اس قدر جذباتی قوم ہوگئی ہوئی ہے۔آپ ہر طرف دیکھتے ہیں کہ کسی کے قریب جایئے وہ شاٹ (Shot) مارتا ہے اور پھر ان کو بھڑکانے والی وہ شعلہ افزا تقریریں ہیں جو آپ کے ہاں کی جاتی ہیں۔سب سے بڑا لیڈر وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ مشتعل کرنے والی تقریر کرسکتا ہو۔قوم پہلے ہی بالکل گرمیوں کے زمانے کا سوکھا ہوا ایندھن ہے اور اب اس پہ پٹرول لگا کر ذرا سی ایک دیا سلائی دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آج مسلمان قوم کی حالت اور توہم پرستی کا نتیجہ

یہ کچھ ہوجانے کے بعد پھر انون (Unwin) کہتا ہے کہ اُسمیں علم وبصیرت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات کے طے کرنے میں کبھی علم وبصیرت سے کام نہیں لیتی۔وہ واقعات کے اسباب وعلل یعنی Causes and Effects کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، آنکھیں بند کرکے اسی پر چلتی جاتی ہے، ہر معاملے میں توہم پرستی ان کے ہاں مذہب بن جاتی ہے۔ابتدا میں وہ دم درود، تعویذ گنڈے، دھاگے، کی طرف آجاتی ہے اور جب انہیں یہ تعویذ دینے والے مرجاتے ہیں تو ان کی قبروں پہ جاکر اپنے معاملات کا حل تلاش کرتے ہیں۔عزیزانِ من! سوچیے یہ کون لکھ رہا ہے۔ اُس نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے غیر مہذب Primitive (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس زاویۂ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکا کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا، ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے۔اس طرح دنیا کے قبائل، مہذب اور غیر مہذب، کی زندگیوں کا ذاتی مطالعہ کیا ہے۔ان پر تحقیق کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ

اس قسم کے معتقدات، اکابر پرستی، قبر پرستی، تعویذ پرستی، اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں اور زمانے کا امتزاج بھی ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا:

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

وہ کہتا ہے کہ زمانہ کہیں سے کہیں چلا جائے، وہ قوم اس معاشرے میں، اپنی اسی روشِ کہن پہ چلتی چلی جاتی ہے۔کیا بات ہے! عزیزانِ من! یہ کچھ کوئی قرآنی مومن نہیں لکھ رہا، بلکہ ان کی اصطلاح میں ایک کافر لکھ رہا ہے کہ ''اس معاشرے میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی

خواہشات کو پورا کرتے ہیں' اور مر جاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں' اسی طرح جیسے ایک حیوان نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے''۔ ❶ سوچتے ہیں یہ لوگ' جنہوں نے جنسی توانائی کے Preserve (محفوظ) کرنے کی تحقیق کی ہے' وہ کیسے درخشاں نظر آتے ہیں! وہ بتاتا ہے کہ اگر اس جنسی توانائی کو بغیر Preserve (محفوظ) کیے یونہی بہا دیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ آپ کے ہاں تو کبھی اس پہلو پر تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی' لیکن اگر اس طرف اس پہلو پر تحقیق ہو بھی' تو کوئی اس پر کبھی آپ کے ہاں توجہ ہی نہیں دیگا۔

قوم کی جذباتی کیفیت کی وجۂ جواز

برادران عزیز! یہ قوم جو اتنی زیادہ جذباتی ہوگئی ہے اس کا ایک بنیادی سبب اس جنسی توانائیوں کا ضائع کرنا ہے اور جسے انہوں نے خود فریبی سے یعنی اپنے آپ کو فریب میں رکھ کر کہہ دیا ہے کہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے' دراصل یہ اسی کا ہی فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ قوم یکسر جذباتی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی معاملے کو Rationally (عقل و فہم و بصیرت سے) نہ سوچتی سمجھتی ہے' نہ اس کا حل دریافت کرتی ہے۔ یا تو وہ اشتعال میں آ کر قانون شکنی پہ اترتی ہے اور اگر وہ Passive (غیر فعال) ہوتی ہے تو گنڈے' تعویذ' قبر پرستی' اکابر پرستی' پر چل پڑتی ہے۔

عزیزانِ من! اب اسکے بعد آپ سوچیے کہ قرآن نے کیا کہا کہ کون ہے وہ قوم جسے ہم نے مومن کہا ہے' جن کے اعمال' جن کے کام' جن کی جدوجہد' جن کی کوششیں' نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں' ثمر بار ہو سکتی ہیں' جن کی کھیتیاں پروان چڑھ سکتی ہیں؟ وہ کہ جو اپنی جنسی توانائی کو Preserve (محفوظ) رکھتے ہیں اور وہ اسے صرف تولید کے مقصد کے لیے صَرف کرتے ہیں۔ لہٰذا قرآن حکیم نے اس مقصد کے لیے اس زمانے کی جماعتِ مومنین کو مخاطب کیا کیونکہ معاشرے میں اس زمانے میں ابھی غلام اور لونڈیاں موجود تھے۔ قرآن نے ان کا ذکر اس انداز سے کیا اور ہر مقام پہ یہ کہا کہ ان کو تو رفتہ رفتہ آزاد کرتے چلے جانا۔

ازواج کے متعلق قرآن نے وحدتِ زوج کے اصول کو قانوناً بنیادی طور پہ رکھا اور اسمیں یہ ایک کلیہ مستثنیٰ رکھا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور پھر یہ بھی رکھا کہ اس میں بھی ہر فرد کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے شادیاں کرتا چلا جائے۔ اس کے لیے بھی کہا

---

❶ ڈاکٹر انون (Unwin) کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

In such a society human beings are born; they satisfy their desires; they die. And, when their corpses have been disposed of, they are forgotton. (P.346)

ان تمام باتوں کے لیے ڈاکٹر انون کی کتاب کے صفحات 346-345 از حد کارآمد ہیں۔ وہ ان توہمات کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

کہ معاشرہ بیٹھ کر یہ فیصلہ کرے گا کہ حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ جہاں اس کی گنجائش ہوسکتی ہے تا کہ عورت کو Protection (حفاظت) دے دی جائے۔ لہٰذا وہاں بھی Protection (حفاظت) دینے کا سوال ہے۔ یہاں آپ کی شریعت میں یہ چیز عام ہوتی ہے اور قرآن نے جو کہا کہ جو بھی اس کے علاوہ کوئی دوسری شکل اختیار کرے خواہ وہ اس کا نام جائز شریعت کا قانون رکھ لے' تو وہ اس توانائی کو ضائع کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے کہا کہ **اُولٰٓئِکَ هُمُ الْعَادُوْنَ**[1] (23:7)۔ یہاں لفظ **الْعَادُوْنَ** میں ساری بات کہہ دی کہ یہ قوم سرکش ہوجائے گی' بیباک ہوجائے گی' یہ قوم حدود فراموش ہوجائے گی' یہ کناروں کو توڑ دے گی' تو اس قوم کا دریا دریا نہیں رہے گا بلکہ سیلاب بن جائے گا۔

عصمت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا انداز باریک بینی

عزیزانِ من! یہاں جنسی توانائی کی حفاظت آیا ہے۔ دراصل قرآن کریم میں ''فروج'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کی اہمیت آج کے دور کے سائنٹسٹ (سائنسدان)' سوشیالوجسٹ (ماہر سماجیات)' یا سائیکالوجسٹ (ماہر نفسیات) کی جو تحقیقات ہیں' ان سے جا کر پوچھیے کہ قرآن اس باب میں کیا کہہ گیا تھا۔ یہ وہی ہے جسے قرآن کریم نے ''حافظون'' اور ''محصنین'' کہا ہے۔ قرآن کی باریکیوں کی بات درمیان میں آجاتی ہے۔ عزیزانِ من! اسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا کروں! ذرا سا غور طلب ہے۔ میں نے کہا کہ ایک لفظ ''احصان'' بھی ہے۔ وہ مولوی کے الفاظ میں حلوے والی ح سے ہے' چوہدری جی کے الفاظ میں حقہ والی ح سے ہے۔ یہ وہی ہے جسے وہ ''ت ث ج'' والی ح کہتے ہیں اور آگے ص ہے۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ ایک تو ''احسان'' ہوتا ہے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے ''احصان'' کا لفظ کہا ہے یعنی عصمت کو محفوظ رکھ لینا۔ یہ اس کے لیے لفظ ہے۔ اس طرح ''محصنین'' مردوں کے لیے' محصنٰت ص کے زیر کے ساتھ' عورتوں کے لیے ہے اور ایک ہے محصنٰت' ص کے زبر کے ساتھ۔ کہیں یہ ص زیر کے ساتھ آیا ہے' کہیں یہی ص زبر کے ساتھ آیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا اور یہ عربی زبان پتہ نہیں کیا زبان ہے! عام طور پہ' ان کے ہاں یہ جو ''محصِنۃ'' ہے اس کے معنی ہیں ''حفاظت کرنے والی'' اور وہ جو ''محصَنۃ'' ص کے اوپر جو زبر ہے' اس کے معنی ہیں ''جس کی عِصمت کی حفاظت کی گئی ہو''۔ یہ جو وہ محصَنۃ تھی' وہ شادی شدہ باعصمت عورت ہے۔ یہ لفظ اس کے لیے بولتے تھے۔ اس کے برعکس جو محصِنۃ ہے' یہ جو غیر شادی شدہ (Un-married) یعنی کنواری ہوتی تھی' اس کے لیے بولتے تھے۔

---

[1] وہ قانون شکنی ہوگی اور حدود خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے) (24:2) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔744)

ایک زیر زبر میں' عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ قرآن نے کیا بات بتادی ہے۔ غیر شادی لڑکی کہا' وہ اپنی عصمت کی حفاظت آپ کرتی ہے اور جب وہ شادی شدہ ہو جاتی ہے تو اس کی جو شادی ہے وہ اس کی حفاظت کر دیتی ہے' وہ مُحصَن ہو جاتی ہے۔ وہ حفاظت کی گئی والی بات آپ کی سمجھ میں یوں آئے گی۔ آپ اپنے ہاں کی یا ہمارے ہاں کی لڑکیاں جن کے ہاں ابھی عِصمت کا یہ تصور ہے' آپ دیکھیں گے کہ جو (Un-married) غیر شادی شدہ لڑکیاں ہیں' وہ تنہا کبھی مارکیٹ تک نہیں جاتیں۔ خواہ اتنے سے آپ کے چھوٹے بھائی کو' بچے کو' ساتھ کیوں نہ لے جائیں' کبھی تنہا نہیں جاتی۔ اس لڑکی کی شادی کر دیجیے تو شادی کے بعد اس کے اندر خود اتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تنہا چلی جاتی ہے۔ یہ عورت پر Psychological Effect (نفسیاتی اثر) ہوتا ہے۔ جو شادی شدہ عورت ہے اس کے اندر یہ ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ میری عصمت محفوظ ہے' کوئی میری طرف نگاہِ بد سے نہیں دیکھ سکتا' کوئی آنکھ اٹھا نہیں سکتا یعنی کچھ اندر تبدیلی ہوتی ہے۔ ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ مرداں نوں تے ساڈے احساس ای اے نہیں ہوسکدا ہیگا کہ محفوظ تے غیر محفوظ ہوندی کی ہیگی اے۔ اے تے سارے ای لُٹیرے نیں۔ [1] ہمارے ہاں کی عورتوں' لڑکیوں میں ابھی یہ بات ہے' بیٹیوں میں ہے۔ یہ جو غیر شادی شدہ بچی ہے وہ اپنے آپ کو عِصمت کے اعتبار سے غیر محفوظ سمجھتی ہے' اس لیے وہ اپنی حفاظت کا خود انتظام کرتی ہے۔ اس کے لیے محصنۃ کا لفظ آیا ہے۔ اور جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر مُحصَنت ہوتی ہے یعنی شادی نے اس کی عِصمت کی حفاظت کر دی۔

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا تھا کہ عربی زبان کو دیکھیے اور قرآن کے الفاظ کو دیکھیے۔ بہر حال بات جنسی توانائیوں کے Preserve (محفوظ) رکھنے کی تھی۔ اس کا ایک ہی مصرف تھا اور وہ ہے تولید۔ حیوانات کے اندر فطرت نے خود اسکی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ وہ جو نر حیوان ہوتا ہے' وہ مارتا بھی کیوں نہ ہو' فطرت نے خود اس کے ہاں وہ Lasers (روشنی کے تابش) لگا رکھے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اس کا استعمال ہی نہیں کر سکتا۔ وہ تو جب فطرت کا اشارہ ہوتا ہے' جب Mating Season (جنسی اختلاط کا وقت) آتا ہے' صرف اس وقت یہ چیز بیدار ہوتی ہے اور وہ اس کو صرف Creative Purpose (تخلیقی مقصد) کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی وہی جسے میں نے Procreation (تولید) کہا تھا۔ جب فطرت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں' فطرت یہ پھاٹک نہیں کھولتی' اس کو جھنڈی نہیں دکھاتی' وہ سارا سال گائے اور بیل ایک گلے (Herd) کے اندر چرتے پھرتے رہتے ہیں' کوئی بیل گائے کو نظرِ بد سے دیکھتا ہی نہیں' نہ وہ اس کو آنکھ مارتی ہے۔ وہاں فطرت ان کا انتظام کرتی ہے کیونکہ انہیں صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں بنایا۔ صرف انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے تو اب پوچھو نہیں کہ ان کے اوپر کیا ذمہ داریاں عائد کیں۔ اس کے برعکس وہ گائے وہاں کے اشارے کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کو اس

---

[1] ہمارے ہاں کے مردوں میں تو یہ احساس ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ محفوظ غیر محفوظ ہونا ہے کیا؟ یہ تمام ہی لُٹیرے ہیں۔

پہ اختیار ہی نہیں ہوتا۔ اس کی توانائیاں محفوظ رہتی ہیں۔ نقص یہ ہے کہ وہ حیوانات ان توانائیوں کو تخلیقی Purpose (مقصد) کے لیے استعمال نہیں کر سکتے کہ تخلیق حیوانات کا منصب نہیں ہے' یہ انسان میں آ کر ہونا تھا اور یہ بڑی حقیقت تھی جسے غالب [1] اپنے انداز میں بیان کر جاتا ہے۔ ''چاک مت کر جیبِ' بے ایامِ گل''۔ اس کا بڑا ہی حسین انداز ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ ہے کہ بہار کا موسم آتا ہے تو پھر ان کا جنون ابھر آتا ہے۔ چاک دامانی کے معنی یہ ہیں۔

یہ عرب زبان کے لحاظ سے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ان عربوں کے ہاں جو یہ لفظ ہے' جسے اب ہم ''فرج'' کہتے ہیں' عربوں کے ہاں چاک دامانی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس طرح سے اس کے یہ معنی' جو کچھ ہم شرمگاہ وغیرہ کرتے ہیں' وہ لوگ بھی حالانکہ وہ جاہل بدو تھے' وہ ایمائیت (Suggestiveness) اور اشارے کے اعتبار سے ''چاک دامانی کہتے تھے''۔ اس لفظ کو غالب (1869-1797) نے وہیں سے لیا۔

چاک مت کر جیبِ' بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

تو جنسی توانائی کا' عزیزانِ من! یہ مصرف قرآن نے بتایا ہے۔ یہ اس کی تاکید تھی۔ یہ اس کی اہمیت تھی اور پھر ہمارے ہاں جب یہ چیز اربابِ شریعت کے ہاں آ گئی تو پھر آپ نے دیکھ لیا کہ وہ کیا کیا دروازے کھلے ہیں! آیات تو آج 3 ہی آئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہ سوال اتنا اہم تھا جس کا مکمل جواب آ گیا۔

سورۃ المؤمنون کی آیت 7 تک آ گئے' 8 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797)

تیسرا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 8 تا 11)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱

عزیزانِ من! آج اپریل 1977ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 8 سے ہو رہا ہے: (23:8)۔

گزشتہ سے پیوستہ

اس آیت کے آغاز سے ہی مومنین کی خصوصیات بتائی جا رہی ہیں۔ اس سورۃ کا آغاز تو اس سے ہوا تھا کہ **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ** (23:1) وہ مومن ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں، جن کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں، اوراس کے بعد بتایا تھا کہ ان کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔ پہلی پانچ آیات میں ان خصوصیات کا جامع طور پر ذکر تھا۔ جیسا کہ قرآن کا انداز ہے، بتایا تھا کہ **الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ** (23:2) وہ اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے ہیں لیکن میکانکی طور پر یا رسمی طور پر نہیں، محض قانون کی شق پورا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے دل کے جھکاؤ کے ساتھ۔ یعنی یہ چیز ان کے اپنے دل کا ارادہ اور خواہش ہو جاتی ہے، اس کا تقاضا ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ان فرائض کو پورا کرتے ہیں۔ پھر کہا تھا کہ **وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ** (23:3)۔ لغو سے اعراض برتنے کے سلسلہ میں، میں ان تمام امور کی تفصیل پہلے درسوں میں بتا چکا ہوں، اس لیے ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اگلی دو آیات میں کہا تھا کہ **وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ** (23:4-5)۔ وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جس سے تمام نوعِ انسانی کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے اور اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

رَاعُوْنَ (23:8)۔اس آیت کا عام ترجمہ' عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عہد یا معاہدہ یا وعدے کی پاسداری کرتے ہیں اور امانات کی حفاظت کرتے ہیں۔اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ کسی سے جب کوئی وعدہ کیا جائے تو اس وعدے کا ایفا کیا جائے' اسے نبھایا جائے۔کوئی شخص' اگر کوئی امانت تمہارے پاس رکھ جائے' تو اس امانت کی حفاظت کی جائے' اس میں خیانت نہ کی جائے۔ٹھیک ہے انفرادی طور پر یہ چیزیں بھی ہونی چاہئیں اور معاشرے کے لیے وعدے کی پابندی' امانت میں خیانت نہ کرنا ضروری ہیں لیکن بات اس سے کہیں زیادہ گہری ہے۔آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کی جو اخلاق کی پابندیاں قرآن نے بتائی ہیں' ان کے لیے کہا جائے گا کہ یہ تو دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں' انہیں تو Universal Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاق) کہتے ہیں مثلاً یہ چیز کہ جھوٹ نہ بولو' سچ بولو' چوری نہ کرو' زنا نہ کرو' دغا نہ دو' فریب نہ کرو' دھاندلی نہ کرو۔یہ چیزیں ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں' تمام مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔مذاہب چھوڑ کر' جتنی بھی مہذب سوسائٹیاں کہلاتی ہیں' ان سب میں یہ پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ وحشی قبائل میں بھی ان میں سے بہت سی چیزیں پائی جاتی ہیں۔انہیں Universal Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاق) کہا جاتا ہے۔

یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی' ورنہ میں یہ بتاتا کہ یہ جو اس قسم کی خصوصیات یا ضوابطہ اخلاق ہیں' Originally (ابتداً) یہ بھی وحی پر ہی مبنی تھے۔وحی کا رشتہ' رابطہ اور نسبت تو پھر گم ہوگئی مگر یہ چیزیں باقی رہ گئیں۔یہ عالمگیر اس لیے ہیں کہ قرآن کی رو سے دنیا کی ہر قوم میں' ہر زمانے میں' خدا کی طرف سے نبی آتے رہے' وحی کی رو سے وہ ان ضوابط کو عام کرتے رہے اور وحی کی تعلیم میں بعد میں بہت سی آمیزش ہوئی' تحریف ہوئی لیکن یہ جو بنیادی ضابطے یعنی اخلاق کی چیزیں تھیں' یہ ان اقوام میں' ان معاشروں میں باقی رہیں اور یہ متوارث چلی آرہی ہیں۔اس اعتبار سے تو یہ وہی ہیں جو عام طور پہ پائی جاتی ہیں مثلاً اگر کہا جائے کہ قرآن نے کہا کہ جھوٹ نہ بولو' تو کہا جائے گا کہ یہ چیز تو ساری دنیا میں موجود ہے۔قرآن بھی یہ کچھ کہتا ہے۔یہ جسے آپ عالمگیر اخلاق کا ضابطہ کہتے ہیں' قرآن بھی کہتا ہے کیونکہ وہ بھی تو وحی کی چیز ہے اور یہ وحی کی بات ہے اور ہونی چاہیے لیکن وہ اس سے آگے بھی جاتا ہے۔اس سے بھی آگے نہ جانے کا جو تصور تھا' وہ مولانا ابوالکلام آزاد [1] جو آج مرحوم ہو چکے' نے دیا [2] تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر

---

[1] احمد محی الدین ابوالکلام آزادؒ (1888-1958)

[2] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے:

Parwez G.A: Are All Religions the Same? (Tr. Prof. Dr.Manzoor-ul-Haque), Idara Tolu-e-Islam Regd,Lahore.

پائی جاتی ہیں۔ میں اس سے زیادہ نہیں کہتا کہ ان کے ذہن نے غلطی کھائی جو یہ کہا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں۔ وہ عالمگیر سچائیاں یہی تھیں' جو وحی نے دی تھیں اور جنہیں Universal Code of Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاق) کہا ہے۔ وہ تمام مذاہب میں ہی نہیں' بلکہ جہاں مذاہب نہیں ہیں' وہاں بھی یہ چیزیں ہیں۔ اگر انہی چیزوں کو Repeat (دہرانے) کرنے کے لیے قرآن آیا تھا تو یہ چیز کہ یہ ایک واحد منفرد مختص مخصوص غیر متبدل ابدی مکمل قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں ضابطہ حیات ہے تو یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور اگر یہ وہی ہے جو چند اخلاقی ضوابط ہیں' انہی کا اعادہ ہی صرف مقصود ہے' جن پہ میں زور دے رہا ہوں' تو یہ تو وہی چیز ہے' اس کے بعد اس سے آگے تو کچھ نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم' وحی کی بنا پر ایک عالمگیر ضابطہ حیات ہے

برادران عزیز! یہی وہ مقامات ہیں جہاں یہ چیزیں عالمگیر ضابطے کے طور پر آتی ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ دراصل قرآن تو اپنے ہاں خصوصیت کی بہت بڑی چیز بھی بیان کر گیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ بھی ان الفاظ پہ غور کیجیے' ذہن اس سے آگے جاتا ہی نہیں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عہد کی پابندی کرتے ہیں اور امانات میں خیانت نہیں کرتے۔ اس پر انسان مطمئن ہوتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ یہ بڑی اچھی خصوصیت ہے جس کے اندر بھی پیدا ہو جائے لیکن بات اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ انسانی تمدن کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جب سے تاریخ کا پہلا دور ہمارے سامنے آیا ہے' اس دَور سے یہ سوال وجہ پریشانی بنا رہا کہ قبائل کے معاشرے میں نظامِ حکومت کس قسم کا ہو' اور خدا کی وحی نے اس کے متعلق کیا کچھ کہا؟ وہ تو پہلی جتنی بھی وحی آئی تھی' وہ اب اپنی منزہ شکل میں کہیں باقی نہیں رہی' اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا چیز آئی تھی لیکن یہ جو انسانی کوششوں کی تاریخ ہے' وہ بتا رہی ہے کہ اس میں انسان بڑا ناکام و سرگرداں چلا آ رہا ہے۔

اصل مسئلہ تو صحیح نظامِ حکومت کا ہے

اصل میں صحیح نظامِ حکومت ہی ایسی چیز ہے جس سے معاشرے (Society) میں امن وامان ہی نہیں بلکہ فلاح وفوز بھی پیدا ہوتی ہے' انسان روزمرہ کی سرگردانی اور پریشانیوں سے محفوظ و مطمئن ہو کر' کسی بلند مقصد کی طرف گامزنی کے قابل ہوتا ہے۔ یہ جو صحیح نظامِ زندگی ہے' جسے آج کی اصطلاح میں نظامِ حکومت کہیے' وہ تو قرآن کے الفاظ میں' انسانی زندگی کا صحیح خطوط پہ متشکل کرنا تھا جو ایک بنیادی تقاضا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی تلاش میں نوعِ انسانی کا یہ قافلہ' صدیوں سے مارے مارے پھرتا ہے اور اس نے اس کے لیے جو طریق بھی تجویز کیا' ناکام ثابت ہوا' پھر اسے چھوڑا' پھر کوئی دوسرا طریق تجربۃً اختیار کیا' چنانچہ Trial & Error (سعی وخطا) کا یہ سلسلہ اب

تک مسلسل ومتواتر چلا آ رہا ہے۔ انسان کی کوشش ہائے ناتمام ان تجربات کی' بالحزن ناکامیوں اور نامرادیوں کی سرگزشت ہے۔ یعنی یہ آخری کوشش جو اس سلسلہ میں ہوئی اور جس پر انسان نے یہ کہا کہ بہر حال یہ حل قابلِ اطمینان ہے اور ابھی تک اس حل میں مزید Improvement (بہتری) نہیں ہوئی ہے' وہ انقلابِ فرانس (1789) کے زمانے میں پیدا ہونے والا نظریہ میثاق ❶ ہے' جسے Theory of Contract کہا جاتا ہے۔ انسان نے اسے انسانی تاریخ میں ایک سنگِ میل اور معرکہ آرا نظریہ قرار دیا ہے۔ Theory of Social Contract (سماجی نظریۂ میثاق) یہ ہے کہ حکومت یا اربابِ نظم ونسق اور اس ملک کے جو دوسرے باشندے ہیں' ان دونوں کے مابین ایک معاہدہ (Contract) ہوتا ہے۔ اس معاہدے (Contract) کی رو سے' یہ جنہیں آپ عام الفاظ میں رعایا یا ملک کے باشندے کہتے ہیں' وہ اپنے کچھ حقوق اربابِ نظم ونسق حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں اور یہ اس کے معاوضے میں ان کے ساتھ کچھ معاہدہ کرتے ہیں کہ تم یہ کچھ' ہمیں دیدو' یہ کچھ Surrender (حوالے) کردو' یہ چیزیں Pay (ادا) کردو' یہ چیزیں تمہاری Responsibility (ذمہ داری) ہوگئیں' جسے آج کی اصطلاح میں Obligations (فرائض) کہتے ہیں تو اس کے مقابلے میں یہ تمہارے Rights (حقوق) ہونگے جنہیں ہم پورا کریں گے۔ اس Theory (نظریہ) کی رو سے یہ جو دو Parties (جماعتیں) بن جاتی ہیں' اُن میں یہ پارٹی جو نظم ونسق کی ذمہ دار ہوتی ہے' وہ یہ کہتی ہے کہ تم اپنی ان چیزوں کو Surrender (حوالے) کردو' ہمیں دیدو' ہمارے حوالے کردو' اور ہم اس کے مقابلے میں تم سے معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم یہ کچھ کریں گے۔ گویا جو کچھ انہوں نے ان کو دیا تھا' وہ یوں ان Rights (حقوق) کی شکل میں ان کی طرف لوٹاتے ہیں جس کا وہ عہد ومعاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ذرا غور طلب چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس قسم کی آیت کے سلسلے میں یہ چیز پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہوگی۔

یہ جو حکومت میں Theory of Social Contract (معاشرتی نظریہ میثاق) ہے' اس پر جمہوریت کے سارے نظامِ عمارت کی بنیاد استوار ہو رہی ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اب تک کی انسانی کوششوں میں یہ آخری اور بہر حال بڑی کامیاب کوشش ہے۔ یہ کامیاب ہے' یا نہیں' اس کو تو چھوڑ دیئے لیکن یہ کہا گیا ہے کہ ابھی تک اس سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا نظام' انسانی کوششوں نے ایجاد نہیں کیا۔ نظام وضع کرنے کے سلسلے میں یہ انسان کی آخری کوشش بتائی جا رہی ہے۔ فرانس کا جو انقلابی تھا اس کا شمار دنیا کے عظیم فلاسفروں میں ہوتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ نظریہ یونانِ قدیم سے چلا آ رہا تھا لیکن اٹھارویں صدی میں یورپ میں انہوں ❷ نے اسے پہلی دفعہ فروغ دیا اور یہ پہلی بار

---

❶ اسکی مکمل وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 363-350 مع انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

❷ ہابز (Hobbes: 1588-679)' لاک (Locke:1632-1704) اور روسو (Rousseau: 1712-1778)۔ یہ سرفہرست ہیں۔

کی چیز اس لیے کہی گئی ہے کہ انسانی تاریخ تو ان کے سامنے تھی مگر قرآن ان کے سامنے نہیں تھا۔ اس میں ان کا کیا قصور ہے کہ یہ ہم نے اس انداز سے ان کے سامنے پیش ہی نہیں کیا۔ اب بھی وہ مشکل ہی ان کے سامنے پیش کی ہے۔ موجودہ جمہوریت کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے۔

چودہ سو سال پیشتر قرآن کی طرف سے پیش کردہ نظریہ میثاق کے خدوخال اور اس کی ضمانت

عزیزانِ من! یہ Theory of Social Contract (معاشرتی نظریہ میثاق) چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے پیش کیا تھا اور ان جامع الفاظ میں پیش کیا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ [1] (9:111)۔ مومنین سے ان کا مال اور جان خرید لیتا ہے' یہ اسے دیدیتے ہیں۔ ایک سائیڈ سے کنٹریکٹ کی یہ بات آ گئی۔ اس کی دوسری سائیڈ بھی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ کنٹریکٹ (Contract: معاہدہ) اس کے عوض میں کیا دیتا ہے۔ وہ تو مومنین کی مال اور جان لے لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن نے کہا کہ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ وہ اس کا عہد کرتا ہے کہ میں اس کے عوض تمہیں الجنتہ دیدونگا۔ ہمارے سامنے دو Parties (جماعتیں) آ گئیں۔ ان کے مابین یہ ایک معاہدہ (Contract)' یہ ایک میثاق ہوا ہے۔

میں متعدد بار یہ چیز عرض کر چکا ہوں کہ قرآنی تصور کی رو سے جہاں' یہ ذمہ داریاں خدا کے لفظ سے آتی ہیں کہ خدا یہ کر دے گا' قرآن نے خود بتایا ہے کہ خدا تو تمہارے سامنے براہِ راست نہیں آئے گا' تم اس کے ساتھ یہ معاہدہ بھی نہیں کرو گے' وہ نظام جو خدا کے ان قوانین اور احکام کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوتا ہے' تم اس کے ساتھ یہ معاہدہ (Contract) کرو گے۔ جو نظام خدا کے قوانین و احکام کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوتا ہے قرآن اسے ''اللہ اور رسول'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ خدا کا وہ نظام ہے جو اس کے رسول ﷺ کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا اور رسول اللہؐ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ نظام اسی سلسلے میں آگے چلتا ہے۔ وہ جنہیں جانشینانِ رسول کہا جاتا ہے وہ اس نظام کے اربابِ حل و عقد ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جو خدا کے قوانین و احکام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔

---

[1] اس معاہدہ (Contract) کی رو سے کہا گیا ہے کہ خدا مومنین سے ان کا جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ (Contract) محض ذہنی اور اعتقادی نہیں کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیا اور خدا نے آپ کو جنت دے دی۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں' نظام خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا اور جسے حضورؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور مستحکم رہنا تھا۔ اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہوتا تھا۔ (اخروی زندگی کی کیفیت اور ہے)۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے 48:10 (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 449 (فٹ نوٹ 1)۔

اسلامی حکومت کی شرطِ اوّل

اس نظام میں خدا کے قوانین و احکام کو عملاً نافذ (Implement) کرنا ہے۔ اب اس نظام کی اس شرط اوّل کو سامنے رکھیے اور سوچیے کہ ہر حکومت یہ نہیں ہے' خواہ آپ اس کا نام اسلامی حکومت رکھ لیں یا مسلمانوں کی سلطنت رکھیں' وہ نظام یہ نہیں ہے۔ یہ تو وہ نظام ہے جو خدائی قوانین و اقدار و اصول اور احکام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نازل ہوا تو آپؐ نے اس نظام کو متشکل کیا۔ اسے اللہ اور اسکے رسول کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور حضورؐ کے بعد پھر جب یہ نظام آگے چلے گا تو اس نظام کے لیے یہ اصطلاح تھی جو استعمال کی گئی۔

قرآن نے خود یہ کہا ہے کہ مومن خدا کے ہاتھ اپنا مال اور جان بیچ دیتے ہیں۔ خدا تو سامنے نہیں آتا' خریدار ہی سامنے نہیں آتا' تو یہ جو بیچ دیں گے یہ پھر کیسے بیچیں گے' یہ اسے کیسے منتقل کریں گے؟ جان کو تو چھوڑ دیجیے کہ جب ضرورت پڑے گی مانگ لی جائے گی' قرآن اَمۡوَالَهُمۡ (9:111) بھی تو کہتا ہے۔ خریدار ہی سامنے نہیں ہے تو یہ بیچیں گے کیسے؟ اور جب خریدار ہی نہیں ہے تو یہ بیچا ہی نہیں گیا' اس نے Take over (حوالے) نہیں کیا تو وہ جو اس کی طرف سے دوسرا عہد (Contract) ہے جس کے لیے کہا ہے کہ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ [1] (9:111)۔ وہ کون پورا کرے گا؟

آپ خدا کے "مروجہ تصور" کو ذہن میں رکھیے تو ان آیات کا عملی مفہوم ہی کچھ نہیں رہتا: نہ خریدار وہ چیزیں لیتا ہے' نہ وہ جو عہد ہوتا ہے' اس کے متعلق یہ کبھی ہوتا ہے کہ وہ پورا کیسے کرے گا کیونکہ سودا ہی نہیں ہوا۔ یہ ہے وہ تصور جو مذہب کی دنیا میں ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! دین میں یہ تصور نہیں ہے۔ دین تو نظام کا نام ہے۔ اب مذہب کے اس مروّجہ تصور میں ہر شخص مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ چیز کئی دفعہ ہمارے سامنے آ گئی ہے کہ ان سے پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو مالک نہیں ہیں' مالک ہر شے تو اللہ ہے۔ وہ جو بڑے بڑے ایوان اور عمارات ہوتی ہیں' ان کے باہر سنگ مرمر کی بھی ایک تختی لگا دیتے ہیں: اس پہ لکھا ہوتا ہے کہ "درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است۔ ہمارے پاس تو صرف یہ امانت کے طور پر رکھا ہے' مالک تو وہ خود ہے اور وہ جو مالک ہے' نہ وہ خود کبھی Possession (قبضہ) لینے کے لیے آئے' نہ بسنے کے لیے آئے' نہ خود کسی کو کرائے پہ دے' نہ خود لے۔ یہی کرائے پہ دیں' یہی اس کو بیع کریں' یہی اپنی وراثت میں دیں' مگر "مالکِ ہر شے' درحقیقت وہی خدا ہے۔ ہم تو صاحب! اس کی طرف سے واقع ہوئے ہیں' ہمارے ہاتھ میں امانت ہے"۔ یعنی جو مالک ہے اس کو کوئی عمل دخل ہی نہیں ہے اور یہ جو اس کے امین ہیں اس کے اندر سارا عمل دخل صرف ان کا ہے۔ کیا یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ خدا خرید لیتا

---

[1] اس کے معاوضہ میں' وہ انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دیدیتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 449)

ہے تو بس یہ اسی کے لیے تھا کہ تم اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کرلو کہ خدا نے خرید لیا ہے اور خریدنے کے بعد پھر ہمارے ہی پاس چھوڑ دیا ہے کہ اس نے تو ہمارے پاس امانت رکھی ہے اور پھر جتنا جی چاہے' اس ملکیت میں بڑھاتے چلے جائیں اور ذہن میں عقیدہ یہ رکھیں کہ صاحب! مالکِ حقیقی خدا ہی ہے' ہم تو صرف امین ہیں۔ عزیزانِ من! سب کچھ انہی کے پاس رہتا ہے: نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی۔ یہ ساری جائیداد تو اپنے قبضے میں رکھی' پھر مرنے کے بعد اولاد کو منتقل ہوگئی۔ اب یہ جائیدادیں بیچی جارہی ہیں۔ بس یوں کہو جیسے کرائے پہ دی جارہی ہیں۔ جو کچھ جی میں آئے کرتے رہتے ہیں لیکن کہتے یہی ہیں کہ مالک حقیقی وہی ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ مالک وہ ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ جی! وہ تو لامکان ہے' یعنی اپنا گھر بار ہی کوئی نہیں۔''

آپ غور کیجیے' عزیزانِ من! یہ قرآن اس طرح آپ کو ذہنی فریب دہی کے لیے نہیں آیا کہ جس طرح جی چاہے آپ اپنا اطمینان کرلیں تو اس کا منشا پورا ہوگیا۔ وہ تو آپ کو ٹھوس حقیقتیں پیش کرتا ہے۔ اب آپ کے سامنے اشتریٰ والی یہ آیت (9:111) ہے۔ اس میں خریداری کی بات کہی ہے۔ یہ یونہی نہیں ہے کہ یہ کوئی ذہنی سودے ہیں جو آپ کرلیں اور اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ اس سودے کے متعلق سورۃ الفتح میں دیکھیے صلح حدیبیہ [1] کے زمانے میں وہ وقت آیا جب نبی اکرمؐ صحابہؓ کے ساتھ گئے۔ مکے والوں نے انہیں باہر ہی روک لیا' حج کی بھی اجازت نہیں دی اور یہ نظر آگیا کہ یہ آپ ﷺ پر یورش کررہے ہیں مگر یہ تو صرف حج کرنے کے لیے آئے تھے۔ مکے والوں کی نیت خراب ہوگئی۔ افواہ پھیل گئی کہ جو صحابہؓ مکے میں ان لوگوں کے پاس گئے تھے' انہوں نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ وہاں رشتے داریاں تھیں' ان کی عزیزداریاں تھیں۔ وہ آپس میں رہتے سہتے تھے۔ حضرت عثمانؓ (573-656AD) کے متعلق خاص طور پہ مشہور ہوگیا کہ انہیں گرفتار کرکے شہید کردیا ہے تو پھر حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کہا کہ لو بھئی! عہد کا وہ وقت آگیا۔ مال تو آپ لوگوں نے دے رکھا تھا۔ قرآن کی رو سے مال تو کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ تو عملاً خریدا ہوا ہوتا ہے۔ میں یہ عرض کررہا ہوں کہ قرآن نے کیسے یہ بتایا؟ حضور ﷺ نے کہا کہ لو بھئی! وہ جو اللہ کے ساتھ تم نے خریداری کا معاملہ کیا ہوا ہے' جانیں بیچی ہوئی ہیں' اب اس کا وقت آگیا ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے کہا' جیسا کہ اس زمانے کا طریقہ تھا' کہ آؤ' اس معاہدے (Contract) کے اوپر ہاتھ پہ ہاتھ رکھیں: نیچے ہاتھ اوپر ہاتھ۔ ہمارے ہاں اب بھی یہ طریقہ رائج ہے۔ جو کوئی بات بھی ہوتی ہے' یہ اسے ''پکی کرنا کیندے نیں'' [2] کہ لاؤ' ہاتھ لاؤ اور پھر ہاتھ پہ یوں ہاتھ رکھتے ہیں تو سودا پکا ہوتا ہے۔ ان عربوں کے ہاں بھی یہی دستور تھا۔

---

[1] ذیعقدہ 6ھ

[2] اسے عہد پختہ کرنا کہتے ہیں۔

سنگِ اسود کے اوپر ہاتھ رکھنا دراصل عہد پکا کرنے کا ہی معاملہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو کعبے کے سنگِ اسود پر جا کر ہاتھ رکھنا ہوتا ہے' یہ وہی پکے سودے کی شرط ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ لو بھئی! وہ جو تمہاری بیع وشرٰی تھی یعنی خرید وفروخت کا معاملہ تھا' اب عملاً اس کا وقت آ گیا۔ اب آ ؤ' اس کا معاہدہ (Contract) کریں۔ اب ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہاتھ آتا تھا تو رسول اللہؐ ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کو بتا دو کہ ان کے ہاتھ کے اوپر یہ رسول کا ہاتھ نہیں' خدا کا ہاتھ ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ وہ سودا کنکریٹ (محسوس) شکل میں سامنے آ گیا۔ وہ خریدار جس کے Behalf پر[1]' اس نے یہ معاملہ کرنے کی اتھارٹی دے رکھی تھی' وہ سامنے آ گیا۔ اب یہ ذہنی چیز نہ رہی' صرف نظری اور اعتقادی چیز نہ رہی۔ تم مطمئن ہو گئے کہ سودا کرنے کے بعد خریدار آ گیا' اس نے ان چیزوں کا Possession (قبضہ) لے لیا۔ یہ تو وہ امانات تھیں' جو انہوں نے اس کے سپرد کر دیں اور ادھر سے عہد (Contract) ہے جس کے لیے کہا کہ یہ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ [2] (9:111) ہے۔ جب ہمارے ہاں یہ خرید وفروخت ذہنی ہوتی ہے تو الجنۃ مرنے کے بعد چلی جاتی ہے کیونکہ خرید وفروخت تو Actually (حقیقت میں) ہوتی ہی نہیں ہے۔ جب یہ ہوا ہی نہیں تو یہ معاہدہ بھی ذہنی ہوا اور اسی طرح یہ الجنۃ بھی۔ اب اس ذہنی الجنت کے متعلق بھی یہی ہے کہ یہ قیامت میں جا کر ملے گی۔ ارے! ملے گی کیسے؟ تم نے تو یہ جان و مال Hand-over (حوالے) ہی نہیں کیا۔ تم نے ان چیزوں کا قبضہ ہی نہیں دیا تو اس کے معاوضے میں الجنۃ کیسی؟ کہا کہ جی! ہم نے تو ساری عمر اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھا۔ ہم نے تو اپنے آپ کو اس کا مالک ہی نہیں سمجھا۔ اگر وہ لینے کے لیے آتا ہی نہیں ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ لیکن وہ جو اس نے قرآن کریم میں کہا ہے کہ جان و مال کے بدلے میں جنت دیں گے تو وہ تو دینی پڑے گی۔ پوچھا کہ شیخ جی یہ کیسے؟ کہنے لگے کہ جی ہم تو ہر وقت انتظار میں رہے۔ آپ نے غور کیا کہ یہ بات کیا بنی؟

عزیزانِ من! قرآن تو عملی زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ ذہنی اطمینان کا ضابطہ نہیں ہے۔ ذہنی اطمینان تو جس طرح سے بھی کسی کا جی چاہے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ اپنا ذہنی اطمینان ہوتا ہے۔ اسے خواہ آپ فریب نہ بھی کہیں تو بھی یہ جھرلوا اپنے طریق پر گردوارہ [3] میں جا

---

[1] جس کی جانب سے

[2] اس کے معاوضہ میں نظامِ خداوندی انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کی بہم رسائی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما کے تمام وسائل واسباب کی فراہمی' اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے (20:118)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 449 تا 450)

[3] سکھوں کا دھرم شالہ

کر ہو جاتا ہے' مندر میں ہو جاتا ہے' یہ عیسائی گرجوں میں کر لیتے ہیں' یہودی اپنے صومعہ میں کر لیتے ہیں۔ اگر اپنا ہی اطمینان کرنا ہے تو یہ تو بھنگڑا اور ملنگ اپنے ہاں سوٹے ❶ لگا کر بھی کر لیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ زندگی کا عملی ضابطہ ہے۔ یہ الجنۃ یہاں سے' اسی دنیا سے' شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بیع وخرید کا معاملہ یہاں ہوتا ہے۔ خدا نے انہیں اتھارٹی دے رکھی ہوتی ہے' جو یہاں اس کا نظام نافذ کرتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ (2:219) وہ پوچھتے ہیں کہ اس کے عوض میں وہ جو الجنۃ ملتی ہے اس کے لیے کتنا دیدیں' اس کی کیا قیمت دیں؟ کہا کہ صرف اپنی دال روٹی کے لیے رکھ لو اور باقی جو سارا کچھ ہے' اس کے عوض دیدو۔ پھر اس کے بعد انہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ Actually (حقیقت میں) کیسے دیدیں؟ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) ضرورت سے زیادہ جو کچھ ہے' اسے دے دو۔ لہٰذا پکی بات ہوگئی' اب یہ ذہنی چیز نہ رہی' زندگی کی ٹھوس حقیقت بن گئی۔ عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس کے عوض وہ نظام کیا دیتا ہے؟ کہا کہ وہ (اس دنیا میں) ''الجنۃ'' دیتا ہے۔ آخرت کی جنت پہ ہمارا ایمان ہے اور وہ حقیقت ہے لیکن وہ جنت یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اس الجنۃ کی پہلی چیز ہے اور اس نظام کی یہ وہ جنت ہے جس میں لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:38) کسی قسم کا خوف اور حزن باقی نہیں رہتا۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ قرآن کی یہ آیت بنیادی چیز ہے۔ اس میں امن مل جاتا ہے۔ لفظ امانت اور ایمان کا تو مادہ ہی امن (ا م ن) ہے۔ یہی آیت ہے جس میں کہا ہے کہ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ❷ (9:111)۔ پھر وہ مال کیسے دیتے ہیں؟ کہا کہ اس طرح ان سے وصول کر لو۔ اس کے بعد جہاں تک جان کا معاملہ ہے تو اس کے متعلق یہ کہا ہے کہ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ (9:111) جب وقت آجاتا ہے پھر وہ سر بکف' کفن بدوش' میدانِ جنگ میں آجاتے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد حق کی حمایت کے لیے جانیں ہتھیلی پہ ہوتی ہیں' پھر یا تو وہ لڑتے لڑتے وہیں جان دیتے ہیں یا بطور غازی واپس لوٹتے ہیں۔ یہاں آپ نے یہ دیکھا کہ وہ جو Actually (حقیقت میں) جان امانت تھی' وہ انہوں نے کیسے دی۔

حاکم اور رعایا کا قرآنی مفہوم

یہ سب کچھ کرنے کے بعد' میں معاہدے (Contract) کی بات کہہ رہا تھا کہ یہ ایک Contract Theory (نظریہ میثاق) ہے۔ اس مملکت کا نظام اس میثاق کے نظریئے پر قائم ہوا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ادھر یہ کہا ہے کہ تم یہ کچھ جو ضرورت سے زائد ہے' دیدو۔

---

❶ کش لگانا

❷ اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 449)

اب اس ''دیدو'' کے اندر بھی ایک بڑی چیز موجود ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسے بھی یہاں ہی واضح کر دینا چاہیے یعنی یہ جو ہمارے ہاں ''رعایا'' کا لفظ ہے اسے انگریزی زبان میں Subject کہتے ہیں۔ اس لفظ میں زیادہ ''استبداد'' ہے۔ یہ جسے Subject کہتے ہیں' یہ مستبد زمانے کا لفظ ہے' یہ استبداد کے زمانے کی باتیں ہیں' Subject (رعایا) کا یہ لفظ ہی محکومیت میں آتا ہے' جب کہ قرآن یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتا۔ وہ میثاقی نظام کے تحت ان دو میں (یعنی رعایا اور حاکم میں) فرق ہی کچھ نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ کچھ یہ لوگ ہیں' جو وہ ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیتے ہیں جو خدا نے اپنے اوپر لی ہوئی ہیں۔ مثلاً خدا نے یہ ذمہ داری لی ہوئی ہے کہ **وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا** (11:6) کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا کے اوپر نہ ہو۔ تو یہ ذمہ داری براہِ راست تو پوری نہیں ہوتی۔ یہ جو خدا کے نظام کو نافذ کرنے کے لیے یہ ایک مملکت قائم ہوتی ہے' حکومت قائم ہوتی ہے' یہ ذمہ داری وہ اپنے سر لے لیتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو ہر بار دہرائی جاتی ہے۔

حضرت عمرؓ (581-644/45AD) کا وہ قول ہے کہ ''دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو مجھ سے اس کا بھی مواخذہ ہوگا۔'' یہ انہوں نے اپنے اوپر خدا کی وہ ذمہ داری لی ہوئی ہوتی ہے۔ خدا تو براہ راست وہ ذمہ داری پوری نہیں کرتا' یہ لوگ وہ ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ وہ جو حضرت عمرؓ (581-644/45AD) کے اس قسم کے اقوال ہیں' وہ قیامت تک کے لیے مشعلِ راہ ہیں: جتنی بھی نظام مملکت اور حکومت کی ذمہ داریاں ہیں' یہ اقوال ان کے لیے راہنما اصول ہیں۔ ان کے ہاں کی وہ مشہور چیز ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ میں خلیفۃ المسلمین' امیر المومنین یا نظم و نسق کا سربراہ ہوں' تو کیا تمہیں پتہ ہے کہ میرا فریضہ کیا ہے؟ میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ جب میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا تھا' یقین مانیے کہ میں بالکل چکرا گیا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ انہی کی سمجھائی ہوئی بات پھر سمجھ میں آئی۔ انہوںؓ نے کہا یہ تھا کہ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا کہا؟ آپؓ نے فرمایا: ٹھیک ہے کہ دعا تم اس وقت ہی خدا سے مانگو گے جب تمہارا کوئی کام رکا ہوا ہوگا اور اگر وہ کام یہیں ہو جائے تو پھر وہاں درخواست دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قرآن نے اور صحبتِ نبویؐ نے وہ کیا لوگ پیدا کر دیئے تھے' عزیزانِ من! اور آگے یہ کہا کہ بھائی! یہ بات بھی سن لو کہ خدا تک تمہاری دعا کے پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ میرے خلاف وہ تمہاری شکایت ہوگی کہ میں نے یہ کام پورا نہیں کیا' ہمیں وہاں اوپر جا کر اپیل کرنی پڑی۔ ارے بابا! خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔ ایسی صورت تو نہ پیدا ہونے دو' آ کر مجھ سے کہا کرو' خدا تک جانے کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی کہ میں ایسے حالات پیدا ہونے دوں۔'' لہٰذا ''میرا تو منصب یہ ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک نہ پہنچنے دوں' یہیں ان کا معاملہ صاف کر دوں۔'' میرے خدا! یہ تھی وہ Theory of Social Contract (نظریہ میثاق

معاشرت) عزیزانِ من! یہ تھا وہ معاہدہ جو کر رکھا تھا۔ انہوں نے خدا کی طرف سے یہ معاہدہ (Contract) پورا کرنا تھا۔ اب یہ عہد سنیے۔ میں اس آیت کو سامنے لے آیا ہوں جس میں کہا تھا کہ خدا نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جان اور مال۔ کیوں؟ اس لیے کہ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ❶ (9:11)۔ ان سے یہ عہد (Contract) کیا۔ یہ جان و مال انہوں نے جنت کی زندگی کے عوض دے دی۔

امانات لوٹانے کا قرآنی مفہوم

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس آیت وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (23:8) اور یہ وہ ہیں' جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں (Contracts) کا پاس رکھا۔ اس آیت میں لفظ ''امانت'' دیدیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ بس ٹھیک ہے دیدیا ہے ''جی اے ہن تہاڑا ہویا۔ ❷ قرآن تو مال و جان ان کے پاس بطور امانت رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنا معاہدہ (Contract) پورا نہیں کرتے تو انہیں اس میں سے ایک پائی بھی لینے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ یہ تو امانت تھی۔ وہ یہ معاہدہ (Contract) پورا کریں گے تو اس وقت اس میں سے کچھ لے سکیں گے جو انہیں دیا ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے' یہ جو امانتیں ان کے پاس آئی ہیں' یہ ان امانتوں کی حفاظت کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ان امانتوں کی کیسے حفاظت کریں گے؟ کہا کہ وہ جو ان کے ساتھ معاہدہ کیا تھا' یہ اس معاہدے کو پورا کرتے چلے جائیں گے۔ میثاق کی قرآنی Theory (نظریہ) کے تحت ایک ذمہ داری (Responsilibity) کو پورا کرنے سے ایک حق Establish (ثبت) ہوتا ہے' Approve (منظور) ہوتا ہے۔ اس وقت کسی کا حق صحیح معنوں میں Right (حق) بنتا ہے جب وہ پہلے اس ذمہ داری کو پورا کرے۔ انہیں مومنین کے جان و مال کو لینے کا حق نہیں پہنچتا' تاوقتیکہ یہ اپنے اس عہد (Contract) کو پورا نہ کر دیں۔ یہ جان و مال لے کر رکھتے ہیں تو امانت کے طور پہ لے کر رکھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ (581-644/45AD) نے دیکھا کہ ایک یہودی آ رہا ہے۔ آپؓ نے کہا: کہاں جا رہے ہو؟ یہودی تھا' غیر مسلم تھا' کہنے لگا: جی! وہ جو مملکت کا Due (واجب الادا) ہوتا ہے' وہ خزانے میں دینے جا رہا ہوں۔ کہنے لگے: یہاں تم کب آئے تھے؟ اس نے کہا: جی وہ کچھ دن ہوئے ہیں' ابھی حال ہی میں آیا ہوں۔ فرمایا کہ ابھی جب اس حکومت نے تمہارے لیے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو اس حکومت کو تم سے کچھ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پہلے یہاں سال بھر رہو اور جب یہ تمہارے لیے اتنا کچھ کر دیں گے تو اس کے بعد پھر جا کر یہ Due (واجب الادا) دینا۔

---

❶ اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 449)

❷ کہ بس اب یہ تمہارا ہوا۔

عزیزانِ من! جب (عربوں نے) ملک [1] فتح کیا ہے تو وہاں کے اعتبار سے ان لوگوں سے جزیہ لینا تھا۔ یہ جسے آپ جزیہ کہتے ہیں' اور جسے اب اتنا بدنام کر دیا ہے' اس کے تو معنی ہوتے ہیں: ''ان کی جان و مال' عزت اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری کے سلسلہ میں ان سے کچھ لینا''۔ اس لیے ان کو کہا جاتا تھا کہ اس کے معاوضے میں کچھ تھوڑا سا خرچہ وغیرہ ادا کرو۔ اس چیز کو ٹیکس کہنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ دراصل وفاداری کی علامت (Symbol) کے طور پر' ان سے کچھ تھوڑے سے پیسے لیے جاتے تھے' جو زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سال کے ہوتے تھے۔ اب جب یہ ملک [1] فتح ہوا تو انہوں نے ان کی سال بھر کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وہاں چھاؤنی ڈال دی۔ چھ ہی مہینے کے بعد اس چھاؤنی کو وہاں سے اٹھ کر کہیں دوسری جگہ چلے جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ یہ عیسائی تھے اور اس سے پہلے بھی یہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد بھی عیسائیوں کی یعنی بازنطینیوں کی حکومت پھر اسی طرح سے مسلط ہو جانی تھی۔ ان مسلمان مجاہدین کی اس واپسی پر وہ عیسائی باشندے رو رہے تھے' ان کا پلا پکڑ رہے تھے کہ خدا کے لیے نہ جایئے' عیسائی پھر آ جائیں گے لیکن انہیں بتایا گیا کہ ہمیں تو بہر حال جانا ہے اور جاتے وقت انہوں نے وہ سال بھر کا جو لیا ہوا تھا' لیکن چھ مہینے کے بعد یہ واپس گئے تھے' تو ان کا جو آدھا تھا' یہ کہتے ہوئے' ان کو واپس دے دیا کہ جب ہم تمہاری حفاظت ہی نہیں کریں گے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم سے کچھ لیں' یہ تو ہمیں اس وقت حق پہنچتا ہے جب ہم اپنے عہد کو پورا کریں۔

برادرانِ عزیز! یہ کچھ امانت اور عہد (Contract) کے متعلق ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ لہٰذا یہ الفاظ جن کو ہم یونہی سمجھتے رہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ بھئی! کوئی امانت تمہارے پاس رکھ جائے تو اس میں خیانت نہ کیا کرو' اسی طرح واپس دے دیا کرو اور جب کسی سے وعدہ کیا کرو تو پورا کیا کرو۔ یہ بات اتنی سی نہیں ہے۔ یہ تو بہت آگے جانے والی بات ہے۔ اب آپ یہ دو الفاظ (امانت اور عہد) دیکھیے کہ ان کے اوپر کتنی بڑی عمارت استوار ہو رہی ہے۔

اس پورے نظامِ مملکت کی آیت کے الفاظ آپ نے سن لیے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ** (9:111)۔ خرید لیتا ہے خدا مومنین سے ان کی جان اور مال۔ اس کے معاوضے میں ان سے عہد کرتا ہے کہ ہم تمہیں جنت دے دیں گے۔ جنہوں نے یہ بیچا' اس آیت میں اس کی عملی شکل بتا دی۔ یہ نہیں ہے کہ ذہنی طور پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بیچ دی جان بھی' اور مال بھی۔ کہا کہ واقعی جب وہ وقت آتا ہے تو وہ میدانِ جنگ میں جان دینے کے لیے آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اب

---

[1] بازنطین (روم)۔ اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء ص ص 323-324 (فٹ نوٹ 1)

اس عہد (Contract) کا دوسرا حصہ رہ گیا۔ خدا کے ذمے جو عہد قرآنِ کریم نے کہا تھا' عزیزانِ من! سنیئے وہ عہد کیا ہے۔ یہاں وہ لفظ آیا ہے۔ دیکھیے یہ لفظ کہاں آتا ہے۔ کہا کہ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ❶ (9:111)۔ خدا سے زیادہ بہتر عہد پورا کرنے والا کوئی نہیں۔ ہم نے تم سے کہا کہ ہم وہ عہد پورا کریں گے لہٰذا ان لوگوں سے یہ کہدو کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد مال اور جان اس سودے کے عوض ہمیں دے دو۔ جان تو بہرحال ایک دن جانی ہی ہے اب تم نے یہ دیدیا ہے تو یہ یقین رکھو کہ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (9:111)۔ خدا نے یہ عہد کیا ہوا ہے اور خدا سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا تو کوئی اور نہیں ملے گا۔ جب صورت یہ ہو جائے کہ جان و مال کی یہ اتنی چھوٹی سی قیمت دیں تو اللہ یہ عہد پورا کرے کہ انہیں اس کی طرف سے الجنۃ ملے اور جس کی طرف سے یہ عہد (Contract) ملے اسی کی طرف سے یہ یقین دہانی بھی کرائی جائے کہ اس سے زیادہ عہد پورا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کتنا اچھا سودا ہے!

عزیزانِ من! انہی الفاظ کے فوراً بعد کہا کہ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ (9:111) تم اپنے اس سودے پر جشن مناؤ جو تم نے کرلیا ہے۔ عزیزانِ من! میں Contractual Theory of Quran (میثاقِ نظریۂ قرآن) پر ہی آ رہا ہوں۔ Theory (نظریہ) کے اعتبار سے تو اس ❷ نے واقعی بہت بڑی بات کہی لیکن اس نظام اور قرآنِ کریم کے اس نظام میں فرق ہے۔ یہ جو ان کی طرف سے اس نظام کو یا حکومت کو دینا ہوتا ہے آپ وہ بھی بات چھوڑ دیجیے آپ دیکھیے کہ پچھلے درس میں خَاشِعُوْنَ (23.2) کا لفظ آیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ ان قوانین و احکام کی پابندی دل کا تقاضا ہو جائے' تمہارا یہ عمل بطیبِ خاطر ہونا چاہیے۔ اطاعت کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں لیکن اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ یہ نظام یا حکومت تو یہ سب کچھ وصول کرلے مگر اس کے عوض اس نے ان کے ساتھ جو Promises (وعدے) کیے ہوے ہیں' معاہدے (Contracts) کیے ہوئے ہیں' وہ پورے نہ ہوں تو پھر اس سودے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہ اچھا! پھر ہم بھی کچھ کوشش کریں گے کہ اس میں کچھ تھوڑا بہت ڈنڈی ماریں۔ یہ جو حکومت کے ٹیکس کہتے ہیں کہ "صاحب! قاعدے قانون کے مطابق یہ بنتا ہے اور پھر اس سے نکلنے کے ہزار طریقے نکالتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ طریقے یہ لوگ کیوں نکالتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے سودے پہ تو فَاسْتَبْشِرُوْا (9:111) تمہیں جشن منانے چاہئیں۔ اس قسم کے سودے میں یہ سوگ کیوں منا رہے ہیں کہ اِدھر جو ان کی قیمت تھی' وہ تو ادا کر دی گئی' وصول کر لی' اور وہ جو اُدھر سے معاہدہ کیا تھا' عہد کیا تھا' وعدہ کیا تھا' وہ پورا نہیں ہو رہا۔

---

❶ اس عہد (Contract) کا پورا کرنا اللہ نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ سے بڑھ کر' اپنے عہد کو پورا کرنے والا' کوئی نہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔450)

❷ ہابز (Hobbes:1588-1679)۔ اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص350 اور 351 کے فٹ نوٹ 3 اور 1 (ص 351)

اب آپ نے غور فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے ان کو دیا تھا' اسے قرآن نے ''امانت'' کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا ہے' کیوں وہ ان کے پاس امانت کے طور پہ رہ سکتا ہے؟ یہ اس لیے کہ معاہدہ پورا کرو تو پھر اس پہ تمہاری یہ مشیت یا حق Establish (ثبت) ہو جائے گا' تم As of Right (بطورحق) نہیں لے سکتے۔ یہ کچھ تمہارے نظامِ مملکت سے کہا جارہا ہے کہ تمہارا بھی Right (حق) اس صورت میں Approve (منظور) ہوگا جب تم وہ جو معاہدہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے' جس میں تمہاری Obligations (فرائض) ہیں' Responsibilities (ذمہ داریاں) ہیں کہ ان کو پورا کرو اور عزیزانِ من! پھر جب یہ صورت ہو جائے کہ اتنا سادے کر اتنا کچھ مل رہا ہو اور اتنا یقین ہو کہ جو معاہدہ ہوا ہے وہ یقیناً پورا ہو کے رہے گا اور پورا ہوتا چلا جائے گا تو اس سے زیادہ جشنِ مسرت کا مقام دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ پھر میں یہ بتا دوں کہ مولانا ❶ کا وہ شعر فوراً ذہن میں آ جاتا ہے۔ جب نیلام ہوا تو زلیخا نے یوسف خرید لیا۔ مولانا ❶ اس میں کہتے ہیں۔ سہیلیوں نے پوچھا کہ کتنے میں خریدا؟ اس نے کہا: کیا پوچھتی ہو' اُس کے مقابلے میں کہ میں نے اس کے لیے کتنا دیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ زلیخا نے کہا کہ:

درا ہم چند دادم جاں خریدم

تعالیٰ اللہ عجب ارزاں خریدم

اور کچھ تھوڑے سے چاندی کے' سونے کے یا دھات کے' سکے جمع کر کے' ان کے عوض میں نے جان خرید لی' خدا کی قسم! یہ تو میں نے آج بڑا ہی سستا سودا کیا ہے۔ ان سے کہو کہ وہ کہیں کہ **فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ** (9:111) تم اس سودے پر خوش ہو جاؤ۔ اللہ کی قسم! بڑا سستا خریدا ہے۔ اس معاشرے میں' عزیزانِ من! جو کچھ نظامِ خداوندی کو دیا جاتا ہے تو ادھر سے جو کچھ اس کے عوض میں ملتا ہے اس پر ہر شخص محسوس کرتا ہے: ''بڑا ہی سستا سودا تھا۔''

خدا تعالیٰ کی طرف سے نظامِ ربوبیت کا وعدہ جماعتِ مومنین کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے

عزیزانِ من! اب پھر سورۃ المؤمنون کی 8 ویں آیت پر آ جایئے۔ اس کے دو الفاظ پہ آیئے: **وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ** ❷ (23:8)۔ یہ دو الفاظ ''امانات اور عہد'' ہیں۔ مومنوں کی جماعت' ان کا معاشرہ' ان کا نظام' ان کی مملکت' کی کیفیت یہ ہے کہ یہ امانات اور اپنے معاہدوں کی بڑی پاسداری کرتے ہیں۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ بات انفرادی طور پہ کسی کے ساتھ

---

❶ مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی اور ان کی مثنوی کا نام ہے: مثنوی یوسف زلیخا۔

❷ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا (4:58) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔774)

وعدہ کر کے یا امانت رکھ کے واپس دینے کی نہیں ہے۔ یہ تو ایک بہت بڑا نظامِ حکومت ہے اور نوعِ انسانی کو قرآن یہی کچھ سکھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ تو اقوامِ عالم کو مخاطب کرتا ہے کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ نظامِ حکومت کیا ہوتا ہے۔ خدا کے متعلق متعدد مقامات میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (3:9) وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وہ اپنے ہر وعدہ کو پورا کرتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جب خدا یہ کہتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے تو مذہب میں آ کر تو اس کے وعدہ کے پورا ہونے یا کرنے کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! بات بڑی سیدھی سی ہے لیکن گستاخی معاف، مثلاً یہ کہ اگر ہم کہیں کہ خدا نے کہا ہے کہ ہر جاندار کے رزق کا ذمہ ہمارے اُوپر ہے یعنی خدا کے اُوپر ہے، تو آج کے حالات کے مطابق بھی دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے اور جب قحط پڑتا ہے تو ایک ایک قحط کے اندر لاکھوں کی تعداد میں لوگ بھوک سے مر جاتے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ جب یہ کچھ کہا گیا ہے تو پھر کہاں ہے خدا کا وہ وعدہ، وہ ذمہ داری؟ خدا کی یہ ذمہ داری کیسے پوری ہوتی ہے؟ اس ذمہ داری کے پورے کرنے کا طریق وہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ لہٰذا اگر اسے دین کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ذمہ داری کیا ہے۔ دراصل وہ جماعت، وہ لوگ، جو خدا کے نام پہ اسلامی نظام کا لفظ استعمال کرنے کے بعد، اس نظام کو متشکل کرتے ہیں، وہ قرآنی نظام حکومت کی ساری ذمہ داریاں اپنے اوپر لیتے ہیں۔ یعنی اس طرح وہ ذمہ داریاں جو خدا نے اپنے اوپر لے رکھی تھیں، وہ ان کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں اور جنہیں ہم خدا کے Dues (واجب الادا رقوم) کہتے ہیں وہ ان کو ادا کرنے ہونگے، یہ معاہدہ ان کے درمیان ہوگا۔ لہٰذا جس طرح یہ کہا گیا ہے کہ خدا اپنا وعدہ ہمیشہ پورا کرتا ہے کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسی طرح یہ جو نظام ہے، اس کے اوپر ذمہ داری عائد ہو جائے گی کہ وہ کوئی معاہدہ، کوئی وعدہ، ایسا نہ کرے جس کی وہ خلاف ورزی کرے۔ جونہی وعدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے، عزیزانِ من! سارا بھروسہ Confidence ٹوٹ جاتا ہے۔ انفرادی طور پہ کبھی کوئی شخص آپ سے وعدہ خلافی کرے تو آپ دیکھیے اس کے بعد کبھی آپ اس کا اعتبار ہی نہیں کرتے۔ جو اعتماد ہے اس کی بنیاد اس پہ ہے کہ آپ کو یقین ہو کہ یہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ یہ اعتماد جو اس قسم کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کبھی ایسا نہیں کرے گا، اسے عربی زبان میں ''توکل'' کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ قرآن کا کوئی لفظ بھی لائیے، قرآن کی کوئی اصطلاح بھی لائیے، اس کے بعد دیکھیے کہ اس کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح توکل کا لفظ جس میں کہتے ہیں کہ توکل بخدا بیٹھے ہیں صاحب، اللہ توکل کرو جی۔ عزیزانِ من! توکل اس بھروسے کو کہتے ہیں جو اس طرح سے حاصل ہو کہ اس نے جو کہہ دیا ہے، وہ ضرور کرے گا، یقین ہے مجھے اس پہ اور جب یہ آپ کو کسی کے اوپر بھروسہ یا توکل ہو جائے کہ یقیناً یہ ایسا کرے گا اور پھر جو آپ کے ذمے ہوگا، آپ بھی بطیبِ خاطر وہ کچھ کریں گے تو یہ نظام یوں قائم ہوگا اور اس طریق پر امانت اور عہد دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ یعنی اس طرح یہ جو دیتے ہیں اور وہ جو لیتا ہے، وہ بطور امانت لیتا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ اپنا عہد (Contract) پورا

کرتا چلا جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ سے بھی اس کے کیے گئے وعدہ کے متعلق پوچھا جاسکتا ہے

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی کون سی آیات ہیں جو ابھر اور نکھر کر اس کی شہادت نہیں دیتیں۔ لاریب' یہ خدا کا ہی کلام ہے' یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ جب اس نے خدا کے متعلق کہہ دیا ہے کہ ہم اپنا عہد (Contract) پورا کرتے ہیں تو اس کا سوال ہی نہیں کہ ہمیں اسمیں ذرا سا بھی شبہ گزرے کہ وہ اپنا عہد پورا نہیں کرے گا۔ بہرحال' اس کے باوجود اس کی یقین دہانی کے لیے سنیے کہ خدا تعالیٰ نے کیا کہا؟ لیکن اس کے لیے پہلے تو ذہن میں یہ رکھیے کہ ہمارے ہاں خدا کے متعلق تصور یہ ہے کہ اس سے تو کسی بات کے متعلق پوچھا ہی نہیں جاسکتا' وہ تو کسی قاعدے قانون کا پابند ہی نہیں۔ اس لیے اَللّٰہُ الصَّمَدُ ❶ (112:2) کا ترجمہ ''اللہ بے نیاز ہے'' کیا جاتا ہے بلکہ الصمد کے معنی ہوتے ہیں: بے پرواہ' یعنی وہ لاپرواہ ''اوتھے کیہہ پرواہ! اوتھے بے پروائیاں' پھڑ لئے عملاں والیاں نوں' چھڈ دیئے اوگن ہارنوں ❷۔ جیہو جئے ایتھے ساڈے نظام' او ہو جیا اوتھے' اسی تے خدا نوں عرش تے بٹھا رکھیا ہویا اے ❸ تو اس (خدا) سے تو پوچھا ہی نہیں جاسکتا۔ یقیناً یہ بات اس کے برعکس ہے اس کا جو واقعی مقام ہے' ہم جب اسے دیکھیں' اس پر ہمارا ایمان ہو کہ وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرے گا' تو اس سے پوچھنے کا سوال ہی نہیں ہے لیکن آپ یہ دیکھیے کہ وہ اپنے متعلق کیا تصور دیتا ہے؟

عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت جو میں کہہ رہا ہوں۔ کہا کہ جب وہ الجنۃ کا وعدہ کرے گا جو اس نے تمہیں دی ہوئی ہے تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ لَهُمۡ فِيهَا مَا يَشَآءُونَ خٰلِدِيۡنَ (25:16) جو آرزو ہوگی پوری ہوگی' جو خواہش ہوگی پوری کی جائے گی' جو مانگو گے وہ ملے گا۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور آگے ہے کہ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا (25:16) یہ وہ وعدہ ہے کہ اگر بفرض محال پورا نہ ہو تو

---

❶ اس کے مکمل مفہوم و تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام' رجسٹرڈ' لاہور' 2006 (سورۃ الاخلاص۔ 112 ویں سورۃ)

راقب کا یہ شعر یوں ہے:

❷ اوتھے کیہہ پرواہ اے راقب' اوتھے بے پروائیاں پھڑ لئے عملاں والیاں نوں' چھڈ دیئے اوگن ہارنوں

(اے راقب! خدا بڑا بے پرواہ ہے۔ اس کی بے پروائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیکوکار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں (حوالہ پرویزؒ: کتاب التقدیر' ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1986' ص 332)

❸ اس کے ہاں کوئی پرواہ نہیں ہے' وہ بے پرواہ ہے' کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے۔ جیسے یہاں ہمارا نظام ہے' ویسا ہی وہاں ہے۔ ہم نے تو خدا کو عمل سے عاری عرش پہ بٹھا رکھا ہے۔

تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ تم نے یہ وعدہ کیا تھا' وہ کیوں پورا نہیں کیا؟'' تم خدا سے یہ پوچھ سکتے ہو!'' میں نے کہا کہ یہ جو اس طرح خدا کے متعلق مفہوم آتا ہے' وہ سمٹ کر اس دنیا میں خدا کے نام پہ نظام قائم کرنے والوں کے ذمے آتا ہے تو ان کا ہر یہ وعدہ مسئول ہوتا ہے' اس کے خلاف نہیں ہوسکتا یہ اس لیے کہ یہ قرآن کے تصور کے مطابق ہے۔ آئین ❶ یا نظام کے مطابق جسے Sovereign Authority (اقتدار مطلق) کہتے ہیں وہ یہی ہے' وہ خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ Constitution (آئین) کی اصطلاح کے مطابق یہ Sovereign Authority یا Sovereignty (مطلق اقتدار) وہ ہوتی ہے جس سے پوچھا نہ جاسکے' جو ہو Accountabe to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو)۔ یہ Sovereignty (مطلق اقتدار) اس کی ہوتی ہے۔ By Definition (تعریف کی رو سے) وہ کسی کو Accountable (جواب دہ) نہ ہو' اس نے کسی کو حساب نہ دینا ہو' کوئی اس سے پوچھ نہ سکے۔ ہمارے ہاں تو یہ Sovereignty (مطلق اقتدار) ایسے ہی بکس میں ہے جس طرح ہم خط کے اوپر 786 لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے آئین میں یہ چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو چیز ہے کہ اُس سے سوال نہیں کیا جاسکتا' پوچھا نہیں جاسکتا' صحیح نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (25:16) خدا بھی جو وعدہ کرتا ہے' اگر بفرضِ محال وہ پورا نہ ہو تو اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کیوں پورا نہیں ہوا؟ غور فرما رہے ہیں کہ عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ❷ (23:8) کے کیا معنی ہوئے؟ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ بات تو دوطرفہ ہے:؟ بیع وشریٰ کا سودا دونوں طرف سے ہوتا ہے اور دونوں طرف سے وہ شرائط پوری کرنا ہوتی ہیں۔ یہاں ایک طرف ''امانت'' کہا ہے اور دوسری طرف ''عہد'' کہا ہے۔ دوسرے مقام پہ دونوں ہی طرف سے ''عہد'' کہا ہے کہ تم ''کچھ'' دینے کا عہد'' کرتے ہو' ہم بھی اس کے عوض ''کچھ دینے کا عہد'' کرتے ہیں کہ ہم یہ کچھ تمہارے لیے کریں گے۔ یہ تمہارے Rights (حقوق) ہو گئے اور یہ ہماری Obligations (فرائض)۔ تم عہد کرتے ہو تو یہ تمہاری ذمہ داریاں ہوگئیں۔ اب دیکھیے کہ وہ شرط کس طرح رکھی ہوئی ہے؟ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (2:40) تم اپنا عہد پورا کرتے چلے جاؤ اور ہم اپنا عہد پورا کرتے چلے جائیں۔ اب خدا کی طرف سے عہد کا پورا کرنا مشروط ہوگیا کہ اِدھر سے جو بھی عہد ہے' اس کی پابندی کی جائے گی۔ جونہی دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی کی طرف بھی یہ بات آگئی کہ اس نے عہد کو پورا نہیں کیا' تو سودا کٹ گیا۔ اس سودے کا نام ہی ایمان ہے۔

---

❶ آئین کی قرآنی تفصیل کے لیے دیکھیے:

Parwez, G.A:Quranic Constitution in an Islamic State Compiled by Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque (2000). Lahore: Idara Tolu-e-Islam (Regd)

❷ وہ اپنے معاہدوں (Contracts) کا پاس رکھتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نظام جو کچھ ان سے وصول کرتا ہے' یہ کہتا ہے کہ وہ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھتا ہے۔ اب یہ جو چیزیں امانت کے طور پر اپنے پاس رکھتا ہے' تو ان کے عوض یہ تمہارے Rights (حقوق) پورے کرے گا۔ اس لیے کہا ہے کہ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اس عہد (Contract) کو پورا کریں گے۔ ہم سے جب ایک عہد پورا ہوتا ہے تو اس کے عوض میں جو کچھ بطور امانت لیا ہوا ہوتا ہے پھر وہ ہماری ملکیت میں آ سکتا ہے' پھر وہ ہمارا ہو سکتا ہے' اس سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ اب دیکھیے کہ کیسے جامع اور حسین الفاظ ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ (4:58) خدا تمہیں یہ حکم دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ کیا حکم دیتا ہے؟ وہ حکم دیتا ہے کہ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (4:58) یہ جو چیزیں انہوں نے تمہیں بطور امانت دی ہوئی ہیں' ان کے مالک وہی رہتے ہیں۔ جب تم اپنا ایک عہد پورا کرتے ہو تو اس حصے تک ان کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ تمہاری طرف آتی ہے۔ اس کو کہا گیا ہے کہ امانت کو لوٹا دینا۔ عہد پورا کرتے چلے جاؤ تو یہ امانت جو انہوں نے تمہارے پاس رکھی تھی' یہ پوری ہوتی چلی جائے گی۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ امانات کو جو' ان کے اہل ہیں' ان کی طرف لوٹاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ امانات کو کیسے لوٹاؤ؟ میں نے کہا ہے کہ قرآن کوئی چیز محض نظری (Theoretical) یا (تعلیمی) Academic نہیں رکھتا۔ وہ تو انسانی زندگی کے نظام کا ضابطہ ہے۔ جو عملی زندگی (Practical Life) ہے' اس میں اس کا نفاذ ہونا ہے۔ کیسے لوٹاؤ؟ سنیے! وہ کیا حکم دیتا ہے؟ اس طرح کہ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (4:58) جب ان کے معاملات کے فیصلے کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ پہلی چیز یہ ہو گئی۔ اور دوسری طرف ان سے یہ کہا کہ یہ نظام وہ ہے جو عدل کے ساتھ ہر معاملے کا فیصلہ کرے گا۔ میں اگر قرآن کے عدل کی Definition (تعریف) یا تشریح میں جاؤں گا تو دوسری طرف نکل جاؤں گا۔ دوسرے درس میں یہ چیز عرض کروں گا کہ عدل کیا ہوتا ہے۔ جب وہ یہ کچھ کریں تو اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ [1] (4:59)۔ یہ عدل (Justice) کرو۔ لہٰذا جب بھی کسی معاملے میں تمہیں کوئی اختلاف ہوا کرے تو فوراً ''اللہ اور رسول'' کی طرف رجوع

---

[1] اے جماعت مومنین! تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو' جسے قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے' رسولؐ نے قائم کیا ہے اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگانِ حکومت (افسرانِ ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسرانِ ماتحت میں' کسی بات میں اختلاف ہو جائے' تو اس کے لیے مرکز کی طرف رجوع کرو۔ یعنی افسرانِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو' جو اس معاملے کا' قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی۔ (42:10) مرکزی اتھارٹی کے فیصلہ کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ آخری ہوگا اور چونکہ وہ فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا' جس پر تم ایمان رکھتے ہو' اس لیے اس فیصلے کو بطیبِ خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کرو (4:65) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص-197)

کیا کرو ان کے فیصلے کی اطاعت کیا کرو۔ اب یہ ان کے فیصلے کی جو اطاعت ہے' وہ ان کے اوپر لازم آئی۔ وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ یہ فیصلے عدل کے ساتھ کریں گے۔ پھر وہی عہد اور امانت کا جو قصہ تھا وہ آپ کے سامنے آ گیا' یعنی امانت میں خیانت نہ کرنے کی بات ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَخُوۡنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ وَ تَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ** (8:27) اے جماعتِ مومنین! یہ خدا کے نام پر جو نظام قائم ہوا ہے' اس کے قوانین کو' احکام کو' نافذ کرنے کے لیے اسے جو کچھ تم نے سونپنا ہے' اس کی سپردگی میں دینا ہے' اس میں خیانت نہ کرنا۔ اسے یاد رکھو۔

نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے دوران کچھ مشکل گھاٹیوں کا ذکر

اب سوال یہ ہے کہ خیانت کی طرف مائل کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟ یہ قرآن ہے' یہ کوئی بھی چیز ادھوری یا مبہم یا ذومعنی چھوڑتا ہی نہیں' اسے وہیں کا وہیں صاف کر دیتا ہے۔ کہتا ہے یاد رکھو! اس راستے میں کچھ تھوڑی سی رکاوٹیں آئیں گی۔ اس میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ وہ پھسلنی گھاٹیاں ہیں جہاں انسان لغزش کھاتا ہے۔ کہا کہ **وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَ اَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ** (8:28) یاد رکھو! لغزش کی یہ گھاٹیاں اولاد اور مال و دولت کی ہوس ہے۔ یہ لغزش کی گھاٹیاں بنا کرتی ہیں۔ یہ انسانوں کو خیانت پر مائل کرتی ہیں' اس بات کا بہت خیال رکھنا۔ اب اس طرح' عزیزانِ من! یہ جو مملکت' سلطنت' حکومت بنتی ہے' اور خداوندی نظام کی حکومت ہے' یہ ملتی کیسے ہے؟ ایک تو چنگیزی [1] انداز سے ملتی ہے۔ وہ چنگیزی انداز کیا ہوتا؟ یہ دھاندلی کا لفظ تو ہمارے ہاں عام ہے۔ کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں کہ دھاندلی کے معنی کیا ہیں؟ ایک بات جب کسی مسلمہ قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائے' وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی قاعدے قانون مقرر کیے جائیں یہ الگ بات ہے۔ جب آپ نے ان کو Accept (قبول) کر لیا ہے تو جو چیز اس کے مطابق کی جائے وہ با قاعدہ ہو جائے گی' جو اس کی خلاف ورزی میں کی جائے اسے بے قاعدہ یا لاقانونیت کہیے۔ اسے آجکل کی اصطلاح میں دھاندلی کہتے ہیں۔ سلطنتیں بھی جب دھاندلی سے حاصل کی جاتی ہیں' تو اسے چنگیزیت کہتے ہیں۔ کسی قاعدے قانون کے مطابق نہیں' قوت کے بل بوتے پہ۔ قوت کا تو یہ ہے کہ جس کے پاس کم قوت ہو' وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ زیادہ قوت والا اپنی بات منوا لیتا ہے۔ یوں جب مملکت حاصل ہوتی ہے تو اس کے لیے اصطلاح ہے جسے چنگیزیت کہا ہے۔

---

[1] اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص 310 (فٹ نوٹ 2)

علامہ اقبال کے نزدیک چنگیزیت کا مفہوم

عزیزانِ من! اس دھاندلی کی وضاحت کے لیے اقبالؒ (1877-1938) نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے جو بڑی صحیح ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نہیں جی! پھر پہلا مصرع بھی تو سن لیجیے کہ اس میں بات اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ شخصی حکومت ہو' ملوکیت ہو۔ یہ وہ ہے جو آپ کے اپنے ذہن میں نہیں ہے:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جب قاعدہ اور قانون الگ ہو جائے اور پھر جب ہم دین کہیں گے تو قاعدہ اور قانون تو وہ ہوگا جو خدا کا مقرر کیا ہوا ہو اور جب وہ الگ ہو جائے تو پھر باقی دھاندلی رہ جاتی ہے۔ آپ کی زبان میں ترجمہ یوں ہو گیا: یہ چنگیزی قسم کا نظام ہے۔ لہٰذا قرآن اس طرح حاصل کی ہوئی مملکت کو دھاندلی قرار دیتا ہے' اس کو فرعونیت سے تعبیر کرتا ہے۔

خدا اپنا وعدہ یا اپنا عہد کس طرح پورا کرتا ہے؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ نظامِ مملکت جسے نظامِ خداوندی یا قرآنی مملکت کہا جاتا ہے' کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے لیے (24:55) ایک بڑی مشہور آیت ہے۔ اسمیں کہا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (24:55) خدا نے صاحبِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ اب اس آیت میں خدا کا وہی معاہدہ' وہی عہد' وہی وعدہ' آ گیا۔ خدا کے وعدے کے معنی ہوتے ہیں کہ اگر یہ چیز یوں ہو جائے تو یقیناً وہ بات پوری ہو جائے۔ اسی کو' عزیزانِ من! سمجھنے کی اصطلاح میں قانون (Law) کہا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے کئی دفعہ قانون کی یہ Definition (تعریف) آپ کو بتائی ہے۔ یہ مسلمہ Definition (تعریف) ہے۔ جسے آپ (قانون) Law کہتے ہیں' جنہیں Laws of Nature (قوانینِ فطرت) بھی کہتے ہیں تو ان کے لیے آپ کے ذہن میں آتا ہے کہ اگر آگ جلاؤ گے تو پانی گرم ہو جائے گا' اتنے درجے تک کی (Heat) (گرمی) ہو جائے گی تو جوش مارے گا یعنی ابل (Boil) جائے گا۔ یہ کوئی ہنگامی بات نہیں ہے کہ کبھی یہ کچھ ہو جائے اور کبھی نہ ہو۔ جب بھی ایسا کرو گے یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہوگا۔ آپ کو یاد ہے اور آپ نے وہ الفاظ بھی لکھ رکھے ہونگے جو اسکی Definition (تعریف) کے لیے کہے جاتے ہیں: if یعنی اگر یہ کرو گے' then یعنی پھر یہ ہوگا اور Always یعنی یہ ہمیشہ ایسا ہوگا۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ خدا کا یہ وعدہ

ہے کہ ''یہ کرو گے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہ ہو جائے گا'' تو یہ ہے قانونِ خداوندی کا ترجمہ۔ عزیزانِ من! یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ اگر تم آگ جلا کر اس کے اوپر پانی رکھ دو گے تو گرم ہو جائے گا۔ جب بھی ایسا کرو گے ایسا ہو جائے گا: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ❶ (48:23) اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ عزیزانِ من! وہاں Law (قانون) ہوتا ہے۔ Law (قانون) کے بعد آرڈیننس (Ordinance) نہیں ہوتا۔ یہ Law (قانون) غیر متبدل ہے اسی لیے کہا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ❷ (6:34)۔ اس کا Law (قانون) کیا ہے؟ کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55)۔ ایمان یہ ہو کہ یہ جو خدا کے قوانین ہیں' اس کی طرف سے جو عائد کردہ شرائط ہیں' ان کی صداقت پر تمہیں یقین محکم ہو' پورا پورا بھروسہ ہو نیز وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55) یہ یقینِ محکم ہو کہ جب بھی آگ جلائی' پانی رکھا' وہ گرم ہو جائے گا۔ پھر کہا کہ اس کے بعد آگ بھی تو جلاؤ' پانی بھی تو اوپر رکھو۔ یہ جو اگلی چیز ہے' اُسے عملِ صالح کہتے ہیں۔ یہ اس قانون کا عملاً نتیجہ برآمد کرنے کے لیے ضروری ہے' لیکن مذہب میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ''چولہا وی ہوندا اے' تے لکڑیاں وی ہوندیاں نیں' تے دیگچی وی اتے رکھی ہوندی اے۔ ماچس نئیں ہوندی اوناں کول'' ❸۔

جب بھی تم ایمان کے بعد یہ چیز کرو گے تو کیا ہوگا؟ اس کیلیے کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ (24:55) ان سے خدا کا عہد ہے کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) ہم انہیں اس دنیا میں' اس زمین پر' استخلاف' تمکن' مملکت' حکومت' سلطنت' جو بھی نام رکھ لو' عطا کریں گے۔ ان کو یہ کچھ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں دیں گے۔ چنگیزیت نہیں' محض کمزور کو دبا کر نہیں' قوت کے بل بوتے پہ نہیں' بلکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ❹ ہوگا۔

میں نے کہا ہے کہ قرآن کی کوئی بھی بات سامنے لایئے' خواہ وہ ہمارے ہاں اس موجودہ معاشرے میں ہو' یا موجودہ مذہب کے اندر ہو' تو پھر وہاں کوئی بھی اصطلاح اور کوئی بھی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا ہم نے مفہوم نہ بدلا ہو۔ یہی کچھ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ کے معنوں میں ہوا۔ اس ''خلافت فی الارض'' کے معنی وہ خلافت نہیں ہے جو ہمارے ہاں ذہن میں آ گئی ہے یعنی خلافتِ راشدہ۔ وہ تو چلی گئی۔ اب یہ خلافت کیسی؟ آپ نے کبھی پڑھا ہوگا کہ جو حضرت صاحب ہیں' وہ تشریف لے گئے یا ان کی زندگی میں ہی فلاں کو انہوں نے

---

❶ خدا کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1200)

❷ خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 293)

❸ چولہا بھی ان کے پاس ہوتا ہے' لکڑیاں بھی ہوتی ہیں' چولہے کے اوپر رکھی ہوئی دیگچی بھی ہوتی ہے' مگر ان کے پاس دیا سلائی نہیں ہوتی۔

❹ انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔

اپنا مجاز یعنی خلیفہ مقرر کر دیا: تمہیں خلافت دیدی گئی ہے۔ اس دور میں جب یہ خلافتیں یوں بٹا کرتی تھیں، تو تین مملکتوں کی خلافتیں تو آپ کے اس ایک درویش ❶ کے پاس بھی تھیں لیکن کوئی زمین نہیں، روحانیت کے عالم میں ہے۔ رہن نوں مکان وی ہے نہیں۔ گورنمنٹ کوارٹر اچ رہندے نیں ❷۔ ''اب یہ خلافت روحانیت کی طرف بدل گئی، ذہنی ہوگئی۔ وہ عطا کرنے والا' روز اپنے دو دو تین تین خلیفے بناتا چلا جاتا ہے۔ خلافت مل گئی لیکن قرآن تو بھاگنے نہیں دیتا۔ میری بچی نے پوچھا تھا کہ کچھ اس خلافت کے متعلق بھی تو کہو۔ تو میں نے کہا تھا کہ یہ تو زمین پہ نہیں تھی، یہ عالمِ روحانیت میں ہوتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ** (24:55) اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔

عزیزانِ من! اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا۔ انہیں پتہ تھا جو کچھ وہ پہلے کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ مملکت یہ تھی مگر ہمارے ہاں وہ بے ملک نوابی خلافتیں مل رہی ہیں اور رہنے کے لیے مکان تک بھی نہیں ہے۔ اس زمین پہ تو کچھ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالباً کچھ کرنے کے لیے انہوں نے حجام کو بھی خلیفہ کہنا شروع کر دیا۔ ''اے تے الگ بات ہے۔ اوناں اپنی خلافت چھڈ کے ہیئر کٹنگ سیلون بنا دتا۔ لیکن اوتے نائی ہونداسی۔ اونوں خلیفہ کیندے ہوندے سی۔ اوساڈا بڈھا نائی ہونداسی امام بخش۔ اسی اونوں خلیفہ کیندے ساں۔ سانوں تین خلافتاں سن۔ او خلیفہ' ای نئیں سانوں کہن دینداسی: نہ کسی نہ لئی' نہ کسی نے دتی' اوتاں وراثت وچ ملی ❸۔ قرآن کہتا ہے کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ** (24:55) ہم انہیں اس زمین پر حکومت عطا کریں گے اور پھر یہ بات اس ذہن میں آجائے گی کہ یہ اسی طرح ہوگی **كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** (24:55) جس طرح پہلی اقوام کی اس دنیا میں مملکتیں، سلطنتیں، حکومتیں ملی تھیں، یہ بھی اس طرح کی حکومت اس زمین پر ملے گی کہ جس کی کئی ایک مثالیں تاریخ میں پہلے سے موجود ہیں۔ لہٰذا یہ ہے وہ مملکت جسے **كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ** کہا اور مزید کہا کہ **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى** (24:55) یعنی جب مملکت اپنی ہوگی تو پھر وہاں دین کا تمکن ہوگا۔ وہ مملکت یہ تھی۔

---

❶ یہ اشارا پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

❷ رہنے کو مکان نہیں، صرف گورنمنٹ کوارٹر میں رہتے ہیں۔

❸ یہ تو الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنی ''خلافت'' چھوڑ کر ہیئر کٹنگ سیلون بنا لیا' مگر وہ تو حجام ہوتا تھا۔ اسے خلیفہ کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارا بوڑھا حجام امام بخش ہوتا تھا۔ ہم اسے ''خلیفہ'' کہتے تھے۔ ہمیں تین خلافتیں تھیں مگر وہ ہمیں یہ ''خلیفہ'' نہیں کہنے دیتا تھا: وہ خلافت تو اس نے نہ کسی سے چھینی' نہ کسی سے لی' نہ کسی نے دی' وہ تو محض وراثت میں ملی تھی۔

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نزدیک مملکت کے حصول کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ وہ بنیادی آیت ہے جس کی بنا پہ تحریک پاکستان میں ہماری ان کے ساتھ جنگ ہوا کرتی تھی۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے یہ نظریہ پیش کیا اور پھر قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1949) ہمیشہ یہ چیز پیش کیا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے دین کا تمکن تو ''استخلاف فی الارض'' کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ غیروں کی حکومت میں تو دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا بات تھی اس جنگ کی! عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ جب ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں جو تمکن فی الارض حاصل ہوتا ہے' تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! اس نتیجے کی پہلی چیز یہ ہوئی ہے کہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) وہاں ہر قسم کا خوف ختم ہو جاتا ہے' امن نصیب ہو جاتا ہے۔ یہی تو ایمان کا نتیجہ ہے' یہی تو امانت کا نتیجہ ہے جس کو امن کہا ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تمکن فی الارض اس لیے ضروری ہے۔ اس کے فوراً بعد اب پھر وہی يَعْبُدُوْنَنِيْ (24:55) کا لفظ آ گیا۔ یہ ایک اصطلاح پھر آ گئی' جس کا ترجمہ عبادت سمجھ لیا' اس کو پرستش کہہ دیا۔ یعنی تا کہ یہ میری عبادت کر سکیں' اور پھر عبادت کے معنی ہو گئے' پرستش۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ کے لیے اپنی مملکت کی ضرورت کیا ہے؟ یہی تو ہمارے خلاف وہ دلائل پیش کیا کرتے تھے کہ صاحب! قرآن نے کہا ہے کہ تا کہ ''تم میری پرستش کر سکو'' تو وہ تو یہاں ہو رہی ہے' ہندوؤں کی مملکت کے اندر ہو رہی ہے' کر رہے ہیں۔ ہم انگریز کے زمانے میں بھی کر رہے تھے۔ صاحب! اس کے لیے تو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ تھی وہاں لڑائی۔ وہ کہتے تھے کہ اس کے لیے اپنی مملکت کی ضرورت نہیں' لیکن عزیزانِ من! اگر يَعْبُدُوْنَنِيْ قرآن سے پوچھیے تو اس کے معنی یہ ہیں ''تا کہ وہ صرف میری محکومیت اختیار کر سکیں''۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ تو اپنی ہی مملکت کے اندر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس مملکت کا تو مقصود ہی یہ ہے کہ یہاں صرف خدا کی محکومت اختیار کی جائے اور یہ اس طرح کی جائے کہ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (24:55) انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ اگلے الفاظ ہیں' عزیزانِ من! وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (24:55) یہ سب کچھ قرآن میں آنے کے بعد' سمجھنے کے بعد' کر چکنے کے بعد' بھی جو اس سے انکار کر جائے تو اس سے بڑا فاسق کوئی نہیں ہو سکتا ہے!

قرآنی نظریہ میثاق کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت کا ماحصل

عزیزانِ من! آپ کے سامنے دو ٹکڑے آ گئے۔ ایک ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (23:8) اور وہ یہ ہیں' جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا۔ جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس کی بنیاد Theory of Social Contract (سماجی نظریہ میثاق) پر ہے۔ قرآن کے الفاظ میں نظریہ میثاق کے اوپر اربابِ نظم و نسق اور ان لوگوں میں معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جن کے ساتھ وہ یہ کچھ معاہدہ کرتے ہیں تو یہ مملکت خدا کے احکام و قوانین واقدار کو قائم و نافذ کرنے

کے لیے ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے جان و مال اس غرض کے لیے ان کے پاس بطور امانت رکھ دیتے ہیں۔ وہ ان سے معاہدہ (Contract) کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں (Responsibilities) خدا نے لی تھیں ان کے عوض میں وہ سب ہم پوری کریں گے اور اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ❶ (2:38)۔خوف (Fear) بیرونی خطرات کو کہتے ہیں اور حزن (Anxiety) وہ ہوتا ہے جو دل کے اندر ہر وقت ایک دھڑکا لگتا ہے۔ یہ چیز ہوتی ہے کہ اکثر اوقات تو اسکا پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ تو کچھ یوں ہوتا کہ

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جارہا ہے

وہ تسکینِ خاطر بھی اسی قسم کی ہوتی ہے' اس پہ بھروسہ نہیں ہوتا۔ حزن (Anxiety) کے اندر یہ کیفیت ہے: ''مگر دل ہے کہ ڈوبا جارہا ہے''۔ یہ حزن کہلاتا ہے۔ غلط معاشرے کے اندر غیر شعوری طور پر فضا میں ایسے اثرات ہوتے ہیں کہ بظاہر آپ کو اس وقت کوئی خطرہ نہ بھی محسوس ہوتا ہو' پھر بھی آپ محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ کوئی خطرہ ہے اور جب Actually (حقیقت میں) محسوس طور پر وہ خطرہ پیدا ہو جائے تو وہ ''خوف'' ہوتا ہے اور جب یہ چیز Anticipatory (متوقعانہ) ہوگئی یعنی یہ ہوگئی کہ پتہ نہیں کچھ چیز ہے کہ ''نامعلوم کیا ہو'' تو یہ ''حزن'' (Anxiety) ہوتا ہے۔ سو قرآن حکیم نے پہلی چیز یہ بتائی تھی کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:38) خوف بھی نہیں اور حزن بھی نہیں۔ یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! اس نظام میں' جہاں ایک طرف Contract (میثاق) کی ایک پارٹی ہے' عوام اپنی ان چیزوں کو بطور امانت اس کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ پارٹی اس کے معاوضے میں ان کے Rights (حقوق) پورے کرنے کا عہد اور معاہدہ کرے کہ وہ ان کے ساتھ اپنے اس عہد کو پورا کرتے چلے جائیں گے تو یہ ہے سارا قصہ۔ وہ نظامِ حکومت یہ ہے' وہ اسلامی نظام یہ ہے۔ یہ ہے مملکت کا وہ نقشہ جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ میں خود Theory of Social Contract (معاشرتی نظریہ میثاق) کے دینے والے ان لوگوں ❷ کی قدر کرتا ہوں کہ وہ تنہا عقل کے زور پر' فکر کے زور پر' مطالعہ کے زور پر بھی' اس نتیجے پر پہنچے۔ یہ بڑی چیز تھی لیکن یہ نظریہ میثاق آگے جا کر فیل ہو گیا۔ وہ نہیں چل سکا کیونکہ یہ کچھ تو انہوں نے نظری طور پر (Academically) لے لیا' لیکن یہ عملاً کیسے تشکیل

---

❶ ان کے لیے نہ خوف ہوگا نہ حزن

❷ ان لوگوں کے نام اور تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 350,351 کے فٹ نوٹ 3 اور 1 (ص 351)

پائے گا' وہ کونسے جذباتِ محرکہ ہونگے جو ان کو یہ سب کچھ دینے پر آمادہ کریں گے؟ دوسری طرف ان سب کو اس عہد کو پورا کرنے کے لیے کیسے آمادہ کریں گے؟ انہیں یہ جذباتِ محرکہ کہیں نہیں ملے اور پھر یہ چیزیں میکانکی طور پر بھی نہیں ہوسکتیں۔ اسی لیے جمہوریت' اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں' محض تماشہ بن کر رہ گئی۔ تماشہ بھی نہیں بلکہ:

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

[اقبالؒ: بانگِ درا (سلطنت)]

قرآنِ حکیم پیکر کی تبدیلی کے لیے جذبہ محرکہ عطا کرتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو چیز ہے کہ صرف پیراہن بدلتا ہے' اس میں پیکر نہیں بدلتا' اس کے لیے قرآن وہ جذبات محرکہ دیدیتا ہے جن سے یہ چیزیں دل کا تقاضا بن جاتی ہیں۔ دل کے تقاضے کی مثال میں نے یہ دی کہ پیاس لگتی ہے تو پانی پینا آپ کے دل کا تقاضا ہوجاتا ہے' جب تک وہ پورا نہ کریں اس تقاضے کی تسکین نہیں ہوسکتی۔ اتنی سی بات ہے کہ ایک چیز قانونی طور پر حاصل کرلی جائے اور اس میں نفسیاتی تغیر نہ ہو تو نیا قانون مکینکی طور پر کبھی چل ہی نہیں سکتا۔ قانون تو صرف ان استثنائی چیزوں کے لیے ہوتا ہے تاکہ ایسے لوگوں کے لیے جو مختلف طریق سے سوسائٹی کے لیے خطرہ بنے رہیں' اس قانون کے تحت یہ سوسائٹی ان کے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ لہٰذا اس قسم کے لوگوں کے لیے قانون ہوتا ہے ورنہ تمام معاشرے کا پورا نظام' ان جذباتِ محرکہ پر چلتا ہے جو اس کے اندر ہوتے ہیں۔ اس لیے امانات اور عہد کی یہ چیز ہے کہ اس کی پوری پوری رعایت برتنا' پاسداری کرنا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ❶ (23:2)۔ صلوٰۃ ان تمام فرائض کے لیے جامع اصطلاح ہے جو خدا کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں۔ کہا کہ ان فرائضِ منصبی کی ادائیگی دل کے جھکاؤ کے ساتھ کرنا۔ یہاں مومنوں کی چار پانچ خصوصیات بتائی ہیں۔ اس کے بعد آخر میں کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ❷ (23:9)۔ یہاں صلوٰت کہا ہے اور جمع کے صیغے میں بھی کہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جتنی چیزیں ان کے ذمے عائد کی جاتی ہیں' یہ ان کی محافظت کرتے ہیں۔

---

❶ وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ' خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتے رہے یعنی اسکی رو سے جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں' انہیں بطیبِ خاطر سرانجام دیتے رہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔773)

❷ (مختصراً یہ کہ کامیابی و کامرانی کی زندگی ان کی ہے) جنہوں نے خدا کے مقرر کردہ نظامِ صلوٰۃ کی پوری پوری محافظت کی۔ یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں اُن کا قدم قانونِ خداوندی کے اتباع میں اٹھا۔ (24:41)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔774)

یہ پوری کائنات بطور عطیہ انسان کو مل سکتی ہے لیکن جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

آپ نے اس آیت یعنی (23:9) میں یہ دیکھا کہ یہ "یحافظون" کی چیز ہے یعنی یہ ان کی محافظت کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ❶ (23:10)۔ اب پوچھتے ہو کہ جنت کس کو ملے گی؟ تو سنو! الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ❷ (23:11) وہ لوگ فردوس کے وارث ہونگے' اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا بات ہے' ایک لفظ وارث کہہ دینے کی! اس کی جو وسعت ہے وہ سامنے آجاتی ہے۔ کہا کہ یہ جنت یونہی رہنے کے لیے نہیں دیدی' خیرات کے طور پر نہیں دیدی' کرایہ دار کی حیثیت سے نہیں دیدی کہ جب جی چاہے نکال دیا جائے۔ ان کو وارث بنا دیا' ان کو اس کا مالک بنا دیا' اب کسی کا احسان نہیں رہا۔

اس تصور کے مقابلے میں ہمارے ہاں وہ تصور ہے جس کے متعلق کئی دفعہ بات آچکی ہے کہ یہ جنت بخشش کے طور پر دی ہوئی ہوگی اور ہماری تو انتہائی دعا یہ ہوتی ہے کہ دعا کرو' اللہ کسی طرح بخش دے' یعنی بخشش ہو جائے' جب قوم یہاں پہنچ جاتی ہے تو وہ اعمال کے بدلے میں کوئی چیز نہیں لیتی' وہ خیرات پہ اتر آتی ہے۔ یہاں بھی ہم خیرات مانگتے پھرتے ہیں۔ انفرادی طور پہ بھی اور اجتماعی طور پہ بخشش ہی مانگتے پھرتے ہیں۔ یہاں سے آگے جانے کے بعد اللہ کے ہاں سے بھی وہ جنت بخشش کے طور پہ مل جائے۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں بھئی! وہ جو جنت خیرات کے طور پر' بخشش کے طور پر' اس سے لیتا ہے' وہ تو باعثِ ذلتِ انسانیہ ہے اگر اعمال کا فطری نتیجہ ہے تو وہ یہ جنت ہے۔ اس لیے اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ یہ باہر کی چیز نہیں ہے بلکہ تیرے خونِ جگر کا نتیجہ ہے:

جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

عزیزانِ من! قرآن کریم کی آیت میں یوں آیا ہے کہ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ❸ (23:11)۔ انہیں وارث بنا دیا۔ اگر کسی کو خیرات میں کچھ دے کر اس سے کہہ دیا جائے کہ اچھا بھئی! میں یہ کچھ واپس نہیں لونگا' اسے یہ جائز جائیداد میں بھی دیدی جاتی تو کیا یہ وراثت اس طرح سے ملی جس طرح قرآن نے کہا ہے؟ عزیزانِ من! یہاں الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ (23:11) آیا ہے۔ لفظ

---

❶ یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی کی سعادتوں اور کامرانیوں کے وارث ہوں گے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 774)

❷ یعنی اس دنیا میں بھی ایسی زندگی کے مالک جس میں ہر طرح کی وسعتیں اور فراخیاں' سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں اور آخرت میں بھی اسی قسم کی زندگی کے وارث۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے (43:72؛ 7:43)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 774)

❸ اس دنیا میں بھی ایسی زندگی کے مالک جس میں ہر طرح کی وسعتیں اور فراخیاں' سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں۔ اور آخرت میں بھی اسی قسم کی زندگی کے وارث۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 774)

"یرثون" فعل ہے۔ یعنی یہ وہ ہیں جو اس کے مالک بنیں گے۔ وہ یونہی نہیں بنا دیئے جائیں گے۔ پہلے تو یہی چیز لیجیے کہ وہ کیسے مالک بنیں گے؟ کیا انہیں جنت کا قبضہ دے دیا جائے گا اور وہ اندر چلے جائیں گے؟ کہا کہ نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔ انہیں آواز دی جائے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنا دیئے گئے ہو اور یہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7:43) تمہارے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ ہم نے تو کچھ بھی نہیں دیا۔ اس میں تو وہ اپنا بھی احسان نہیں رکھتا حالانکہ وہ اتنے بڑے احسانات کا مالک ہے۔ جنت جیسی چیز کا وارث قرار دیتا ہے' آواز دیتا ہے کہ یہ جنت بھیک کے ٹکڑے نہیں ہے۔ یہ ان کی محنت کا نتیجہ ہے' خیرات میں نہیں ملی ہے۔ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنے ہو۔ کیسے بنے ہو؟ اس کے لیے کہتا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7:43)۔ ارے بھئی! یہ تو تمہارے اپنے ہی کاموں کا معاوضہ ہے جو تم نے کیے تھے' اور یہ تمہیں اس کے بدلے میں ملی ہے۔ ہم نے تو اس میں کچھ نہیں دیا۔ یہ ہے: الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ❶ (23:11)۔ جنت کا لفظ عام طور پہ قرآن میں آتا ہے مگر یہاں "فردوس" کا لفظ آیا ہے۔ ہے تو یہ جنت ہی' لیکن عربی زبان کی رو سے "فردوس" کے اندر وسعتیں اور فراخیاں آتی ہیں۔ عرب اسے ان معنی میں استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لفظ میں وسعتیں اور فراخیاں' سربلندیاں اور سرفرازیاں' سرسبزیاں اور شادابیاں' یہ ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہوں تو اسے فردوس کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ تھا وہ عہد (Contract) جو خدا نے تمہارے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ جان اور مال ان کا خریدا اور یہ جو انہوں نے دیا ہے تو اس کے بدلے میں' اس کی قیمت کے عوض' جو انہوں نے ادا کی' چیز ان کی ہوگئی' ان کو جنت کا مالک بنا دیا۔

اس جنت کی تفصیل تھوڑی سی تشریح چاہتی ہے۔ معاف رکھیے گا' معلوم نہیں آپ احباب کہتے ہونگے کہ میں آجکل وقت زیادہ لے لیتا ہوں۔ جی ہاں! یہاں یہ الفاظ آئے ہیں: هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (23:11)۔ تمہیں پھر وہاں سے کوئی نہیں نکالے گا۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک جنت مفت میں ملی تھی' جو آدم کی جنت تھی؟ وہ عمل کے بدلے میں نہیں تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ایک لغزش ہوئی جنت سے نکال باہر کیا' مگر یہ جو جنت ہے یہ اعمال کے بدلے میں ہے اور اس کے لیے کہا ہے کہ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (23:11) تمہیں وہاں سے کوئی نہیں نکالے گا' تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ یہ ہیں ان مومنین کی صفات و خصائص جو کامیابیوں کی زندگی بسر کریں گے۔ صفات و خصائص کی یہ چیزیں پہلے کہی گئی ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری چیزیں ہیں' اس کے بعد کامیابیوں کی یہ کیفیت ہوگی۔ اب اگلی چیز یہ ہوئی کہ یہ بات صرف کھانے پینے تک ہی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں؟ اگر معاملہ کھانے پینے کا ہی تھا تو حیوان اور انسان میں فرق نہیں ہے۔

---

❶ اس دنیا میں بھی ایسی زندگی کے مالک جس میں ہر طرح کی وسعتیں اور فراخیاں' سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں۔ اور آخرت میں بھی اسی قسم کی زندگی کے وارث۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 774)

عزیزانِ من! اگلی آیت میں یہ بات تمہیں بتائیں گے کہ یہ بات انسان کے متعلق ہو رہی ہے' انسان اور حیوان میں فرق کیا ہے' کہ انسان کی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں ہے۔ یہ حیوانی زندگی کے مراحل طے کرنے کے بعد منزل انسانیت میں پہنچا ہے' اور اب انسانی زندگی کے مراحل طے کرتا ہوا' آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ پھر تمہیں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ یہ نظام کیوں ضروری تھا اور یہ جنت ہوتی کیا ہے؟ یہ بات اگلی آیت میں ہمارے سامنے آئے گی۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمنون کی آیت 11 تک ہم آئے' 12 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلُ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

چوتھا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 12 تا 14)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ‌ۚ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ
نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ‌ ۖ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا
الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ۗ
ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ‌ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ﴿۱۴﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1977ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 12 سے ہو رہا ہے: (23:12)۔

للہ الحمد قریب ایک ماہ کے ناغہ کے بعد تجدید درس کا ہمیں پھر موقعہ ملا۔ 17 اپریل کی اتوار کو آخری درس ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ جو ملک میں سیاسی ہنگامے برپا ہوئے' ان کی وجہ سے حالات سازگار نہ رہے' ہمیں بھی درس کو معطل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس کے لیے کہونگا کہ اجازت پہلے سے لے لی تھی لیکن کرفیو کے حالات ایسے تھے کہ اس میں صبح کے وقت یہاں اکٹھا ہونا مشکل تھا بلکہ بعض اوقات ناممکن تھا۔ اس لیے مجبوراً اس سلسلے کو ملتوی کرنا پڑا۔ یوں تو اب گنتی میں آیا تو چار ہی درس ناغہ ہوا یا ایک ماہ لیکن وہ جو (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869) نے کہا تھا کہ ''شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں'' تو اس ناغے سے جو احساسِ محرومی تھا' اس کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پتہ نہیں کتنے عرصے کے بعد پھر یہ سلسلہ شروع ہوا۔ احباب اس دوران میں جس کرب و اضطراب کے ساتھ اس کے متعلق دریافت کرتے رہے اس سے مجھے احساس ہوا۔ وہ نہ بھی ہوتا تو خود دل پہ جو گزری وہ تو میں ہی جانتا ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ پھر ہم آج جمع ہوئے ہیں۔

ہم آج جمع ہوئے ہیں۔

آج مئی کی 22 تاریخ ہے اور یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ ایسی آیت پہ درس کا آغاز ہو رہا ہے جو درحقیقت دین اور سیکولرازم میں ہی نہیں بلکہ انسان اور حیوان میں بھی خطِ امتیاز ہے۔ بڑی اہم چیز ہے' یوں تو کونسی چیز اہم نہیں ہے لیکن بعض چیزیں اپنے عقائد کے اعتبار سے بڑی ہی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

اس سورۃ کی پہلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ مومن وہ ہیں جن کی یہ خصوصیات ہیں: لغو سے معترض رہتے ہیں' صلوٰۃ قائم کرنے والے ہیں' نوعِ انسانی کی نشوونما کی ذمہ داریاں لینے والے ہیں' جنسی اختلاط میں پابندیوں کو پورا کرنے والے ہیں اور جو امانات اور عہد ہیں' ان کی رعایت رکھنے والے ہیں۔ ان آیات میں یہ چیزیں گنائی گئی تھیں۔

دینِ خداوندی اور سیکولرازم کا بنیادی فرق

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ جو خصوصیات بتائی گئی ہیں' یہ جو پابندیاں گنائی گئی ہیں' وہ کیوں ضروری ہیں؟ حیوانات پر تو وہ پابندیاں ہیں جو فطرت نے ان کے اندر رکھ دی ہیں' جیسے میں ہر درس میں عام طور پہ مثال دیا کرتا ہوں کہ بکری کے اوپر پابندی ہے کہ وہ گوشت نہیں کھا سکتی یعنی وہ اس کے لیے رزقِ حرام ہے اس کے لیے تو اس کے اندر ایک ایسی پابندی ہے کہ وہ رزقِ حرام کھا ہی نہیں سکتی' شیر کے لیے وہی گوشت رزقِ حلال ہے' گھاس رزقِ حرام ہے' وہ رزقِ حرام کی طرف آ ہی نہیں سکتا۔ اگر انسان بھی اسی سطح کے اوپر ہے جس سطح کے اوپر حیوان ہوں تو اس کے لیے بھی حرام اور حلال کا کوئی فرق نہیں ہو سکتا' نہ ہونا چاہیے لیکن جن چیزوں کو پہلے گنایا گیا ہے' قرآن میں تو ان دونوں میں فرق کیا گیا ہے۔ یہ جو فرق کرنے والی چیز ہے انہیں اقدار یا Values کہتے ہیں۔ حیوانات میں Values (اقدار) نہیں ہوتیں' یہاں Necessities (ضروریات) ہوتی ہیں' یہاں صرف ایک حیوان کی جسمانی پرورش کا سوال ہوتا ہے۔ اس کے لیے فطرت کی طرف سے اس کو قاعدے ضابطے دیئے گئے ہیں' یہ ضابطے ان کے اندر ہوتے ہیں۔ یہاں Value (قدر) نہیں ہوتی۔ جیسا میں مثال میں کہا کرتا ہوں ایک بھوکے بیل نے اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ وہ نکلتا ہے' اپنے مالک کے گھر سے سیدھا چلا جاتا ہے' جو کھیت سامنے آتا ہے' اس میں اپنا منہ مارتا ہے' اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ اس بیل کے لیے رزقِ حلال اور حرام کا سوال نہیں ہے۔ اس کے لیے پیٹ بھرنے کا سوال ہے۔ وہ چیز کہ وہ گھاس ہی کھا رہا ہے' یہ تو ایک چیز تھی' جو اس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ گھاس کس کے کھیت سے وہ چر رہا ہے' حیوان کے درجے تک یہ تخصیص نہیں' یہ تمیز نہیں۔

انسان کی خصوصیت صرف Values (اقدار) کی بنا پر ہے

وہ جو چیز ہے کہ اپنے ہی کھیت سے کاٹ کر کھائے' دوسرے کے کھیت سے نہ کھائے' اسے Value (قدر) کہتے ہیں۔ یہ الگ پیمانہ ہے جسے ہم قدر کہتے ہیں' اس کی جمع اقدار ہے' Values اسکا ترجمہ کیا ہے جبکہ عربی زبان میں' قرآنِ کریم ایک اگلی چیز بیان کرتا ہے' میں بتاؤنگا کہ اسے اقدار کیوں کہا گیا ہے۔ ماپنے کا پیمانہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ جو امتیاز کی چیز ہے کہ تم نے اپنے کھیت سے ہی کھانا ہے' اس کی اجازت کے بغیر یا آپس میں رضامندی کے بغیر دوسرے کے کھیت سے کاٹ کر نہیں کھانا' یہ Value (قدر) ہے۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے' حیوان کی نہیں۔ اب حیوان اور انسان کے اندر کونسا خطِ امتیاز ہے کہ وہ انسان ہے اور یہ حیوان ہے۔ تو ہم تو آسانی سے کہیں گے کہ ہمیں پتہ ہے کہ یہ حیوان ہے' یہ بکری ہے' یہ بیل ہے' یہ بھیڑ ہے اور ہم انسان ہیں۔ شکل وشباہت سے نظر آجاتا ہے۔ سوال شکل وشباہت کا تو ہے نہیں۔ شکل وشباہت کے اعتبار سے تو آپ نے سینکڑوں انسان دیکھے ہونگے' جو حیوانات سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟

یورپ میں' 19 ویں صدی میں' یہ جو فزیکل سائنس یا ہیومن بائیالوجی وغیرہ والی سائنس ہے' وہ جوزوالوجی والی سائنس ہے' ان کے ذریعے قریباً 19 ویں صدی میں یہ وہاں تک آئے۔ یہ انسانیت کی بڑی بدبختی تھی کہ وہاں کی جو مذہبیت تھی' جو کلیسائی مذہبی پیشوائیت تھی' اُس نے ان پہ زندگی تنگ اور گراں کر رکھی تھی۔ اس کا ایک ردّ عمل شروع ہوا۔

انسان اور گدھے کی طبعی مشینری میں کچھ فرق نہیں

عزیزانِ من! اس کے بعد تو وہ جو کہتے ہیں کہ رسا تڑا کر بھاگے' وہ واقعی رسا تڑا کر بھاگے۔ بدقسمتی سے وہی وہاں سائنٹفک ریسرچ کا دور تھا۔ وہاں بھی انہوں نے انسان کے جسم کو چیرا پھاڑا' جیسے آج بھی یہاں میڈیکل کالج میں انسانوں کی جو لاش ہے' اس کی تکا بوٹی کرتے ہیں' چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہاں ایک پوسٹ مارٹم کالج ہے' وہاں انہوں نے میز پہ ایک ''گدھا'' لٹایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لڑکے انسان کی لاش کو چیر پھاڑ رہے ہوتے ہیں' وہ ''گدھے'' کی لاش کو چیر پھاڑ رہے ہوتے ہیں۔ ان دونوں نے اس کے اندر دیکھا کہ جو اِس کے اندر ہے وہی کچھ اُس کے اندر ہے' بعینہٖ اسی ترتیب کے ساتھ' اسی نظام کے ساتھ ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڑا جانور ہے' تو اس کے بڑے اعضا ہونگے' چھوٹا جانور ہے چھوٹے چھوٹے ہو گئے لیکن بعینہٖ دونوں میں انہیں ایک ہی چیز نظر آئی۔ تو اس تشریح یا اناٹومی سے یہ سائنسدان اس نتیجے پہ پہنچ گئے کہ صاحب! یہ تو انسان اور حیوان میں فرق ہی کچھ نہیں' دیکھ لو آ کر' کوئی فرق ہے تو بتا دو' ہمیں فرق والی چیز دکھا دو۔ یاد ہے آپ کو شعر:

کسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے
(ریاض خیر آبادی)

انہوں نے وہاں رنگ و بو دیکھ کے فیصلہ کر دیا کہ انسان اور حیوان میں فرق ہی کوئی نہیں۔

انسان کو معاشرتی زندگی کی خاطر سوسائٹی کے قانون کی لازمی ضرورت ہوتی ہے

یہ جو وہاں سوشیالوجی والے تھے انہوں نے کہا کہ کیا کہتے ہو؟ یہاں مل جل کے رہنا ہے۔ یہاں اگر تم نے کہہ دیا کہ انسان اور حیوان میں فرق ہی کچھ نہیں ہے تو معاشی دنگل ہو گیا' پھر تو جینا محال ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لیے سوسائٹی سے قوانین مقرر کر لینا' ان قوانین کی پابندی ان سے کرالو' بس۔ وہ جو چلا آتا ہے کہ

Man is a Social Animal [1]

وہ یہ چیز ہے کہ یہ ہے تو Animal (حیوان) ہی لیکن چونکہ اس نے سوسائٹی میں رہنا ہے' اس واسطے سوسائٹی کچھ قوانین مقرر کرلے۔ جس قسم کے قوانین وہ چاہیں مقرر کر لیں' مقصد یہی ہے کہ ذرا امن چین سے آپس میں رہیں' کوئی ہلڑ بازی نہ ہو' کوئی دھاندلی نہ ہو' کوئی تعدی نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی کے Laws (قوانین) کے ذریعے باہمی امن قائم کیا جائے۔ انسانوں نے مل جل کے تو رہنا ہے' مگر ہیں یہ حیوان ہی۔ تو پہلی چیز تو سوسائٹی کے Laws (قوانین) کی آ گئی۔ یعنی وہاں حیوان انسانوں کے اس مقام سے آگے چلا گیا کہ وہاں وہ بکری اس قانون سے تجاوز کر نہیں سکتی' خلاف ورزی کر نہیں سکتی جو اسکے لیے مقرر کیا گیا ہے اور یہاں جو حیوان شہروں کے اندر رہ رہا ہے جسے انسان کہا جا رہا ہے' قانون تو اس کے لیے بھی ہے لیکن اس کا جب جی چاہے اس کو توڑ سکتا ہے۔

انسان کا وقار تو قانون کے احترام ہی میں ہے

قرآن نے جو پہلے کہا تھا کہ **اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ** (7:179) یہ انسان نہیں' حیوان ہے' وہیں کہا تھا کہ **بَلۡ ھُمۡ اَضَلُّ** (7:179) ان سے بھی بدتر ہے۔ وہ قوانین توڑ نہیں سکتا' یہ توڑ سکتا ہے۔ توڑتے وقت کیفیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کے لیے کہا ہے کہ جاہل بھی ہے' ظالم بھی ہے۔ اس میں اور حیوان میں کچھ ذرا سا فرق پڑتا ہے۔ یہ اس چوراہے کے اوپر دائیں طرف جانے کے لیے کھڑا ہے اور بائیں طرف جانے سے اسے جس سڑک پہ جانا ہو' وہ سائیکل پر ہو' اس کی سڑک اگر دائیں کو جانے والی سڑک سے ذرا پہلے آتی ہے اور وہ چکر ذرا بڑا ہوتا ہے' اسے دو پاؤں زیادہ مارنے ہوتے ہیں' تو ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ پہلے دیکھ لے کہ وہ لال پگڑی والا سپاہی تو

---

[1] انسان ایک سماجی حیوان ہے۔

نہیں کھڑا' اگر ٹوپی والا نہیں ہے تو وہ یوں دندناتا ہوا' سیٹی مارتا ہوا' قانون توڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ سوسائٹی کے Laws (قوانین) کو توڑنے کا جذبہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ یہ تو میں نے چھوٹی سی مثال دی۔ یہاں قرآن نے کہہ دیا کہ مومن اپنے وعدے کے پابند ہوتے ہیں۔ وعدہ تو دو انسانوں کے درمیان ایسا ہوتا ہے کہ جن میں ایک قانونی گرفت بھی کوئی نہیں ہوتی' سوسائٹی میں بھی کوئی اس کے لیے قانون نہیں بنایا ہوا ہوتا۔ تو اگر سوسائٹی کا جو Law (قانون) ہے وہی صرف پابندی ہے تو وہ اس پر کیوں پابند رہے گا؟ تو کوئی بھی وعدے کا پابند آپ کو نہیں ملتا۔ اس نے کہا ہے کہ مومن امانات کی رعایت رکھتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے ہوئے' خاموشی سے' دوسروں سے الگ' آپ کے پاس کوئی امانت رکھ دیتا ہے' جبکہ کوئی دوسرا دیکھنے والا بھی نہیں ہوتا' وہ امانات کی رعایت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مکر جائے تو سوسائٹی کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اس کو اپنی گرفت میں لے لے۔ لہٰذا ہم اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ یہ جنہوں نے انسان کو حیوان قرار دیا اور سوسائٹی کے Laws (قوانین) کو ہی پابندیاں قرار دیا تو سوسائٹی کے Laws (قوانین) منوانے کے لیے انہیں کس قدر تگ و دو اور دردِ سر مول لینا پڑا ہے۔

سوسائٹی کے غلط نظام کے باعث انسانی فکر کی ناکامی اور اس کی مشکلات

یہ کتنی بڑی سپاہ یا پولیس ہے' پھر وہ ریزو پولیس ہے اور وہ جانباز ہے' پھر ان کے اوپر رینجرز ہیں' ان سے کام نہیں چلا' پھر وہ آرمی والے ہیں' وہ عدالتیں ہیں' وہ جیل خانے ہیں۔ یعنی اتنی بڑی آبادی نہیں ہوتی' وہ لوگ نہیں ہوتے جن سے قانون منوانا ہوتا ہے' جتنا اِن منوانے والوں کی تعداد ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سب سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں کہ صاحب! قانون نہیں مانے جاتے۔ یہ سوسائٹی میں جو کچھ ہوا ہے وہ عالمگیر ہے۔ اس وقت بھی ساری دنیا کے اندر قوانین توڑنے کی یہ چیز ہے' کہیں چھوٹے پیمانے پہ ہے' کہیں بڑے پیمانے پہ ہے۔ ''جیہد ادا لگدا اے گھٹ کوئی نہیں کردا۔ تے گھٹ کون کردا اے'' ''عصمتِ بی بی از بیچارگی' جیہڑا کچھ کرن جوگا نہیں ناہوندا۔'' [1] یہ Situation (سماں) عالمگیر ہے۔ یہاں والے بھی چیخ رہے ہیں' بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ کیا کیا جائے؟

انسانی عقل کے نزدیک مصائب و آلام کا تجویز کردہ حل

کیا یہ کیا جائے کہ پولیس تھوڑی ہے' نفری اور زیادہ بڑھا دی جائے؟ سربراہِ مملکت ایک اور قسم کی بھی ریزرو فورس بنا لیتا ہے' آرمی کے اختیارات کچھ اور زیادہ کر دیتا ہے۔ ان کے لیے اسلحے بڑھا دیئے گئے۔ وہ دن رات اس میں غرق ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا نہیں کہ اس

---

[1] جس کا داؤ لگتا ہے وہ اپنا کام کر گزرتا ہے' کمی کوئی نہیں کرتا۔ جو یہ کچھ کرنے کے لائق ہی نہیں ہوتا تو وہ بس عصمت بی بی از بیچارگی ہے یعنی وہ تو بس بے سروسامانی کی وجہ سے پارسا بنا ہوا ہے۔

کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کو حیوان تصور کیا گیا ہے، وہ حیوان جس کے اندر روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے، یہ حیوان سے بھی بدتر ہے۔ ارے اگر حیوان یہی تھا تو اس کے اندر کوئی چیز رکھ دی جاتی تو یہ سارا دردِ سر تو نہ ہوتا۔ ساری قیامت برپا ہوئی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک نقطے کے اوپر آ کر بات رکتی ہے۔ وہ ہے اصل چیز۔ اس بنیاد کو تو لیتے نہیں اور اس کے اوپر جو عمارت چلی جا رہی ہے، ردے پہ ردا رکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہی ہے جو سعدی [1] نے کہا تھا: ''تا ثریا می رود دیوار کج''، یعنی اگر بنیاد کی اینٹ غلط رکھی گئی ہے آسمان تک وہ دیوار ٹیڑھی کی ٹیڑھی جائے گی۔ چلی جا رہی ہے یہ دیوار ٹیڑھی۔ اس بنیاد پہ نہیں آئے۔ آپ نے مسئلے کی اہمیت کو دیکھ لیا کہ یہ مسئلہ، یہ پرابلم کتنی بڑی ہے لیکن عام طور پہ اس طرف نگاہ نہیں جاتی کہ یہ ہوا کیا؟

انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل وحی کی روشنی میں موجود ہے

اب آیئے دیکھیں، قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ مقامات ہیں، عزیزانِ من! جہاں قرآن کی عظمت سامنے آتی ہے۔ جسے معجزہ کہتے ہیں ساری دنیا عاجز آئی ہوئی ہے۔ اس وقت اس مسئلے کے حل میں تو معجزہ وہی ہوتا ہے جہاں انسانی عقل عاجز آ جائے اور وہاں وہ حل بتائے۔ قرآنِ کریم پیچھے سے اقدار (Values) دیتا ہوا چلا آ رہا تھا، وہ انسانیت کا خاصہ جو میں نے ابھی عرض کیا۔ سوال یہ ہوا کہ یہ کونسا انسان ہے جس کا یہ خاصہ ہے؟ یہ ہے، جسے ہم Values (اقدار) کہتے ہیں۔ اور پھر کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن میں ربط نہیں نظر آتا۔ یہ ٹھیک ہے ان بیچاروں کو ربط کیا نظر آئے گا؟ کہ جی پیچھے سے چلا آتا ہے کہ **هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ** (23:9) اور **وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ** (23:8) اور اس کے بعد آیت آتی ہے کہ **وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَـةٍ مِّنْ طِيْـــنٍ** (23:12) انسان کو ہم نے مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ ملا بیچارے کی سمجھ میں کیا بات آئے گی کہ صاحب! معاہدے، عہد اور امانات، عصمت اور عفت سی ان خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد یہ کیوں کہا کہ انسان کو ہم نے مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا؟ ان میں ربط کیا ہے؟ یہ اسے نظر نہیں آ سکتا۔ ربط اسے نظر آئے گا جس کو یہ بات سمجھ میں آئے کہ ان دونوں یعنی انسان اور حیوان میں قرآن نے کیا فرق کیا ہے۔ قرآن نے انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے، ان آیات میں انسان کی پیدائش کا وہ حصہ دیا ہے جسے جنین کہتے ہیں اور وہ جو رحمِ مادر کے اندر ہوتا ہے، وہ پہلے بیان کیا ہے۔ پہلے تو میں یہ عرض کروں کہ یہ چھٹی صدی عیسوی کی بات ہو رہی ہے۔ اس وقت علمی یا سائنٹفک ریسرچ کے اعتبار سے، زمانے کی نہج سے بھی، وہ کتنا پیچھے ہے۔ پھر اس دور میں آپ دیکھیے کہ سائنس کی ریسرچ، بالخصوص انسان کے متعلق دیکھیے ٹھیک اس مقام پہ، چھٹی صدی عیسوی کا جتنا بھی وہ انسانی تحقیق کا علم ہے اس کو سامنے رکھیے، بات سمجھ میں آ جائے گی۔ قرآن سمجھنے کا یہ طریقہ بھی ہے کہ انسان کے سامنے اس کے اپنے دور کی فکر موجود ہو۔

---

[1] سعدی شیرازی (1184-1291)

نزولِ قرآن کے وقت دنیائے عرب کی علمی سطح اور رحمِ مادر میں جنین کے متعلق قرآنی انکشافات

عزیزانِ من! یہ جو Embryology ہے' یعنی جو جنین کے متعلق معلومات' اس دور میں جہاں بھی انسانی علم یا تحقیق پہنچی تھی' وہ محفوظ ہے۔ اسے سامنے رکھ لیجیے۔ یہ عرب جیسا خطہ ہے' جس میں نہ سائنس ہے' نہ تحقیق ہے' نہ فکر ہے' لکھنا پڑھنا نہیں ہے۔ عرب میں مکہ کیپٹل سٹی ہے' اور ویسے بھی بہت مشہور سٹی اس تمام دائرے کا مکہ ہی تھا۔ بہت بڑی کاوش کی ہے تو معلوم ہوا ہے کہ مکے میں سترہ افراد ایسے ملے ہیں' جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے یعنی Educated نہیں۔ یہ وہی ہے جسے آپ عام خواندگی کہتے ہیں۔ اور ان میں ایک ایسا شخص تھا' جو وہ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ تقابل کر کے دیکھیے' پھر قرآن سمجھ میں آتا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں' اس دور میں' ایمبریالوجی (Embryology) کے متعلق یعنی جنین کے متعلق' جو تحقیقات تھیں' انہیں سامنے رکھ لیجیے' عزیزانِ من! ہم عقیدے کی بنا پہ کچھ نہیں کہتے۔ میں تو کم از کم یہ بات عقیدے کی بنا پہ نہیں کہتا۔ یہ بات علیٰ وجہ البصیرت ہونی چاہیے۔ ایمبریالوجی (Embryology: علم الجنین) کے متعلق اس دور کی جو تحقیقات ہیں' ان میں جو بڑی سے بڑی تحقیقاتی چیزیں ہیں انہیں سامنے رکھ لیجیے۔ دوسری طرف اس ملک کے اندر جتنے پڑھے لکھے لوگ تھے' ان کے پڑھے لکھے ہونے کے علم کی جو سطح تھی' اس سے مقابلہ کر لیجیے اور ان کے ہاں کی خواندگی (Literaoy) کو بھی دیکھ لیجیے۔ اس میں بھی آتا ہے وہ ایک شخص اتنا بھی نہیں جانتا مگر یہ دیکھیے کہ وہ ان دو آیتوں کے اندر کیا کچھ بیان کر گیا ہے حالانکہ وہ جو اس زمانے کی جنین کے متعلق تحقیق تھی وہ قیاسات پر مبنی تھی' بعد کی تحقیقات نے اس وقت آ کر ان کو مردود قرار دیا ہے' باطل قرار دیا ہے' اس کی تردید کر دی ہے اور غلط قرار دیدیا ہے اور یہ جو اس تاریک ترین خطہ کے اندر' ان پڑھ آدمی' اس دور میں' جو موضوع وہ بیان کر رہا ہے' وہ آئینے کی طرح ہے جو اس وقت انکشاف ہوا ہے۔ آج چیر پھاڑ کے بعد' اور ایمبریالوجی (علم الجنین: Embryology) کے علم کی جو انتہا ہے' وہ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ میں اس کو صرف جنین تک لا رہا ہوں۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ رحمِ مادر میں' کسی عورت کے رحم کے اندر انسان کی یا بکری کے رحم کے اندر جو حیوان کی اسٹیج ہے' دونوں مشترک چلی آ رہی ہیں لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ اتنے میں بھی قرآنِ کریم جو بیان کر گیا ہے' علمی ریسرچ اس کی تصدیق کر رہی ہے اور اسی Contemporary (ہمعصر) دور میں ہمعصروں کے ہاں کا اس دور کا علم جو انتہا پہ پہنچا ہوا تھا' اس سے بھی اس کی تصدیق ہو رہی ہے۔

قرآنِ حکیم کا تو ایک ایک لفظ اپنی جگہ سائنٹفک ریسرچ کی انتہا ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (23:12)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اب یہ تو وہ آیتیں

آ گئی ہیں' عزیزانِ من! جن کے لیے واقعی جی چاہتا ہے کہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے اسٹوڈنٹ کو میں سامنے بٹھاتا اوران کو بتاتا۔ یہ ان کے بتانے کی چیز تھی اوران کے اساتذہ کو بتاتا' مغرب کے ریسرچ اسکالر کو بتاتا۔ قرآن کے دولفظ ہوتے ہیں' سائنٹفک ریسرچ کی جوانتہا ہوتی ہے' بات وہاں دولفظوں میں پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے تو اس کا ترجمہ کردیا ''مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔'' کیا پتہ ترجمہ کرنے والوں کو کہ مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا تو یہ کیا پیدا کیا؟ اور پھر وہ جو عام مفہوم ہمارے پاس ہے' وہ سامنے ہے کہ مٹی کا باباآدم کا ایک پتلا بنایا۔ وہ سیدھی سی بات ہے کہ جی' وہ مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ''جس طرح کمہار مٹی نوں گوندا ہیگا نا اوہدے وچوں وٹے لکھ کڈ دیندا ہے نا صاف ستھری مٹی لیندا اے نا'' ❶ اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ آدم کا پتلا بنایا۔ مطلب یہ ہے۔ اب انہیں کون بتائے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟

تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں سائنسی انکشافات

سائنس کے انکشاف کی انتہا اس پہ پہنچی ہے کہ زندگی کی نمود کیسے ہوئی۔ قرآن نے یہ کہا کہ **وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ** (23:30) پہلے بات یہ سوچ لو کہ اس کی نمود کے لیے بنیاد پانی ہے۔ جب تک کسی چیز کو پانی نہیں ملتا تو زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ میں بار بار لفظ ''نمود'' استعمال کررہا ہوں۔ قرآن کی رو سے وہی کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ زندگی پیدا نہیں ہوتی' وہ تو پیدا کرنے والے نے پتہ نہیں کس شکل میں پیدا کر رکھی تھی۔ اس کے ہاں کی وہ پیدا ہوئی جو چیز ہے' کسی خاص شکل میں اس کی نمود ہوتی ہے' Manufacturing ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ نمود کی پہلی شرط پانی ہے اور پانی کے ساتھ دوسری شرط خالص مٹی کی ملاوٹ قرار دی۔ یہ دو چیزیں ملتی ہیں تو زندگی کی اولین نمود ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ زندگی کی اولین نمود' یہ جو جوہڑ تالاب ہوتے ہیں' ان کے کنارے پر جہاں پانی اور مٹی ملتی ہے اوراس میں کچھ حرارت پڑتی ہے' تو زندگی کا اولیں جرثومہ جسے لائف سیل کہتے ہیں وہ اس سے پیدا ہوجاتا ہے۔ قرآن نے پانی کہا' طین کہا' مٹی کہا' اور ایک آیت میں طیــــــن لازب کہا۔ جب مٹی اور پانی دونوں مل جائیں تو اسے طینِ لازب کہتے ہیں۔ لیکن اس نے سـلٰـلـة کہا کہ وہ مٹی کے اندر کوئی اور چیزیں ملی ہوئی نہ ہوں۔ اگر یہ ملی ہوئی ہوں تو اس سے یہ فرسٹ لائف سیل نہیں پیدا ہوتا۔ یہ ساری کثافتیں اس میں سے نکل جائیں' اس کے بعد وہ مٹی اور یہ پانی دونوں ملیں۔ اس لیے کہا کہ پھر سورج کی حرارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو یہ جو چیز ہے اس سے زندگی کے پہلے جرثومے یعنی لائف سیل (Life cell) کی نمود ہوتی ہے۔ اندازہ لگایئے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ انسان کی ابتدا جو ہے یعنی جو **بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ** (32:7) ہے' وہ **خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ** کی بات نہیں ہے' وہ

---

❶ جس طرح کمہار مٹی کو گوندھتا ہے' پھر اس میں سے پتھر کے ریزے اور تنکے نکال دیتا ہے۔ صاف ستھری مٹی لیتا ہے۔

بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ (32:7) کی بات ہے یعنی زندگی کے اوّلیں جرثومے سے انسان کی پہلی ابتدا ہوئی' کی بات ہے۔

انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہمارے ہاں صدیوں سے پائے جانے والے تصورات

اب وہ جو ہمارے ہاں Pre-formation (ساختِ اوّلین) کا تصور ہے تو وہ بھی یہ ہے کہ بنا بنایا ہوا انسان کا ایک پتلا تھا' جو اللہ تعالیٰ وجود میں لے آیا' وہ کیسے بنا جی؟ کہا کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ ٹھیک ہے "او کمہیار جنا کم وی نہیں کرسکدا"؟ [1] بنا کے رکھ دیا۔ اب آگے بات نہیں چل رہی۔ اکیلا آدمی تو ایک بنا تھا۔ بابا آدم اگر کروڑ بھی مرد بنا دیئے جائیں آگے تو بھی بات نہیں چلتی۔ عزیزانِ من! یہ جو ذہن میں مروجہ چیزیں ہیں ان کو کہنا پڑتا ہے' ورنہ میرا جی نہیں چاہتا کہ اس مقام پہ آ کر میں ان کو دہرایا کروں۔ ارے بھئی! جس نے یہ بنا دیا تھا' اسی قسم کی ایک عورت کو بھی ساتھ کیوں نہ بنا دیا؟ وہ اس کے ساتھ نہیں بنائی' وہ یوں بنایا کہ اس کی پسلی چیری۔ اس میں سے عورت نکالی لیکن میں نے کہا ہے کہ ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ محرف تورات نے جو قصے دیئے ہیں' وہاں سے انہوں نے مانگ لیے۔ وہ افسانوں کی یہ کتاب ہے اور قیامت یہ ہوئی کہ افسانوں کی کتاب قرآن کے ساتھ تھوپی گئی۔

رحمِ مادر میں قدم قدم پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ

قرآن کہتا ہے کہ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ (32:12) انسان کی زندگی کی پہلی ابتدا یہاں سے ہوئی۔ اور اس کے بعد قرآن نہایت مختصر الفاظ میں یہ Stages (مراحل) گنا رہا ہے جو رحمِ مادر کے اندر تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں' جنہیں اُس صدی میں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا' ریسرچ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ساری Stages (مراحل) وہ ہیں جو آج کی تحقیق کے مطابق پوری اتر رہی ہیں۔ کہا کہ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ (32:12)۔ اور میں کیا عرض کروں! جی مجھے آگے بڑھنا ہی چاہیے' ایک ایک لفظ پہ رکونگا تو ایک ایک درس چاہیے۔

یہ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ اُس نے کیا چیز کہی ہے؟ جب چلنے والی کوئی چیز کسی مقام پہ آ کر ٹھہر جائے' تو اسے قرار کہتے ہیں۔ وہ جامد نہیں ہوتی۔ پہلے یہ حرکت ہے۔ یہ جو Pregnancy (حمل) ٹھہرتا ہے' اس کا آج کی ریسرچ والوں سے پوچھیے کہ کس طرح سے یہ جو مادہ منویہ ہوتا ہے' جو اس کا جرثومہ ہوتا ہے' وہ Travel (سفر) کرتا ہے' وہ آگے چلتا ہے' وہ وہاں عورت کے رحم پہ جا کے کہیں چپک نہیں جاتا' وہاں ایک خلیہ سا ہوتا ہے' وہ اس کے اندر جا کر حرکت سے رکتا ہے' اسے قرار اور مکین کہا۔ اب وہ مقام ہے جہاں وہ اس کے اندر جا کے رک گیا ہے۔ خیر مجھے یہاں جلدی سے بڑھنا چاہیئے' میں نے کہا ہے کہ ان چیزوں کا صحیح مقام وہ لوگ ہیں جن کی یہ Branch of Knowledge (علم کی شاخ) ہے۔ وہ سامنے ہوتے تو میں قرآن کے دیگر مقامات سے بھی انہیں بتاتا کہ وہ کیا کیا کرتا ہے۔ ان کے

---

[1] کیا وہ کمہار جتنا کام بھی نہیں کر سکتا؟

نقشے کے اوپر میں بتا تا کہ دیکھو قرآن نے جو Stages (مراحل) گنائی گئی ہیں' ان پہ نگاہ رکھو۔ ان سے کہتا ہے کہ میں قرآن کی یہ آیات پڑھتا جاتا ہوں اور تم دیکھتے چلے جاؤ کہ کس طرح سے شہادت ملتی ہے۔ **ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً** (23:14) وہ یونہی لوتھڑا سا جسے ہم کہتے ہیں' ہوتا ہے۔ لوتھڑا تو پھر بھی اس کے لیے صحیح لفظ نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کے لیے لفظ لوتھڑا ہی ہے۔ اس لوتھڑے میں پھر بھی گوشت کا کچھ تصور آتا ہے مگر یہ جس کو پلازمہ (Plasma) کہتے ہیں یہ ہوتا ہے۔ اب وہ پلازمہ تو جس طرح سے وہ جالی سی ہوتی ہے' وہ چیز ہوتی ہے۔ یعنی علق جالی سی ہوتی ہے' یونہی کسی چیز کے ساتھ چپکی ہوئی' پلازمہ کی شکل میں ساتھ یوں لگی ہوئی۔ **فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً** (23:14) وہ جو جالی سی تھی' اب اس کے اندر تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ گوشت ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن وہ گوشت کا ٹکڑا ابھی بن جائے تو آگے بات نہیں چلتی۔ آگے کہا کہ **فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا** (23:14) گوشت کے اس ٹکڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ **فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا** (23:14)۔ عظام [1] خاص طور پر ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں اور یہ وہیں سے عظیم کا لفظ ہے۔ عظیم شے ہی وہ ہوتی ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ہو۔ جو Invertebrates [2] (غیر فقاری) ہوتے ہیں' ان کو ''عظمت'' نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ان میں ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ پھر وہ جو ہڈیاں تھیں' انہیں ڈھانچے کی صورت میں ابھار دیا۔ **فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا** (23:14) پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔ جلدی جلدی میں پاس ہو رہا ہوں کہ موضوع تو آگے ہے۔ ہر حیوانی جنین ان Stages (مراحل) سے گزرتا ہے' انسانی جنین بھی انہی سے گزرتا ہے۔

آج کی سائنٹفک ریسرچ کا آخری مقام

عزیزانِ من! انیسویں صدی کی سائنٹفک ریسرچ کا آخری مقام یہی ہے۔ حیوان کی مادہ (Female) کے رحم سے بھی ایک بچہ نمودار ہو جاتا ہے' انسان کی مادہ (Female) کے رحم سے بھی ایک بچہ نمودار ہو جاتا ہے اور انہی Stages (مراحل) سے پاس ہوتا ہے۔ حیوان وہاں آ کر ختم ہو گئے' وہ مراحل ان کے لیے آخری بات تھی' اس سے آگے نہیں بڑھے۔

---

[1] عَظْمٌ ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عَظْمُ الْفَدَّانِ کسان کے ہل کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جس کے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ ہل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عَظَمَاتُ الْقَوْمِ قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ عَظْمُ الطَّرِيْقِ راستے کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عَظَمَةٌ کے بنیادی معنی تکبر وغرور' بڑائی نیز عزت وحرمت کے بھی ہیں۔ اَلْعَظِيْمَةُ سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ (تاج العروس)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا ہونے اور قوی ہونے کے ہیں۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص۔ 1175)

[2] Invetebrates have no backbone or simple column.

اس مادی جسم کے بعد انسان اور حیوان میں ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا

سنیئے' عزیزانِ من! کہا کہ یہاں تک تو جو چیز ہوگی وہ تم حیوانی اور انسانی جنین میں مشترک پاؤ گے۔ اور آگے ایک لفظ ہے۔ کیا بات ہے صاحب! کوئی لفظ اس کو ادا نہیں کرے گا۔ کہا کہ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (23:14) اسے ایک بالکل نئی قسم کی مخلوق کی شکل میں نمودار کر دیتے ہیں۔ ''ایہد ے بعد کچھ ہور دا ہورای ہوگیا'' [1]۔ اس ''آخر'' کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ عربی زبان کا جو یہ لفظ ہے' اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ جو پیچھے سے کڑی در کڑی سلسلہ چلا آ رہا ہے' اب ذہن میں یہ تھا کہ اس مسلسل چلے آ رہے' کی اگلی کڑی کچھ ایسی ہی ہوگی' جیسی پچھلی کڑی آ رہی ہے' انہی میں کچھ تھوڑا سا اور لیا' اور وہ ترقی کرتا چلا جائے گا' بنیادی اعتبار سے تو وہی ہوگا لیکن کہا کہ نہیں' اب اس کے بعد تو وہ کچھ اور سے اور ہوگیا۔

آخر کے لفظ کا مفہوم

عزیزانِ من! جو اٰخر کا لفظ ہے' اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ'' کچھ اور کا اور ہی ہو جانا۔'' آخرت کی زندگی تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہے؟ اب یہاں سے آپ سمجھ لیجیے کہ بات کیا ہوئی؟ کہا کہ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (23:14)۔ حیوان میں تو یہ بات نہیں۔ وہ تو وہاں ختم ہوگیا' جہاں تک آیا تھا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ وہاں اندر سے بچہ تیار ہوگیا اور اس کے بعد کہا کہ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (23:14) اور اس کے بعد بس کچھ اور سے اور ہوگیا۔ یہ ہے جی وہ Stage (مرحلہ) جہاں قرآن حیوان اور انسان میں خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ اگر وہاں تک ہی رہے جو پچھلی Stages (مراحل) گنائی گئی ہیں تو اس اسٹیج تک اگر انسان کا تصور ہے تو وہ تو پھر حیوان ہے۔ وہ ٹھیک ہے جو کچھ انہوں نے کہا۔ وہ وہاں رکے ہوئے ہیں اور پھر ''اس حیوان'' [2] کے متعلق جو مصیبتیں پیدا ہو رہی ہیں کہ وہ جنگل میں نہیں رہتا' شہروں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتا ہے' اس کی ساری مصیبتیں یہاں بھگت رہے ہیں کیونکہ وہ وہاں کھڑے ہوگئے۔ اب یہ جو اتنا سا اگلا ٹکڑا ہے' یہ کیا ہے؟ کہا کہ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (23:14)۔ یہ ان سائنسدانوں کے ہاں نہیں آیا۔ بات ساری اس خلقًا اٰخر کی ہے' عزیزانِ من! آیئے دیکھیں کہ یہ خلقًا اٰخر کیا ہے؟ کس چیز سے یہ کچھ اور بنتا ہے؟

عزیزانِ من! مجھے اب درس کے آخری ادوار میں زور سے یہ کہنا پڑا کہ خدا کے لیے قرآن کے نسخے اپنے ساتھ لایا کیجیے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سے نسخے ملتے ہیں' جو آپ کے پاس جیب میں آ جاتے ہیں۔ یہ ناظرہ بھی اگر آپ پڑھنا جانتے ہونگے تو آپ کے

---

[1] اس کے بعد وہ کچھ اور ہی بن گیا۔

[2] یہ اشارہ انسان کی طرف ہے۔

سامنے وہ لفظ آئے گا تو آپ Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ کیا بات ہے جواب تک آپ زبانی سنتے رہتے ہیں۔ یونہی آپ کے ذہن میں کوئی ایک تصور سا آتا ہے' میری باتوں سے قرآن کا وہ لفظ سامنے نہیں آتا۔ بات تو ساری یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ وہاں یہ حیوان تھا۔ یہ بات ہوئی تھی کہ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ (32:7)۔اس میں' میں نے کہا تھا کہ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا کہا ہے یعنی یہ Pre-formation (ساختِ اوّلین) کا تصور نہیں ہے کہ یہ بنا بنایا ہوا انسان آ گیا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ انسان کی تخلیق کی ابتدا تھی۔ وہ جو ہمارے ہاں کا تصور ہے کہ خدا نے مرد انسان کا ایک پتلا بنا دیا' وہ بــدا [1] کے خلاف جاتا ہے۔ وہ تو یہاں سے ابتدا کی۔ جہاں سے ابتدا کی جاتی ہے تو وہ تو Physiologically (طبعی طور پر) وہاں تکمیلی سطح تک نہیں ہوتا' وہ تو مختلف کڑیاں گزرتا ہے' تو وہاں سے آخر میں جا کر' پھر وہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ ایک لفظ بــــــد آنے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ تو یہ Pre-formation (ساختِ اوّلین) کا تصور نہیں ہے' یہ پہلے سے بنی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے کہ ایک Accomplished Finished Form (مکمل تیار شدہ ہیئت) کے اندر یکلخت پتلا کھڑا کر دیا۔ یہ تو یہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اور پھر آگے وہی طین آیا ہے کہ مِـنْ طِيْـنٍ (32:7) اس کا آغاز اُس بے جان مادہ (Inorganic Matter) سے ہوا۔ اس بے جان مادہ یعنی طِيْــــنٍ لَّازِبٍ (37:11) کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو اس میں زندگی کے اوّلین جرثومہ (Life Cell) کی نمود ہوئی۔ اس کے بعد' یہ کاروانِ حیات مختلف مراحل طے کرتا ہوا اُس وادی میں آ پہنچا جہاں کہا کہ ثُـمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (32:8) افزائش نسل بذریعہ تولید (Procreation) یعنی نر اور مادہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ وہ گنا تا چلا جاتا ہے۔ اب آیئے خـلـقًا اٰخر کے اوپر۔ کہا کہ یہاں تک تو یہ جو انسان اور حیوان ہے' اس کا جنین انہی مراحل سے گزرتا ہے' دونوں یکساں مراحل میں سے گزرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے روح خداوندی کا لفظ انسان کے اختیار ارادہ کی قوت کے عطا ہونے کا نام ہے

یہاں جو خلقًا اٰخر کہا ہے' اس میں کہا ہے کہ نَـفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32:9)۔ وہ سارا مکینکل پروسیس (میکانکی عمل) ہو رہا تھا' مادی ہو رہا ہے' فزیکل ہو رہا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ اب اس میں یعنی انسان کے اندر' ہم نے خالص خدا کی جو ایک قسم کی قوت

---

[1] بَدَأَ بِهٖ. بَدْأً وَابْتَدَاَ ۔ کسی چیز کے ساتھ شروع کرنا۔ بَدَأَ الشَّیْءَ اس چیز کو شروع کر دیا۔ اس نے پہل کی۔ فُلَانٌ مَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ ۔ فلاں آدمی نہ از خود کوئی بات کرتا ہے۔ (Initiate کرتا ہے) اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتا ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد اوّل)' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1960' ص۔ 301)

تھی، وہ اسکے اندر پیدا کی اور اسکا نتیجہ یہ تھا کہ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (32:9) یہ صاحبِ ہوش وحواس، بصارت والا، بصیرت والا، فکر والا، علم والا، صاحبِ ارادہ، انسان بن گیا۔ حیوان میں ارادہ نہیں ہوتا، حیوان اس پابندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے جو اسکے اندر رکھ دی گئی ہے۔ یہ جو اس نے کہا ہے کہ اس میں ''خداوندی توانائی'' (Divine Energy) پیدا کی تو میں نے عرض کیا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، کچھ مفہوم سمجھانا ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تو روحِ خداوندی ایک چیز لے آئے اور کہا کہ: صاحب! پھر خدا کی ایک روح ہوگئی پھر اس روح میں سے تھوڑی تھوڑی ہر انسان کو ملی، اور تصوف کی ایک عمارت بنی، کہ ہاں یہ تو خدا کی روح میں سے اتنی اتنی اتنی جو ہے وہ ہر ایک کے اندر ڈال دی۔ ''اوہدے اچ باقی کی بچیا ہونا پچھے؛ اوبھورا بھورا وی لئی ہووے اوہدے وچوں مکی نہ ہووے گی تے کم از کم تھوڑی بہت گھٹ تے گئی ہووے گی۔'' ❶ میں کیا عرض کروں کہ کیا کیا چیزیں ہمارے ہاں آ گئیں۔

ہمارے ہاں روحِ خداوندی کے متعلق پائے جانے والے غلط تصورات کا نتیجہ

عزیزِ من! اس روحِ خداوندی میں سے کچھ حصے اُسے نہیں دیئے گئے۔ وہ جو خداوندی ایک خصوصیت ہے، جو اس کائنات میں انسان کے سوا کہیں اور نہیں تھی کہ خود دیکھ کر، سن کر، سمجھ کر، کسی چیز کا کسی چیز میں فرق کرنا، فیصلہ کرنا، اس کو اختیار کرنا، اس کو چھوڑنا، یہ اسے دیا گیا۔ اسی طرح یہ جو ارادہ ہے، وہ اسے دیا گیا۔ یہ ارادہ ہے اصل میں جو اسے دیا گیا۔ یہ اختیار و ارادہ سماعت بصارت قلب، سمجھ سوچ کے اوپر مبنی ہو تو تقلید ختم ہوگئی۔ تقلید تو حیوانی درجہ ہوتا ہے۔ ہر حیوان مقلد ہوتا ہے۔ ہر بکری کا بچہ اُسی طرح چلتا ہے، وہی کچھ کرتا ہے جو اس سے پہلی بکری کر رہی ہوتی ہے۔

مقلد کا قرآنی مفہوم اور تقلید پرستی کا نتیجہ

یہ تو جو لفظ تقلید ہے، بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ جی، ہم مقلد ہوتے ہیں۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اسکے معنی کیا ہیں۔ یہ مویشی کے، حیوان کے، گلے میں جو وہ رسی ڈالتے ہیں اور اس رسی کو پکڑ کے اگلا چلتا ہے، اس کو قلد کہتے ہیں۔ تقلید یہاں سے ہے۔ ''گلے دی رسیاں اوناں نے بندھیاں ہویاں نیں، لے کے تری جا ریا اے۔'' ❷ اور پھر یہ بھی نہیں ہے کہ وہ گڈریا یا چرواہا جو ایک بیل کی رسی کو پکڑ کر لیے جا رہا ہے، وہ تو ان کے ہاں یوں ہے جیسے آپ نے قطار دیکھی ہے، وہ ایک کو کوئی آگے چلانے والا ہوتا ہے پیچھے ہر اونٹ کی دم کے

---

❶ اس میں باقی کیا بچا ہوگا!! اگر اس میں سے ذرہ ذرہ کر کے بھی لیا ہوگا تو اگر وہ ختم نہیں ہوئی ہوگی تو بہت حد تک کم تو ضرور ہوگئی ہوگی۔

❷ انہوں نے گلے کی رسیاں باندھی ہوئی ہیں۔ یہ اسے لے کر چلا جا رہا ہے۔

ساتھ پچھلے اونٹ کے نکیل کی رسی باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ بس چلا جا رہا: پہلی قطار کا اونٹ ہو' دوسری قطار کا اونٹ ہو' کوئی پتہ نہیں ادھر کیوں چلے جا رہے ہیں صاحب! وہ یہ حیوانی سطح ہے۔ اس حیوانی سطح کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پچاس لاکھ سال پہلے کے بھی جو کسی بکری کے یا بھیڑ کے ہڈیوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں' بالکل اسی قسم کی یہ بکری اور بھیڑ ہے جیسی آج بکری اور بھیڑ ہے۔ تقلید میں ہوتا یہ اسی قسم کا ہے' اور آج بھی بکری کا بچہ پیدا ہوتا ہے' بکری کا ہی بچہ رہتے ہوئے مر جاتا ہے۔ یعنی کسی قسم کی Improvement (بہتری) نہیں' کسی قسم کی ترقی نہیں' کوئی تبدیلی نہیں۔ جیسے پیدا ہوا' اسی قسم کا ہی مر جاتا ہے۔ یہ ہوتا ہے مقلد۔

کائنات کی کسی شے کو بھی اختیار و ارادہ کی یہ قوت (روح) عطا نہیں کی گئی

یہاں جسے روحِ خداوندی کہا گیا ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ اب میں توانائی کے سوا اس کا ترجمہ اور کیا کروں۔ کہا یہ ہے کہ یہ روحِ خداوندی چیز تھی' وہ قوت تھی' وہ توانائی تھی' جو انسان کو دی اور اس سے وہ حیوانات سے الگ ہو گیا۔ اب یہ جو کہا ہے کہ **ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) تو وہاں پہنچنے کے بعد ہم نے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ یہ ہے وہ چیز جو حیوانات میں نہیں ہے' تمام مخلوق میں کسی اور میں بھی نہیں ہے۔ قرآن میں کسی جگہ اور کسی مخلوق کے لیے یہ چیز نہیں آئی ہے۔ یہ صرف انسان کے لیے ہے۔ یہاں یہ چیز ہے جسے یہ کہا گیا ہے اور کس حسین انداز میں کہا گیا ہے کہ **خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) کچھ اور ہی بنا دیا۔ تو میں آپ احباب سے یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کم از کم قرآن کے نسخے رکھیے اور یہاں پہلی چیز یہ بھی ہے کہ اس سے پہلی نسل کو کچھ فارسی بھی آتی تھی' مگر یہاں تو یہ بھی نہیں ہے۔ وہاں سے میں جو سمجھانے کے لیے نیچے اترتا ہوں تو اقبالؒ (1877-1938ء) ہی سامنے آتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی زبانی "خلقًا آخر" کی تفسیر

ہماری اس دور کی خوش بختی ہے کہ اس میں ایک ایسا شخص ❶ پیدا ہوا جس کی قرآن پہ عمومی نگاہ اتنی بڑی تھی اور پھر بات کرنے کا ایسا حسین سلیقہ تھا کہ شعر اور ادب کے ساتھ جن کا کچھ لگاؤ ہے' دلچسپی ہے' وہ Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ کیا شخص تھا! یہ ہے وہ چیز **خلقًا اٰخر** کہ کچھ اور بنا دیا:

ز آب و گِل خدا خوش پیکرے ساخت

ٹھیک ہے خدا نے پانی اور مٹی سے ایک بڑا اچھا پیکر بنا دیا' بابا آدم نہیں' یعنی وہی حیوانی سطح پر جو انسان ہے وہ آب و گل سے ایک پیکر تراشا ہوا' خوش پیکرِ ساخت بنا ہوا' اسے حیوان سے ذرا اچھا بنا دیا:

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ز آب و گِل خدا خوش پیکرے ساخت

جہانے از ارم زیبا ترے ساخت

اور وہ کائنات جو اس نے بنائی، ٹھیک ہے، ہم مانتے ہیں لیکن یہ تو سارا جہانِ آب و گِل ہے۔ اس کی زیبائی اور رعنائی میں بھی کچھ فرق نہیں کچھ اختلاف نہیں ہے صاحب! بہار کے موسم میں دیکھیے کہ یہ آب وگل کیا کرتی ہے

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

ایک ایک بوند اس کی، ایک ایک پتی اس کی، رعنائیاں اس کی، زیبائیاں اس کی، جاذبتیں اس کی، پوچھو نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے یہاں تک یہ کچھ بنادی ہم مانتے ہیں کوئی شبہ نہیں۔ انداز یہ ہے کہ خدا خوش پیکرے ساخت۔ ٹھیک ہے

ولے ساقی بآں آتش کہ دارد

اس کے بعد میرے ساقی نے اس آتشی شعلے کو جو اس کے پاس تھا اس نے اس سے

ز خاکِ من جہانِ دیگرے ساخت

میری اسی مٹی سے باہر کی دنیا بنا ڈالی، اس کو روشن کر دیا، اُسے منور کر دیا۔

نفسِ انسانی کی بنیاد پر انسان کا مقامِ بلند

عزیزانِ من! شعر کی دنیا میں پوچھیے کہ شعر کی جو انتہائی خوبی ہوسکتی ہے اور میں کہونگا کہ تغزل کی جو خوبی ہوسکتی ہے اس پر پرکھ کے دیکھیے، بڑے سے بڑا بھی عش عش کر اٹھے گا۔ اور کتنی بڑی چیز ہے کہ **خلقا اٰخر** کو جہانِ دیگرے کہا اور کس انداز سے بآں آتش کہا کہ یہ وہی ہے جسے نفخ فیہ من روحنا کہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، مگر اس شخص نے کس خوبی سے ترجمہ کیا کہ ٹھیک ہے خدا نے یہ سارا کچھ بنا دیا لیکن میرے ساقی نے اس آگ کے شعلے کو جو اس کے ہی پاس تھا، کسی اور کے پاس نہیں تھا، اسی آب و گِل کے ہیولے سے ایک نئی دنیا تخلیق کر دی۔ یہ ہے وہ **خلقاً اٰخر**۔

لفظ اطوار کا مفہوم اور انسانی ذات

عزیزانِ من! بات چلی ہے تو پھر آگے بھی چلنی چاہیے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا** (71:13)۔ یہ میں بعد میں بات کرونگا، پہلے یہ سنیے کہ **قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا** (71:14)۔ طور کا یہ لفظ تو ہمارے ہاں ہے اگرچہ وہ بھی کچھ صحیح مفہوم نہیں دیتا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ 'کسی اور طور پہ یہ بات کر دی' 'کچھ اس کے طور بگڑے ہوئے تھے آج'، ہم یہیں تک پہنچے ہیں۔ لیکن بات تو غزل

کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''طور'' کے سمجھانے کے لیے اس کے معنی عام طور پہ تو یہ ہوتا ہے' ایک طور سے دوسرا طور' اب میں یہ کیا عرض کروں کہ وہ محسوس کرنے کی بات ہے کہ یہ اطوار کیا چیزیں ہیں' کیا کیا کیفیتیں بدلتی ہیں جس کو کہا جاتا ہے۔ ایک تو وہ ہے کہ Physical Changes (طبعی تغیرات) ہوتے ہیں' ایک Physical Change (طبعی تغیر) کے علاوہ اس نے کہا کہ ہم انسان کو اس درجے کے اوپر پہنچانے کے لیے اس کے اندر کچھ کیفیتیں بدلتے گئے جب جا کر وہاں سے یہ آخری بات وہ ہوئی۔

یہ ہے وہ چیز جس کو یہ کہا کہ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (71:14) ہماری تخلیق کا یہ جو سلسلہ چلا تھا' اس میں اطواراً کیفیات بدلتی گئیں' طور ترا بدلتا گیا۔ میں نے کہا تھا کہ شعر تو وہ عام غزل کا ہے بس بات وہی سمجھا سکتا ہے:

بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہوگئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہوگئے

'یہ کچھ اور ہوگئے' یہ جو چیز ہے الفاظ میں سمجھائی نہیں جا سکتی۔ 'کچھ اور ہونا' یہ ہوتا ہے طور سے بے طور ہونا۔ یہاں اطواراً جو قرآن نے کہا ہے: یوں کیفیات بدلتی ہیں' تبدیل ہوتی ہوئی چلی جائیں' تبدیل ہوتی ہوئی چلی جائیں' اور اس کے بعد اس کے اندر ایک ایسی چیز دی' یہ ہے' عزیزانِ من! کہ جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے' قرآن اس کے لیے نفس کہتا ہے' اقبالؒ (1877-1938) خودی کہتا ہے۔ اگرچہ یورپ کی زبان میں ابھی اس کے لیے لفظ نہیں ملا' اُنہوں نے اس کے لیے Personality کہا۔ Personality کا عام مفہوم جو تھا وہ آپ کو معلوم ہے: آج کیا ہوگیا ہے کہ اس کی بہت اچھی Personality ہے۔ وہ صرف کوئی اس کا پیکر ہوتا ہے اس کے متعلق بات ہوگئی' تو یہ لفظ پامال ہوگیا۔ اُنہوں نے Self کہا۔

تصوف کی دنیا نے خودی کا چہرہ ہی مسخ کر دیا ہے

وہ جو تصوف والا Self تھا وہ ہمارے ہاں بھی فقیری میں خودی کا بدتمیز لفظ ہے۔ ہمارے ہاں ہے کہ ''خودی خدا داویر'' ❶۔ سارا تصوف خودی کو مٹانے کے لیے ہے۔ وہاں بھی Self کا لفظ اُنہوں نے تلاش کیا لیکن اس سے جو Selfish کا لفظ ہے اس کا مفہوم بدترین ہوگیا یعنی اب یہ کسی کا بدترین کیریکٹر ہوتا ہے' وہ اس کا Selfish ہونا ہے اور اس کے برعکس بڑی خوبی Selfless ہونا ہے۔ وہی تصور Self کو مٹانے کا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جو الفاظ کا ترجمہ اور اس کے مفہوم کی تبدیلیاں ہیں' یہ بڑی ضروری چیز ہیں۔ یہ بیان ہی تو ہے جس سے انسان حیوان سے متمیز ہوتا ہے۔ گویائی بات کرنا ہی تو ہے۔ Semanticism (علم المعانی لسانیات) ان کے ہاں نئی

---

❶ خودی خدا کی دشمن

سائنس ہوئی ہے: الفاظ کے اندر کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ تو میں نے کہا کہ ان کے ہاں Self کا لفظ آیا تھا۔ تصوف آ گیا اس نے تو بنا دیا سب سے بڑی خوبی Selfless (ہونا)۔ چل بھئی! Self ہی ختم ہو گیا کیونکہ Self کے معنی Selfish کے ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں بھی تصوف میں جو خودی ہے ''اوہدے پچھے ڈنڈا لئی پھردے ہیگے نیں''[1] وہ تو ہمارے ہاں اس شخص[2] نے آ کے مفہوم بدل دیا' اس نے انسان کا جو انتہائی معیار بتایا ہے' وہ اس خودی کے لفظ کے اندر پرو دیا۔ قرآن نفس کہتا ہے' اسے ذات بھی کہا گیا ہے۔ اب آیا یہ فلسفہ۔ تو یہاں سے ہم ہٹے تھے۔

خودی کے لیے Personality کے لفظ کی بجائے Psyche کا لفظ بھی مکمل نہیں

ہمارے ہاں نئی برانچ نفسیات والوں نے Self یا Personality کا لفظ نہیں رکھا۔ یہ اپنے ہاں Psyche[3] کا لفظ لائے ہیں' جس سے Psychology آیا ہے۔ وہ کچھ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا کچھ مفہوم بن جائے۔ مفہوم بنے گا نہیں جب تک وہ قرآن کے اندر آ کر نہیں دیکھیں گے کہ وہ اس کے لیے کہتا کیا ہے؟ وہ ہوتا کیا ہے؟ قرآن کہتا یہ ہے کہ ہر انسانی بچے یعنی جنین میں جب آخری اسٹیج آتی ہے' تو اس میں یہ ایک چیز پیدا ہوتی ہے' جو اس کو حیوانی بچے سے متمیز کر دیتی ہے اور یہ ہے وہ جسے آپ توانائی[4] کہیے۔ تو یہ اس قسم کا خدا ہی کا خاصہ تھا کہ اس نے اس کو صاحبِ ذات' صاحبِ خودی بنا دیا۔ میں نے اپنی بہت سی کتابوں میں اس پر بحث کی ہے خاص طور پہ اس کو میں نے مطالب الفرقان کی دوسری جلد[5] میں سمٹا کے رکھ دیا ہے۔ یہ

---

[1] اس کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔

[2] یہ اشارہ مفکرِ قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

[3] آج کل اسے کچھ ان معنوں میں لیا جا رہا ہے:

The mind functioning as the center of thought, feeling and behavior, and consciously or unconsciously adjusting and relating the body to its social and physical environment (Ref. Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: the Reader`s Digest Assciation Limited, P.1241).

[4] اسے Divine Energy کہتے ہیں۔

[5] پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1983' ص ص۔ 16 تا 32۔

Potentiality[1] امکانی طور پر ہر انسانی بچے کو ملتی ہے۔

انسانی زندگی کا اصل مقصد نفس انسانی کی نشوونما کرنا ہے

اب سارا پروسیس (عمل) یہ ہے کہ یہ جو انسانی بچے کو Undeveloped Form (غیر نشوونما یافتہ شکل) کے اندر ایک صورت ملتی ہے اس کو Develop (نشوونما) کیا جائے۔ ہم نے جو لفظ کا Development (نمود) لفظ استعمال کیا ہے' قرآن کہتا ہے کہ یہ اس سے محکم ہو جاتی ہے' مستحکم ہو جاتی ہے' اس کو ثبات مل جاتا ہے' یہ Integrated (یک جا مستحکم) ہو جاتی ہے۔ یہ سارا دین کا نظام ہے' یہ پروسیس (عمل) ہے۔ اب اس کے لیے بات اقدار کی آئی۔ اقدار کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو یہ جو Self یا انسانی خودی Undeveloped Form (غیر نشوونما شکل) کے اندر ملی ہے یہ Develop (نشوونما) ہو جاتی ہے' یہ محکم ہو جاتی ہے' مستحکم ہو جاتی ہے۔

نفس یا خودی کی نشوونما کے لیے اقدار کی ضرورت لازم ہے

یہ انسانی جسم بطور Material (مواد) ملتا ہے کیونکہ لائف یا زندگی کی اس موجودہ سطح پر انسانی ذات کی Development (نشوونما) اس مادی پیکر کے اندر ہی رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔ اس لیے انسان اگر Values (اقدار) کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی یہ ذات' اس کا یہ Self مستحکم ہو جاتا ہے' Develop (نشوونما پانا) ہو جاتا ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ اس کا پروسیس کیا ہے؟ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کا ہر ارادہ' ہر نیت' ہر خیال' اس کی ذات پر اپنا ایک نقش (Print) چھوڑتا ہے' اپنا ایک اثر اس کے اوپر مرتب کرتا ہے۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ سوسائٹی نے جو ان پابندیوں کا اپنا نظام بنایا تھا' تو بات اس سے بالکل ہٹ گئی۔ اب بات یہ ہوئی کہ کوئی سپاہی ہو یا

---

[1] یہی وہ ''میں'' ہے جس سے انسان فی الحقیقت' انسان کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ سورہ السجدۃ کی آیات 7 تا 9 میں انسانی تخلیق کے اُن مراحل (Stages) کا ذکر ہے جن میں انسان اور حیوانات دونوں شریک ہیں۔ ان میں انسان کے لیے غائب کی ضمیر (Third Person) لائی گئی ہے: نسلہ' سواہ' فیہ۔ اس کے بعد ہے کہ وَ نَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (32:9) ''خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔'' اس طرح وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَةَ (32:9) خدا نے ''تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔ یہاں ضمیر غائب کی جگہ مخاطب (لکم) (Second Person) لائی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس ''نفخ روح خداوندی'' کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان تخاطب کے قابل ہو گیا۔ یعنی اب یہ مخلوق انسان کہلانے کی مستحق قرار پا گئی۔ اور یہ ''تم'' وہ ہے جو ہر آن بدلنے والے انسانی جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ تم نے دس سال پہلے یہ کہا تھا تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ تم آج بھی وہی شخص ہو جو دس سال پہلے تھے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: مطالب القرآن جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1983' ص ص 16 تا 17)

نہ ہو' دیکھنے والا ہو یا نہ ہو' عدالت ہو یا نہ ہو' جیل خانہ ہو یا نہ ہو' جو بھی اس نے کام کیا' حتیٰ کہ کام کرنے کا جو ارادہ بھی اس نے کیا' اس نے اپنا ایک نتیجہ مرتب کر کے اس کی ذات پہ ایک اثر چھوڑ دینا ہے۔ اگر وہ عمل کسی قدر یا Values کے مطابق یا اس کے تحفظ میں ہے تو وہ اثر انسانی ذات کو محکم کرتا ہے' اگر وہ Values (اقدار) کے خلاف ہے تو وہ اس کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہ جو محکم شدہ ذات ہوتی ہے' Developed Personality (نشوونما یافتہ شخصیت) ہے' وہ اپنے ان نقوش اور تاثرات کو لے کر مرنے کے بعد آگے جاتی ہے۔ جسم کے ساتھ انسان ختم نہیں ہو جاتا لیکن جسم آگے نہیں جاتا۔ یہ جو ذات یا نفس ہے' یہ موت کے ساتھ مرتا نہیں ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ

زندگانی ہے صدف ' قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

انسانی جسم کے فنا ہونے سے انسانی ذات ختم نہیں ہوتی

کیا بات ہے اس کی تشبیہات کی! قرآن کے حقائق سامنے ہوں اور اس اقبالؒ کا طرزِ بیان ہو تو عزیزانِ من! انسان کو وجد آ جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ یہ موتی بنتا کس طرح سے ہے؟ بہار کے موسم کو نیساں کہتے ہیں' کہا یہ جاتا ہے کہ بہار کے موسم میں ایک خاص بادل آتا ہے' سمندر سے اوپر آ کر سیپیاں اپنا منہ کھول دیتی ہیں' اس کا ایک قطرہ سیپی کے اندر چلا جاتا ہے' وہ منہ بند کر لیتی ہیں اور نیچے چلی جاتی ہیں اور وہاں جا کر پھر اس سیپ کو گردشیں ملتی ہیں۔ اس کو جتنی زیادہ صحیح گردشیں ملتی چلی جاتی ہیں' وہ جو پانی کا قطرہ ہے' اس میں وقار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے' اس کے اندر ثبات پیدا ہوتا چلا جاتا ہے' وہ محکم ہوتا چلا جاتا ہے تآنکہ پانی کا قطرہ موتی بن جاتا ہے:

زندگانی ہے صدف ' قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی

اگر اس میں یہ خودنگر و خودگر و خودگیر کی سی چیزیں پیدا ہو جائیں تو

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے[1]

---

[1] اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 53 (حیاتِ ابدی)

ذاتِ انسانی کا جو قطرہ موتی بن جائے تو پھر وہ سمندر کا حصہ نہیں بنتا

اگر سیپ کو توڑ دیجیے' تو وہ جو پانی تھا وہ تو سمندر میں مل کر ختم ہو گیا۔ اگر وہ پانی موتی بن گیا ہوا ہے تو لاکھوں تلاطم خیزیاں ہوں' سمندر کی موجیں ہوں' اس موتی کا بگڑتا کچھ نہیں ہے۔ ''اوہ دودھ اچوں مکھن بن گیا ہوندا ہیگا۔ اے سارا دن چاٹی اچ پائی رکھو' پانی اچ اوہدا کچھ نہیں بگڑدا''۔ [1] یہ جو اس کو استحکام حاصل ہوتا ہے' اس سے Integration پیدا ہوتی ہے۔ یہ جو Integration ہے تو اس کے لیے اب میں آپ کو پیچھے لے جاؤں گا۔ میں نے کہا تھا کہ میں پہلی آیت یعنی (71:13) بعد میں لونگا۔ وہاں کہا ہے کہ **مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا** (71:13) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم للہ وقارا کی تَرْجُوْنَ (آرزو) نہیں کرتے اور اس کے فوراً بعد کہا کہ **وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا** (71:14) تمہیں ہم نے ایسے پیدا کیا تھا کہ تم میں تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی تھیں' تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی تھیں' تم ان تبدیلیوں میں سے ضرور گزرو۔

خدا تعالیٰ تو انسانی ذات کو مقامِ بلند پر فائز کرنا چاہتا ہے

اس گردشِ پیہم میں سے گزرو' یہ گزرنا بڑا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تم ان تبدیلیوں میں سے کاہے کے لیے گزرو؟ کہا کہ یہی منزلِ مقصود نہیں ہے کہ یہ جو مادی پیکر کی زندگی ہے' اس میں گردشِ افلاک کے نیچے یہی گردشیں ہوتی ہوئی چلتی جائیں اور اس کے بعد تم ایک دن ختم ہو جاؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا سے ''وقار'' نہیں چاہتے۔ وقار تو ہمارے ہاں لفظ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وقر یا وقار کے معنی ہوتا ہے کہ ''کوئی چیز جو متحرک ہو' وہ کسی مقام کے اوپر آ کر اتنی مستحکم ہو جائے کہ پھر اس میں کوئی Disintegration (انتشار) نہ ہو' اسے عربی زبان میں وقار کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تم کو کیا ہوا' تم چاہتے کیوں نہیں کہ ان اطوار میں سے' ان ادوار میں سے' ان گردشوں میں سے' گزرنے کے بعد' تمہاری ذات کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ محکم ہو جائے' اسے وقار مل جائے۔

ذاتِ انسانی کو مستحکم کرنے کی خاطر ارادے کا محکم ہونا لازم ہے

اور یہ جو ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم **لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا** (71:13) ہو۔ اس کے معنی یہ ہو گئے کہ وہ از خود ہی محکم نہیں ہو جاتی۔ اس کی وجہ **لا ترجون** ہے' تمہیں اس کے لیے آرزو کرنی چاہیے' تمنا پیدا کرنی چاہیے' خواہش پیدا کرنی چاہیے' ارادہ پیدا کرنا چاہیے۔ تم کیوں نہیں اس قسم کا ارادہ کرتے' کیوں نہیں آرزو کرتے کہ تمہاری اس خودی کو جو وہ قطرۂ نیساں کی طرح' پانی کے قطرے کی

---

[1] وہ دودھ سے مکھن بن چکا ہوتا ہے۔ اگر اسے سارا دن لسی کے برتن میں رکھو' اس کا پانی میں کچھ نہیں بگڑتا۔ (وہ مکھن کا مکھن ہی رہتا ہے۔)

طرح ہے، وہ محکم ہو کر گہرِ تابدار بن جائے۔ تم کیوں نہیں اس کی خواہش کرتے۔ تو گویا نظر آیا کہ اس میں انسان کا خواہش کرنا ضروری ہے، اس پانی کے قطرے کو موتی بنانے کے لیے اس کی اپنی آرزو، ارادہ اور عمل ضروری ہے۔ کہا کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ پانی کا ایک قطرہ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے ''اوہ ہر ایک دا پانی دا قطرہ موتی بن جائے۔ ایہڈی وڈی متاعِ حیات کی ہور ہوسکدی اے''![1] تم یہ کیوں نہیں چاہتے؟ کیا انداز ہے بات کہنے کا کہ تم سوچو تو سہی کہ اس میں تمہیں کتنا بڑا فائدہ ہے، کیوں نہیں تم چاہتے کہ اس یونہی بہنے والے پانی میں وقار پیدا ہو جائے اور وہ موتی ہو جائے۔ تصوف نے کہا کہ جی، آپ جو کہتے ہیں، وہ سارا کچھ غلط ہے، زندگی کا ماحصل یہ ہے ہی نہیں کہ یہ پانی کا قطرہ موتی بن جائے اور پھر اپنی ہستی کو برقرار رکھے۔ تصوف والوں کے نزدیک مقصد حیات ہی یہ ہے کہ ''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا''، یعنی اس کی اپنی ہستی ہی ختم ہو جائے۔

دنیائے تصوف نفسِ انسانی کے مقامِ بلند کی سوچ سے بہت بعید ہے

سارا تصوف یہ ہے کہ یہ جو کسی طرح سے یہاں سے روح کا حصہ آ گیا ہے، کسی طرح سے پھر ایسا کرو کہ یہ باقی تمہارے پاس الگ نہ رہے ''اوتھے چلا جائے تے اوہدے اچ جا کے جذب ہو جائے۔''[2] ''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا''۔ اس کے لیے کہتے ہیں کہ فنا فی اللہ ہو جا۔ اور وہ جو مقام ہے جو قرآن دیتا ہے، عزیزانِ من! وہ ہے وقار کا مقام: پانی کے قطرے کا موتی بن جانا۔ یہ شخص اقبالؒ یہاں تک لے جاتا ہے۔ وہ جاوید نامے میں کہتا ہے کہ آخر الامر، وہ تمام اطوار طے کرتا ہوا، منزلیں طے کرتا ہوا، گردشوں اور کیفیات میں سے فلک در فلک افق در افق چلتا ہوا، آخر میں جا کے، وہ حضورِ کمال میں خدا کے سامنے جا پہنچتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں عظمتوں کے اس مقام پر ایک احتیاط کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا

وہاں پہنچنے کے بعد، سنیے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہاں پہنچ گیا تو احتیاط برتنا:

بخود محکم گذر اندر حضورش

بڑا سخت مرحلہ آ گیا ہے، اس میں بڑی تپش ہے، اس کے اندر بڑا تلاطم ہے۔

بخود محکم گذر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش[3]

---

[1] وہ ہر ایک کا پانی کا قطرہ موتی بن جائے۔ اس سے بڑی متاعِ حیات اور کیا ہو سکتی ہے!

[2] وہاں چلا جائے اور اس میں جذب ہو جائے۔

[3] پرویزؒ: مجلس اقبال حصہ دوم، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 1997ء، ص۔ 30

او' تمہارے سامنے نور کا سمندر ہے۔ دیکھنا کہیں وہاں یہ نہ ہو جائے کہ تو اس کے اندر جا کر' اپنی ہستی کو کھو دے' ختم کر دے' وہاں بھی اتنی احتیاط برتنا۔ سمندر ہے' اس میں تو مدوجزر ہوتا ہے' اپنی ہستی کو قائم رکھنا۔ میں نے کہا ہے کہ اگر آپ اس کے ایک شعر کا بھی تجزیہ کرتے چلے جایئے تو عجیب چیز ہوتی ہے کہ کنارے پہ تو کھڑا ہے' ٹھیک ہے' احتیاط برتنا' نور کا سمندر ہے' یونہی تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں دور کھڑا ہوں' میری Entity میری Personality' میرا الگ تشخص قائم ہے۔ کہنے لگا کہ ذرا احتیاط برتنا' اس میں مدوجزر بھی ہوتا ہے'' او چھل مار کے باہر وی آ جاندا ہوندا ای۔ بہا کے نہ کتھے لے جائے' بڑی احتیاط ورتیں''[1]

کیا ہے یہ جو کچھ کہہ گیا ہے؟ یہ کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (71:13) اس زندگی کی آرزو کیوں نہیں کرتے کہ اس کے بحرِ نور کے کنارے بھی جا کر کھڑے ہو تو اس میں جذب نہ ہو' تمہاری ہستی وہاں بھی قائم رہے صاحب! اور یہ جو قائم رہے' تو اس قائم رہنے کا کوئی آخری مقام قرآن نے نہیں بتایا' عزیزانِ من! قرآن تو یہ کہتا ہے کہ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (84:18) چاند بھی اس طرح اطوار بدلتا' کیفیات بدلتا' گردشوں میں گزرتا' بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پہلے دن کا چاند آخر تک وہ مہِ کامل بن جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے بعد پھر اس کے اندر زوال شروع ہو جاتا ہے' گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ کہا کہ تمہارے بڑھنے کی مثال یہ نہیں ہے۔ تمہارے بڑھنے کی مثال یہ ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) چاند کی سی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ وہاں ہو' تو وہاں یہ نہ ہو کہ تم پیچھے ہٹ کے گھٹنا شروع کر دو' بلکہ اور بڑھتے چلے جاؤ' بڑھتے چلے جاؤ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انسان کو تو درجہ بدرجہ بلندیوں کی ہی طرف بڑھتے جانا ہے

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کیا الفاظ ہیں صاحب! طبقًا بلندیوں کی طرف جانا۔ یہ چاند کے ادوار ہیں۔ یہ ایک مقام پہ جا کر رکتا ہے۔ جب بھی رکتا ہے تو کہیں کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ وہ وہاں کھڑا ہو سکتا ہے۔ رک جانا خود ضعف کی علامت ہے۔ دیکھنا' کہیں رک نہ جانا۔ کیا مثال ہے قرآن کی کہ چاند منزلیں طے کرتا ہوا' ایک مقام پہ جا کر مہ کامل بن کر' کیوں گھٹنا شروع ہو جاتا ہے' وہ وہاں رک جاتا ہے' ترقی نہیں کرتا۔ یہاں کہا کہ رک نہ جانا کیونکہ:

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں' وہیں صیاد ہوتا ہے

---

[1] وہ لہروں کے ذریعے باہر بھی آ جاتا ہے۔ دیکھنا' وہ کہیں تمہیں بہا کر ہی نہ لے جائے۔ بڑی احتیاط برتنا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) بڑھتا چلا جا' انتہا کوئی نہیں۔ کوئی بتا نہیں رہا کہ یہ انتہا کیا ہے۔ اس کا خوبصورت انداز ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

میرے نزدیک تیرے عشق کی انتہا وصال نہیں ہے۔ وصال تو اس تصوف کی رو سے ہے۔ جس میں ''عشرتِ قطرہ'' ہے۔ ''دریا میں فنا ہو جانا''۔ میں تو تیرے بحرِ نور کے کنارے کھڑے ہو کر بھی وصال نہیں چاہتا' اُن کے عشق کی یہ انتہا ہوگی' میرے عشق کی یہ انتہا نہیں ہے۔ ہوں تو سادہ سا ہی مگر بات تو میں نے ایسی کی ہے کہ: تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں' میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں تو وہ جو اس کے عشق کی انتہا ہے' وہ اپنی ذات کا فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ اس کا محکم سے محکم تر ہوتے چلے جانا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (23:14) پھر ہم نے تمہیں کچھ اور بنا دیا۔ اور یہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو کچھ اور بنا ہے' یہ وہ چیز ہے جسے انسانی ذات' انسانی نفس' انسانی خودی' Psyche' اگر انگریزی کا لفظ لینا ہے تو Personality (شخصیت) کہتے ہیں۔

حقیقی عمل خدا پرستی نہیں بلکہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے جس سے انسانی ذات میں پختگی آتی ہے

اب آئی وہ ساری بات جس کے لیے ہمارے ہاں کا ایک لفظ ''خدا پرستی'' لیا گیا ہے' وہ پرستی کا لفظ تو فارسی کا ہے۔ پوجا پاٹ کے معنی ہیں۔ یہ بڑا ہی غلط معنی ہے۔ عبد تو پرستش نہیں ہے' وہ خدا کی Worship (پرستش) نہیں ہوتی۔ وہ تو ہمارے سامنے اپنی ذات کے پختہ کرنے کے لیے ذاتِ خدا کا ایک Standard (معیار) ہے اور:

"The most developed complete form of personality" ہے۔

ذاتِ خدا کی جو صفات گنائی گئی ہیں' وہ اس کے Various Attributes یا Facets ہیں۔ جتنی انسانی ذات پختہ ہوتی چلی جائے گی' اس میں وہ جو صفاتِ خداوندی ہیں' وہ علیٰ حدِ بشریت منعکس ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ وہ Standard (معیار) ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ خدا کے ساتھ ہمارا یہ تعلق اس جیسا ہوتے جانا ہے: اس کے لیے قرآن کی بڑی خوبصورت تشبیہ ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ (2:138)۔ یعنی اللہ کے رنگ میں رنگے جاؤ۔

اب انسان میں کیا کیفیات آتی ہے' میں ان میں سے کیا کیا بیان کروں اور کسے چھوڑوں! کتنے دھبے کپڑے پہ ہوں' کتنے مختلف رنگ کپڑے کے اوپر ہوں' ایک جو گہرا رنگ ہے' وہ اس میں دے دیجیے' وہ سارے پہلے اختلافات جو آپ کے ہیں' مٹ جاتے ہیں جیسے

ابھی پیدا ہوا۔ یک نگہی کی خاطر ایک ملت کی تشکیل ایک نظریہ حیات کی متقاضی ہے۔ اگر تیری جماعت کے کپڑے اس رنگ میں رنگے گئے ہوں تو یہ یک نگہی اور یک رنگی' ایک ہی رنگ میں رنگے جانے کی مثال ہے۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ

قرآن سے لا الہ کہنے والے! تمہیں پتہ ہے کہ لا الہ کہنے والے جب اجتماعی شکل اختیار کرتے ہیں تو وہ کیا ہوتا ہے۔

با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

آنکھ کی تو خوبی یہ ہے' عزیزانِ من! کہ آپ کو چیزیں ایک نظر آتی ہیں حالانکہ یہ دو آنکھیں ہیں۔ ان دو آنکھوں میں سے جو نظر نکلتی ہے' وہ اگر کبھی آخر تک الگ الگ رہے تو ساری چیزیں دو دو نظر آئیں' تو آپ ایک قدم نہیں چل سکتے۔ یہ جو اس کے اندر فطرت نے انداز پیدا کیا ہے کہ یہاں سے دو نگاہیں نکلتی ہیں آگے چل کر ایک ہو جاتی ہیں' وہاں سے دو آنکھوں میں ایک شے آتی ہے' الگ الگ اس کا اثر ہوتا ہے' اندر اس قسم کا اس نے بنا دیا ہے کہ وہ دونوں جا کر یکلخت ایک نقطہ میں مل جاتی ہیں۔ تب یہ چیزیں آپ کو یوں ایک نظر آتی ہیں۔ اور اگر ''با ہزاراں چشم بودن یک نگہ'' لاکھوں آنکھیں ہوں اور آگے جا کر وہ ایک نصب العین کے اوپر جم جائیں' کہتا ہے کہ جب افراد میں یہ کیفیت پیدا ہو' تو اسے جماعت یا ملت یا قوم کہا جاتا ہے۔ بہر حال خدا کے ساتھ تعلق یہ ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظریہ حیات کو نہ اپنانا' خدا کو فراموش کرنا ہی نہیں' بلکہ اپنی ذات کو بھی بھلا دینا ہے

دو لفظوں میں' عزیزانِ من! یہ عرض کر دوں کہ جسے ہم خدا کا ذکر یا خدا کو یاد کرنا کہتے ہیں وہ بات تو میں کرونگا۔ وہ کہتا ہے کہ **وَ لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ** (59:19) ان جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ جیسے خدا کو فراموش کر دینا کہتے ہیں' اس سے کیا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **فَأَنسٰهُمْ أَنفُسَهُمْ** (59:19) وہ خود فراموش ہو جاتے ہیں' ان کی جو ذات ہے' وہ بھول جاتی ہے' نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے' یہ حیوانات کی سطح پہ آ جاتے ہیں' یورپ کے ریسرچ اسکالرز کی سطح پر کہ انسان حیوان ہے۔ خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے۔ جونہی انسانی ذات کا تصور آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہوا' سمجھ لیجیے کہ آپ خدا کو بھلا بیٹھے ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) پھر یاد آ جاتا ہے۔ اس کے بغیر میرا تو چارہ ہی نہیں ہو سکتا۔

منکرِ حق نزد ملا کافر است

ٹھیک ہے ملا کی شریعت کی رو سے خدا کا منکر کافر ہے لیکن

منکرِ خود نزد ما کافر تر است

میرے نزدیک جو اپنے آپ کو بھول جاتا ہے وہ کافرتر ہے۔ خدا کو بھول جانے والا خدا کا منکر ہے۔ خدا کا منکر تو کافر ہوتا ہے لیکن ''منکرِ خود نزد ما کافرتر است''۔ ❶ اقبالؒ (1877-1938ء) انسان سے کہتا ہے کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خس چمن مشو

تجھے پتہ بھی ہے کہ تو کس شجرِ طیب کی ایک شاخ ہے۔ وہ جو کہا تھا کہ خدا نے کہا ہے کہ میں نے اپنی توانائی کا شمہ دیدیا ہے' کس خوبصورت انداز میں اس کو بتاتا ہے کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خس چمن مشو

سدرہ اس طرح ہے۔ بہرحال ذاتِ خداوندی سے تعلق کی بات آئے گی تو عرض کرونگا۔ تُو تو اس شجرِ طیّب کی ایک شاخ ہے' تو اپنا یہ مقام پہچان' اپنے آپ کو اس دنیا کے باغ کا خاروخس نہ سمجھ لے۔ ''شاخِ نہالِ سدرۂ'' تُو تو اس شجرِ طیّب کی ایک لہلہاتی ہوئی شاخ ہے' اپنے آپ کو خاروخس چمن کیوں سمجھ رہا ہے۔ اگلے مصرعے میں کہتا ہے کہ

منکرِ او اگر شوی ' منکر خویشتن مشو

اگر تمہیں کبھی مغالطہ ہو گیا ہے' اس کا انکار بھی کر بیٹھا ہے تو اپنا انکار نہ کر۔

اپنی ذات کا انکار خدا کی ذات کے انکار سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے

''اپنا انکار نہ کر۔'' یہ ہے' عزیزانِ من! انسان ہونے کا مقام' یہ ہے خدا کے ماننے کا مقام' یہ ہے ایمان' یہ ہے کفر اور ایمان کا فرق۔ یہ قطرۂ نیساں' یہ پانی کا قطرہ' گہر اور موتی بنتا ہے۔ اسی دنیا کے تلاطم خیزیوں کے اندر چکر کاٹتا ہے۔ یہ مقصد ہے اس دنیا کی زندگی کا انسان کے لیے' وہ ہے ہی یہ سارا مقصد کہ اس کی ذات' جو اسے غیر نشوونمایافتہ صورت (Undeveloped Form) کے اندر ملی ہے' وہ Develop ہو جائے' وہ جو اس کے اندر پانی کی سی کیفیت ہے' یونہی ہر شے میں جذب ہو جانا' اس میں وقار پیدا ہو جائے' اس میں ثبات پیدا ہو' وہ محکم ہوتی چلی جائے اور کہیں جا کر اپنا الگ تشخص نہ کھو دے۔ یہ ہے مقصد اس دنیا کی زندگی کا۔ ایک اور شعر آ گیا۔ وہ پوچھ رہا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ پھر کہتا ہے:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

---

❶ میرے نزدیک اپنے آپ کو بھول جانا کافرتر ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! چلتے چلتے ذرا سیر ہی کرتے چلیں۔ کہتا ہے کہ یہ تو مقصد نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

(اقبالؒ: بالِ جبرئیل)

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (23:14) پھر ہم نے تمہیں کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اور اس کے بعد ہے کہ **فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ** (23:14) خدا کا خالقین میں سے احسن ہونا' یہ بات ہے کہ تمہیں کچھ سے کچھ بنا دیا' اس سے نیچے درجے کا مکینکل فارم کا حیوان تو شاید یہ اور بھی بنا چھوڑے۔ یہاں خالقین کہا ہے۔ یہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس کو مانتا ہے کہ خالق اور بھی ہو سکتے ہیں' ایجادات کر سکتے ہیں۔

میں عرض کر دوں کہ فاطر اور خالق میں فرق کیا ہوتا ہے؟ خدا نے اپنے آپ کو **فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** کہا ہے۔ فاطر وہ ہوتا ہے جو پہلے کسی میٹریل کے بغیر کوئی چیز وجود میں لے آئے اور عام طور پہ خالق وہ ہوتا ہے جو پڑے ہوئے میٹریل کے اندر کچھ ترتیب' کچھ Proportion (تناسب) وغیرہ اِدھر اُدھر کر کے کوئی نئی چیز بنا دے' جسے ایجاد کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ احسن الخالقین ہے۔ خالق اور بھی ہو سکتے ہیں جبھی تو خالقین کہا ہے کہ ہو سکتے ہیں لیکن وہ احسن الخالقین نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جو خلقت کا احسن مقام ہے' وہ کیا ہے؟ **ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) یہ انسانی ذات' انسانی خودی ہے' جب یہ دی ہے تو کہا کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** ❶ (95:4)۔ دیکھیے یہاں بھی احسن ہے اور کتنا خوبصورت لفظ ہے! حسین ترین بھی اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے تو بڑی عجیب چیز ہے۔ تو حسنِ انسانی اس آب و گل کے پیکر سے نہیں ہوتا' اس کا حسن اس کی اس ذات کی رعنائیوں اور زیبائیوں کا نام ہے' عزیزانِ من! اور اعمالِ حسنہ یا حسنات وہ ہیں جو انسان کے اندر وہ حسن پیدا کریں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 14 تک آ گئے۔ آئندہ ہم 15 ویں آیت سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀......❀

---

❶ اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' پارہ 30 مکمل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

پانچواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 15 تا 22)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ
طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ
وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ
كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿٢٠﴾
وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿٢١﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1977ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 15 سے ہو رہا ہے: (23:15)

کفر اور اسلام کا مدار انسانی ذات یا خودی کے صحیح تصور پر ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں موضوع زیرِ نظر انسانی ذات یا نفسِ انسانی تھا جسے میں نے کہا تھا کہ اقبالؒ (1877-1938) نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اُسے Self بھی کہا جاتا ہے۔ الفاظ اس کے لیے مختلف ہیں۔ میں یہ عرض کردوں کہ یہ Self یا نفس یا ذات کی بات محض ایک Academic Question (علمی سوال) نہیں ہے' کوئی علمی یا نظری بحث ہی نہیں ہے۔ سائیکولوجسٹ کے نزدیک تو یہ بات نظری سی ہے اور اگر وہ اس طرح سے اس سے آگے چلتے ہیں تو اسے طب یا میڈیسن یا ڈاکٹری تک لے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں طب ہے' Medicine ہے' ڈاکٹروں کا ایک میدان ہے' وہ اسے یہیں تک لے کر آئے ہیں۔ ہمارے ہاں تو آج تک کبھی کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ میں عرض کروں کہ جنہوں نے اس پہ غور کیا ہے' انہوں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔ اصل چیز یہ ہے کہ یہ وہ

جس پر کفر اور اسلام کا مدار ہے۔

خدا کے صحیح تصور کے بغیر مسلم اور کافر کا فرق متعین نہیں ہوتا

محض خدا کے ماننے سے کوئی شخص مومن یا مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ساری دنیا بھری پڑی ہے' انہیں چھوڑ دیجیے جو خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں' باقی ساری دنیا خدا کا اقرار کرتی ہے۔ خدا ہی کا اقرار اگر انسان کو مومن یا ہماری اصطلاح میں مسلمان کر دیتا ہو تو پھر غیر مسلم تو کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ جن کے ساتھ سب سے پہلے تصادم ہوا یعنی عرب میں قریش کے ساتھ' مکے والوں کے ساتھ' حجاز والوں کے ساتھ' عرب کے ساتھ' ساری دنیا کے ساتھ' وہ سب خدا کو مانتے تھے اور اہل کتاب تو خدا کے علاوہ انبیائے کرام کو بھی مانتے تھے' کتابوں کو بھی مانتے تھے۔ خود یہ جو قریش تھے' جو سب سے زیادہ مقابل پہ آ رہے ہیں' اور ہم سمجھتے ہیں کہ سب سے اشد ترین درجے کے وہ کافر اور مشرک تھے' قرآن اس کے لیے شاہد ہے کہ جب ان سے پوچھو کہ وہ زمین آسمان کس نے بنائے' وہ کہیں گے خدا نے بنائے ہیں' وہ خود خدا کے قائل تھے۔ تو کیا بات تھی کہ پھر ان کو اس قدر انتہائی درجے تک وہ لے گئے۔ ساری عمر ان کے ساتھ تصادم رہا۔ یہ کس چیز پہ تھا؟ بات ذرا گہرے دل سے سوچنے کی ہے۔ وہ نفسِ انسانی کا انکار تھا۔ خدا کا انکار نہیں تھا۔

آج دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ابتری کی وجہ جواز اور اس کا حل

میں پھر یہ عرض کر دوں کہ آج بھی اگر یہ طب میں یا ادویات میں آئے ہیں تو آپ اس کو سائیکولوجی (Psychology) کا یا سائیکی (Psyche) کا ہی مسئلہ نہ سمجھ لیجیے گا' یا وہ نفس ہی کا نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ اگلی بات ہے اور بڑی اہم چیز ہے۔ آج دنیا میں جس قدر ابتری پھیلی ہوئی ہے غیر مسلم ہوں یا مسلمانوں کا ملک ہو' وہ ساری اس چیز کے اوپر ہے کہ قرآن نے جو تصور انسانی ذات کا دیا ہے' اس کا انکار ہو رہا ہے۔ ہر جگہ انکار ہو رہا ہے۔ مسلمان کے ہاں بھی انکار ہو رہا ہے' غیر مسلم کے ہاں بھی انکار ہو رہا ہے اور انسان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے جب تک کہ اس چیز کے اوپر یقینِ محکم نہ ہو جائے۔

یہ چیز کیا ہے؟ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا؟ قرآن کا جو دیا ہوا تصور ہے' اسے ذرا غور سے سمجھیے تو بات کچھ سمجھ میں آ جائے گی۔ میں نے یہ جو قرآن کی آیت ہمارے زیرِ درس تھی' اس میں بتایا تھا کہ حیوانات کی سطح تک انسان اور حیوان وہی مدارج طے کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ رحمِ مادر کے اندر بکری کا بچہ بھی وہی مدارج طے کرتا ہے' جو انسان کا بچہ یعنی جنین طے کرتا ہے' بجز اس کے کہ آگے جا کر جو قرآن نے کہا تھا کہ وہ خلقاً اخر ہو جاتا ہے یعنی یہ کچھ اور مخلوق بن جاتا ہے' اس سے پہلے تک تو یہ دونوں یہی مدارج طے کرتے ہوئے باہر آتے ہیں۔

حیوان ہمیشہ ہر جگہ مکمل شکل میں دنیا میں آتا ہے جبکہ انسان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی

انسان اور حیوان میں فرق کیا ہوتا ہے؟ بکری کے بچے نے جو کچھ بننا ہوتا ہے' وہ بن چکا ہوتا ہے۔ اسے غور سے سمجھیے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ اس نے جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بنا بنایا ہی آتا ہے' اس کو صرف پرورش کی ضرورت ہوتی ہے' یہ کھانے پینے کی چیزیں آخری عمر تک دیتے چلے جائیے' جب تک اس نے جینا ہے بکری کی بکری رہے گی۔ اور وہ آج کا بچہ نہیں بکری کا وہ لاکھ سال پہلے کا بھی جو کبھی بکری کا کہیں سے ڈھانچہ نکلتا ہے یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ وہی ہوتا ہے جو آج کی بکری کا ہوتا ہے۔ یہ جو Animals (حیوانات) ہیں' وہ Complete Form (مکمل شکل) کے اندر دنیا میں آتے ہیں۔ یہ ان کی Pre-formation [1] (اوّلین ساخت) ہوتی ہے۔ یہ بن چکتے ہیں جو کچھ انہوں نے بننا ہوتا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ کچھ بننے کے لیے ایک ہیولا سا ہوتا ہے' ایک میٹریل ہوتا ہے' یوں سمجھیے کہ وہ چاک پہ بیٹھے ہوئے کمہار کے پاس مٹی کا ایک تھوبہ سا ہوتا ہے۔

حیوان کے مدمقابل انسان کے سامنے زندگی کا ایک عظیم مقصد ہوتا ہے

آدم کے معنی ہیں: ''گوندھی ہوئی مٹی''۔ بنا بنایا ہوا تو یہ حیوان ہوتا ہے۔ اسے آخری عمر تک سامانِ پرورش دیئے چلے جائیے یہ حیوان کا حیوان ہی رہے گا لیکن انسان میں کچھ اور بننے کی صلاحیت ہے۔ حیوان سے وہ جو کچھ اور بننا ہے' اس پروسیس (عمل) کا نام اسلام ہے' یہ کچھ بن جانے کا نام مومن ہے۔ اس بات پر ایمان کہ جو کچھ میں پیدا ہوا ہوں' یہ میرا منتہا نہیں ہے' بلکہ کچھ بن جانا میری زندگی کا مقصد ہے۔ یہ کچھ بن جانے والی جو بات ہے یہ ہے وہ انسانی ذات یا نفس پر ایمان۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ یہ جسم نہیں کچھ بنتا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے حیوان کا جسم اور انسان کا جسم ایک ہی ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں اس کے لیے کوئی موزوں لفظ نہیں ہے' غالب [2] نے کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی امتیاز کی چیز سامنے لاؤں کہ

---

[1] یہ حیاتیاتی نظریہ کہ کسی عضویہ کی نشوونما مکمل طور پر اس کے سائز میں ہی ہوئی ہے کیونکہ جرم خلیہ میں تمام اجزا مُصَغَّر موجود ہوتے ہیں یا زیادہ بہتر انداز میں یہ کہ

A biological theory that all parts of a future Organism exist completely formed in the germ cell and develop only by increasing in size (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited, p.1216).

[2] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اچھا کر گیا ہے ہمارے لیے۔ یہ لوگ کام کی بات کر جاتے ہیں۔ اس نے جو یہ دو لفظ کہہ دیئے ہیں کہ یہ پیدا ہوتا ہے تو وہ آدمی ہوتا ہے اور اس نے انسان بننا ہوتا ہے اس لیے کہا کہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اب یہ جو کچھ اس نے کہا ہے میں اس کو ہیولا کہتا ہوں۔ وہ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ مٹی کا تھوبہ ہو گیا۔ اس سے ذہن میں ذرا ٹھیک تصور آ جاتا ہے کہ چاک پہ چڑھنے سے پھر اس کے بعد وہ کچھ سے کچھ بنتا چلا جاتا ہے۔

قدرت صرف آدمی پیدا کرتی ہے' انسان اس نے خود بننا ہوتا ہے

وہ جو میں نے کہا تھا کہ **خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) یہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ جتنی تگ و تاز دنیا میں ہو رہی ہے' یہ انسانی جسم کے کچھ کرنے کے لیے ہو رہی ہے خواہ وہ چاند پر بھی کیوں نہ اٹھ کر چلا جائے۔ یہ جو کچھ سے کچھ اور بننے کی بات ہے یہ ہے جو اسلام نے پروگرام دیا اور قرآن نے اس کا Process (عمل) بتایا ہے اور یہ ہے' اس کے اندر وہ شے جو جس میں کچھ بننے کی صلاحیت ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ یہ بنا بنایا نہیں ہے۔ کچھ بننے کی صلاحیت کے متعلق تو قرآن نے کہا کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** (95:4)۔ یہ اس چیز کا قوام کیا بنا ہوا ہوتا ہے؟ انسان بننے کی صلاحیت کے متعلق یہاں کہا ہے کہ اس میں ایک ایسی چیز رکھی ہے جو ایک حسین ترین چیز ہے۔ وہ اسے دیدی گئی ہے جس سے اس نے خود کچھ بننا ہے۔ اور خود بننے کے متعلق کہا کہ **ثُمَّ رَدَدْنٰـهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ** ❶ (95:5)۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اسی سامان سے' اسی مٹی سے چاہے تو بدترین قسم کا یہ کچھ بن سکتا ہے اور اسی سے چاہے تو پھر یہ پوچھو کہ کہاں چلا جا سکتا ہے۔ کچھ بن جانے اور بگڑ جانے کی صلاحیت اس میں ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ یہ بنا بنایا ہوا نہیں ہے بڑی اہم ہے۔ پھر میرے سامنے وہی اقبالؒ (1877-1938ء) آ جاتا ہے اور پھر وہی دشواری آ جاتی ہے کہ شعر فارسی میں ہے اور پھر اتنا اہم مسئلہ ہے۔ لیکن جس طرح سے وہ بات کر جاتا ہے' کوئی دوسرا اس انداز کا ہے نہیں' جہاں میں اس سے بدل سکوں۔ ہمارے ہاں اردو کے متعلق بھی تو اتنا ہوتا تھا۔ اقبالؒ کی جو بھی اردو ہے وہ اس میں بھی کہیں کہیں اس مقام تک پہنچ جاتا ہے لیکن جیسا (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869) نے کہا تھا کہ فارسی بھی اہم ہے اسی طرح اقبالؒ (1877-1938) کے ہاں بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

یکے در معنئ آدم نگر! از ما چہ می پرسی

---

❶ اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص-1463)۔

میں نے کہا تھا کہ آدم کا ایک معنی گوندھی ہوئی مٹی بھی ہوتا ہے۔ تو اس کے معنی وہ ہیں کہ کچھ بننے کے لیے مضطرب و بیقرار تڑپ اس کے اندر ہو۔ اب دیکھیے کہ اس کا استعارہ کتنا خوبصورت ہے۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ یہ یوں سمجھیے کہ ایک شاعر کے ذہن میں ایک خیال دل افروز ہے:

یکے در معنئ آدم نگر ! از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

شعر کا مفہوم تو ذہن و قلب میں آ گیا ہے، لیکن ابھی وہ مصرع موزوں نہیں بنا، خیالات کی شکل میں ہے، اس کے لیے کچھ موزوں الفاظ ہیں ان کی تلاش ہے۔ وہ آ بھی جاتے ہیں تو پھر وہ موزوں ہیں۔

خلد کا قرآنی مفہوم

خلد کا یہ لفظ تو، عزیزانِ من! اللہ آپ کو ذوق بخشے، تو پتہ چلے گا کہ یہ بات کیا کر جاتا ہے! اس کے لیے بیسیوں الفاظ آ سکتے تھے ''ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے''۔ کچھ بننے کے لیے بے تابی ہے۔ اب یہ شاعر بتا سکتا ہے کہ ذہن میں خیال آیا ہوا ہو اور کچھ الفاظ ملیں، کچھ نہ ملیں اور وہ مصرع موزوں نہ بن رہا ہو تو وہ جو اس کی کیفیت ہوتی ہے، جو اس کی خلش ہوتی، وہ ہے ''ہنوز اندر طبیعت می خلد'' اور ''چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے''۔ یہ مضمون تو ایسا ہی ہے جیسا شاعروں کے سامنے بھی ہوتا ہے ''پیش پا افتادہ'' کچھ نہ بھی بنا ہوا ہو تو کیفیت یہ ''چناں موزوں شود'' اور اس طرح سے موزوں ہو گا۔ ''کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے''۔ [1]

خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کے فرشتے مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں

یہ جس نے اس کو یہ صلاحیتیں دی تھیں وہی جب اس کو دیکھے گا تو کہے گا کہ **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ** (33:56) ''او صدقے تیرے کی بن گیا اے توں''! خدا اور اس کے فرشتے تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ لیکن خدا صرف ایک ذات کے اوپر اکتفا نہیں کرتا کہ یہ وہی ہے جو کچھ بن گیا۔ **ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ** (33:43) او جماعتِ مومنین! تم آدمی سے انسان بن گئے ہو، تو خدا اور اس کے فرشتے تم پہ درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے صرف نبی پہ درود و سلام بھیجنے کی بات نہیں کہی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ **ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ** [2] (33:43)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک اچھا شعر سننے سے زبان پر بے ساختہ بات آ جاتی ہے، کتنی خوبصورتی سے اقبالؒ نے یہ کہا کہ

---

[1] اوئے میں تیرے قربان جاؤں، تو کیا سے کیا بن گیا!

[2] قوانینِ خداوندی کی برکات سے تم پر تبریک و تہنیت کے پھول برسیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 977)۔

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں آدم اور انسان میں واضح فرق بیان کیا ہے

یہ مقامِ انسان' آدم سے انسان بننے کے لیے ہے۔ آدم کے متعلق تو قرآن نے کہا ہے کہ اس کی ابتدا سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (23:12) سے کی اور پھر یہاں سے گزرا اور یہ مراحل طے کیے۔ یہ سارے حیوانی مراحل ہیں۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ [1] (95:4)۔ یہاں آدم نہیں کہا' انسان کہا ہے۔ تو یہ بنا بنایا ہوا' Complete (مکمل) نہیں آیا۔ اگر یہی صورت ہو کہ جیسا یہ پیدا ہوا ہے' ویسا ہی مر جائے یعنی بڑا ہوا' توانا ہو گیا' تندرست ہو گیا' امیر ہو گیا' یہ سب کچھ کر لیا' چاند پہ بھی چلا گیا' مگر وہ حیوان کا حیوان ہی رہتا ہے لیکن جو انسان بنتا ہے' یہ ہے جو اس کے اندر Changes (تغیرات) واقع ہوتی ہیں۔ یہ وہ اطوار ہیں جو میں نے کہا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ اطواراً پیدا کیا۔ ''طور'' جو ہوتا ہے وہ اندورنی کیفیات کا نام ہوتا ہے' بیرونی طور پر تو وہی ہوتا ہے' اس میں کیا تبدیلی ہو گی۔ اس کے اندر جو تغیرات ہوتے ہیں' ان سے وہ طور سے بے طور ہوتا چلا جاتا ہے' اطواراً ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ وہ تدریجاً ہوا ہے۔ اس طرح سے اطواراً کی کیفیت ہوتی ہے' کچھ اور ہوتا جاتا ہے کچھ اور بنتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ جو ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ o ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ o اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا [2] (95:4-6)۔ اس بدلنے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اندر Integration (محکمیت) اور Disintegration (انتشار و خلفشار) ہے۔ حیوانی سطح سے آگے اس کے اندر دونوں طرح کے امکانات ہیں۔ Dis-integration (انتشار و خلفشار) بھی تو اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں اس میں جمود آ جائے تو چاک کی وہ گردشیں ہیں' اسے کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں' ویسے اگر آپ مٹی یہاں رکھ دیجیے تو اس میں سے کچھ نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ [3] (95:5)

---

[1] ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کر کے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1463)۔

[2] ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کر کے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے لیکن اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ حیوانی زندگی کے اس پست مقام سے' انسانیت کی بلند سطح پر آنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1463 تا 1464)

[3] حیوانی زندگی کے پست مقام پر چلا جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1463)۔

ہی رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے اور یہ کہ اس میں اس کے امکانات رکھے ہیں کہ یہ کیفیات بدلتا چلا جائے' یہ ہوگا کیسے؟

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا ہے

انسان نے جو کیفیات بدلنی ہوں اس کی کچھ سمت بتائی ہے کہ یہ کس طرح سے کیا ہوگا کہ پستی کی طرف چلا جائے گا؟ کہا کہ سنو **لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** (84:19) وہ درجہ بدرجہ طبقاً عن طبق ہوا. **لَتَرْكَبُنَّ** کیا بات ہے! صاحب! بلند ہوتا چلا جائے گا' اوپر چڑھتا چلا جائے گا۔ یہ ہے قرآن' عزیزانِ من! میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کا بنیادی عمودی موضوع انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرادینا ہے۔ آدمی کی سطح کے اوپر تو وہ جیسے پیدا ہوتا ہے' کھاتا پیتا ہے' مرجاتا ہے' معاملہ ختم ہوگیا' **لَتَرْكَبُنَّ** کہاں ہوا؟ نہ اطوار بدلے نہ وہ کیفیت ہوئی۔ قرآن کہتا ہے کہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ جسے انا الیہ راجعون کہتے ہیں' یہ اس کی طرف جانے والی بات ہے۔ جس کی طرف جانے والی بات ہے اس کو ابتدا سے اس نے ''ذی المعارج'' کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا۔ سیڑھی کے ہر ڈنڈے کے اوپر آپ چڑھیں گے تو پہلے سے آپ اونچے ہوجائیں گے۔ قرآن کے کیا الفاظ ہیں! ہر قدم اوپر جائے گا۔ یہ ہے **لَتَرْكَبُنَّ**۔

قرآنی اقدار پر عمل پیرائی کا نتیجہ ہر قدم پر رفعت کی شکل میں سامنے آتا ہے

انسان کی ذات کے اندر یہ جو Changes (تغیرات) آتے ہیں یہ ہیں' جو اسے قطرے سے گوہر بنادیتے ہیں' یہ ہیں جو اس میں یہ کیفیات پیدا کردیتے ہیں کہ یہ درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا چلا جائے۔ یہ انسانی ذات یا انسانی نفس کے اندر جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں' یہ ہے وہ پروسیس (عمل) جسے آپ اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے ان اقدار یا Values کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جو قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ پیمانے ہیں' سطحِ زندگی کے لحاظ سے' پیمانے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جنہیں اعمالِ صالحہ کہتے ہیں۔ خدا نے قرآنِ کریم میں کہا ہے کہ اس کے اندر ہم نے Undeveloped Form (غیر نشوونما حالت) کی صورت میں' صلاحیتیں دی تھیں وہ اسے Develop (نشوونما) کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اعمال ان کی صلاحیتوں کو Develop (نشوونما) کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ کچھ سے کچھ بنتا چلا جاتا ہے لیکن کچھ سے کچھ بننے کا معیار لَتَرْكَبُنَّ ہے یعنی پہلے درجے سے یہ ایک درجہ اوپر جائے گا' اور اس طرح سے چڑھتا چلا جائے گا۔

نیک و بد اعمال کے نتائج انسانی ذات پر نفسیاتی اثرات کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں

یہ پروسیس (عمل) کیا ہے؟ جسے اب میں انسانی ذات کہوں' اس میں جو تغیرات ہوتے ہیں' تو سوال یہ ہے کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ اب

یہاں قرآن کی رو سے دیئے ہوئے نفسِ انسانی کے تصور میں اور یہ جو Academically (علمی لحاظ سے) ہمارے ہاں سائیکولوجیکلی (نفسیاتی طور پر) یا Personality (شخصیت) کے متعلق کہا جاتا ہے' سے یہ فرق پڑ گیا۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے دو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہم تو انہیں نیک اعمال اور بد اعمال کہتے ہیں' اچھے اور برے کام کہتے ہیں۔ اچھے اور برے اپنے اپنے معاشرے میں تو اضافی سی چیز ہوتی ہے۔ لیکن قرآن جو کہتا ہے وہ ہے اصل شے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال بھی دو قسم کے اثرات پیدا کرتا ہے: ایک وہ ہوتے ہیں' جس سے انسان کی جو Personality (شخصیت) ہے' وہ پختہ ہوتی ہے' Develop (نشو ونما) ہوتی ہے' یہ قطرۂ نیساں پختگی حاصل کر کے تھوڑا سا گوہر بنتا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں جنہیں وہ حسنات کہتا ہے' ان میں توازن پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ Balanced Personality (متوازن شخصیت) کا لفظ ان (Psychologisls) (ماہرین نفسیات) کے ہاں آیا تھا۔ وہ تو قرآن بتاتا ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ثُمَّ سَوّٰىكَ (18:37)۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ Balance (توازن) ہے کہ وہاں جب اس میں تغیر پیدا ہوتا ہے' اس کی ذات کے اندر پختگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے' وہ Balance (متوازن) ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ اعمال ہیں' جن کے اثرات سے ذات ناپختہ ہوتی ہے' کمزور ہوتی ہے' مضمحل ہوتی ہے۔ کچھ تھوڑا سا بنا ہوا' یہ انسان پھر ان کے ہاں واپس آ جاتا ہے۔

انسانی ذات پر مرتب ہونے والے اثرات دو قسم کے ہوتے ہیں

عزیزانِ من! میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ قرآن کی رو سے انسان کا ہر عمل' اس کا ہر ارادہ' اس کی ذات یعنی اس کے نفس پر ایک اثر پیدا کرتا ہے اور یہ اثرات دو قسم کے ہوتے ہیں: جن سے یا تو وہ ذات پختہ ہوتی ہے' اوپر جانے کے قابل بنتی ہے اور یا وہ کمزور ہو جاتی ہے' وہ نیچے گر جاتی ہے۔ یہ پروسیس (عمل) پوری عمر اس پہ جاری رہتا ہے۔ یہ جو تصور ہے' یہ جو نظریہ ہے' اس پر ایمان ہے کہ میں اپنے ہر عمل سے اپنے آپ کو کچھ بنا رہا ہوں: یا تو انسانیت کی سطح سے نیچے گرا رہا ہوں یا اسے اوپر لے جا رہا ہوں۔ یہ وہ نظام ہے جس میں اس پر ایمان ہوتا ہے کہ میرے ہر عمل کا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

جسمانی موت کے بعد زندگی کا اگلا پروسس مزید ارتقائی منازل کی طرف

اب اس کے بعد' عزیزانِ من! آج کے درس کی یہ پہلی آیت آ گئی کہ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ (23:15) یہ پروسیس (عمل) جاری رہتا ہے تا آنکہ جو جسم تمہارا ہے' وہ ایک دن Disintegrate (منتشر) ہو جاتا ہے۔ اگر تو یہ حیوانی سطح ہے' تو دونوں ختم ہو گئے' خواہ آسمان پہ جائے خواہ وہ چاند پہ جا کر ختم ہو جائے یا یہاں کہیں زمین پہ ختم ہو جائے۔ اگر وہ آدمی کی سطح کے اوپر ہے تو وہ جسم تو

موت سے ختم ہوا لیکن اگر وہ دوسری سطح یعنی انسان کی سطح پہ ہے تو ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ❶ (23:16)۔ یہاں تبعثون کا لفظ آیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ تم اٹھائے جاؤ گے۔ سمجھانے کے لیے یہی ہوتا ہے کہ قبروں میں انسان لیٹا ہوا ہوتا ہے، وہاں سے تم اٹھائے جاؤ گے حالانکہ تُبْعَثُوْنَ کا یہ لفظ بعث "ب ع ث" سے ہے۔ اس "ب ع ث" کے معنی ہوتے ہیں "کسی کے راستے میں جو رکاوٹ ہے، اس کو Remove (ہٹانا) کر دینا، اس کو ہٹا دینا۔" آپ کو یہ معلوم ہے کہ عراق میں بعث پارٹی ہے۔ عربی جدید میں بھی یہ لفظ "آزادی" کے معنی میں آتا ہے۔ محکومیت اور غلامی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں، ان کو ہٹا دیا جائے تو آزادی آ جاتی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ جو انسان کے راستے میں کچھ رکاوٹیں آ رہی تھیں، زندگی کی اگلی سطح شروع ہو گئی، یہاں تو ایک خاص درجے تک یہ کچھ بن سکتا ہے۔ اس سطح زندگی میں اس کا یہ سارا جتنا پروسیس (عمل) ہے، یہ جس قدر ارتقا ہے، جو کچھ بننا ہے، اس مادی پیکر کے اندر ہی بننا ہے، اس کی Limitations (حدود) ہیں اور وہ ہیں جنہیں آپ کہتے ہیں کہ یہ جو موت ہے، اس سے یہ Disintegrate (منتشر) ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ یہ جو تمہارے راستے میں کچھ رکاوٹیں آ رہی تھیں، جن سے "تم کچھ اور نہیں" بن رہے تھے، ہم نے ان رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ چل بھئی میدان اور وسیع ہو گیا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں (اقبال)

اب نئے میدان میں آؤ۔ یہ نئی آماجگاہ، نئی رزمگاہ آ گئی، چلتے جاؤ۔ یہ جنت بھی انسان کا آخری مقام نہیں ہے۔ وہ تو زندگی کا ارتقا ہے، ایک درجہ ہے۔ وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہمیں تو ازن بدوش راستے دکھا، اس کو اور تیز کر دے، اس کے آگے راستے ہیں۔ وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ❷ (53:42)۔ اس کو تو چھوڑ دیجیے کہ قرآن منتہا کی کیا بات کہتا ہے، اسے دیکھیے کہ یہاں تو یہ بات کہی ہے کہ عزیزانِ من! جو منتہا و مقصود ہے وہ نفسِ انسانی یا انسانی ذات کے اوپر وہ چیز ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اب یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی کہ یہ جو شاعر ❸ کہہ گیا تھا وہ کیا ہے کہ

---

❶ (وہ کچھ اور" جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، جسمانی موت سے فنا نہیں ہو جاتا۔ وہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ) تم قیامت کے دن، اٹھا کر کھڑے کر دیئے جاؤ گے (84:19) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 775)۔
اس کھڑے کر دیئے جانے کا مفہوم اوپر متن میں لفظ بعث کی تشریح کر کے دیا گیا ہے۔

❷ انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نظامِ ربوبیت کا قیام ہو جائے اور انفرادی طور پر ہر فرد کی ذات میں صفاتِ خداوندی (Divine Attributes) کی نمود (اعلیٰ حد بشریت) ہوتی جائے اور زندگی کے ہر معاملے کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق ہو (79:44) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1245)۔

❸ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء)

منکرِ حق نزد ملا کافر است

خدا کا منکر ملاّ کے نزدیک، ٹھیک ہے، کافر ہے۔ میں بھی جانتا ہوں لیکن

منکرِ خود نزد من کافر تر است

میرے نزدیک جو اپنی ذات کے اس تصور کا انکار کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ کافر ہے۔

انسان کے لیے ذات کے تصور سے انکاری ہونا سب سے بڑا کفر ہے

اس کفر کو تو آسانی سے بدلا جا سکتا ہے، خدا پہ ایمان لے آئیے: اٰمنت باللہ کہیے مومن ہو گیا۔ یہ ہے اصل چیز جو اس نے کافر تر کہا ہے۔ یہ تو زندگی کے سارے تصورات کے بدلنے کی بات ہے، مقاصد حیات کے بدلنے کی بات ہے، نصب العین حیات کے بدلنے کی بات ہے Purpose of Life & Destination کے بدلنے کی بات ہے، ہر عمل کے متعلق جو مقصد ہے اس کے بدلنے کی بات ہے۔ ہر عمل یا ہر ارادہ، قرآن کہتا ہے کہ نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کے اوپر پڑتا ہے۔ ہر وقت محاسبہ خویش کیے چلے جانا، اس لیے اس نے کہا ہے کہ تمہارا اعمال نامہ کہیں باہر نہیں ہے، وہ تو تمہاری گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ یہ دیکھتے چلے جانا کہ یہ لٹر کبن میں اگلی سطح پر جانے کے قابل ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ جو میں نے ابھی عرض کیا تھا، آپ بھی اب اس پہ غور کیجیے کہ قرآن کی رو سے وہ جو اسے ایمان کہتا ہے، اس قسم کا انسانی ذات کے متعلق یہ تصور (Concept) آپ کو کہیں نہیں ملتا۔

خدا کے متعلق موجودہ سائنٹسٹ کا تصور ہمارے ہاں کے تصور سے زیادہ علیٰ وجہ البصیرت ہے

وہ جو صرف خدا کو ماننے والے ہیں، جیسے وہ عرب والے کہتے تھے کہ یہ زمین و آسمان اسی نے بنائے، بارش وہی برساتا ہے، یہ آپ کے ہاں کے سائنٹسٹ، جتنے بھی مغرب کے ہیں، وہ ان میں سے تو ہر ایک اسے مانتا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ بہتر طریق سے، علیٰ وجہ البصیرت مانتے ہیں کہ واقعی یہ کائنات کا خالق ہے اور یہ سارا کچھ وہی ہے اور انسان کو بھی اس نے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہی ہے وہ مقام جہاں انکار ہوتا ہے۔ اس کے لیے مذہب کی دنیا کی طرف آ جائیے۔ یہاں تو بہرحال ہمارے ذہن میں ہے کہ بھئی! یہ تو ماننے والے لوگوں میں سے ہیں، ایمان والے لوگوں میں سے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں مذہب کی جو عام سطح ہے، اس میں وہ جو اعمال یا جنہیں آپ احکام کہتے ہیں، ان کا تصور کیا ہے؟ کہ یہ کرو۔ کیوں کرو؟ کہ جی، خدا کا حکم ہے۔ آپ اس بات سے دیکھتے ہیں کہ ''یہ کرو خدا کا حکم ہے'' اب سوال یہ ہے کہ میں یہ کیوں کروں؟ یعنی میرا اس میں کچھ نہیں، کسی کا حکم ہے اور مجھے کرنا ہے صاحب! یہ تو ابتدا ہی خوف سے ہوتی ہے: نہیں کرو گے تو جہنم میں ڈال دے گا۔ خوف سے تو انسان کی Personality (شخصیت) نہیں رہتی۔ مومن کے متعلق تو

وہ کہتا ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** [1] (2:38)۔ یہاں تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ پوچھا جائے گا کہ کیوں کیا جائے؟ تو یہ ہوگا کہ صاحب! اس سے اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔

آج کے نوجوانوں کی پریشانی

میرے پاس، عزیزانِ من! نوجوان آتے رہتے ہیں۔ میں ان کا استقبال کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ان کے دل میں تڑپ ہے جس کے لیے وہ آتے ہیں۔ ان کے دل میں اعتراضات کیا اٹھتے ہیں، میں وہ پیش کر رہا ہوں۔ جس زمانے تک تو انسان سوچ نہیں رہا تھا اس زمانے تک تو یہ بات چلتی تھی کہ خدا کا حکم ہے، اسے مانو۔ وہ نوجوان اب سوچتے ہیں کہ صاحب! یہ سب تو محض حکم منوانا ہے۔ یہاں تو آپ ڈکٹیٹر کے متعلق روز ہمیں وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ یہ بدترین فارم ہے اور وہ اس قسم کی آپ ایک شکل ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ اس نے حکم دیا ہے تم مانو۔ کیوں مانوں؟ یہ پوچھنے کی جرأت ہی نہیں ہے۔ نوجوان مجھ سے یہ کہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیوں مانیں؟ میں ان کو کہتا ہوں کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، بلا تامل کہیں کیونکہ پھانس نکل نہیں سکتی جب تک آپ نہیں بتائیں گے کہ پھانس کہاں ہے۔ جب تک وہ نکل نہ جائے آپ سو ہی نہیں سکتے۔ ہوتی تو وہ پھانس بڑی چھوٹی سی ہے، مگر تڑپائے رکھتی ہے رات بھر۔ ہماری نئی نسل کے قلب کے اندر شکوک کی یہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں۔ یونہی نہ ان کو لتاڑ دیا کرو۔ ان کا قصور نہیں ہے۔ یہ جو ساری پھانسیں ہیں، یہ ہماری چبھوئی ہوئی ہیں۔

کہتے یہ ہیں کہ صاحب! جی، حکم ماننے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ وہ نوجوان کہتے ہیں کہ صاحب! ذرا سوچیے کہ میں اپنے آپ کو مشقتوں میں ڈالوں، مصیبتوں میں ڈالوں، یہ کرتا رہوں، آخر کاہے کے لیے؟ کہ جی وہ خوش ہو جائے، تو مجھے کیا ضرورت ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے خدا کا تصور بادشاہوں کے تصور سا اپنے ذہن میں لیا ہوا ہے۔ انسان کا محدود ذہن اس سے آگے جا نہیں سکتا تھا۔ سب سے اونچا، صاحبِ اختیار، صاحبِ قدرت ہمارے ہاں بادشاہ ہوتا ہے۔ کہنے کو تو ہم نے یہ کہا کہ **السلطٰن ظِل الله علی الارض** یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ تو پہلی بات تو یہی ہے کہ کیا اللہ کے اس سائے سے کچھ پتہ چل سکتا ہے کہ وہ یہ کروانے کے لیے "کیوں" کہتا ہے؟ اب شہنشاہیت یا جسے آپ بادشاہت کہتے ہیں اور کہتے تھے، ہے کیا؟

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہے لات و منات
(اقبالؒ)

---

[1] ان کے لیے نہ خوف ہے، نہ حزن۔

بادشاہ کا ذہن اور بچے کا ذہن ایک ہی جیسا ہوتا ہے

ہم نے لفظ ہی بدلے ہیں۔ یہ جو بات ہے کہ ایسا کرنے سے وہ خوش ہو جاتا ہے ایسا کرنے سے وہ ناراض ہو جاتا ہے تو اب پوری رعایا کا مقصدِ زندگی کا منشا یہ رہ گیا کہ اسے خوش رکھا جائے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور ان شہنشاہوں کی کیفیت یہ ہے جو سعدی نے کہا تھا:

گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند

یہ بادشاہ ہیں ان کی کبھی تو کیفیت یہ ہے کہ سلام کرو تو وہ کہتے ہیں بدتمیز کہیں کا' کبھی یہ ہے کہ گالی دیجیے تو وہ کہتے ہیں آ ہاہا! پھول جھڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں روزمرہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو بچہ ہوتا ہے' اس کے متعلق ہمارے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ بچے کا ذہن ہے ''بچے دا ذہن تے بادشاہ دا ذہن اکو جیا ای ہوندا ہیگا اے'' [1] اور آگے چلیں تو ''بھولے بادشاہ'' کے الفاظ آتے ہیں۔ اب پوری رعایا کا فریضہ یہ ہے کہ کسی طرح سے بادشاہ سلامت خوش ہو جائیں۔ اور خوش ہو جائیں تو انہوں نے کام کر دیا' ناراض ہو گئے تو پھر قیامت آ گئی۔ ساری کوشش اس میں ہے کہ وہ خوش ہو جائیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ تم اللہ کو خوش کر لو اس کے حکم کی تعمیل کرو۔ کاہے کے لیے؟ اس لیے کہ وہ خوش ہو جائے۔ دیکھتے ہیں آپ کس طرح سے بنیادی تصور بدلنے سے یہ ساری چیزیں کیسے بدل جاتی ہیں۔

قرآن نے یہ تصور نہیں دیا۔ اُس کا تصور تو شہنشاہیت کا ہے ہی نہیں' وہ تو اسے مٹانے کے لیے آیا ہے۔ وہ انسانی بادشاہتوں کو ہی مٹانے کے لیے نہیں آیا تھا وہ خدا کے متعلق بھی جو غلط تصور تھا' اس کو بھی بدلنے کے لیے آیا تھا۔

خدا کا تصور قرآن کے آئینے میں

قرآن کہتا یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ خدا کا حکم ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو گے تو یہ ہوگا' ایسا نہ کرو گے تو نہیں ہوگا۔ دیکھتے ہیں ایک Concept (تصور) کے بدلنے سے کس طرح انسان کی ساری دنیا بدل گئی۔ ایک بات ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ دوائی نہ کھاؤ گے تو بخار ہو جائے گا۔ پہلے میں یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے' اسے کرو۔ اس میں یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ اس میں میرے کچھ بننے ونئے والی بات ہے۔ دوسرے میں کہ ''ایسا کرو گے تو یہ ہوگا'' ایسا نہ کرو گے تو نہیں ہوگا'' وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں یہ نہ کرونگا تو میرا یہ بگڑے گا۔ جیسے ڈاکٹر کہتا ہے کہ بھئی! دوائی کھالو گے' تندرست ہو جاؤ گے تو اس سے میرا کچھ سنورے گا' نہ کرونگا تو میرا کچھ بگڑے گا۔ یہ ہے سارا تصور جو قرآن نے دیا ہے' عزیزانِ من! کہ تم مریض ہو' ہم تمہیں نسخے دے رہے ہیں' ہم تمہیں اقدار' پیمانے دیدیتے ہیں کہ ایسا کر لو گے تو تم یہ کچھ بن جاؤ گے'

---

[1] بچے کا اور بادشاہ کا ذہن ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

تم اس کے خلاف کرو گے اس طرح سے تباہ ہو جاؤ گے۔ تو یہ تو سارا ہی کچھ میرے لیے ہے۔ اسی لیے اُس نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ یہ **ذکرکم** (21:10) ہے' اور اس میں سب کچھ تمہارے متعلق ہے جو میں کہہ رہا ہوں' ورنہ ہمیں کیا ضرورت ہے۔ یہی چیز ہے جو اس [1] نے کہا کہ

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

قرآنِ حکیم نوعِ آدم کا ترجمان ہے وہ انسانی زندگی کی اقدار تو دیتا ہے کسی کو ڈراتا نہیں ہے

یہ میرا ترجمان ہے۔ خدا تو غنی العٰلمین ہے' اُسے کیا ہے کہ وہ اپنا تعارف کراتا پھرے' اپنی ترجمانی کراتا پھرے کہ "اوہدا کوئی کم پھنسیا اے ساڈے ول"۔ [2] ہمارا ہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! جسے آپ قرآن کی رو سے ایمان کہتے ہیں۔ بات تو یہ ٹھیک ہے کہ خدا سے بات چلتی ہے جو آپ کہیں گے لیکن وہ اس قسم کے خدا سے بات چلتی ہے کہ جو تمہیں اس قسم کے پیمانے اقدار قوانین دیتا ہے کہ جس سے تمہارا کچھ بنتا ہے' خلاف جاتے ہو تو تمہارا بگڑتا ہے۔ یہ ایمان' میں پوچھ رہا ہوں کہ کہیں نظر آتا ہے؟ یہ ایمان تو ہر جگہ آپ کو نظر آئے گا کہ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے' یہ بات کہ حرام کا مال کھاؤ گے تو ہلاکت ہو جائے گی' نہیں نظر آتی۔ وہ جو حکم کا تصور تھا' وہی ہمارے ہاں چل رہا ہے' قانون کا تصور نہیں ہے۔ Keep to the Right , Keep to Left ٹھیک ہے' اس کی خلاف ورزی کرو گے تو سپاہی چوک پہ پکڑ لے گا' جرمانہ ہوگا' حوالات ہوگی۔ خارج کا حکم ہے خارج سے اس کی سزا ہے' جو میرا اندر ہے اس کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانی نفس کی اہمیت

یہ جتنی آپ کے ہاں احکام کی اطاعت کرائی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی پہ سزائیں وغیرہ دی جاتی ہیں' یہ سارا تعلق انسان کے جسم کے ساتھ ہوتا ہے' اندر کا تغیر تو اس سے نہیں ہوتا۔ قرآن' اس کے اندر کا جو تغیر ہے' اس کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ یہ جو کچھ قرآنِ کریم میں ہے' میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں کے یہ جتنے اہلِ شریعت ہیں' ان کے ہاں بھی خدا سے یہ احکام منوانے کی بات چلتی ہے' مان لو گے خدا راضی ہو جائے گا' نہ مانو گے خدا ناراض ہو جائے گا۔ سیکولرازم والے یا باقی دنیا والے سائنٹسٹ' خدا کو خارجی دنیا کا خالق تو مانتے

---

1. یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔
2. کہ اس کا کوئی کام ہمارے ہاں آ پڑا ہے۔

ہیں' انسان کے ساتھ تعلق کو نہیں مانتے۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ جنہوں نے ہمارے ہاں مانا ہے وہ اہل تصوف ہیں مگر'' یہاں نفس' Self' شخصیت ہی غائب ہے۔''

انسانی ذات کے متعلق اہلِ تصوف کا نظریہ حیات

سائنسدانوں کے ہاں تو پھر بھی جسمِ انسانی کا تو کچھ بنتا تھا' اگرچہ وہ خود کچھ نہیں تھا۔ (ان اہل تصوف) نے کہا کہ جی' یہ دنیا' یہ لذات' یہ اس کے حواس' اس کے تعلقات' یہ ساری چیزیں' انسان کا جسم' انسانی زندگی' یہ سارا عذاب ہے۔ انہوں نے خدا کی ذات کے اس حصے کو چھوڑ رکھا ہے جو تمہارے اندر کسی طرح سے آ پہنچی تھی اور مقصد زندگی یہ بنایا ہے کہ یہ ان سارے Cycles (ادوار) کو کسی طرح سے توڑ کے نکل' جائے' اور اس طرح جس کی ہے وہاں چلی جائے۔ وہ تو پھر بھی بیچاری خشک لکڑیاں تھیں' جلانے کے تو کام آتی تھیں' یہ ان اہل تصوف کے ہاں تو پانی میں گری ہوئی گلی سڑی لکڑیاں ہیں۔ یعنی جو تصور آپ کے ہاں انسانی ذات کا تھا' وہ کہتے ہیں کہ اہلِ طریقت کے ہاں تزکیۂ نفس کا ایک لفظ ہوتا ہے۔ تزکیہ کے معنی ان کے ہاں Development (نمود) نہیں ہوتا' ان کے ہاں تزکیہ کے معنی ہوتا ہے کہ یہ جتنی آلائشیں' جو اس Material World (مادی دنیا) کی ہیں' اس انداز کی ہیں' ان کو الگ کرتے چلے جاؤ۔ میں کاہے کے لیے انہیں الگ کرتا چلا جاؤں؟ بھئی! مجھے بتاؤ میں کیوں کرتا جاؤں؟ کہا کہ صاحب! یہ اس لیے ہے کہ تمہارے اس جسم کے پنجرے کے اندر خدا کی ایک چیز آ کر پھنس گئی ہے اور وہ تڑپ رہی ہے' اس کے دروازے کھول دو تا کہ وہ نکل جاؤ۔ اب ان کے ہاں کی مشقتیں تو پوچھو نہیں' وہ کیلوں والے تخت کے اوپر ساری عمر لیٹے رہتے ہیں اور آگ سامنے جلا کے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ تصور ویدانت سے ہمارے ہاں آ گیا ہوا ہے کہ فلاں صاحب نے ساری عمر کیچڑ میں گزار دی' وہ فلاں تھے جی' وہ نہائے نہیں ساری عمر' وہ فلاں تھے جی' انہوں نے ناخن نہیں ترشوائے ساری عمر۔ آ گیا وہی تصور آپ کے ہاں کہ حضرت صاحب نے کیا کیا؟ کہ جی وہ سات برس تک کنویں میں الٹے لٹکے رہے' ایک جو کا دانہ کھاتے تھے ایک گھونٹ پانی کا پیتے تھے' کھڑے ہوتے تھے تو روتے رہتے تھے' اتنا روئے اتنا روئے کہ جو یہاں کے رخسار تھے ان کا گوشت گل گیا'' تے چڑیاں نے آلنڑے بنا لیے''۔[1] میں یونہی یہ نہیں کہہ رہا' عزیزانِ من! یہ آپ کے ہاں کے جو بلند ترین اولیائے کرام' صوفیائے کرام گنے جاتے ہیں' یہ ان کے ہاں کی منتہائے زندگی ہے۔ یہ ہے تصور' عزیزانِ من! جو آپ کے ہاں آیا۔ یہ جو اس[2] نے کہا تھا کہ

---

1. چڑیوں نے وہاں اپنے گھونسلے بنا لیے۔
2. علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء)

یہ ترے مومن و کافر تمام زناری

مومن اور کافر کے اندر خدا پہ ایمان اور خدا سے انکار کی تو بات کہاں!! دونوں کے متعلق کہتا ہے:

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ ماسکہ ذاتِ انسانی کا تعارف ہے

عزیزانِ من! قرآن اپنی ذات پہ ایمان کے اس بنیادی نقطے سے اپنی عمارت کو شروع کرتا ہے: اس میں اس چیز پہ ایمان ہے کہ جیسا میں پیدا ہوا ہوں، یہ حیوان ہے، اس نے انسان بننا ہے۔ اسے قرآن کے الفاظ کے اندر مومن کہہ لیجیے لیکن یہ تو ہمارے ہاں ان الفاظ کے معنی اتنے بگڑ گئے ہیں کہ ذہن میں یہ تصور نہیں آتا۔ یہ ہے وہ ایمان جو قرآن پیدا کرتا ہے اگر یہ چیز ہو کہ انسانی ذات پہ آپ کا یہ ایمان ہے تو پھر آپ انسان کے اندر آئے کہ جنہوں نے کچھ بننا ہے۔

قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کا درس دیتا ہے

اور یہ جو ہیں کہ جنہوں نے اپنے اندر کچھ بننے کی چیزیں پیدا کی ہیں، تو پھر وہ ان کو کہتا ہے کہ یہ انفرادی چیز نہیں ہے کہ تم اپنی ذات میں کہو کہ میں بن گیا اور ٹھیک ہے مقصد پورا ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو اس طرح سے بنے ہوئے ہیں، اکٹھے ہو جاؤ، اکٹھے ہونے کے بعد اٹھو، اور ہماری کائنات کو بھی سنوار و اور انسانیت کو بھی یہ کچھ بناؤ جو کچھ تم بن گئے ہو۔ ''دیکھا ہے جو کچھ تو نے اوروں کو بھی دکھلا دے'': **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** (5:67)۔ بلغ کے معنی ''پہنچا دینا بھی ہیں۔'' آپ کو معلوم ہے، پہلے بھی یہ چیز آ گئی ہوئی ہے کہ تبلیغ کس کو کہتے ہیں۔ یہ باتیں بار بار درس میں دہرانی چاہئیں۔

تبلیغ اور احسان کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ بلغ بڑی چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ ہی یہ ہو گیا کہ بس صرف پہنچا دینا۔ یہ بات نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں تو ریگستان ہوتا تھا اور پانی کی بڑی کمی ہوتی تھی۔ پانی کی کمی کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ وہاں سے سمندر کے سمندر تیل نکل رہا ہے، اور وہ اس قدر تیل والے ہیں مگر پانی کے گھونٹ کے لیے وہ ترستے ہیں۔ وہ بھارت سے، ایران سے، پاکستان سے، پانی منگوا رہے ہیں۔ وہاں تو پینے کا پانی نہیں ہے۔ ایک زمانے میں وہاں کہیں کنویں ہوتے تھے، جہاں نخلستان ہوتا تھا۔ تو کنویں کے اوپر وہ رسی بھی ہوتی تھی، وہاں پانی نکالنے کے لیے کچھ ڈول رکھا ہوا ہوتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں، یہاں ہمارے ہاں بھی یہ جو کنویں ہوتے تھے، جہاں نہریں نہیں ہوتی تھیں، وہاں گرمیوں کے موسم میں پانی بہت نیچے چلا جاتا ہے۔ تو اب معلوم نہیں تھا کہ وہاں پانی لینے کے لیے کس کنویں میں

جائیں اور پانی نکالیں۔ ❶

ہمارے ہاں احسان کا بدلہ احسان نہیں دیا ہے تو کہتے ہیں طوطا چشم' نمک حرام' پتہ نہیں کیا کچھ بنا ہے۔احسان کے معنی ہی یہ ہیں کہ کسی کمی سے اگر اس کی Proportion (تناسب نسبت) بگڑ گئی ہے' تو اس کی وہ کمی پوری کردو تاکہ اس کا حسن پورا ہو جائے اور اس کا بدلہ کیا! اس کا تم نے توازن برقرار رکھنا تھا' توازن برقرار ہو گیا۔یعنی اس کے عمل سے توازن برقرار ہونا تھا وہ ہو گیا چنانچہ جو تیرا مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔عزیزانِ من! یہ ہے جو اس قرآن نے' خدا کی کتاب نے دیا ہے' یہ ہے جو اس کی مثل کہیں نہیں مل سکتی' یہ ہے جو ساری دنیا سے لازوال ایک دین ہے جس کی کوئی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ (23:15)۔ٹھیک ہے جسم تمہارا Disintegrate (مضمحل) ہو کے چلا گیا' حیوان ختم ہو گیا' آدمی جو حیوان کی سطح پہ ہے' ٹھیک ہے' وہ ختم ہو گیا۔اگر تم یہی سمجھتے ہو تو جسم کے مرنے سے تم بھی ختم ہو گئے' مگر سنو **ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ تُبْعَثُوْنَ** (23:16) اس وقت وہ موانعات تمہارے راستے میں آ رہے ہیں' ایک حد تک بڑھ سکتے ہو' آگے نہیں جا سکتے۔ہم نے ان موانعات کو توڑ دیا ہے اور آگے بڑھو' اس لیے **لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** (84:19) درجہ بدرجہ اوپر اٹھتے چلے جاؤ۔

اب بات یہاں سے چلی تھی کہ وہ جو اس کی ابتدا کی تھی وہ **سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ** (23:12) سے کی تھی یا یوں کہو کہ وہ وہاں سے' جو حیوانی درجہ ہے' یہاں تک یہ چلتے آئے اور چلتے آئے۔اور اس کے بعد **ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) ہوئے اور وہاں کہا تھا **فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ** (23:14) اللہ احسن تقویم میں پیدا کرنے والا ہے اور اس کا نتیجہ یہ کہ

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے ❷

---

❶ ان کنوؤں پر ڈول اور رسی رکھی رہتی تھی۔گرم مقامات کے کنوؤں کا پانی ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتا اکثر نیچے اتر جاتا ہے جس کی وجہ سے ڈول کی رسی پانی کی سطح تک نہیں پہنچ سکتی۔اس مقصد کے لیے یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ رسی کا ٹکڑا رکھتے تھے جسے ڈول کی رسی (الرشاء) کے ساتھ باندھ دیتے تاکہ ڈول پانی تک پہنچ جائے۔اس رسی کے ٹکڑے کو التبلغۃ کہتے تھے۔یہاں سے تبلیغ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی اگر ایک انسان اپنی ذاتی استعدادی کمی کی وجہ سے کسی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا تو اس کی اس کمی کو اس طرح پورا کر دیا جائے کہ وہ اصل مقصد تک پہنچ جائے لیکن اگر وہ (الرشاء) کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہتا تو خالی التبلغۃ اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی۔تبلیغ اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت کو بھی کام میں لائے۔(ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن: جلد اوّل' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔347)

❷ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کا ضربِ کلیم میں حیاتِ ابدی کے عنوان سے یہ پورا شعر یوں ہے:

ہوا اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

انسان کی ہر دو قسم کی پرورش کی اہمیت اور خدا تعالیٰ کی ذمہ داری

اب اس میں دونوں قسم کی پرورش کی ضرورت پڑ گئی۔ اگر ایک بچے کی طبعی (Physical) پرورش آپ نہیں کرتے تو اس کا انسان بننے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے یعنی جب اس کے پاس وہ گھوڑا ہی نہیں جس پہ چڑھ کر اس نے سفر طے کرنا ہے تو منزل پہ پہنچ نہیں سکے گا۔ یہ جسمِ انسانی تو اس کے لیے سواری کا کام دینے کے لیے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو سواری ہے' اس کی پرورش تو بڑی ضروری ہوتی ہے۔ ''ٹانگے والا شام نوں جا کے پہلاں گھوڑے واسطے پٹھے لے اوندا اے' تے مگروں جا کے اپنے بچیاں دی روٹی دا انتظام کردا اے۔''[1] اس کو پتہ ہے کہ اس کی نشو ونما پہ سارا دارو مدار ہے۔ اس لیے جسم کی نشو ونما بڑی ضروری ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ربط چلا آ رہا ہے قرآن میں! کہیں یہ ذہن میں نہ آ جائے کہ یہ مادی زندگی' یہ انسانی جسم کی نشو ونما' یہ سب کچھ غلط ہے۔ کہا کہ اس کے لیے تمہیں پیدا کیا' اس کے لیے ہم نے خود انتظامات کر دیئے۔

چودہ سو سال پہلے آسمانی کرّوں کی کیفیت کا بیان

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ (23:17)۔ فضائے آسمانی کے اندر طرائق ہیں۔ طریق کے معنی یونہی راستے کے بھی ہوتے ہیں اور اس کے معنی ہوتے ہیں ''ایک کے پیچھے دوسرا چلنے والا' ایک کے پیچھے دوسرا چلنے والا۔'' علم الافلاک کے ماہرین اس لفظ طرائق کی داد دیں گے جو قرآن نے کہا ہے۔ اس زمانے میں جب ابھی تصور میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ جو کرّے ہیں' یہ کچھ چلتے بھی ہیں' متحرک بھی ہیں۔ اس زمانے میں ان کرّوں کے لیے طرآئق کہنا کہ یہ ایک دوسرے کے پیچھے چلے آ رہے ہیں' محوِ گردش ہیں' بڑی بات تھی۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ اس لیے بتایا کہ **وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ** (23:17) یہ نہیں تھا کہ ہم نے پیدا کر دیا تو بس پھر اس کے بعد ہم بے پرواہ ہو کر چلے گئے کہ ''ٹھیک ہے ساڈا کم ایناں ای ہیگا سی''[2] پیدا کر دیا بس اور کیا' یہ غلط بات ہے۔ جو ہم نے پیدا کیا ہے اس کے سامانِ نشو ونما کی طرف سے ہم غافل نہیں ہیں۔ جو پیدا کیا ہے اسکی طرف سے بھی غافل نہیں ہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ جو پیدا کرنا تھا وہ ہم پیدا کر چکے اور اب اس کے بعد کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

---

[1] ٹانگے والا' شام کو جا کر پہلے اپنے گھوڑے کے لیے گھاس لاتا ہے پھر اپنے بچوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہے۔

[2] ٹھیک ہے ہمارا بس اتنا ہی کام تھا۔

1913ء میں یورپ کی علمی سطح کی حالت

یورپ میں ایک School of Thought (مکتب فکر) ایسا بھی تھا کہ اس کے مبلغ یہ کہتے تھے کہ Universe (کائنات) Accomplished Form (مکمل شدہ حالت) کے اندر ہے' اسے جو کچھ بننا تھا بن گئی۔ خدا کے متعلق یہ تھا کہ جس طرح ساتویں دن چابی دینے والا کلاک ہوتا ہے' ایک دفعہ اس کو چابی دے رکھی ہے اور اس کے بعد وہ سو گیا ہے' یہ اس کے بدلے میں چل رہی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ جو 1913ء کے اسکولز آف تھاٹ (مکاتیب فکر) تھے' زمانے کی تحقیقات نے آہستہ آہستہ انہیں خود ہی مٹا دیا۔ بہرحال وہاں یہ تصور تھا۔ پہلے تو کہا کہ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (23:17)۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے اس کو چابی دیدی ہے اور یہ خود ہی چل رہی ہے۔ ہم اس کی طرف سے غافل نہیں تھے' سامانِ نشو ونما بھی ضروری تھا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ کائنات Accomplished Form (مکمل شدہ حالت) یعنی Complete Form (مکمل حالت) کے اندر نہیں بن گئی ہے بلکہ ہم يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35:1) اس میں نت نئے اضافے کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا اس کی تزئین کے لیے' اس کی آرائش کے لیے' اس کی تحسین کے لیے' اس میں اور اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب [1] اچھے انداز میں بات کہہ گیا ہے کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تو آرائش و جمال سے وہ فارغ نہیں ہے اس طرح وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (23:17)۔

سامانِ نشو ونما کے پیش نظر سمندر کے پانی کو کشید کرنے کی غرض سے سورج کی بھٹی کا انتظام

بہرحال جسمِ انسانی کی پرورش کا پہلا سوال آ رہا تھا۔ اس کے لیے کہا کہ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ (23:18) اب دیکھو تمہارے لیے یہ سامانِ نشو ونما' یہ پرورش کا سامان' جو ہم نے پیدا کرنا تھا' اس کے لیے کتنا بڑا انتظام کیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عرب والے' وہاں سے پانی کے جو ٹینکر منگوا رہے ہیں' وہ مکے سے تیس میل کے فاصلے پہ جدہ ہے' وہاں تو سمندر ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ سمندر کے پانی کا ایک قطرہ بھی پینے کے قابل نہیں ہے۔ اگر اس پانی کا ایک لوٹا کھیتی پہ ڈال دیا جائے تو کھیتی جل جاتی ہے۔ وہ اس قدر Salty (نمکین) ہوتا ہے کہ آدمی پی نہیں سکتا۔ اس کھیتی کا سارا دار و مدار زمین پہ ہے۔ جو کچھ کھانا پینا ہوتا ہے' وہ اس سے اگتا ہے۔

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)

اس کھیتی باڑی کے لیے اس افراط سے پانی کا کیا انتظام ہے صاحب! ملاحظہ فرمایئے کہ اسی سمندر سے' سورج کی کرنیں' پانی کشید کر کے Distilled water (کشید شدہ پانی) دیتی ہیں اور یہ Distilation (عملِ کشید) بڑا مشکل امر ہوتا ہے۔ سمندر کے کنارے پانی پینے کو نہیں ملتا۔ وہاں وہ انتظامات کر رہے ہیں کہ وہاں پانی Distilation (کشید) ہو جائے تو جتنے یہ پانی میں گھلے ہوئے مادے ہیں' یہ چیزیں وہیں رہ جائیں اور خالص پانی اوپر آ جائے۔ اس پہ اتنی Cost (قیمت) آتی ہے کہ ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ اتنے بڑے پیمانے پہ جو Distilation (کشید کا عمل) ہے وہ اس قدر Costly (مہنگا) ہے' یہ بہت بہت مشکل چیز ہے۔ فلٹریشن (عمل تقطیر) تو بڑی آسان چیز ہے۔ یہ ریت اگر پانی میں گھل جائے تو وہ تو بڑی آسانی سے الگ ہو جاتی ہیں لیکن اگر نمک اس میں ملا ہوا ہو تو وہ Distilation (کشید) کرنا پڑتی ہے۔ سمندر کا پانی جس کی کیفیت یہ ہے' اس میں سے یہ آبِ مقطر' کشید کر کے' سورج کی یہ کرنیں آپ کے لیے یہ کرتی ہیں' کہ اسے اوپر لے جاتی ہیں! وہ بادلوں کے مشکیزے بھر دیتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر ہواؤں کے جھکڑ ان مشکیزوں کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر لیے پھرتے ہیں۔ اور وہاں دوسرے مقام پہ اس ایک آیت میں ایک لفظ ہے **وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ** (2:238) تم زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی اطاعت میں کمر بستہ کھڑے ہو جاؤ۔ [1] اس میں قانتین ایک لفظ ہے۔ [2] شروع میں تو ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ ہم ہر لفظ پر کھڑے ہو کر سوچتے ہی نہیں ہیں حالانکہ قرآن کا ہر لفظ ایک خاص معنی و مفہوم رکھتا ہے۔ آپ سوچیے کہ اگر کسی سقے کی مشک دس جگہ سے ٹپکتی ہو' تو جہاں جا کر اس نے پانی گرانا ہے وہ مشک اس سے پہلے ہی خالی ہو جائے گی اور اگر مشک ایسی ہو کہ اس کا منہ ہی آگے سے نہ کھلے تو جہاں پانی چاہیے' وہ وہاں جا کر گرائے ہی نہیں۔ قرآن نے اپنی توانائی کی مشک کے منہ کو بند رکھ کر اس مقام پر جہاں اس پر توانائی کی ضرورت ہے' اس مشک کے منہ کو کھولنے والے ایسے افراد کے متعلق کہا تھا: **قٰنِتِيْنَ** (3:17;33:35)۔ بات یہ ہے کہ عربوں کے ہاں قَـنِيۡتٌ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس کی اِدھر اُدھر سے سلائی ایسی ہو کہ پانی کا ایک قطرہ باہر نہ گرے اور منہ اس قسم کا ہو کہ جہاں جی چاہے' اُسے کھول لیجیے تو سارا پانی باہر نکل جائے۔ کہا کہ انسانی توانائی کے یہ مشکیزے اس قسم کے ہیں۔ انسانوں کے لیے بھی اُس نے یہی کہا ہے۔ مومن کی زندگی کے متعلق بھی ایک لفظ کے اندر یہ ساری بات آ گئی کہ بڑی صلاحیتیں

---

1. پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' ص۔ 91
2. بقول صاحب تاج العروس سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ لہٰذا اس کا صحیح مفہوم ہے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور صرف قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص۔ 1390)

اور توانائیاں تمہارے اندر ہوتی ہیں لیکن ایسا نہ کرو کہ انہیں یونہی ہر جگہ بہاد و انہیں ہر جگہ محفوظ رکھا کرو اور یہ بھی نہ ہو کہ بخل ہو۔ جہاں کہا جائے وہاں ان کا منہ کھول دیا کرو۔ یہاں (23:18) میں بادلوں سے کہا کہ کیا یہ ہو کہ بس جہاں ہو منہ کھول دیا جائے؟ نہیں بقدرِ ضرورت ان کا منہ کھلتا ہے۔

رزق کی فراوانی اور زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے پانی کے مہیا کرنے کا حیران کن انتظام

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تین دن مسلسل بارش ہوتی رہی، سترہ، اٹھارہ انچ بارش ہوگئی۔ وہی بارش جو آیہ رحمت تھی، پھر وہ سیلاب بن جاتی ہے۔ وہ جو وہاں کی قدر ہے، وہ جو وہاں کا پیمانہ ہے، یہ اس کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمارے پیمانے کے مطابق وہ پانی اس سے بڑھ جاتا ہے۔ اور اگر وہاں پیمانہ ہی نہ ہو تو جتنا پانی سمندر کا اوپر جاتا ہے، اوپر جائے، وہاں ٹھنڈ لگے، اور سارے کا سارا نیچے آ گرے۔ یعنی بات تو اس نے ساری یہ کرنی تھی کہ تمہارے جسم کی پرورش کے لیے ہم نے یہ کچھ سامان کیا ہوا ہے، اور وہ جو کیا ہوا سامانِ پرورش ہے، ذرا دیکھیے کہ اس کے بیان کرنے کا انداز کیا ہے۔ اس کے لیے **بِقَدَرٍ** کہا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں اتنی مقدار کے مطابق ہی پانی اوپر سے نیچے آتا ہے۔ سارے کا سارا، جتنا بادل ہے، ایک ہی جگہ ٹھنڈا ہو کر کہیں ایک ہی جگہ گر جائے تو سیلاب آجائے۔ اور اگلی چیز اور ہے۔ کہا کہ **فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ** (23:18)۔ اگر صورت یہ ہو کہ پانی جتنا پڑے، وہ پڑنے کے بعد زمین اس کو چوسے نہیں، آگے بہادے، تو کھیتی نہیں ہوسکتی۔ کہا کہ ہم نے زمین کو ایسا بنایا کہ وہ پانی کو چوس کر اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے۔ **بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ** (23:18)۔ اس کے لیے یہ کر دیا کہ جتنا اوپر سے زائد ہے، وہ بہہ کے آگے چلا گیا اور یہ کچھ اپنے اندر جذب کر لے۔

یہ جو پانی جذب کرنا ہے، کھیتی کا سارا دارومدار اس کے اوپر ہے۔ جتنی نمی چاہیے اس نے اپنے اندر محفوظ کر لی ہے اور پھر اس کی محفوظیت کی کیفیت یہ ہے کہ مئی جون کے مہینے میں آپ پانی کسی تھالی میں رکھیے تو سارا اڑ جاتا ہے لیکن زمین کی اوپر کی سطح جو ہوتی ہے وہ تو خشک ہوتی ہے، نیچے جو پانی ہوتا ہے وہ اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے جبھی تو یہ سارے پودے کھیتیاں بڑے ہوتے ہیں۔ **فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ** (23:18)۔ کہا کہ یہ ساری چیزیں کون کہہ رہا ہے؟ **وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ** (23:18) ہم چاہتے تو پانی جتنا برسا تھا، سارے کا سارا اڑا کر لے جاتے۔ **فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ** (23:19) یہ پانی زمین میں جذب ہوا اور وہاں سے پھر کھجوروں کے، انگوروں کے باغات ہوئے۔ اگر یہ قرآن ہمارے ہاں آتا، تو جنت کے پھلوں میں آم کا ذکر پہلے ہوتا۔

قدرت کی طرف سے یہ تمام نعمتیں کسی ایک فرد کے لیے نہیں ہیں بلکہ "لکم" (تم سب) کے لیے ہیں

عزیزانِ من! یہ باتیں Agriculture (زراعت) کے Process (عمل) کی ہو رہی ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ قرآن درمیان میں کر کیا جاتا ہے؟ ایک لفظ لے آتا ہے جس سے اپنا جو بلند مقصد ہے وہ بھی ساتھ ساتھ کے ساتھ سامنے لے آتا ہے۔ بات تو یہ تھی کہ ہم نے پھر یہ باغات اگائے' انگور کھجور پھل پھول نباتات اگائے۔ ان سب چیزوں کا پروسیس (طریق) تو یہی ہوتا ہے لیکن یہاں درمیان میں ایک چیز اور آ رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **لَكُمْ** (23:19) پوری نوع انسانی کے لیے یہ پیدا کیا ہے۔ اور اگر عزیزانِ من! اس **لَكُمْ** کے اندر کچھ فرق آ جائے تو بات خدا کے پروگرام کے خلاف چلی جائے گی۔ اس نے نخیل واعناب وفواکہ کہا ہے۔ اگر نوعِ انسانی میں سے ایک فرد بھی ایسا ہے' جس کے لیے عام گیہوں کی روٹی نہیں ہے' اگر ایک بھی اس سے محروم رہ گیا ہے' تو بات لکم کے خلاف چلی جائے گی۔ کہتے ہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے؟ ارے لکم سے پوچھو کہ نظام کیا ہے۔

دنیا کی ساری جنت 'لکم' کے ایک لفظ میں پوشیدہ ہے

اس پروگرام کے مطابق جو زندگی ہوتی ہے' اسے اس نے یہاں بھی جنت کی زندگی کہا ہے۔ **وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ** [1] (23:20)۔ اتنی افراط سے وہاں یہ سب چیزیں اس نے بیان کی ہیں لیکن اس کے بعد آپ دیکھیے کہیں یہ نہیں کہا کہ ایک طبقہ تو ہوگا جس کو یہ کچھ میسر آئے گا اور دوسرا وہ ہوگا جو سارا دن محنت کرے گا۔ کہیں یہ بات نہیں ہے۔ اُس میں طبقات ہوتے نہیں ہیں حتیٰ کہ اعلیٰ درجے کے صوفے' ریشم کے پردے' چاندی اور سونے کے برتن' ظروف بلوری' یہ چیزیں وہاں گنائی گئی ہیں۔ یہ چیزیں جن کو ملا کی شریعت نے حرام قرار دیدیا ہے' جنت والوں کے لیے ہیں اور اس جنت میں کہیں طبقات کا ذکر نہیں ہے کہ بعض کو ملے گی' بعض کو نہیں ملے گی۔ وہ اتنا اونچا معیار ہو جاتا ہے کہ اتنی بڑی معیاری زندگی کا اس کے بعد تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا بتاؤں' عزیزانِ من! لمبی زندگی ہو' لمبے وقت ہوں' قرآن سامنے ہو' وقت گزرنے کا خیال نہ ہو' وہاں جنت میں یہ باتیں کریں گے' وہاں یہ ٹائم پیریڈ نہیں ہوگا۔

---

[1] اور اسی طرح (زیتون کے درخت کو بھی) اگاتے ہیں' جو سینا کی وادیوں میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اس سے تیل نکلتا ہے جس سے کھانے والوں کے لیے بہت اچھا سالن تیار ہوتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔776)۔

جسمانی طور پر رزق کا یہ سارا نظام ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے

قرآنِ کریم نے کہا کہ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ (23:21)۔وہاں زراعت کی چیز آئی تھی' اب قرآن حیوانات کی طرف آ گیا ہے۔کہا کہ وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً (23:21)۔یہاں قرآن مقامِ عبرت کہتا ہے۔یہ لفظ جو عبرت ہے' میں ابھی اس کے معنی بتاتا ہوں۔کوئی بات چھیڑی جائے' اس کے متعلق گفتگو کی جائے' کہا جائے کہ اس سے نتیجہ کوئی اور ہو' جس تک تم نے پہنچنا ہو' اُسے تم کہانی کی طرح نہ سنو' یہ فزیکل چیزیں جو ہم گنا رہے ہیں' یہ باتیں Physical World (طبعی دنیا) کی کر رہے ہیں' یہ جسمانی نشو ونما ہی ہے تمہاری۔باتیں ہم یہ کر رہے ہیں لیکن اس میں تمہارے لیے عبرت ہے۔یاد رکھو کہ تم نے اس سے کسی اور نتیجے پہ پہنچنا ہے۔

یہ جو عبرت کا لفظ ہے' اسے سمجھیے۔آپ نے عبور تو سنا ہوگا' دریا عبور کرتے ہیں۔یہ پل کو کہتے ہیں کہ یہاں سے جو چلے ہو وہ اس کنارے پہ پہنچنا ہے۔بات یہاں سے تم نے شروع کی' پل یہاں سے شروع ہو جاتا ہے لیکن یہی مقصد پل کا نہیں ہے' جہاں سے یہ شروع ہوتا ہے۔یہ آخر تک جاتا ہے۔جہاں پل کا جو آخری حصہ ہوتا ہے وہاں اسے عبرت کہتے ہیں' یہاں سے چل کے وہاں پہنچ جائے۔اور اگر یہ وہیں کھڑا رہے تو عبور کر ہی نہ سکے۔عبور کا لفظ یہیں سے ہے۔کہا کہ زیتون کی' اور اعناب کی' اور انعام کی' حیوانات کی یہ باتیں' ہم کر رہے ہیں۔انہی میں کھو کر نہ رہ جایئے' تم نے پہنچنا کسی اور نتیجے پہ ہے۔نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهَا (23:21)۔

قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ ہے کہ کبھی کسی علم حیوانات جاننے والوں سے پوچھو کہ یہ اندر ہوتا کیا کچھ ہے' جس سے یہ دودھ بن کے تمہارے سامنے آتا ہے۔وہاں یہ کہا ہے کہ چیر پھاڑ کر کے دیکھ لیجیے' کچھ خون ہوتا ہے' کچھ گوبر ہوتا ہے' یہ سارا کچھ وہی ہوتا ہے۔کہا کہ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهَا (23:21)۔اجزا تو یہ ہوتے ہیں اور ان اجزا میں سے جو کچھ تمہارے لیے نکلتا ہے' وہ اس قدر خوشگوار ہوتا ہے۔کبھی کبھی میں کہا کرتا ہوں کہ اور کچھ نہیں اگر یہ دودھ سرخ رنگ کا نکلتا تو پینے والے کی طبیعت پہ اس کا کیا اثر ہوتا۔اب تو ہمیں وہ دودھ میسر ہی نہیں آ سکتا' ورنہ اگر وہ خالص دودھ کہیں سے مل جائے' اس میں جو یہ Sugar of Milk ہے' آپ کے ہاں جو ہومیو پیتھک میں Sugar of Milk استعمال ہوتی تھی' وہ ہوتی ہے' یہ بڑا میٹھا ہوتا ہے' بڑا لذیذ ہوتا ہے' اس میں خوشبو ہوتی ہے۔کہا کہ کبھی تم نے سوچا بھی ہے کہ اس کے Ingredients (اجزائے ترکیبی) کیا تھے' وہ اجزا کیا تھے جس میں سے یہ کچھ بنا؟ قرآن کہتا ہے کہ وَ لَکُمۡ فِیۡهَا مَنَافِعُ کَثِیۡرَۃٌ (23:21)۔پھر' وَ لَکُمۡ '' بڑے فائدے کی باتیں ہیں۔وَ مِنۡهَا تَاۡکُلُوۡنَ (23:21) جو تم کھاتے ہو۔وَ عَلَیۡهَا وَ عَلَی الۡفُلۡکِ تُحۡمَلُوۡنَ (23:22) سواری کا کام بھی لیتے ہو اور سواری تو یہ خشکی میں ہے۔خشکی میں سواری کرتے کرتے آگے سمندر آ جاتا ہے۔کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' وہاں کے لیے ہم نے تمہارے لیے کشتیاں بنا دی ہیں۔ساری دنیا کا سفر کرو' کھاؤ' پیو۔

ایک جنین سے جسمِ انسانی، جسمِ انسانی سے نفسِ انسانی، اور اس نفسِ انسانی کی نشوونما کے بعد جہانِ فردا کی کئی ایک نئی اور طویل منازل کی طرف سفر کا آغاز

بات آدمی کی پیدائش کی ہوئی تھی، انسانی بچے کی پیدائش کی ہوئی تھی، حیوان اور انسان کے جنین کے مراحل گنائے۔ آگے بات چلی تھی کہ اس میں خلقاً اٰخر ہے یعنی یہ کچھ اور ہو گیا ہے، یہ اور نفسِ انسانی سے ہوتا ہے۔ آگے بات چلی کہ نفسِ انسانی Developed & Accomplished Form (نشوونما یافتہ اپنی تکمیلی صورت) میں نہیں ہوتا، یہ تمہیں Material (مواد) دیا جاتا ہے جس سے تم نے خود کچھ بننا ہوتا ہے۔ بننے کے ساتھ ہی یہ بات آئی کہ اسے تصوف والا نہ سمجھ لینا۔ انسان کے جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے اور اس کے لیے ہم نے ساتھ سامان دیا ہے۔ جسم بھی ہم نے بنایا ہے اور تمہاری ذات کے لیے ہم نے ہی پیدا کیا ہے۔ جسم کی پرورش کا بھی خیال ہے اور جسم کی پرورش کے لیے ہم نے یہ جو سلسلہ ہے یہ یہاں تک کا ہے۔ تو اب بات یہاں والا کوئی بھی سائنٹسٹ ہوتا تو ختم کر دیتا کہ ان چیزوں کو ایسے کھاؤ، ایسے پیو، سب کچھ کر و لیکن اس کے بعد جو یہ لعبرۃ چیز ہے کہ اس سے بات چلی ہے کہ پہنچنا کہیں اور ہے، یہ تو عبور کرنے کے لیے ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے تاریخ سے مثال دی ہے کہ **وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ** (23:23) اس کہیں اور پہنچنے کے لیے ہم نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا۔ انبیا اس لیے بھیجے تھے کہ وہ جو تمہارا انسان بننے کا حصۂ زندگی ہے اس کے لیے بھی پروگرام دینا، Direction دینے، سامان دینا، ہمارے ذمے تھا۔ یہ تو غلط ہوتا کہ آدمی کو پیدا کرتے اور صرف جسم کی پرورش ہوتی۔ اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہم نے دی ہے۔ جسم کی پرورش کا ہی سامان ہم صرف دیتے تو وہی رہ جاتا جو سیکولرازم کے اندر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی انتظام کیا کہ اس کی ذات کی نشوونما، جس طریقے سے، جن ذرائع سے ہوتی ہے، وہ بھی ہم نے ہی پیدا کیے، ہم نے ہی مہیا کیے اور اس کے لیے اس نے انبیائے کرام علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا۔

قرآن کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس کی ابتدا حضرتِ نوح علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ کہا کہ **وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ** (23:23) اب سلسلہ رشد و ہدایت کی بات شروع ہوئی۔ اسے ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

سورۃ المؤمنون کی آیت 22 تک ہم آ گئے، 23 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

چھٹا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 23 تا26)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿ۚ۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ﴿۲۶﴾

عزیزانِ من! آج جون 1977ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 23 سے ہو رہا ہے: (23:23)۔

انسان کی زندگی کی دو سطحیں: حیوانی اور انسانی

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں بات یوں چلی آ رہی تھی کہ انسان کی ایک تو حیوانی زندگی ہے یعنی فزیکل یا طبعی زندگی ہے اور یہ حیوانی زندگی وہی ہے جو دوسرے حیوانات کی بھی زندگی ہے۔ اس میں صرف جسم کی پرورش مقصود ہے۔ موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن علاوہ ازیں اس کی ایک انسانی زندگی بھی ہے' جبکہ حیوانات میں یہ دو زندگیاں نہیں ہوتیں۔ حیوان پیدا ہوتا ہے تو حیوان ہوتا ہے' مرتا ہے تو حیوان ہوتا ہے۔ انسان میں ایک دوسری زندگی کے بھی امکانات (Possibilities) رکھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اس

اپنانا نہیں چاہتا تو یہ بھی دیگر حیوانات کی طرح پیدا ہوتا ہے تو مر جاتا ہے' فزیکلی حیوان ہوتا ہے' ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دوسری زندگی تو اس سے ایک اونچی زندگی ہے جسے اپنا لینے کا اس میں امکان (Possibility) ہے۔ وہ از خود فطرت کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اس کی صرف امکانی شکل اس کو ملتی ہے' اس کی صلاحیت اس کے اندر ہوتی ہے [1]۔ یہ وہ چیز ہے جو Values (اقدار) سے ملتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ Values (اقدار) کا یہ Concept (تصور) حیوانات میں نہیں ہوتا۔ یہ انسانی سطحِ زندگی پر ہوتا ہے: جائز اور ناجائز کا امتیاز' حلال اور حرام کی تمیز وغیرہ۔ زندگی کی یہ حیوانی سطح نہیں ہے' انسانی سطحِ زندگی ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد قرآنِ کریم جیسا کہ اس کا عام انداز ہے کہ وہ اپنے ہاں تاریخ سے شہادات پیش کرتا ہوا' تاریخی طور پر وہ سلسلۂ رشد و ہدایت کے چشموں کو سامنے لاتا ہے یعنی وہ اطاعت کی روشنی میں' وحی' انبیائے کرامؑ کا امم سابقہ میں آنا' ان کی سرگزشتیں' ان کا مآل اور ان کا انجام' بیان کرتا ہے۔ قرآن حکیم اس سلسلے کو حضرتِ نوحؑ سے شروع کرتا ہے۔

نوعِ انسانی کی جانب سلسلۂ نبوت جاری کرنے کی غرض و غایت کیا تھی؟

قبل اس کے کہ میں حضرتِ نوح علیہ السلام کی اس کڑی سے بات شروع کروں ایک بڑی اہم چیز آپ کے سامنے لانی ہے۔ جن حضرات کے پاس قرآنِ کریم کے نسخے ہیں وہ ان میں نشان زد کرلیں جو میں عرض کرنے لگا ہوں اور اگر نہیں ہیں تو کسی جگہ اسے نوٹ کرلیں' شاید دوبارہ سامنے نہ آسکے۔ یہ اتنی اہم چیز ہے کہ اسکے بغیر دین کی غایت' لم' منتہا اور مقصود و مطلوب سمجھ میں ہی نہیں آسکتا۔ سوال یہ ہے کہ سلسلہ وحی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ انبیائے کرامؑ کو کیوں بھیجا گیا؟ دین کی غایت کیا تھی؟ کائناتی زندگی میں ہی نہیں بلکہ انسانوں کی زندگی میں یہ بہت بڑی انقلابی چیز ہے کہ خاص طور پہ خدا کی طرف سے ایک علم دیا جائے اور پھر ایک منتخب ہستی کو دیا جائے' وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ یہ اتنی Exceptional (استثنائی) چیز ہے کہ دنیا کا کوئی دوسرا غیر از نبی انسان اسے حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ اب جب نبوت کا خاتمہ ہوگیا ہے تو اسکے بعد اس کا علم پہنچ ہی نہیں رہا۔ یہ کتنی بڑی چیز تھی۔

سوال یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ کی بعثت کا مقصد کیا تھا؟ دین کی غایت کیا تھی؟ یہ وحی کا سلسلہ کیوں جاری ہوا؟ گویا آپ بھی اپنے ذہن سے ہی سہی' سوال کرکے دیکھیے تو سہی کہ اس کا کیا جواب ملتا ہے۔ اس کا عام جواب تو آپ کو یہی ملے گا کہ وہ انسانوں کو یہ بتانے کے لیے آئے تھے کہ انسانوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے' فریب نہیں دینا چاہیے' دغا نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وعظ و نصیحت کی باتیں ہمارے ہاں

---

[1] اس کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور' 2005ء' ص 185 (فٹ نوٹ 1)

ہیں۔ٹھیک ہے یہ سب اپنی جگہ بجا اور درست لیکن عزیزانِ من! یہ تو Universal Ethics (عالمگیر اخلاقیات) ہیں۔ یہ تو جو لوگ خدا کو بھی نہیں مانتے' وہ بھی ان چیزوں کو مانتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے آج کل اس دور کی میکاوَلی (1469-1527ء) کی سیاست کو اپنا ایک الگ پیشہ بنایا لیا ہے۔ دنیا کے ملحد' بے دین اور خدا کو نہ ماننے والوں سے بھی پوچھیے تو وہ بھی یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ چوری کرنا بہت اچھا ہے' جھوٹ بولنا بڑی اچھی چیز ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تو دورِ حاضرہ کی میکاوَلی [1] سیاست ہے۔ جس کی بنیاد ہی جھوٹ اور فریب پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سیاست' جیسا کہ وہ کہتے ہیں' کو اخلاقیات یا مذہب سے الگ کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان کی زندگی دو قسم کی قرار دیتے ہیں: ایک انسان کی پرائیویٹ لائف (ذاتی زندگی) اور ایک اسکی پبلک یا سیاسی زندگی۔ یہ وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جتنے بھی Universal Ethics (عالمگیر اخلاقیات) ہیں' پرائیویٹ زندگی کے اندر انہیں ان کی واقعی پابندی کرنا چاہیے: جھوٹ نہیں بولنا چاہیے' فریب نہیں دینا چاہیے' چوری نہیں کرنا چاہیے' لیکن پرائیویٹ زندگی کے علاوہ سیاسی زندگی کے اندر یہ کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں جائز ہیں کیونکہ یہ مقصد کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میرے پیشِ نظر موضوع اس وقت یہ نہیں ہے۔

میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اگر یہ چیز ذہن میں آئے کہ جو اتنی بڑی انفرادی چیز تھی کہ آسمان سے سلسلہ رشد و ہدایت کا حصول اور انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت' ان لوگوں کے ساتھ ان کا اتنا بڑا ٹکراؤ' تو آخر اس کی غرض و غایت کیا تھی' اس ٹکراؤ کا مقصود کیا تھا؟ آپ نے دیکھا کہ پہلے نبی ﷺ سے لے کر آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک' ہر نبی کی اتنی شدید مخالفت کیوں ہوئی ہے کہ میدانِ جنگ تک میں آنا پڑا' وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا۔ اگر وہ یہ کہتے کہ بھئی! جھوٹ نہ بولا کرو' سچ بولا کرو تو کیا اس سے وہ مرنے مارنے پر' یہ کہنے پر اتر آئیں گے کہ یہاں سے نکل جاؤ' ورنہ ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے؟ میں نے کہا ہے کہ یہ Ethics (اخلاقیات) بھی ضروری ہے لیکن یہ تو منتہا نہیں۔ ہم شریعت کی طرف آئیں گے تو یہ کہا جائے گا کہ ہمیں انبیائے کرامؑ کے متعلق یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ نماز پڑھا کرو' روزہ رکھا کرو' حج ادا کرو' زکوٰۃ دو لیکن یہ چیزیں مقصود بالذات (End in itself) تو نہیں ہیں۔ مذہب میں آ کر تو یہ مقصود بالذات ہو جاتی ہیں' لیکن اگر آپ دین میں آئیں گے تو وہاں نظر آئے گا کہ یہ کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means to a High End) ہیں۔ یہ بھی ضروری ہیں۔ دین کے نظام میں' مقصد کے حصول کے لیے جو ذرائع ہیں' وہ بھی تو ضروری ہوتے ہیں۔ سفر کرنے کے لیے ٹکٹ خریدنا ضروری ہے لیکن ٹکٹ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔

---

[1] اب کی تفصیل وتشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 95-94 نیز فٹ نوٹ 1 (ص۔95)

بات میں یہ کہہ رہا تھا بلکہ بات یہیں سے چلی تھی' اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ میں نے اسی لیے اس سوال کو دہرایا ہے۔ میں نے جب بھی یہ سوال کیا ہے تو آپ کے ذہن میں بھی کوئی متعین جواب نہیں آیا۔ عام طور پہ نہیں آئے گا کہ دین کی غایت کیا تھی؟ انبیائے کرامؑ کیوں آتے تھے؟ کیا کرنے آتے تھے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ سارے پیش پا افتادہ جواب غیر مطمئن ہیں لہٰذا اگر آپ سوچنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو نظر آئے گا کہ بات تو یہ کچھ ٹھیک سی ہے کہ کیا وہ یہی کہنے کے لیے آئے تھے کہ جھوٹ نہ بولا کرو' روزہ رکھ لیا کرو' آخر دین کا مقصد اور غایت کیا ہے؟ جب تک یہ نہ متعین ہو' عزیزانِ من! باقی چیزیں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ صبح اٹھ کر سپاہیوں کی لیفٹ رائٹ پریڈ سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ذہن میں یہ نہ ہو کہ ان کو یہ مشق کیوں کرائی جا رہی ہے۔

دین کی اہمیت کے سلسلہ میں قرآنی تعلیم کی جامعیت کی ایک روشن مثال

اگر قرآن حکیم کی (2:213) اور (10:19) ان دو آیتوں کو ملائیے تو اس نے اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی ہے کہ انبیائے کرام کو کس لیے بھیجا تھا۔ یاد کر لیجیے یا نوٹ کر لیجیے کہ دین کا سارا پروگرام اس محور کے گرد گھومتا ہے۔ یہی مرکزی نقطہ ہے۔ یہی اس کی عمودی تعلیم ہے اور وہ ہے سورۃ بقرۃ کی یہ آیت: (2:213)۔ اب اس میں اتنا حصہ آئے گا' سنیے: **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213)۔ ابتداً پوری نوعِ انسانی ایک امت' ایک قوم' کی شکل میں تھی یعنی امتہ واحدۃ تھی۔ اگلا ٹکڑا سورۃ یونس کی آیت (10:19) ہے۔ آپ ان دونوں کو ملا لیجیے' بات سمجھ میں آجائے گی۔ **كَانَ النَّاسُ** (2:213) میں یہی ہے اور (10:19) میں بھی۔ کہا کہ **وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً** (10:19) نوعِ انسان ابتدا میں امتِ واحدہ یعنی ایک قوم تھی لیکن بعد میں **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) انہوں نے اختلافات پیدا کیے' ان میں ایک تفریق پیدا ہوئی اور وہ قوم امتِ واحدہ نہ رہی یعنی **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ وہ مشیتِ خداوندی تھی جو اس پورے پروگرام کی غایت تھی۔ میں دو الفاظ بولا کرتا ہوں: خارجی کائنات کے اندر فطرت کا پروگرام اور انسانی زندگی کے اندر مشیت کا پروگرام۔ یہ بات تو ایک ہی ہے۔ فطرت بھی اسی کی بنائی ہوئی ہے' مشیت بھی اسی کے قانون کا نام ہے لیکن یہ جو **فَاخْتَلَفُوْا** والی چیز تھی' یہ مشیت کے پروگرام کے اندر فٹ نہیں بیٹھتی تھی اور اس سے پروگرام Upset (تتر بتر) ہو رہا تھا۔ اس چیز سے انسانوں کے مابین امتِ واحدہ نہ رہنے سے' ان میں اختلافات پیدا ہو جانے سے' ان میں تفریق پیدا ہو جانے سے' وہ نظام درہم برہم ہو رہا تھا' چنانچہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو ایک بڑا انقلابی قدم اٹھانا پڑا جو اس سے پیشتر قطعاً کائنات میں نہیں تھا۔ کائنات میں یعنی باہر کی اشیائے کائنات یا حیوانات کے لیے' قطعاً اسکی ضرورت نہیں تھی کہ خدا کی طرف سے خاص طور پہ کوئی نبی ان کی طرف آئے اور وہ سوچتے ہوں کہ یہ کچھ کہے۔ اسکی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حیوانات میں کبھی کوئی نبی نہیں آیا۔ کسی نے آکر بکریوں کو یہ نہیں بتایا کہ تم نے گھاس چرنی

ہے' گوشت نہیں کھانا۔ کسی نے شیر سے نہیں کہا کہ گوشت تم پہ حلال ہے' سبزی تم پہ حرام ہے۔ انہیں انبیاء کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ انسانوں میں بھی' وہ کہتا ہے کہ جب تک امتِ واحدہ سے فَاخْتَلَفُوْا کی بات نہیں تھی' اسکی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جب فَاخْتَلَفُوْا (10:19) ہوا یعنی انہوں نے اختلاف کیا' ان میں تفریق پیدا ہوئی' ان میں فرقے پیدا ہوئے تو فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (2:213) اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا۔ یہ ہے' عزیزانِ من! دین کی غایت۔ یہ غایت تھی اور ہے کہ نوع انسانی امت واحدہ رہے لیکن ان میں اختلاف پیدا ہوا۔ اب انسان کی اپنی عقل وفکر کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان اختلافات کو مٹا سکتے ورنہ ضرورت نہیں تھی' لہٰذا ان اختلافات کو مٹانے کے لیے مشیت کو یہ ایک انقلابی قدم اٹھانا پڑا' یعنی انبیائے کرامؑ کو بھیجنا پڑا۔ آپ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (2:213) میں اسے دیکھیے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس غرض ومقصد کیلیے کہ نوع انسانی کے ان اختلافات وامتیازات کو مٹا کر پوری انسانیت کو امتِ واحدہ بنا دیا جائے' عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ (2:213) خدا نے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا۔ وہ آ کر یہ بتاتے تھے کہ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ (2:213) اس اختلافی زندگی کا انجام بڑا تباہی ہوگا اور امتِ واحدہ بن کر رہنے کا نتیجہ بڑا خوشگوار اور سرفرازیوں کا حامل ہوگا۔ کیا یہی بات وہ وعظ کہنے کے لیے آئے تھے؟ اور کیا اس سے انہوں نے آگاہ کر دیا اور اس چیز کی خوش خبریاں دیدیں اور بس؟ کہا کہ نہیں' ایسا نہیں۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (2:213) ہر نبی کے ساتھ ایک ضابطہ قانون بھیجا جاتا تھا جو حق پر مبنی تھا۔ عزیزانِ من؟ میں یہ عرض کردوں کہ ہمارے ہاں یہ جو عقیدہ پھیلایا گیا تھا کہ ''من نیستم رسول [1]'' میں تو نبی ہوں' میں تو رسول نہیں ہوں۔ یہ کیا فرق تھا نبی اور رسول میں؟ کہ جی! وہ رسول تو کتاب لایا کرتا ہے اور نبی بغیر کتاب کے آیا کرتا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے وہ کوئی وحی لے کر نہیں آتا' کوئی ضابطہ قانون لے کر نہیں آتا' کوئی حکم لے کر نہیں آتا۔ خدا کی طرف سے وہ آتا ہے' اتنی بڑی Expectation (توقع) ہو رہی ہے' وہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں صاحب! انہوں نے مجھے کوئی کتاب تو دی نہیں' ویسے ہی بھیج دیا ہے۔ اندازہ لگایئے عزیزان من! یہ کیا بات ہوئی؟ کئی دفعہ یہ بات آ چکی ہے کہ بابا! اس کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوتا تھا اور اپنے ساتھ کتاب لاتا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں علم کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی ایک آیت ساری عمر ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (2:213) تمام انبیاء کو ہم نے کتاب دی اور رسولوں کے متعلق کہا کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (57:25) ہم نے اپنے تمام رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ

---

[1] یہ اشارہ غلام احمد قادیانی (1908-1835) کی طرف ہے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے قرآن کریم کی اکملیت ومحفوظیت کا تو انکار نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے دعوئے نبوت کی ایک اور راہ نکالی۔ یعنی انہوں نے کہا کہ میں رسول نہیں ہوں اس لیے بلا کتاب آیا ہوں۔ ''من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب'': (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ص۔807)

کتاب نازل کی۔ رسول اور نبی ایک ہی بات تھی' یہ ایک ہی منصب کے دو نام ہیں [1]۔ سوال ہی نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی آئے اور خدا کا کوئی حکم ساتھ نہ لائے۔ کتاب کے یہ معنی نہیں کہ اتنی بڑی ضخیم مجلد کتاب ہو۔ کتاب کے معنی قانون کے ہوتے ہیں۔ کوئی ایک حکم بھی خدا کی طرف سے لے کر آ جائے گا تو وہ نبی کی کتاب ہے۔

میں یہاں اس ضمن میں یہ عرض کر دوں کہ کہا یہ گیا ہے کہ نوعِ انسان کو امتِ واحدہ بنانا مقصد عظیم تھا۔ نوعِ انسان امتِ واحدہ کی شکل میں رہتی تھی' اس میں اختلاف پیدا ہوئے۔ اختلافات مٹانا انسان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ یہ کیوں انسان کے بس کی بات نہیں حالانکہ عقلِ انسانی تو اس کو بہت بڑا ذریعہ دیا گیا ہے جو حیوانات کو نہیں دیا گیا۔ یہ تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ نبی بھیجے۔ وہ ان اختلافات کو مٹاتے تھے۔ اس لیے کہا کہ **اَنْـزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ** (2:213)۔ ان کے ساتھ بالحق ضابطہ قانون بھیجا تا کہ **لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ** (2:213) وہ انسانوں کے اختلافی معاملات اس کتاب کے ذریعے مٹا دیں۔ اس سے دین کی غرض وغایت سامنے آ گئی۔

عزیزانِ من! اس سے پہلے بھی جن حضرات کی نگاہ قرآنِ کریم پہ تھی ان کے تو یہ ذہن میں ہوگا لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ دین کی غرض وغایت کیا ہے؟ کیا کسی نے آج تک آپ کو بتایا تھا کہ انبیائے کرامؑ بھیجنے کی کیوں ضرورت پڑی؟ اس وحی کے ذریعے ایک انقلابی قدم کیوں اٹھایا گیا؟ یہ حضرات کاہے کے لیے آتے تھے؟

قرآنی اقدار کے اس انقلابی اقدام کی غرض وغایت

عزیزانِ من! اب یہ جو کچھ بھی باقی ہے' آپ اسے تاریخ کہہ لیجیے۔ یہ وہ اقدار تھیں جو باقی رہ گئیں۔ مثلاً یہ کہ جھوٹ نہ بولیے' سچ بولیے' فریب نہ دیجیے' روزے رکھیے' نماز پڑھیے۔ یہ سارے اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع ہو جائیں گے کیونکہ اس مقصد کے لیے **فَـبَـعَـثَ اللّٰـهُ** (2:213) اللہ نے انبیاء کو بھیجا۔ اب باقی جتنے بھی آپ کے ہاں احکام آئیں گے' وہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع ہونگے۔ اگر یہ مقصد ہی سامنے نہیں یا جس انداز سے آپ ان ذرائع کو اختیار واستعمال کرتے ہیں' وہ مقصد ہی نہیں پورا کر رہے' تو وہ دین نہیں ہے۔ مقصد تو یہ تھا کہ اس سے اختلافات مٹائیں۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے کہا کہ **الـنَّــاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) الناس یعنی پوری نوعِ انسانی ایک امتِ واحدہ تھی۔ اس عالمگیر انسانیت میں انسانوں نے اختلافات پیدا کر دیئے۔ اس طرح ان میں تفریق پیدا ہوگئی' تفرقہ پیدا ہوگیا' وہ الگ الگ ہوگئے۔ اس لیے اس سارے عظیم انقلابی پروگرام کو وحی کے ذریعے قوانین دینے کی ضرورت پیش

---

[1] اسکی مزید تشریح وتفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: معراج انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1949ء ص ص۔ 815-817۔

آئی۔ایک نبی بھیجنا' اس نبی کا فریضہ قرار دینا کہ وہ ان کے اختلافات کو اس کتاب کے ذریعے مٹائے' یہ ہے غایتِ دین۔

عزیزانِ من! آنا تو مجھے اس پر آخر میں چاہیے تھا لیکن کیوں نہ یہیں سے بات شروع کر دی جائے۔آپ سوچیے کہ یہ ہے دین کی غایت' یہ ہے نبی کا مقصود' یہ ہے وہ کتاب جو خدا نے دی ہے۔ اس کتاب کا یہ مقصد ہے کہ اختلافی معاملات ختم کرے' فیصلہ دے' اختلاف مٹا دے اور انسانیت کو امتِ واحدہ بنا دے۔عزیزانِ من! وہ قوم یہ مقصد کیا پورا کرے گی جس کے اپنے اندر کہنے کو بہتر (72) اور حقیقت میں بہتر ہزار (72000) فرقے خود موجود ہوں۔جو قوم ہزار سال میں اپنا یہ اختلاف نہ مٹا سکے کہ نماز میں ہاتھ یہاں اوپر باندھنے چاہئیں یا نیچے' وہ دین کی اس غرض و غایت کو پورا نہیں کر سکے گی۔

فرقہ بندی کو شرک قرار دینے کی وجہ جواز

قرآن نے فرقہ بندی کو کیوں شرک کہا ہے' اس پر کبھی تو کھڑے ہو کر سوچیے' کبھی تو ان سے پوچھیے' اس لیے کہ یہ انبیائے کرام کے بھیجنے کی بنیادی غایت اور غرض تھی۔وہ بات تو پھر اس کے خلاف جاتی ہے۔خدائے واحد کو خدا ماننے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ خدا کو ماننے کا لفظ بھی ہم بول دیتے ہیں لیکن ذہن میں نہیں آتا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ دراصل خدا کو ماننا اس کی اس متعین کردہ غرض اور غایت کو ماننا تھا۔یہ تھا خدا کو ماننا۔اور پھر الکتٰب کا تو مقصد ہی یہ ہے اور انبیائے کرامؑ اس لیے ہی آیا کرتے تھے۔ختمِ نبوت کے بعد یہ فریضہ اس امت کے ذمے لگایا گیا۔اس کو وارثِ کتاب بنایا گیا۔یہ کام اب اس نے کرنا تھا اور اگر اس امت کے اندر خود یہ اتنے مختلف فرقے پیدا ہو جائیں' تفریقات پیدا ہو جائیں' اور فرقے مذہب کے نہیں بلکہ مملکتوں کی صورت میں بن جائیں' تو اس کا انجام کیا ہو گا! ابھی میں بتاتا ہوں کہ یہ مختلف مملکتیں' یہ سلطنتیں' یہ نسل کی بنا پر مختلف قومیتیں' انہی مسلمانوں کی' اسی امت کی ہیں جس نے عالمگیر انسانیت کو امتِ واحدہ بنانا تھا۔کیا یہ اس ایک خدا کے بندے کہلا سکتے ہیں؟ آپ نے اسے سوچا نہیں کہ قرآن نے اسے کیوں شرک کہا ہے؟ اس لیے کہ یہ مختلف خداؤں کے بندے ہیں۔خدائے واحد کا ماننا' جسے توحید کہتے ہیں' ایک ذہنی اور اعتقادی سی چیز نہیں ہے۔وہ عملاً مشہود ہونے کی چیز ہے اور وہ مشہود اس طرح ہو گی کہ جو بھی توحید کا قائل ہو گا' یعنی ایک خدا کو ماننے والا ہو گا' اسی ایک کتاب کو ماننے والا ہو گا' اور جتنے بھی لوگ اس میں ہونگے ان میں اختلاف نہیں ہو گا' افتراق نہیں ہو گا' فرقہ نہیں ہو گا' تفرقہ نہیں ہو گا۔اگر اس کتاب کے ماننے والوں کی جماعت امتِ واحدہ نہیں بنتی تو پھر دو ہی باتیں ہونگی: یا تو یہ کہ معاذ اللہ یہ دعویٰ غلط تھا' اس کتاب میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ وہ ان کو ایک کر سکے کیونکہ اس نے تو بتایا تھا جو کتاب ہم بھیجتے تھے' اس کی غایت یہ ہوتی تھی کہ پوری انسانیت کو امتِ واحدہ بنا دے۔مگر یہ کتاب تو اختلاف نہیں مٹا سکی اور یا یہ چیز تھی کہ صاحب! ہم اس کتاب کو یہ کچھ کرنے والی مانتے ہی نہیں۔اب دیکھیے بات کہاں چلی جاتی ہے۔میں نے کہا

تھا کہ اس نکتے کو سمجھ لیجیے کہ دین کی بات کیا ہے؟ اس کی غایت وغرض جو قرآن نے بتائی ہے اور پھر متعین الفاظ میں بتائی' وہ کیا ہے؟

انسانی تصورات کو قبائلی طور پر تقسیم کرنے کا ابتدائی عمل کیسے شروع ہوا؟

اب سوال یہ ہے کہ **فَاخْتَلَفُوْا**[1] (10:19) کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی۔ قرآن نے تو نوعِ انسان کو کہا ہے کہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) یہ امت وحدت تھی۔ پھر اس وحدت میں **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) ہوا یعنی اختلاف پیدا ہوئے' ان کے اندر تفریق پیدا ہوئی۔ فکرِ قرآن کا کام تو ان تمام اختلافات کو مٹانا ہے' ہر قسم کی تفریق کو مٹانا ہے۔ محققین علم الاقوام کی تحقیق یہ ہے کہ پورے کرّہ ارض کے اُس خطے میں' جس کے اردگرد کے علاقے میں ہمیں سب سے پہلے انسانی آبادی کا سرچشمہ ملتا ہے' انسانوں کا ایک گروہ تھا۔ اس میں کوئی تفریق نہیں تھی۔

میں سرِ دست اس تحقیق میں نہیں جاتا۔ میں نے اپنی کتابوں میں اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتا رکھا ہے کہ یہ تو آج ان کی تحقیق ہے کہ ان میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ قرآن تو یہ چیز چودہ سو سال پہلے کہتا ہے کہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) یہ امتِ واحدہ تھی۔ عزیزانِ من! اس زمانے میں کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ انسان کہیں ایسی شکل میں بھی رہتا تھا' جہاں اس میں کوئی اختلافی بات نہیں تھی۔ آج یہ تحقیق ہو رہی ہے کہ وہ پہلی بستی یا انسانوں کا گروپ' جہاں رہتا تھا' ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اب اس کے بعد یہ محققین آگے چلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ صاحب! انسانوں کا وہ گروہ ایک جماعت یا جمعیت تھی۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ وہ قبائل میں تقسیم ہوئی۔ پہلی چیز اس تفریق کی یہ آتی ہے کہ وہ ایک امتِ واحدہ' قبیلوں کے اندر تقسیم ہوئی۔ قبیلہ بننے کی بنیاد کیا ہے؟ آج تو ہمارے ذہن میں قبیلہ نہیں آتا۔ مجھے معلوم نہیں اردو والے حضرات جانتے ہیں یا نہیں' مگر ''یہ پنجابی والے تو ہجے وی قبیلہ بیوی نوں کیندے ہیگے نیں''[2] تو قبیلے کی ابتدا اس سے ہوئی تھی۔ وہ جس میں آگے اختلاف نہیں تھا اس سے جتنے بھی بچے پیدا ہوتے تھے' Biologically (حیاتیاتی طور پر) تو وہ کسی مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا ہوتے تھے' لیکن ہر روز ان کے ان بچوں کے تشخص (Indentity) یا ان کی بنا پہ تفریق نہیں پیدا ہوئی تھی' وہ سارے ملے جلے سے اکٹھے ہی رہتے تھے۔ قبیلہ اس وقت بنتا ہے جب ایک باپ کا ایک بیٹا متعین ہو۔ پھر اس بیٹے کی آگے اولاد متعین ہو اور یہ شاخ باقی شاخوں سے اپنے آپ کو الگ کر دے۔ مثلاً یہ نوردین کا بیٹا ہے اور وہ نوردین گبول کا ہے۔ اچھا! یہ گبول ہے! آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بیٹے کو باقی بچوں سے جدا کرنے کا' پہلا بیج کیسے بویا گیا۔ یہ شاخ اگر متعین طور پہ باقیوں سے جدا رہے گی' تو تھوڑے سے عرصے کے بعد ایک قبیلہ بن جائے گا۔ ہمارے ہاں ابھی وہ خاندان بنتا

---

[1] ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

[2] یہ پنجابی زبان والے حضرات تو آج بھی قبیلہ بیوی کو ہی کہتے ہیں۔

ہے۔ یہ وہی سمٹی ہوئی سی کچھ شکل ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ زمانے کی ضروریات نے ہمیں قبیلے سے نکال کر نسلی امتیازات (Racial Discrimination) کی نذر کر دیا۔ اس طرح ہمارے ہاں وہ ایک شکل یہ بنی ہے۔ یعنی پہلی چیز جو قبیلے کا امتیاز تھا' جو بنیاد تھی' وہ اس کا وہی نسلی امتیاز ہے جبکہ فطرت نے نسل میں تو کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ اس طرح ہمارے ہاں میرا بیٹا' اِس کا بیٹا' اُس کا بیٹا بنے مگر Biologically (حیاتیاتی طور پر) اس میں یہ سوال ہی نہیں کہ ان میں کوئی امتیاز ہو' لیکن جب آپ ایک خاص گروہ کو' ایک خاص پیدائش کے اعتبار سے متعین کر دیں گے تو وہ قبیلہ بن جائے گا۔ یہ ہوئی قبائلی زندگی (Tribal Life)۔ اب ان میں تفریق ہوئی۔

قصہ آدم میں آپ کو یاد ہوگا' اگر نہ یاد ہو تو دہرا لیجیے' وہ تمثیلی انداز ہے۔ قرآن میں یہی ساری چیز ہے' جو میں بیان کر رہا ہوں۔ وہ ایک آدم کے قصے میں سمٹا کر رکھ دی ہے۔ آدم کی جنت میں تفریق نہیں تھی۔ اس قصے میں یہ ہے کہ ابلیس نے آدم کی ایک دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا۔ آیئے اپنی زبان میں گفتگو کریں۔ آدم' دراصل یہی آدمی (The Man) ہے۔ آدمی مرنا نہیں چاہتا' ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ طبعی طور پہ تو وہ زندہ رہ نہیں سکتا۔ کتنی ہی لمبی عمر کیوں نہ ہو جائے' بالآخر مرنا ہے۔ یہ مرنا نہیں چاہتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم اسے ایک اور طریقہ بتا رہے ہیں کہ حیاتِ جاوید کیسے حاصل ہوتی ہے۔ ابلیس نے اس کے کان میں کچھ اور پھونکا۔ اس نے کہا کہ ''تمہیں میں بتاتا ہوں' اس کی باتوں میں نہ آنا' میں تمہیں بتاتا ہوں''۔ اس نے کہا: ''کیا بات ہے''؟ کہنے لگا: ''اولاد کے ذریعے سے زندہ رہو' یوں حیات جاوید مل جائے گی۔'' آپ دیکھتے ہیں کہ اختلافِ انسانیت کی شکل میں یہ پہلا اصول کیسے نمودار ہو رہا ہے۔ کہنے لگا: ''یہ کرو' یوں زندہ رہو گے''۔ پتہ نہیں وہ کب کہا ہوگا۔ تمثیلی بات ہے لیکن آدمی جو انسان کی سطح پہ نہیں پہنچا' وہ اس پھندے (Trap) میں آ پھنسا۔

نام و نمود کے تصور کے تحت زندہ رہنے کا فریبِ تمنا

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پچھلی دفعہ انسانی سوچ کی دو سطحیں بتائی تھیں۔ وہ آج بھی بدستور قائم و دائم ہیں۔ جب انسان' آدمی کی سطح پہ' اسی شکل میں' زندہ رہنا چاہتا ہے تو پھر' اگر اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی' تو بڑھاپے میں وہ کچھ زیادہ ہی حریص ہو جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ''کوئی اودا ناں لیندا روے۔ لوگ وی کیندے نیں کہ بوٹا لگیا روے جی اگاں نوں۔ اسی تے اے چاہنے ہیگے[1] آں''۔ دیکھو! یہ وہی چیز ہے کہ جب اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اس کے تحت الشعور میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ ''میرا یہ بیٹا' میرا نام روشن کرے گا''۔ یہی چیز قرآن کہتا ہے کہ ابلیس نے اس کے کان میں سحر پھونکا تھا۔ یہ چیز ہم سب کے تحت الشعور میں ہے اور پھر باپ کا نام' دادے کا نام' پردادے کا نام' الغرض یہ تمام سلسلہ قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ سب فریبِ نفس ہے۔ اس کی رو سے مرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ مجھے زندگی مل گئی ہے۔

---

[1] کوئی اس کا نام لیتا رہے۔ لوگ بھی کہتے ہیں کہ ''جی! مستقبل میں اس کا ''بوٹا'' لگا رہے۔'' ہم تو یہ چاہتے ہیں۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہ تھی پہلی چیز، وہ نسلی امتیاز، جو قبائلی زندگی کے اندر نمودار ہوا۔ یہ بات اب یوں سمجھ میں آجائے گی کہ یہ شروع تو ذراسی ہوئی تھی، پھر یہ جو اس نے طول کھینچا ہے تو سارے کرّہ ارض کی انسانی مخلوق، نسلوں میں بٹ گئی۔ لہٰذا نسلی امتیازات کی قسموں (Kinds) کے متعلق آج کسی سے پوچھیے کہ صاحب! یہ کون کون سی ہیں؟ پھر نمایاں طور پہ جو موٹی موٹی تھیں وہ یوں گنانی شروع کی جاتی ہیں: آریائی نسل (Arian Race)، سامی نسل (Semitic Race) اور منگولین نسل (Mongolian Race)۔ اس طرح انہوں نے انسانی مخلوق کو ان تین بڑی بڑی نسلوں (Races) میں تقسیم ❶ کیا ہے۔ انہوں نے یہاں رنگ کے اعتبار سے بھی یہ امتیاز کیا ہے مثلاً زرد نسل (Yellow Race) سیاہ اور سفید نسل۔ وہی پہلی چیز جو قبیلے کی شکل میں نمودار ہوئی تھی، وہ چھوٹے سے پیمانے سے جو بڑھی ہے تو بڑے پیمانے پہ اس نے عالمگیر انسانیت کو تقسیم کر دیا ہے۔ وہ چیز نسلی امتیاز ہے اور پھر نسل کے اعتبار سے فخر شروع ہوا مثلاً وہ عربی النسل کا اور اسی طرح سے وہ ہٹلر کا، ایرین نسل کا تھا۔ اگر آپ نسل کا یہ سلسلہ اوپر کو یعنی ماضی (Past) کی طرف لے جائیں تو آپ اسے کہاں تک کھینچ کر پیچھے کی طرف چلائیں گے۔ پہلے انسان تو یہی تین نہیں پیدا ہوئے تھے مگر تورات نے تو آسان طریقہ بتا دیا کہ حضرت نوحؑ ❷ کے تین بیٹے تھے: یافث (Japheth)، حام (Ham) اور سام (Shem)۔ ان تینوں کی اولاد جو آگے چلی تو بقول ان کے تین نسلیں ہوگئیں۔ نسلوں کا تو پتہ نہیں شاید قبیلے ایسے بن گئے ہوں گے۔

---

❶ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا اوّلین سرچشمہ، جھیل کیسپین (Caspian Lake) کے اطراف و جوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے ماتحت علم الاقوام السنہ کے محققین (Anthropologists) نے اقوام عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ آریائی (ایرین: Arian) مثلاً ہندی اقوام، ایرانی اور فرنگستانی۔

۲۔ تورانی (منگولین: Mongolian) مثلاً ترکستانی اور چینی

۳۔ سامی (سیمٹک: Semitic) مثلاً آرامی، عبرانی، عرب، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب نے اقوام عالم کی تقسیم اختلاف رنگ کی بنا پر کی ہے یعنی سفید فام (مثلاً امم سامیہ اور فرنگی) سیاہ فام یا سرخ (مثلاً باشندگانِ افریقہ) اور زرد فام (مثلاً جاپانی اور چینی وغیرہ)۔

❷ قیاس ہے کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ قریب 5000 ق م کا ہے۔ اس شجرہ کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: (1994ء)۔ جوئے نور، لاہور: طلوعِ اسلام ٹرسٹ ص۔ 2۔ نیز پرویزؒ نے اپنی تالیف لغات القرآن جلد چہارم کے لیے پہلے ایڈیشن (1961ء) کے ص 1668 میں لکھا کہ ''آج سے قریب کچھ سات ہزار سال قبل، حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے۔ قرآنِ کریم (ان معاملات میں) نہ زمان (Time) سے بحث کرتا ہے، نہ مکان (Spa.ce) ہے۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے' تو اختلاف کی پہلی بنیاد یہی قبائلی زندگی ہے۔ اس نے جو وسعت کھینچی ہے تو وہ آج نسلوں کے امتیاز میں آپ کے ہاں موجود ہے۔ جب وہ ایک گروپ کی شکل میں رہتے تھے تو قرآن نے اسے جنت کی زندگی کہا ہے۔ وہ جنت کی زندگی اس لیے جنت کی زندگی تھی کہ اس میں ابھی میری اور تیری کا سوال نہیں تھا' جنت کی زمین پہ لکیریں نہیں کھینچی گئی تھیں کہ یہ میری زمین اور یہ تمہاری زمین' یہ تمہارے باپ کی زمین ہے۔ یہ چیز نہیں تھی۔ انسان کی وہ ابتدائی زندگی جو گروپ کی تھی' اس میں یہ چیز موجود نہیں تھی۔

ملکیت کے تصور کے متعلق محققین کی موجودہ تحقیق

آج کے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ قبائلی طور پر پرانے قبیلے ابھی تک موجود ہیں۔ آسٹریلیا کے اندر' افریقہ کے دور دراز صحراؤں میں' امریکہ' ساؤتھ امریکہ کے اندر' وہ لوگ موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں یورپ کے محققین نے بڑی تحقیق کی ہے۔ پرانے دور کے جتنے قبائلی ہیں' ان کی تحقیق کے مطابق ان میں ایک چیز مشترک نظر آئی کہ ان کی زبان میں ''ملکیت'' کا لفظ نہیں ہے بلکہ ''استفادہ'' کا لفظ ہے' Property (جائداد' ملکیت) کا لفظ نہیں ہے۔ یعنی ابتدائی زندگی کے اندر یہ کیفیت تھی۔ جب آگے بڑھے ہیں تو ابتدائی قبائلی زندگی میں بھی یہی صورت تھی یعنی اب قبیلے اور قبیلے میں تو لکیروں کا فرق پڑ گیا ہے۔ مگر قبیلے کے اندر ابھی یہ فرق نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب لکریں کھینچیں تو وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ آدم کے دو بیٹوں کے مابین پہلی خون ریز جنگ ہوئی تو یہی تھا وہ ماجرا جو قرآنِ کریم کے تمثیلی انداز میں بیان کردہ قصہ آدم میں ملائکہ (کائناتی قوتوں) نے بھانپا تھا کہ یہ آدم آگے بڑھے گا تو **يُفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ** (2:30) یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا' فساد برپا کرے گا' خون ریزیاں کرے گا' ہمیں پتہ ہے۔

آبادی بڑھی تو پھر وہاں سے قبائل نے ادھر اُدھر جانا بھی شروع کیا۔ انہیں جہاں کہیں کوئی نخلستان یا پانی نظر آیا' اور پانی پہ تو یہ زندگی ہے' یہ قبیلہ وہیں بس گیا۔ اور آگے چلے تو اب یہ اختلاف جغرافیائی اختلاف ہو گیا یعنی وطن ایک نہ رہا' یا آج کی اصطلاح میں وطنیت کا اختلاف ہو گیا۔ ان قبائل کے وطن الگ الگ ہو گئے تو دوسرا اختلاف آ گیا۔ آپ کے ہاں وطنیت کا اختلاف ہے۔ آج بھی وہی اختلافاتِ وطن ہیں بلکہ انسان کی یہ گرہیں اور بھی مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ اس لیے کہ اس نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی رو سے' ان اختلافات کو رفع کرنے کی صورت اختیار نہ کی تو پھر گرہیں اور زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ وطنیت کے اختلاف سے اب وطن کے اندر بسنے والے لوگوں کو ایک شمار کیا گیا' نیشن (قوم) بنایا گیا۔ یہ نیشن (قوموں) کے اختلافات ہیں جنہوں نے آج دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ وہ اختلافات' ایک ہی قوم میں' ایک ہی قبیلے کے اندر موجود ہیں۔ جب میری اور تیری کی تمیز ہوئی تو جس کے پاس زیادہ قوت تھی اس کی

وہ قوت اور زیادہ ہوگئی' جس کے پاس کم تھی اس بیچارے کی وہ کم سے کم تر ہوگئی۔ اس سے طبقاتی اختلاف پیدا ہوگیا۔ جس نے زیادہ سمیٹی' وہ دولت مند ہوگیا' جس کے پاس کم رہی وہ بیچارہ غریب ہوگیا۔ غریب ہوا تو محتاج ہوا۔ اب جس کے پاس یہ دولت زیادہ تھی اس کا کام کرنے کے لیے یہ محتاج مجبور ہوگیا۔ جو اس کی اپنی تھوڑی سی تھی اس سے تو اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی تھیں تو وہ یہاں زمین سنبھالتا تھا۔ دولت مند نے کہا کہ ٹھیک ہے' اب یہ کاشت کرو۔

ابتدائی دور میں یہ اندازِ غلامی تھا کہ یہ جو محتاج ہو جاتا تھا' اسے اس زمانے میں' ابھی مزدور نہیں کہتے تھے۔ وہ غلام ہی تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کی تاریخ میں بدترین دن وہ تھا جس دن سب سے پہلے مزدور نے آقا کو اتنا کما کر دیا جو اس سے زیادہ تھا جو اس مزدور پہ صرف ہوتا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی کما کر لاتا جتنا وہ کھا جاتا تھا تو یہ سلسلہ آگے ہی نہ چلتا۔ اس نے اس سے زیادہ کما کر لا دیا۔ اب یہیں سے آپ کے ہاں سرمایہ داری کی طرح پڑ گئی کہ محنت اس نے کی' یہ بیٹھا رہا۔ جتنا اس پہ صرف ہوتا تھا اس سے زائد وہ لے کر آ گیا۔ جو یہ زائد ہے' وہ ہے جس کو آپ Surplus Money (فاضلہ دولت) کہتے ہیں۔ یہ اختلاف اور آگے بڑھ گیا۔ خدا کی طرف سے انبیائے کرام اختلافات مٹانے کے لیے آتے تھے اور جب نبی چلے جاتے تو اس کی طرف سے دیا ہوا' دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا اور یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

نوعِ انسانی میں اختلافات کی نوعیت اور وسعت

قرآن کہتا ہے کہ دین شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ وہ ایک ہی ہونا چاہیے تھا۔ قرآن نے تو انبیائے کرامؑ کا یہ مقصد بتایا ہے کہ وہ انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس کا سوال ہی نہیں تھا کہ وہ الگ الگ دین لے کر آئیں۔ وہ تو ایک دین لے کر آتے تھے' وہ ایک ہی کتاب لے کر آتے تھے یعنی اس کتاب کی تعلیم ہر مقام پہ ایک ہی ہوتی تھی لیکن جب وہ نبی چلا جاتا تھا تو دین مذہب میں بدل جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر نبی آتا تھا۔ اب مختلف مذاہب میں تفریق پیدا ہوئی یعنی جس مقصد کے لیے انبیاء آ رہے تھے' اُن انبیاء کے جو نام لینے والے تھے وہ اس مقصد کے خلاف رہے۔ اور مذہب کے نام پر یہ تفریق تو کم بخت پہلی تفریقات سے بھی زیادہ سنگین شکل میں نمودار ہوئی۔ جتنی خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے نام پہ دنیا میں ہوئی ہیں' کسی دوسرے اختلاف پر اتنی نہیں ہوئیں۔ اس لیے کہ خوں ریزی کو یہ کہہ کر مقدس بنا دیا جاتا ہے کہ یہ مذہب میں ہے' یہ شریعت کے حکم کے اندر ہے' یہ جہاد ہے' اس میں مرنا' جان دے دینا شہادت کا مرتبہ پانا ہے۔ باقی اختلافات میں سے اگر کسی اختلاف کو دور کرنا ہو تو اسے کچھ تو دلیل دینا پڑتی ہے۔ یہاں دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نازک سے جذبات کو ابھارنا پڑتا ہے یعنی صرف مشتعل کرنا پڑتا ہے۔ یہ محض مذاہب کے باہمی اختلافات کی

وجہ سے ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد کیا تھی؟ ہر اختلاف میں کسی مخصوص گروہ کا مفاد آپ دیکھیں گے۔ایک مخصوص گروہ ہوتا ہے۔اس کے الگ رہنے میں اس کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔اگر وہ دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کے مفادات الگ نہیں رہتے۔اگلا سوال یہ ہے کہ قومیں آپس میں جنگ کیوں کرتی ہیں؟ اصل یہ ہے کہ وہ قومیں جنگ نہیں کرتیں' ان کے اوپر ایک گروہ ہوتا ہے جن کا مفاد اس میں ہوتا ہے کہ ایک قوم الگ رہے' اس کی مملکت الگ رہے' اس کی حکومت الگ رہے' حکومت ہمارے پاس رہے۔اگر انہیں کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یہ کچھ کرنے لگی ہے تو پھر وہ اس مقصد کے لیے اس علاقے کے عوام کو اس کے خلاف تیار کرتا ہے کہ تمہارا ملک چھن جائے گا' تمہارا وطن چھن جائے گا' تمہاری مملکت چھن جائے گی' تمہارا مذہب چھن جائے گا۔گویا اِن کا کچھ نہیں جارہا' صرف اُن کا چھن جائے گا۔یہ ہے اختلاف۔میں نے عرض کیا ہے کہ میں ان اختلافات کی تعریف اور ان کی تفاسیر میں جاؤں تو ایک ایک اختلاف پر بہت وقت لگے گا مگر یہ چیز ضرور بتانے کی ہے کہ ایک مذہب کے اندر بھی اختلاف ہے۔وہ مذہب دوسرے مذاہب کے مقابلے میں بھی اختلاف رکھتا ہے۔اب یہاں مذہب کے اندر فرقے بنے ہوئے ہیں۔برادرانِ عزیز! اس چیز کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن کس قدر تفرقے کی گرہ مضبوط ہوتی ہے اس کا آپ کو بھی احساس ہے۔

اختلافات آپ نے دیکھے۔میں نے ان کے اجمالی خطوط آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔یہ محض باہر کی کھینچی ہوئی لائنیں ہیں۔میں تفصیل میں نہیں گیا لیکن وہ یہی بڑے بڑے خطوط ہیں جن میں آج بھی آپ دیکھیں گے کہ انسانیت اسی میں بٹی ہوئی ہے۔یہی نسل کے اختلافات' وطن کے اختلافات' قومیت کے اختلافات' برادری کے اختلافات' قبیلوں کے اختلافات' خاندانوں کے اختلافات' مذہب کے اختلافات' مذہبی فرقوں کے اختلافات ہیں جنہوں نے نوعِ انسان کو ایک برادری کی شکل میں نہیں رہنے دیا۔

گھٹا ٹوپ اندھیروں میں قندیلِ آسمانی کی نعمتِ عظمیٰ

عزیزانِ من! اب آیئے قرآن کی طرف۔قرآن کہتا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) نوعِ انسان ایک برادری کی شکل میں رہتی تھی۔یہ بڑی جنت کی زندگی تھی۔ **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) اختلاف پیدا ہوا۔جنت چھن گئی۔آدم مایوس ہو گیا کیونکہ ان اختلافات کو مٹانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔اب آپ نے سمجھا کہ وہ کیوں مایوس ہو گیا۔اگر کسی کو شبہ ہو تو آج بھی دیکھ لے کہ دنیا کے نقشے میں اس جمِ غفیر کے اندر کتنے بڑے بڑے دانشور رہ رہے ہیں' ان کی عقل وفکر کے اوپر غور کیجیے تو انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ صاحب! یہ کتنے بڑے نامی گرامی انسان ہیں' لیکن کس طرح عاجز وناتواں ہیں۔ساری دنیا کے دانشور چھوٹے سے چھوٹا اختلاف نہیں

مٹا سکتے' اوران اختلافات کے جو تباہ کن نتائج ہیں وہ آج دنیا کے سامنے بڑے ابھر کر آ گئے ہیں۔ساری دنیا چیخ رہی ہے لیکن کوئی ایک اختلاف نہیں مٹ رہا۔عقل وخرد کی کمی نہیں ہے۔یہ اسی کے سہارے ہی تو بہت آگے پہنچی ہوئی ہے۔انسان چاند تک تو جا سکتا ہے لیکن امیر اورغریب کے اختلافات نہیں مٹا سکتا۔اس کی بین مثال فرانس میں غریب اورامیر ممالک کے اختلاف کا حل سوچنے کے لیے بلائی جانے والی کانفرنس ہے۔کل شام ❶ خبر آ گئی کہ یہ کانفرنس ''نشستن گفتن برخواستن'' ناکام رہ گئی اور وہ سب اپنے گھروں کو چلے گئے۔اوردوسری خبر یہ تھی کہ مریخ یااس کائنات کے باہر کُرّوں میں پہنچانے کے لیے پیغامات (Messages) یواین او کے سیکرٹری جنرل صاحب نے دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں ریکارڈ کر لیے ہیں۔یہ پیغامات (Messages) انہیں یہ کہنے کے لیے ہیں کہ بھئی! تمہارا کوئی مسئلہ اٹکا ہوا ہو تو ہمیں بتا دیجیے ہم حل کرا دیں گے۔او بابا! سعدی ❷ اتنا عرصہ پہلے کہہ گیا ہے: او بگلیا! پہلے گھر دے مسئلے تے حل کر ❸۔ہماری دانش و بینش کا بھی یہی فریبِ نفس ہے کہ ہم تو مریخ تک یہ پیغام پہنچا رہے ہیں اور خود انہی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔خود اپنے ہاں جائے امن نہیں ہے۔

انسانی معاملات کے حل کے سلسلہ میں عقل وفکر کی زبوں حالی

آج کے ایک ہی نیوز پیپر میں یہ بھی ایک نیوز ہے کہ وہ فرانس کے اندر کہاں کہاں سے جمع ہوئے ہیں۔ابھی کئی اور مختلف کانفرنسوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔طرابلس کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ بیت المقدس کا مسئلہ کیا ہے؟ فلسطین کا مسئلہ کیا ہے؟ ارے اپنے ہی گھر کو لے لیجیے' ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔قرآن نے کہا کہ فَاخۡتَلَفُوۡا (10:19) اختلافات پیدا ہو گئے۔پوچھیے' ان سے جو مدعی ہیں کہ وحی کی کوئی ضرورت نہیں ہے' عقل انسانی بہت بڑی چیز ہے' یہ اپنے ہر مسئلے کا حل سوچ سکتی ہے۔ان سے پوچھیے کہ سب سے سنگین مسئلہ کیا ہے؟ آج تم بھی یہ کہہ رہے ہو کہ یہ مسئلہ انسانوں کے باہمی اختلافات ہیں' انہوں نے اس کرّہ ارض کو جہنم بنا دیا ہے۔اگر عقلِ انسانی کے بس کی بات ہے تو مٹا کیوں نہیں دیتے؟ کیا تمہارے ہاں کوئی عقل کی کمی ہے؟ غور کیجیے۔عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے آدم کو کہا گیا تھا کہ ہم نے اپنی طرف سے نوعِ انسانی کے لیے صراطِ مستقیم کی نشان دہی کی خاطر کتاب نور عطا کی ہے جو تمام اختلافات کو مٹا دے گی اور حضرات انبیائے کرامؑ نے جو یہاں عملاً نظام قائم کیا' وہ

---

❶ 4 جون 1977

❷ سعدی شیرازیؒ (1184-1291)

❸ ارے بگلے! پہلے اپنے گھر کے مسائل تو حل کر لے۔

(نوٹ: سعدی شیرازیؒ کا یہ مصرعہ تو فارسی میں ہے' مگر اس کا مفہوم پنجابی میں کہا گیا ہے)

ایک بستی میں تھا' چھوٹی سی جگہ میں تھا۔ اس نظام کا مقصد یہ بتانا تھا کہ وحی کے ذریعے ایسا گروپ پیدا کیا جاسکتا ہے کہ ان میں یہ تفریق نہ ہو' کوئی اختلاف نہ ہو۔ وہ امتِ واحدہ پیدا کر کے جاتے تھے۔ گو وہ محدود ہوتا تھا لیکن وہ چھوٹے پیمانے پہ بھی جو کرتے تھے تو وہ یہ بتا دیتے تھے کہ ایسا ہو جانا ممکن ہے۔ یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ یہ کیسے مٹ سکتے ہیں؟ کہ انسان کی زندگی کو صرف آدمی کی زندگی نہ سمجھا جائے' حیوان کی زندگی نہ سمجھا جائے' اس کی زندگی کو انسانی سطح پر لے آیئے اختلافات مٹ جائیں گے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا[1]

عزیزانِ من! اختلاف تو بنی آدم میں پیدا ہوئے ہیں مگر **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213)۔ جو انسان تھا' وہ تو امتِ واحدہ تھا۔ بات ساری اتنی ہوئی کہ ایک انسان کو' آدم کی سطح پر یعنی آدمی کی سطح پر' چھوڑ دیا جائے تو یہ سارے اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ خوں ریزیاں' فساد انگیزیاں' فتنے اور کرۂ ارض کا جہنم بن جانا' یہ سب کچھ ہوگا۔ اگر اس آدم کو انسانیت کی سطح پر لے آیا جائے تو یہ امتِ واحدہ بن جائے۔ انبیائے کرامؑ اور ان کی امتوں کی ساری تاریخ میں یہی ان کی ساری سرگزشت تھی' یہی ان کی ساری غرض و غایت ہے۔ لہٰذا مذہب کو دین میں تبدیل کرنا انبیائے کرام کی سرگزشت ہے۔ پھر جب یہی بلند سے بلند تر چیز انسانوں کی جگہ آدمیوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو وہ اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ وہی دین جو وحدتِ انسانیت پیدا کرنے کے لیے تھا' وہی دین مذہب میں تبدیل ہو کر مختلف مذاہب کی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن نے ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی تھے۔ ان کی کیفیت دیکھیے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لیے پھر رہے ہیں' ہر روز ایک دوسرے کے ساتھ مناظرے ہیں' سر پھٹول ہے اور قیامت یہ ہے کہ دونوں مدعی ہیں کہ ہم خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب کا اتباع کر رہے ہیں حالانکہ کتاب تو ان اختلافات کے مٹانے کے لیے آیا کرتی تھی' تم اسی کتاب کے ذریعے اختلافات کو اور زیادہ سنگین کر رہے ہو۔ اب آپ کے ہاں مذہب کی بنا پر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاں کی فرقہ بندی میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تو ان یہودیوں اور عیسائیوں کو کہہ رہا تھا' یہاں آپ ہر فرقہ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم قرآن کے پیروکار ہیں' اس پہ ہمارا ایمان ہے' اتنی تلاوت ہوتی ہے' ایک رات میں پورا قرآن دہرا دیا جاتا ہے۔ دنیا میں کسی کتاب کی اتنی تلاوت نہیں ہوتی۔ ہر مسجد میں قرآن دہرایا جاتا ہے' ساتھ والی میں بھی دہرایا جاتا ہے' وہ ساتھ والا نمازی یہاں آ کر قرآن نہیں سن سکتا اور یہاں والا وہاں جا کر نہیں سن سکتا۔ دونوں قرآن کے ماننے والے ہیں حالانکہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ **لِيَحْكُمَ**

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) کے اس شعر کا یہ مصرع ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (2:213) کتاب اس لیے بھیجی جاتی تھی کہ ان میں جو اختلافات پیدا ہو جائیں وہ ان کے لیے حکم بنے۔ بات ساری یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی کتاب کو حاکم تسلیم کیے بغیر باہمی اختلافات ختم ہو ہی نہیں سکتے

عزیزانِ من! ایک لفظ نے یہ سارے کا سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ مذہب میں یہ الکتٰب حکم نہیں ہوتی' یہ حاکم نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے کفر اور اسلام کا جو امتیاز بتایا ہے' وہاں یہ بھی کہا ہے کہ کفر یہ ہے کہ کتاب کو مانا نہ جائے جبکہ اسلام یہ ہے کہ کتاب کو مانا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) جو اس کتاب کو حکم نہیں ٹھہراتا' اس کے مطابق حکومت نہیں کرتا' اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یہی الفاظ یہاں ہیں: لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ (2:213) الناس کے اختلافات مٹانے کے لیے اسے حکم ہونا چاہیے۔ میں قرآنِ حکیم کی بات کہہ رہا ہوں کہ قرآنِ حکیم نے دین کی غرض و غایت ہی یہ بتائی ہے۔ یہ بہت بڑا بنیادی مسئلہ (Problem) ہے کہ لفظوں میں ہی معنی کچھ اور استعمال کر لیں۔ یہ Problem (مسئلہ) بہت بڑی Problem (مسئلہ) ہے۔ قرآن اسے حل کر رہا ہے کہ مقصد یہ ہے۔

دین کی حکمرانی میں مذہبی فرقوں کا تصور ممکن ہی نہیں

اب آپ غرض و غایت کے ماتحت انبیائے کرامؑ کی تاریخ کی طرف آیئے۔ ان کی جتنی بھی امتیں گزری ہیں' ان کی سرگزشتوں کی طرف آیئے اور یہ دین کی غایت رکھ دیجیے پھر دیکھیے کہ قرآن کیا کیا بیان کرتا ہے' کس کس قسم کے اختلافات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلی چیز آئی ہے کہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (23:23) ہم نے نوحؑ کو اسکی قوم کی طرف مبعوث کیا۔ اس نے آ کر یہ کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تم صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اسکے خلاف کوئی اور ایسی طاقت صاحبِ اقتدار نہیں' جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ سو تم بتاؤ کہ تم اُس کے قوانین کی نگہداشت کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ ہم نے مذہب میں عبادت کا ترجمہ پرستش کر دیا۔ اب ہندو اپنے طریق سے پرستش کرتا ہے' مسلمان اپنے طریقے سے کرتا ہے۔ مسلمانوں میں سنی اپنے طریق سے کرتا ہے' شیعہ اپنے طریقے سے۔ سنیوں میں پھر اہلحدیث ہے' وہ اپنے طریق سے کرتا ہے' دیوبندی اپنے طریق سے کرتا ہے اور بریلوی اپنے طریق سے پرستش کرتے ہیں [1]۔

---

[1] ان اشارات کی مزید تشریح وتفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 373-376 نیز ص 374 کے فٹ نوٹ 1 تا 3۔

اگر آپ ایک مملکت میں کسی دوسرے قانون کی محکومیت اختیار کریں تو پھر بغاوت ہو جاتی ہے۔ اختلاف مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت اس کتاب (قرآنِ کریم) کی ہو تو محکومیت اس کی ہو تو چھوٹے سے پیمانے کے اوپر بھی اختلاف مٹ گیا۔ آپ دیکھیے کہ جب قانون عمل کی شکل اختیار کرتا ہے تو ملک میں اس کی اطاعت کرائی جاتی ہے۔ اختلاف کیسے مٹتا ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھیے۔ مثلاً قانون ہے کہ Keep to the left یعنی بائیں طرف چلیے۔ اب ہندو مسلمان سب بائیں چل رہے ہیں۔ اہلحدیث، وہابی، نیم وہابی، رضوی، آرائیں، جاٹ، کمبوہ، شیخ، سید، پٹھان، وہ سب Keep to the left ہیں، بائیں طرف چل رہے، کوئی تفرقہ بیچ میں نہیں رہتا۔ ذرا کسی نے اختلاف کیا، کوئی ذرا Right (دائیں) پہ اُبھرا، تو پولیس والے نے پکڑا۔ وہ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتا کہ نہیں، میں تو فلاں فرقے سے منسلک ہوں، اس لیے قانون ختم ہو گیا۔ یہاں اس قانون نے ختم نہیں ہونا ہے جبھی تو اختلاف مٹ سکتا ہے۔

دین کے نظام کی سب سے زیادہ مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے

اب مخالفت دیکھیے کہ کس کی طرف سے ہوئی۔ بظاہر تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ جو ان کے ہاں مذہبی پیشوا تھے، یہ مخالفت ان کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کو بھی آگے لایا جاتا تھا لیکن قرآن یہ بنیاد بتاتا ہے کہ **فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ** [1] (23:24)۔ آپ کو یاد ہو گا، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ **الْمَلَؤُا** قرآن کی ایک جامع اصطلاح ہے، اس پر پورا پارہ [2] ہے۔ وہاں یہی ہے کہ ہر نبی نے یہ بات کہی اور یہ جو سردارانِ قوم تھے پہلے انہوں نے اٹھ کر مخالفت کی۔ اس اصطلاح کا ترجمہ ''سردارانِ قوم'' کیا جاتا ہے لیکن یہ بنیادی بات نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ان اختلافات کی گرہیں اسلیے مضبوط کی جاتی ہیں کہ مفادات مختلف ہوتے ہیں۔ مادے کے اعتبار سے لفظ ''ملا'' (م ل ا) کے معنی ہوتے ہیں ''وہ جن کے گھروں کے برتن اناجوں سے بھرے ہوئے ہیں، جناں دیاں کوٹھیاں وچ دانے ہون [3] ''۔ اس لفظ کی بنیاد یہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟ عربی زبان میں تو سردارانِ قوم کے لیے، ایک ایک بات کے لیے، سو سو، ہزار ہزار الفاظ مل جائیں لیکن خاص طور پر یہ لفظ کیوں استعمال کیا کہ جس کی بنیاد کے اندر یہ چیز ہے کہ جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوئی تھیں، وہ مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ ان کے ذاتی مفاد پہ زد پڑتی تھی۔ تفریق

---

[1] اُس کی قوم کے اکابرین، جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں، اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص۔ 776 تا 777)۔

[2] نویں پارہ کا نام ہی قال الملا ہے۔

[3] جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوئی ہوں۔

اسوقت مٹی جب تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے [1]۔ بہرحال ان کی طرف سے مخالفت کی پہلی کڑی یہی ہے۔انہوں نے کہا کہ **مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ** (23:24) یہ نوحؑ جو اپنے آپ کو خدا کا فرستادہ کہتا ہے' تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔اس میں کوئی امتیازی بات نہیں ہے۔تمہارے ہی جیسا ہے یعنی ہمارے جیسا بھی نہیں ہے۔اب سنو کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ **يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ** (23:24) چاہتا یہ ہے کہ وہ تمہارے اوپر افضلیت حاصل کرلے' تمہارے اوپر بڑا بن جائے۔یہ کہنے کے لیے آیا ہے۔آپ نے دیکھا کہ وہ اپنی بات اس سطح پر لے آئے کہ اس وقت تو یہ ہمارے بندے بنے ہوئے ہیں اور جو بات یہ کہہ رہا ہے اگر یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تو پھر تو ہم سربراہ نہیں رہ سکتے۔یہ اس قسم کی امت بنانا چاہتا ہے جسمیں اس قسم کے ہی لوگ ہونگے جو ان میں سے واجب التکریم سمجھے جائیں گے۔یوں کہیے کہ پھر اس طرح یہ ہمارے ہاں کی سرداری' اپنے آپ چھن جاتی ہے۔پھر یہ ان عوام کی طرف آ گئے اور کہا کہ یہ جو کہہ رہا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے نبوت ملی ہے' خدا نے اگر ایسا ہی کچھ کہنا تھا تو **وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً** (23:24)۔ فرشتے بھیج دیتا' وہ آ کر بات سمجھا دیتے۔وہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو اپنا پیغامبر کیوں بناتا؟ پھر جو کچھ یہ کہتا ہے وہ بالکل انوکھی بات ہے۔اس کے لیے دلیل کیا ہے؟ یہ ہے کہ **مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ** (23:24) ہم نے یہ کچھ اپنے آباؤ اجداد سے کبھی نہیں سنا۔یہ جو ہمارے ہاں تفریق ہے یہ ہمارے مورثِ اعلیٰ' ہمارے آباؤ اجداد سے چلی آ رہی ہے۔ان میں سے تو کبھی کسی نے یہ بات نہیں کی' اسلاف کے مسلک میں یہ بات قطعاً نہیں ہے' تمہارے اسلاف کے مسلک سے یہ تمہیں برگشتہ کر رہا ہے۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح عوام کو بھڑکا رہے ہیں۔

معاشرے میں کام کرنے والوں (یعنی کمیوں) پر کام نہ کرنے والوں کی حکومت

اب جو آگے کہا ہے' اس کے لیے پہلے یہ سنیے کہ وہ کہا کیا ہے؟ بات غور سے سننے کی آ گئی۔بات آ گئی تھی: تفریق کی' اختلاف کی' تفرقے کی۔میں نے بتا دیا تھا کہ تفرقے کس کس قسم کے ہیں۔ایک ہی قوم کے اندر یہ جو Division of Labour (یعنی تقسیم کار) ہے اس کی رو سے تو مختلف کام مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔کوئی کنکر بناتا ہے' قوم کا کام ہے۔کوئی لوہے کا کام کرتا ہے' قوم کا کام ہے۔کوئی دوکانداری کرتا ہے' کنجڑا سبزی بیچتا ہے' قوم کا کام ہے۔کوئی کپڑے بنتا ہے لیکن اس تقسیم کار سے یہ لوگ جتنے کام کرتے ہیں ان کے اوپر ایک طبقہ ہوتا ہے جو کچھ کام نہیں کرتا' وہ سب کا حاکم ہوتا ہے اور یہ سارے کے سارے کام کرنے والے ''کمی'' بن کر رہ جاتے

---

[1] شکوہ' بانگِ درا' میں اقبالؒ کا یہ شعر یوں ہے:

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ہیں۔ ''کمی'' کا لفظ اب دیکھیے۔ آپ اب تک اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں۔ ''کمی'' کا لفظ کن معنی میں استعمال ہوتا ہے؟ کام کرنے والے۔ تو گویا معاشرے میں تقسیمِ کار ایک بہت ضروری چیز ہے۔ اس کے لیے مختلف کام مختلف لوگوں نے سنبھال لیے یا مختلف لوگوں کے سپرد کیے گئے لیکن نظریہ آیا کہ وہ یہ کام ان لوگوں کے لیے کر رہے ہیں' جو یہ خود کے لیے کوئی کام نہیں کر رہے۔ خود یہ طبقہ کون تھا؟ یہی جو محنت کر کے نہیں کھاتا۔ اور پھر دوسرا مذہب پرست طبقہ ہے۔ یہ دو ہی طبقے ہیں' عزیزانِ من! جو کام کر کے نہیں کھاتے۔ یہ باقی سارے کام کرتے ہیں۔ یہ وہ کام کرنے والے تھے' جو آہستہ آہستہ معاشرے کی نگاہوں میں ''کمین'' ہو گئے اور یہ جو کام کر کے نہیں کھاتے تھے' یہ معاشرے کے مہذب لوگ بن گئے۔

اب دیکھیں کہ یہ نبی کاہے کے لیے آیا کرتے تھے؟ حضرت نوحؑ نے آ کر ایک پیغام دیا۔ اس معاشرے کے اندر دو طبقے تھے۔ ایک طبقہ ان ''کمیوں'' کا تھا یعنی کام کرنے والوں کا اور دوسرا طبقہ وہ جن کے برتن ہمیشہ ہمیشہ سے بھرے رہتے تھے۔ ان انبیائے کرام نے آ کر جب یہ آواز دی تو ان ''کمیوں'' سے کہا کہ تمہیں اس طرح سے کمی' محتاج اور غریب سمجھنے والے یہ کون ہوتے ہیں؟ خدا نے تمام انسانوں کو ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ انسان صرف اس کا حقدار ہے جو کچھ وہ محنت کرتا ہے۔ جو محنت نہیں کرتے وہ تو ایک پیسے کے بھی حقدار نہیں ہیں اور یہ بھی جو تمہارے اوپر سردار ہیں۔ یہ تمہیں ذلیل جان رہے ہیں اور ''کمی'' جان رہے ہیں' کمین جان رہے ہیں' یہ قطعی غلط ہے۔ معاشرے کی یہ تفریق اور تشکیل غلط ہے۔ انسانیت کی سطح پر آؤ۔ یہ تمہارا استحصال (Exploit) نہیں کر سکتے۔

اب یہ سیدھی سی بات ہے کہ جب یہ چیز کہی تو انہوں نے اس اعلانِ حق کے خلاف آواز بلند کی۔ اب آپ سورۂ ھود کو سامنے لائیں۔ اب مخاصمت ہی یہی تھی' ان مخالفت کرنے والوں کے ساتھ یہی بات چیت ہو رہی ہے کہ یہ دو گروہ سامنے آئے ہیں۔ **فَقَالَ الْمَلَاُ** (11:27) اس کی قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے' جن کے پاس سامانِ زیست کی فراوانی تھی' کہا کہ یہ جو تمہارے ساتھ ہیں' یہ تو **اَرَا ذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ** (11:27) ہمارے معاشرے کے کمین اور ذلیل آدمی ہیں۔ دیکھ لیا' عزیزانِ من! نبی کاہے کے لیے آتا ہے؟ دیکھا کہ اعتراض کیا ہو رہا ہے؟ یہ کہ جن کو وہ کمی سمجھتے تھے' جن کو کمین سمجھتے تھے' انہیں یہ بتانا چاہتا تھا' کہ ایسا نہیں ہے' جو انہوں نے کہا ہے۔ وہ صاحبِ ثروت و اقتدار یہ کہتے تھے کہ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے اوپر برتری حاصل ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو تمہارے ہاں تمہارا ساتھ دے رہے ہیں' تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں' یہ ہمارے معاشرے کے بڑے ذلیل لوگ ہیں' کمینے لوگ ہیں' باقی رہا یہ کہ انہوں نے تمہاری بات مان لی ہے تو سنو! انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رو سے قبول نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں۔ یہ تو اناج کے محتاج ہیں۔ انہیں کیا عقل! کیونکہ جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے [1]۔

---

[1] جن کے گھر اناج سے بھرے ہوں ان کے کم عقل بھی صاحبِ عقل ہوتے ہیں۔

حضرت نوح کے دور میں بھی سب سے پہلا اختلاف دولت کے معیار پر تھا

عقل وفکر تو ان کے ہاں ہوتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ درجے (پنچ قوم) کے لوگ ہیں دوسرا یہ کہ یہ جو کہہ رہے ہو کہ انہوں نے اس دین کو عقل وفکر کی رو سے قبول کر لیا ہے' صحیح نہیں ہے۔ اگلی بات یہ ہے کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیا تمہیں رزق اور مال کی رو سے فضیلت حاصل ہے۔ اب برتری اور فضیلت کا معیار یہ ہو گیا۔ روز کی محنت کرنے والا ہمارے پاس آئے اگر ہم اسے نہ دیں تو یہ بھوکا مر جائے۔ اس لیے بتاؤ تو سہی کہ کیا معاشی اعتبار سے تمہیں ہمارے اوپر فضیلت حاصل ہے؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کی کڑیوں میں سے یا پہلا رسول' حضرت نوحؑ' کا سب سے پہلا تعارف کس تعلیم پر ہے؟ اس کی پہلی دعوت کیا ہے؟ وہ دعوت کیا کہہ رہی ہے؟ معاشرے کے اندر پہلا اختلاف دولت کو معیار قرار دینا ہے۔ صاحبِ ثروت واقتدار لوگ دولت کو معیار قرار دیتے ہیں۔ خدا کے نبی محنت کو معیار قرار دیتے ہیں۔ یہ جو ایک قبیلے کے اندر تفریق ہوئی تھی' اسے مٹانے کے لیے کتاب اتری۔ حضرت نوحؑ نے کہا کہ میری قوم کتنے غلط دلائل اور کتنے غلط معیار لا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے۔ سوال تو یہ ہے جو میں پیش کر رہا ہوں کہ صحیح انسانیت کا راستہ کونسا ہے؟ کونسی وہ منزل ہے جو بیّنت پر ہے؟ کون عقل وفکر کی رو سے مانتا ہے؟ کون دعوت دے رہا ہے؟ یہ چیزیں اتنی واضح ہیں کہ اگر تم بھی اپنے جذبات کو الگ کر دو تو بات واضح ہو جائے لیکن تم تو اندھے ہوئے ہو۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ ادنیٰ درجے (پنچ قوم) کے لوگ ہیں' اس لیے ان کی سمجھ میں بات آ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات اس لیے نہیں آ رہی کہ تم اندھے ہو رہے ہو' تمہیں نشۂ قوت کی بدمستیاں ہیں جنہوں نے تم سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت چھین لی ہے اور یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ماننے والے جو ہیں ان کی عقل وفکر کیا ہے! ان کی عقل وفکر صحیح ہے کیونکہ وہ مدہوش نہیں ہیں' وہ نشے میں بدمست نہیں ہیں' اندھے نہیں ہوئے (11:28)۔ کیا الفاظ ہیں! باقی رہی یہ بات کہ ٹھیک ہے' ہم مانتے ہیں لیکن ہماری دعوت تو یہ ہے کہ ہم جبراً یہ بات نہیں سوچ سکتے۔ اس کے لیے ہمارا دل نہیں مانتا۔ میں دلائل و براہین کی رو سے تمہیں سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔

دین کی تعلیم دینے والا کسی شخص سے معاوضے کا طلب گار نہیں ہوتا

اگلی یہ بات ٹھیک ہے کہ جو دولت تمہارے پاس ہے وہ دولت ہمارے پاس نہیں ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ میں جو تمہیں دعوت دیتا ہوں اگر میری یہ دعوت تمہاری طرح بھی اپنے مفاد کے لیے ہو تو میں باہر کے لوگوں کو اکساؤں اور اندر تم سے کچھ اور کہوں۔ دیکھ رہے ہو کہ میں تو تم سے ایک پائی بھی نہیں مانگتا (11:29)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ عزیزانِ من! جو بھی اس دعوت کو لے کر اٹھے گا اس کے لیے پہلی چیز یہ ہو گی کہ وہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگے گا۔ جونہی اس کے معاوضے کا سوال آیا' ہر نبی نے عزیزانِ من! یہ کہا ہے۔ حضورِ نبی اکرمؐ نے

بھی آخر میں یہی کہا ہے' یہ بڑی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا ہے۔ جو روٹی کا محتاج ہو کر اس کی دعوت کے لیے اٹھا اس کی یہ بات کوئی نہیں سنے گا۔ یہ تو پھر اس کے ساتھ ایسا سودا کریں گے کہ پوچھو نہیں صاحب! اسے کہیں کا نہیں رہنے دیں گے۔ یہ اعلان ہے کہ کچھ نہیں مانگتا۔ بھوکا مر جاؤنگا' میں تم سے معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ میں بلا معاوضہ یہ کچھ کر رہا ہوں۔ بلا معاوضہ تو انسان کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ معاوضہ وہاں سے ملے گا' جس نے اس مشن کے لیے تمہیں مامور کیا ہے (11:29)۔ وہ تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ تم میرے ساتھ بات کرو۔ تم یہ کہتے ہو کہ یہ معاشرے کا رذیل ہے۔ اب اگلی بات یہ آ گئی کہ وہ کیا کہنے آئے تھے؟ یہ کہنے آئے تھے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے جو تم کہتے ہو' لیکن اگر ہم تمہاری دعوت پہ آ جائیں تو .... یعنی دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیا جاتا .... تو بھئی! بڑی غلط بات ہے' کوئی تمہارے لیے پوچھتا ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس نہ پیسہ' نہ عقل' نہ فکر' نہ معاشرے میں اس کا کوئی خاص مقام ہے۔ یہ بات ہی کونسی ہے؟ ہم تمہارے پاس آ جاتے ہیں مگر ایک شرط ہے کہ انہیں یہاں سے نکال باہر کرو۔ یہی فرق ہے' عزیزانِ من! خدا کی طرف دعوت دینے والے میں اور اپنے مفاد کے حصول میں غرق ہونے والے میں۔ وہ اس مقام پہ یہ گنے گا کہ یہ اچھا چوہدری کا گھر ہے' برادری والا ہے' پانچ سو ووٹ ملے گا' دوسرا تو محض ''کمی'' ہے' کمہار ہے' اس سے کیا ملے گا۔ لیکن وہ تو آیا ہی اس اختلاف کو مٹانے کے لیے ہے' وہ تو آیا ہی آدمی کو انسانیت کی سطح کے اوپر لانے کے لیے ہے۔ وہ یہ سودے بازی نہیں کرتا کہ میں انہیں تمہارے کہنے پر دھتکاروں صرف اس لیے کہ غریب ہیں' معاشرے میں اونچا مقام نہیں ہے' یہاں تو خیر یہ مجھے کچھ نہ کہہ سکیں گے کل کو جب یہ اپنے خدا کے سامنے جا کر کہیں گے کہ انہوں نے ہمیں اس لیے دھتکار دیا تھا کہ ان سرداروں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ کم بختو! بتاؤ وہاں میں کیا جواب دونگا' تمہیں پتہ نہیں کہ یہ کس عدالت میں جا کر مقدمہ دائر کرے گا (11:29)۔

ہر نبی کی پیش کردہ تعلیم کا مرکزی نکتہ طبقاتی فرق کو مٹانا ہوتا تھا

عزیزانِ من! انسانیت کی اصلاح وہی کر سکتا ہے جسے ہر وقت یہ فکر ہو کہ خدا کے ہاں اس کا مقدمہ دائر ہوگا۔ میں ''وہاں کیا جواب دونگا''؟ تم انہیں یہ کہتے ہو۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے جیسا کوئی بیوقوف ہے ہی نہیں۔ تباہی کی آگ تمہیں گھیرے ہوئے ہے' میں تمہیں بچانے کی فکر کر رہا ہوں اور تم مجھے یہ کہہ رہے ہو کہ نہیں' اس دعوت کو چھوڑ دو' ہمارے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ آگے بھی یہی چیز ہے: یاد رکھو! دولت کو معیار قرار دینا غلط ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تم یوں میرے ساتھ آ جاؤ کیونکہ میرے ہاں بڑے بڑے خزانے ہیں' بڑی دولت ہے' قطعاً نہیں (11:31)۔ میں یہ بات تم سے نہیں کہہ سکتا۔ دنیاوی اعتبار سے بھی میرے پاس کوئی دولت نہیں ہے اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں مذہب کی اسٹیج پر یہ دعوت دے رہا ہوں تو سن رکھو! کہ اب یہ مذہب کی اسٹیج نہیں ہے۔ تم نے کہا تھا کہ ہمارے ہی جیسا کوئی

انسان ہے۔ ہاں بالکل تمہارے جیسا انسان ہے۔ اسے غیب کا علم بھی نہیں ہے۔ مذہب کی سطح پہ بھی دنیا سے اوپر نہیں ہوتا (11:31)۔

عزیزانِ من! وہ تفرقہ کچھ اس تفرقے سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں تو پھر بھی سامنے بیٹھ کر کچھ جرح ہوتی ہے' معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تو یہ لوگ مرنے کے بعد بھی اپنی حکومت کو قیامت تک جاری رکھتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ اس تصور کی شہ رگ کاٹ کے رکھ دی۔ یہ کیوں ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی قبروں کو مردہ بدست زندہ رکھتے ہیں؟ ان کے ہاں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے مگر خدا کا نبی کہتا ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں ہے۔ وہ صرف خدا کے پاس ہے۔ یہاں صرف یہ بات ہے کہ یہ صرف حق کو حق سمجھ کر میرے پاس آئے ہیں' نہ دولت میرے پاس ہے' نہ روحانیت کا کوئی دعویٰ ہے' نہ فرشتے ہونے کا کوئی دعویٰ ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا بات ہے جس کے لیے وہ میرے پاس آئے ہیں؟ ایک ہی چیز ہے جو میں نے ان سے کہی ہے کہ ان کے معیاروں کے اوپر نہ جاؤ۔ خدا کے معیار کے مطابق تم آؤ گے تو تمہیں بڑے درجے ملیں گے اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان سے کہدوں کہ یہ بات غلط ہے۔ میں یہ بات تو نہیں کہتا۔ تمہارا جی چاہتا ہے تو آؤ' نہیں جی چاہتا تو نہ آؤ۔ میں تمہیں Force (مجبور) نہیں کرتا۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔

عزیزانِ من! میرے نزدیک تو سارے قرآن کا ماحصل یہی ہے۔ اسی کو سورۃ الشعراء میں بھی دہرایا گیا ہے۔ وہاں بھی یہ کہا ہے کہ **وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ** (26:109) میں تم سے اس کے لیے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ صرف تم سے یہ کہتا ہوں کہ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ** (26:110) تم صرف قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے میری اطاعت کرو۔ اس پر قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ **قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ** (26:111) انہوں نے کہا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اسطرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں معاشرے کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست' ذلیل اور کمینے ہیں' ادنیٰ درجے کے کام کاج کرتے ہیں۔ کیا ہم اس پارٹی میں شامل ہو کر ان رذیل لوگوں کو اپنا ہمسر بنالیں؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

قرآن حکیم کی تعلیم مساوات انسانیہ کے سوا کچھ اور نہیں

عزیزانِ من! یہی چیز آج راستے میں حائل ہے۔ کہا کہ **قَالَ وَمَا عِلۡمِىۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ** (26:112) نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ان لوگوں کے پیشے کیا ہیں۔ نہ ہی مجھے اس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا کام کرتے ہیں مگر تم ہو جو بار بار کہتے ہو کہ جی! یہ کنجڑا ہے' یہ موچی ہے' وہ فلاں ہے۔ کہا کہ یہ کام ہے' جو وہ کرتے ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ کیا کام کرتا ہے: ترکھانے کا کام کرتا ہے' لوہارے کا کام کرتا ہے۔ یہ کام ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ

ان کے دل کس قسم کے ہیں اور یہ نظام خداوندی کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اسی کے مطابق ان کی قدر و قیمت کے پیمانے مقرر ہیں۔ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّىْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ (26:113) اے کاش! تم اس حقیقت کو سمجھ سکتے کہ انسان کی عزت و تکریم اس سے ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتا ہے (49:13)' نہ اس سے کہ اس کا پیشہ کیا ہے؟ اے کاش! تم عقل وفکر سے کام لو۔ اگر اس سے انکار ہو جائے' جو خدا کے ساتھ کیا جاتا ہے تو معاشرے میں اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ انہوں نے جو خدا کے ساتھ حساب کیا ہے وہ اس حساب سے کہیں بڑا اور اونچا ہے' لہٰذا سن رکھو کہ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ (26:114) میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا' جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لا کر' میرے رفیق کار بنے۔ میرے نزدیک یہ غریب اور ادنیٰ پیشوں کے حامل' ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں' جو قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں انہیں نہیں دھتکاروں گا اور اس کا جواب یہ تھا کہ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (26:116) انہوں نے کہا کہ تم اس ادنیٰ درجے کے لوگوں کو مساوات کی تعلیم دے کر معاشرہ میں فساد برپا کر رہے ہو۔ اگر تم اس روش سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ ہم تمہاری یہ دعوت یہاں نہیں پھیلنے دیں گے' یہ بہت بڑا فساد ہے جو تم لے کر آ گئے ہو' بہت بڑا فتنہ ہے' جسے تم برپا کرنا چاہتے ہو۔ ہم یہ نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے کہا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ (23:25) ایسا نظر آتا ہے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اس لیے اس پاگل کی کسی بات پر کان نہ دھرو۔ تم کچھ دنوں تک انتظار کرو اور دیکھو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِىْ كَذَّبُوْنِ (26:117) نوحؑ نے کہا کہ بارِالہا! میں نے اپنی طرف سے ساری کوشش کر کے دیکھ لی۔ یہ میری ہر بات کی تکذیب کیے جا رہے۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِىْ بِمَا كَذَّبُوْنِ (23:26) اس نے اپنے خدا سے کہا کہ اے میرے پروردگار! یہ میری کوئی بات نہیں سنتے' اور بلا سنے سمجھے' میری تکذیب کیے جا رہے ہیں تو ان کے خلاف میری مدد کر۔ ان کا معاملہ اب حد سے بڑھ گیا ہے۔ اب تو مجھے بتا کہ اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر خدا نے کیا بتایا؟ اسے ہم اگلے درس میں لیں گے' اب وقت ہو گیا ہے۔

سورۃ المؤمنون کی آیت 26 تک ہم آ گئے۔ 27ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

ساتواں باب: سورۃ المؤمنون (27 تا 33)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا
تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى
الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا
مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ
بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ
وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ
وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾

عزیزانِ من! آج جون 1977ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 27 سے ہو رہا ہے: (23:27)۔

انبیائے کرام کی بعثت کا اوّلین مقصد

سابقہ درس میں پیش کی گئی قرآنی آیات کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ انبیائے کرامؑ کو بھیجنے کا مقصد کیا تھا' ان پر کتابیں کیوں نازل کی گئیں اور یہ کیا کرنے کے لیے آتے تھے؟ اب یہ بات آپ کے سامنے واضح ہوگئی ہے کہ قرآن نے کہا ہے وَ مَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً

اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (10:19) نوعِ انسان ایک امتِ واحدۂ ایک عالمگیر برادری کی شکل میں رہتی تھی۔ انہوں نے آپس میں اختلافات کیے اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (2:213) تو ہم نے اس مقصد کے لیے انبیائے کرامؑ کو بھیجا اور ان کے ساتھ ضوابطِ قانون بھیجے تاکہ وہ لوگوں سے اختلافات کو مٹا کر پھر سے انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دیں۔ یہ تھی انبیائے کرام کے بھیجنے کی غرض وغایت۔ اس مقصد کے لیے یہ سلسلہ رشد وہدایت جاری کیا گیا تھا کہ انسانوں نے جو باہمی اختلافات خود پیدا کر دیئے ہیں اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں' فرقوں' پارٹیوں میں' قوموں میں' بٹ گئے وہ ان اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے ایک عالمگیر برادری بنا دیں۔ یہ ہے جو قرآن نے غرض وغایت بتائی ہے۔ وہ اسی کی وضاحت وتشریح میں انبیائے سابقہؑ کی داستانیں اور اقوام گزشتہ کے قصے بیان کرتا ہے کہ اس قوم میں کس قسم کے اختلافات یا گروہ بندیاں یا طبقاتی امتیازات رونما ہو گئے تھے اور اس قوم کی طرف جو نبی مبعوث ہوا' اس نے ان کو مٹانے کی کیا سوچی تھی۔ یہ ہے ساری داستان اور وہ اس کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے کرتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں قرآن پہلا اختلاف یہ بتاتا ہے کہ معاشرے کے بڑے بڑے سردارانِ قوم نے معاشرے میں تفریق پیدا کر دی تھی۔ ''وہ بڑے بڑے سردار اس معاشرے دے کھاندے پیندے لوگ سی [1]۔'' وہ بڑے لوگ معاشرے میں کام کرنے والوں کو کمی اور کمین کہتے تھے' رذیل کہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے محض کاموں کی بنا پہ تفریق پیدا کر دی تھی۔ وہ کسی طرح دھاندلی سے کچھ زیادہ اپنے پاس جمع کر کے بیٹھ گئے تھے۔ وہ کوئی محنت نہیں کرتے تھے۔ وہ سردار بن گئے تھے اور یہ جو بیچارے محنت کرتے تھے' یہ ان کے ہاں کے کمی بن گئے تھے۔ پہلے پیغمبر حضرت نوحؑ کا تعارف اس طرح کرایا جا رہا ہے کہ انہوں نے آ کر ان سے کہا ہی یہ تھا کہ یہ تو معاشرے میں تقسیم کار (Division of Work) ہے' مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں تو معاشرے کا کام چلتا ہے۔ تم اس تقسیم کار کی بنا پہ یہ تفریق پیدا کرتے ہو تاکہ یہی تفریق تمہارے لیے وجۂ عزت اور وجۂ تکریم ہو جائے۔ یعنی تم جو کچھ نہیں کرتے ہو' تم ہی سب سے زیادہ واجب التکریم رہو اور یہ جو اتنی محنت کرتے ہیں وہ تمہارے ہاں کے رذیل تصور کیے جاتے رہیں۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ وہ لوگ جو کچھ نہ کر کے دوسرے کی محنت پر' دوسروں کی کمائی پر' نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں قرآن انہیں مترفین کہتا ہے۔ وہ اس تفریق کو مٹانے کی اس جدوجہد کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے ان کی مخالفت کی۔ اب مخالفت انتہا تک پہنچ گئی۔

قوموں کے جرائم کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان

عزیزانِ من! یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم ان اقوام کا جو ذکر کرتا ہے تو وہ ان کا جو سب سے بڑا جرم ہوتا ہے وہ اسے نمایاں طور پر بیان

---

[1] وہ بڑے بڑے سردار اس معاشرے کے کھاتے پیتے لوگ تھے۔

کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم میں یہی ایک جرم ہوتا ہے۔ دراصل اس قوم کا جو سنگین جرم ہوتا ہے' جو جرم کبیر ہوتا ہے' وہ اُسے باہر لاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے علاوہ اور جرائم بھی اس معاشرہ کے اندر عام ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی معاشرے میں صرف یہ جو ایک قسم کا جرم ہے وہی ہو اور باقی جو لوگ اس قسم کے مجرم ہیں' ان کی زندگی نہایت حسنات میں گزر رہی ہو۔ یہ نہیں ہوتا۔ قرآن تو نمایاں طور پہ اُس ایک کا ذکر کرتا ہے جو وہاں زیادہ ابھرا ہوا ہوتا ہے اور بنیادی ہوتا ہے اور اس کے مٹانے کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں انہی کا زیادہ ذکر کرتا ہے باقیوں کا ذکر نہیں کرتا اور یہ کہ ان میں اور کوئی خرابی ہوتی نہیں ہے۔ اگر اتنی بڑی نمایاں خرابی اس معاشرے میں پیدا ہو جائے کہ جو محنت نہیں کرتے وہ دوسروں کی محنت کو Exploit (استحصال) کریں' ان کی محنت سے خوشحالی کی زندگی بسر کریں اور پھر انہیں رذیل اور کمین بھی کہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم یہ چاہتے ہو کہ یہ آئیں اور ہمارے برابر بیٹھ جائیں' تو جہاں اوپر کے طبقے کی ذہنیت یہ ہو' آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں صرف یہ ایک ہی خرابی نہیں ہوگی۔ اس ذہنیت تک آ ؤ تو سینکڑوں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن ان اقوام کی کسی ایک ایسی خرابی کا ذکر کرتا ہے جو اس معاشرے میں بڑی بنیادی ہوتی ہے اور اس سے پھر وہ بتاتا یہ ہے کہ کس طرح ان کے پورے کے پورے اخلاق پر' اس معاشرے کے ہر گوشے پر' یہ چیز اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں پھر خرابیاں ہی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اب ان کی مخالفت جب یہاں تک پہنچ گئی تو قرآن نے کہا کہ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ (23:26) اس نے کہا کہ ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ میں ان کے بھلے کی کوئی بھی بات کہتا ہوں تو یہ مجھے کہتے ہیں کہ جا بھئی جا' اپنا کام کر' ہمیں زیادہ معلوم ہے' تم جو کچھ کہہ رہے ہو جھوٹ ہے۔ اب اس مقام پر وہ نصرتِ خداوندی طلب کرتے ہیں۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔

عزیزانِ من! یہاں انہوں نے خدا سے یہ کہا ہے کہ اس معاملے میں میری کچھ مدد کرو۔ قرآن کا دوسرا انداز یہ یاد رکھیے کہ وہ کسی قصے کی تمام کڑیاں خود ہی بیان نہیں کرتا چلا جاتا' اس لیے کہ وہ کوئی ناول نگار نہیں' افسانہ نویس نہیں ہے' داستان گو نہیں ہے۔ اس نے تو ایک عظیم نکتہ سامنے لانا ہوتا ہے یا اس تک لے جانا ہوتا ہے اور پھر وہ آپ کے ذہن اور شعور کا بھی احترام کرتا ہے۔ آج بھی آپ دیکھیے بہترین ادب وہ گنا جاتا ہے جس میں بچوں کی طرح ہر بات کو بار بار نہیں دہرایا جاتا بلکہ ایک بات کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے انگریزی زبان میں Suggestiveness (ایمائیت) کہتے ہیں۔ ادب اور شاعری میں تو یہ Suggestiveness (ایمائیت) بڑی چیز ہوتی ہے۔ وہ اس طرح بیان کیے جاتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں کم کر دی جاتی ہیں' انہیں سمجھنے والے کی ذہنی سطح پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ بچوں کی طرح یوں بٹھا کر ایک ایک چھوٹی چھوٹی سی کڑی سمجھانا شروع کریں تو آپ دیکھیں گے اسے ناگوار گزرے گا۔ وہ کہے گا ''کیا مینوں اینا وی پتہ نہیں ہیگا[1]؟'' قرآن کی یہ پہلی عجیب چیز ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نے اب

---

[1] کیا مجھے اتنا بھی معلوم نہیں ہے؟

انسان کو بالغ سمجھ لیا ہے' بچہ نہیں سمجھا کہ اس کی انگلی پکڑ کر وہ ساتھ ساتھ چلاتا جائے۔ اس نے ہر دوراہے کے اوپر بتادیا ہے کہ اب وہ انسانیت تک پہنچا ہے۔ اب اسے صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر دوراہے کے اوپر ایک سائن بورڈ لگا ہوا ہو کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور پھر اس کو چھوڑ دیا جائے کہ جاؤ بھئی! یہ سائن بورڈ پڑھ کر خود اپنی منزل پہ پہنچے چلے جاؤ۔ بچے کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے' بچہ ذرا بھی باہر جانا چاہے تو کوئی نہ کوئی ساتھ جاتا ہے۔ یہ کوئی نہ کوئی وہ انبیاء ہوا کرتے تھے جو بچپن میں گزرنے والوں کی راہنمائی کیا کرتے تھے اور قرآن تو انسان کے عہدِ بلوغت کے لیے ہے۔ اس کے فہم اور شعور کو وہ بڑی اہمیت دیتا ہے' اس کا احترام کرتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ احترام میں ایک یہ اسلوب بھی ہوتا ہے کہ ساری کڑیاں خود نہ بیان کی جائیں۔ ادب آشنا ذہن اس کو Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ بڑا ہی حسین انداز ہوتا ہے۔ مثلاً جب غالب [1] یہ بات کہہ کر گزر جاتا ہے کہ

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا' مری جو شامت آئی
اٹھا' اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس نے کچھ نہیں کہا کہ کیا ہوا لیکن جو Appreciate (پسند) کرتے ہیں ان کے سامنے وہ ساری کہانی آ گئی کہ ہوا کیا ہے۔

طوفانِ نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں کشتی کی تیاری اور مخالفانہ ذہنیت

قرآن کا ایک یہ بھی انداز ہے کہ وہ پوری کڑیاں بیان نہیں کرتا۔ اب یہاں قصہ حضرتِ نوح علیہ السلام میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ وہ جو انہوں نے اس قسم کا معاشرہ قائم کیا تھا' اس میں حفاظتی تدابیر نہیں اختیار کی تھیں۔ بہبود کی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو وہ معاشرہ ان کی طرف سے خود ہی خود غافل ہو جاتا ہے۔ پہلی چیز وہاں یہ بتائی گئی ہے کہ غالباً اس جگہ پہاڑیوں کے اوپر ایک بستی تھی۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس کے گرد کچھ جودی [2] (Judi) کا علاقہ ہے۔ یہ اس علاقے کی بات ہے۔ وہاں سخت بارشیں ہوتی تھیں اور یہ انسانوں کا وہ دور تھا جس میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے لیے کیا کیا جائے۔

اب دو تین چیزیں ہیں۔ ایک بات تو اس مخالفت کی یہ ہو رہی ہے جو معاشرے کی اتنی بڑی خرابی ہے۔ اس میں اگلی بات یہ ہو رہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام خدا سے نصرت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد درمیان کی کڑیاں پوری نہیں ہیں کہ یہاں ایک تباہی آنے والی ہے' جس کی طرف ان کا دھیان نہیں جا رہا اس قسم کا سیلاب آئے گا اور پھر یہ پوری بستی تباہ ہو جائے گی۔ یہاں حضرت نوح علیہ السلام خدا سے مدد طلب

---

[1] مرزا اسداللہ خان غالب (1797-1869)

[2] یہ اس پہاڑی یا ٹیلے کا نام ہے جس پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی (11:44)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس سلسلۂ کوہ میں واقع ہے جو آرمینیا (Armenia) کو میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) سے جدا کرتا ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1960ء ص۔ 457)۔

کر رہے ہیں۔اب خدا سے مدد کیسے دی جا رہی ہے؟ عزیزانِ من! قدم قدم پہ آپ دیکھتے چلے جائیے گا کہ مذہب اور دین میں فرق کیا ہے۔خدا کا نبی مدد مانگ رہا ہے۔بات یہ ہے کہ بے پناہ سیلاب آتے ہیں اور اس بستی کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔اگر سوال یہی ہو کہ ان کے ہاں کی جو حالات کی خرابیاں تھیں ان کی بنا پہ انہوں نے تباہ ہو جانا تھا تو یہ جواُن کا ایمانداروں اور اچھے اخلاق والوں کا گروہ تھا' اگر انہیں محفوظ رہنا تھا تو اس کے لیے خدا سے مدد کیوں مانگ رہے ہیں۔خدا ان کے لیے اپنا انتظام کرتا لیکن آپ دیکھیے کہ کیا انتظام کر رہا ہے؟اور خدا کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہ فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا [1] (23:27)۔اس نے کہا کہ نوحؑ کشتی بناؤ۔دیکھا' خدا کی مدد کیسے ہوتی ہے؟ صحیح راستے کی طرف راہنمائی یعنی نبی کی بھی مدد مادی اسباب کے ذریعے ہو رہی ہے۔کیا مشکل تھا خدا کے لیے کہ ان کو وہاں سے ویسے ہی نکال کر لے جاتا لیکن دیکھیے کہ یہ مدد کیسے ہو رہی ہے۔یعنی طریق یہ ہے کہ انسان نے ہی کچھ کرنا ہوتا ہے۔قرآن تو صرف رہنمائی دیتا ہے اور یہ راہنمائی ایک نبی کی ہو رہی ہے اور اس کی دعا کے اوپر راہنمائی ہو رہی ہے۔لہٰذا کہا یہ جا رہا ہے کہ کشتی بناؤ اور کشتی کے متعلق کہا ہے کہ وَوَحۡيِنَا (23:27) اور ہماری وحی کے مطابق بناؤ۔نظر آتا ہے کہ دور وہ تھا کہ ابھی انسانوں کو خود کشتی بنانے کا بھی علم نہیں تھا یعنی یہ اس ابتدائی دور کی بات ہے کہ جب کشتی بنانا بھی وہ خود نہیں جانتے تھے اور عقلِ انسانی ابھی اس قدر ناپختہ تھی کہ اسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ سیلاب آ جائے تو اس میں کشتی کے ذریعے بچا جا سکتا ہے اس کے لیے وَوَحۡيِنَا (23:27) وحی کی ضرورت پڑتی تھی۔آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم' جو وحی کی آخری کڑی ہے' نے یہاں وحی کے تحت کشتی بنانے کی ساری ترکیب بتائی ہے۔

قرآن زندگی کے بڑے اہم اصول دیتا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ایک جگہ کہتا ہے کہ عدل کرو مگر عدل کی ساری کڑیاں خود نہیں بتاتا' اتنا ہی کہتا ہے کہ عدل کرو حق کے ساتھ اور جس کو قرآن نے الحق کہا ہے یہ خدا کی وحی ہے۔کہا کہ اس کے مطابق عدل کیا کرو اور اس عدل کے لیے کہا کہ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔وہ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز نہیں کرتا اس لیے کہ انسان بالغ ہو گیا ہے۔یہاں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں انسان بچپن کے زمانے میں ہے' تو نبی ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ سیلاب سے بچنے کے لیے کشتی بناؤ' لیکن یہاں اُس وقت تک انسان کو کشتی بنانے کا علم ہی نہیں ہے۔لہٰذا اب وحی کے ذریعے یہ کشتی بنائی جا رہی ہے۔چلو کچھ Instructions یا Directions (ہدایات) دیدیں کہ یہ بناؤ لیکن یہاں نظر آتا ہے کہ معاشرہ' یا عقلِ انسانی' ابھی اس مقام پہ نہیں پہنچی تھی۔یہاں صرف وحی نہیں کہا' بلکہ بِاَعۡيُنِنَا (23:27) کہا ہے

---

[1] اس پر ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری زیرِ نگرانی' ہماری وحی کے مطابق' ایک کشتی بناؤ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔777)۔

کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹھیک ٹھیک بنا رہے ہو۔ یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی انسان کو ''کل ٹھوکن داوی پتا ئی سی ❶''۔

آپ غور کیجیے' عزیزانِ من! کہ یہ قرآن ہے کیا چیز؟ یہ کیا کتاب ہے! نبی علیہ السلام کہتا ہے کہ **رَبِّ انْصُرْنِیْ** (23:26) اے میرے پروردگار! تو ان کے خلاف میری مدد کر۔ یہ کہہ کے مدد کی جاتی ہے کہ کشتی بناؤ۔ اب انہیں یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے۔ لہٰذا کہا کہ صاحب! ہمیں تو پتہ نہیں کہ کشتی کیا ہوتی ہے۔ کہا کہ ہم بتاتے ہیں کہ وہ کیا ہوتی ہے' کیسے بنائی جاتی ہے؟ اب کشتی بنا رہے ہیں۔ اوپر کوئی استاد نہیں ہے جو شاگرد کو دیکھے کہ ''ایتھے کل ٹھوک' ایتھے لکڑی لا'' ❷۔ کہا کہ **بِاَعْیُنِنَا** (23:27) ہم دیکھتے جائیں گے اور تمہیں بتاتے جائیں گے کہ اب کیا کرو' اب کیا کرو۔ یہ ہے پہلا دور' جہاں سے قرآن نے وحی کا آغاز کیا ہے۔ وحی کی تعلیم تو آخری دور کی ہو یا پہلے دور کی' اصولی طور پر وہ ایک ہی ہوتی ہے لیکن وہاں جو معاشرہ مخاطب ہوتا ہے' نبی علیہ السلام کی شخصیت اس کے اعتبار سے ہوتی ہے اور وحی کی Instructions یا Directions (ہدایات) ماحول و حالات کے مطابق دی جاتی ہیں لہٰذا نبی علیہ السلام اسی سطح پہ ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے معاشرے کو بلندیوں پہ پہنچاتا چلا جاتا ہے۔ اگر آپ اس اعتبار سے قرآن کا مطالعہ کریں گے تو عجیب عجیب ارتقائی منازل آپ کو نظر آئیں گی۔ اگر آپ حضرت نوح علیہ السلام سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے تک آئیں گے تو مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف جو وحی آئی ہے آپ دیکھیں گے کہ ذہنِ انسانی میں وہ کتنی وسعت پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے نبی کو وحی آ رہی ہے کہ کشتی بناؤ۔ اب یہ بات دیکھیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ یہ ہر بات میں میری تکذیب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تم یونہی کہہ رہے ہو۔ یہ مجھے مانتے ہی نہیں ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جنہیں بڑے بڑے سردار کہا گیا ہے' جو اقتدار یا دولت کے نشے میں بدمست ہو جاتے ہیں' پھر وہ ان حضرات کی کسی بات کو بھی Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے۔ یعنی جو ان کی مخالفت کرے یا جسے وہ اپنی نگاہ میں سمجھیں کہ یہ شخص قابلِ احترام نہیں ہے اس کی کوئی بھی بات ہو' وہ اسے Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے لہٰذا تباہی وہاں آتی ہے۔ یہ تباہی اس ذہنیت کی وجہ سے آتی ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اپنے آپ کو اتنا خود مکتفی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے کسی کی بات سننے کی' نہ کسی کی بات ماننے کی اور پھر دوسری چیز یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے مقابلے میں ''کمی'' ہیں اس لیے اس قسم کے چھوٹی سطح کے یہ لوگ کیا جانیں کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ دیکھیے قرآن کس انداز میں اس بات کو بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَ یَصْنَعُ الْفُلْکَ** (11:38) اب یہ حضرتِ نوح علیہ السلام بیٹھے کشتی بنا رہے ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھی جیسے جیسے Instructions (ہدایات) ملتی جاتی ہونگی' وہ بناتے جاتے

---

❶ کیل لگانے کا بھی علم نہیں تھا۔

❷ یہاں کیل لگاؤ اور یہاں لکڑی کا تختہ۔

ہونگے۔اب اگر ذہن میں یہ بات ہو کہ ذرا Seriously (سنجیدگی سے) لے لیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں، کیوں کر رہے ہیں تو ان کے لیے کیا مشکل تھا کہ اسی قسم کی کشتی خود بھی بنا لیتے، پھر تو ڈوبنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ بچانا تو کشتی نے ہے، لیکن قرآن ذہنیت بتاتا ہے کہ ایسے مواقع پر ان کے دماغ میں خناس سماجاتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کی بات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے، اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کیا جائے۔ یہاں کہا ہے کہ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ (11:38) چنانچہ وہ کشتی بنا رہا تھا وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ (11:38) وہ قوم کے جو بڑے تھے وہ وہاں سے گزرتے تھے اور مذاق کرتے تھے کہ دیکھو! ان کی مت ماری گئی ہے، یہ کیا کر رہا ہے۔

عزیزانِ من! بڑی گہری چیزیں ہیں جو قرآن کہتا ہے۔ یہ حضرتِ نوح علیہ السلام اور اس زمانے کے مُلّا کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں، آج کی باتیں ہو رہی ہیں۔ جس کسی کو کہیں اقتدار، اختیار یا دولت اور نشے کی یہ چیزیں آجاتی ہیں تو پھر وہ کسی دوسرے کی بات کو درخورِ توجہ ہی نہیں قرار دیتا۔ وہ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ گزرتے تھے تو دیکھتے تھے کہ کشتی بنا رہا ہے اور مذاق کرتے تھے قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (11:38) اور اس تمسخر کے جواب میں وہ ان سے کہتے تھے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم آج ہماری یوں ہنسی اڑا رہے ہو، کل ہی تم دیکھنا تقدیر تمہارا مذاق اڑائے گی۔ اس فقرے کے اندر بڑی ادبیت ہے۔ انہی الفاظ کو لوٹا کے لے آنا کہ تم دیکھو گے کہ کیسی تمہاری ہنسی اڑائی جاتی ہے! سوچیے، عزیزانِ من! کوئی بات راز کی نہیں ہے، کھلے بندوں یہ بنا رہے ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ گزرتے تھے تو یہ سامنے دیکھتے تھے کہ وہ کشتی بنا رہا ہے لیکن وہ مذاق کرتے تھے۔ اس پہ بھی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ وہ ڈوبتے اس وقت ہیں جب ان کی ذہنیت نشے میں اس قدر مدہوش ہو جاتی ہے کہ سامنے دیکھ رہے ہیں کہ اس انداز کی ایک چیز ہو رہی ہے، تو بجائے اس کے کہ اس سے کوئی سبق حاصل کریں یا کھڑے ہو کر سوچیں کہ بات کیا ہے، اس سے پوچھ ہی لیں۔ اس نے تو کوئی راز (Secret) نہیں رکھا ہے۔ وہ تو بتائے گا کہ کیا چیز ہونے والی ہے۔ ہر سال سیلاب آتے ہیں، تم تباہ ہو جاتے ہو۔ کیا یہ بھی کوئی بتانے کی چیز ہے، لیکن وہ مذاق کر رہے ہیں۔ ان کی یہ ذہنیت ہے۔

انسانی ذہنیت میں احترامِ آدمیت کا جذبہ اور قائداعظمؒ کا ایک واقعہ

عزیزانِ من! واقعہ تو وہ اسی زمانے کا ہوگا، ذہنیت آج بھی وہی ہے۔ یہ لفظ نہیں سنتے۔ کہا جاتا ہے کہ جن کے دماغوں کے اندر انانیت (Egoism) اور فرعونیت سماجاتی ہے، پھر ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ کسی کی نہیں سنتے اور جب وہ کسی کی نہیں سنتے تو عزیزانِ من! ہم اور آپ تو کچھ شے نہیں۔ وہاں تو اس انسان کو جو حاکم الناس، عالم الناس ہے، علمِ انسانی کی انتہائی بلندیوں پر ہے، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3:159) معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو، ورنہ نبی کا علم اور یہ جو اس پر

ایمان لائے ہوئے ہیں' ایک سیکنڈ میں دونوں میں تفاوت نہیں پیدا ہونے دیتا۔ نبی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ان سے مشورہ کیا کرو۔ اس سے ذہنیت میں ایک تبدیلی آتی ہے۔ جب آپ کسی سے مشورہ کریں گے تو انکا احترام آپ کے دل میں پیدا ہوگا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بعض اوقات برسرِ توجہ ہوگی۔ وہ بات تو میں نے اس بزرگ و برتر ہستی کی بتائی ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ جتنے لوگ بھی ایسے ہیں' جن کے دلوں میں یہ درد ہوتا ہے یا جن کا کیریکٹر پختہ ہوتا ہے' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ اس کی بات کیوں سنی جائے۔ ہر ایک کی بات پہ کان دھرتے ہیں اور مجھے تو پھر قائداعظمؒ ❶ یاد آتے ہیں جو یہ کچھ اس دور میں دے گئے۔ آپ اس دور کے مورخین سے پوچھیے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ذہنی اعتبار سے جن بلندیوں پر وہ شخص تھا' ایک دنیا اس کی داد دیتی ہے کہ ایسا States man (مدبر) بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس States man (مدبر) کی کیفیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو جرأت دلائی ہوئی تھی کہ ہر شخص مجھے کچھ نہ کچھ جو اس کے ذہن میں آتا ہے مشورہ دے۔ تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا' جتنی ڈاک (Post) آتی تھی وہ کہتے تھے کہ وہ ساری مجھے سنایا کرو۔ انبار سا لگا ہوا ہوتا تھا۔ کسی گاؤں کے پتے (Address) کا ایک کارڈ تھا۔ وہ خط ❷ بھی اس کا وہی بچوں جیسا تھا اور اس کارڈ کی تحریر سے وہ علمیت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

اس نے لکھا تھا کہ آپ نے یہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن یہ ہندو اور انگریز جن کو شکست ہوئی ہے' بڑے کمینے ہیں' اس تقسیم کے وقت احتیاط برتیے' پتہ نہیں یہ کیا کر گزریں۔ کارڈ کو سامنے رکھ کر آپ اس بات پہ بیٹھ گئے اور کہا کہ ''میں نے تم لوگوں سے کہا ہوا ہے کہ کسی کی بات کو بھی ایسا نہ سمجھو کہ توجہ نہ دی جاسکے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ گاؤں کا ایک دہقانی ہے' وہ کتنی بڑی چیز کہہ گیا ہے کہ جنہیں شکست ہوئی ہے' انتقام لیں گے''۔ یہ ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ❸ (3:159)۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ ذہنیت قرآن بتا رہا ہے کہ یہ جو خود پسندی اور رعونت کی وجہ سے فرعون بن جاتے ہیں' کسی اور کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے' اور عقلِ کل بن جاتے ہیں' یہاں قرآن اس ذہنیت والوں کے متعلق بتا رہا ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ یہ کچھ کر رہے ہیں' کہ وہ بتا رہے ہیں' یہ ہو رہا ہے اور وہ مذاق کر کے چلے جاتے ہیں' کہ جا بے ❹ جا۔ لہٰذا یہاں یہ بات تھی جو قرآن نے واضح کرنی تھی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کہانیاں نہیں کہتا۔ وہ تو ہمیں کچھ سمجھانے کے لیے اس زمانے کی بات کرتا ہے۔ ''دھئے نی! توں گل سن۔

-----

❶ محمد علی جناحؒ (1876-1948)

❷ تحریر (Hand Writing)

❸ معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔162)۔

❹ چل بے چل

نو ہے نبی! توں کن کر ❶ ۔ یہ قصہ کسی کشتی بنانے کا اور حضرتِ نوحؑ کا نہیں ہے' یہ آج کا بھی قصہ ہے۔ اب ہم آگے چلیں۔ یہاں تو ہم جلدی سے یوں گزر جائیں گے۔ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُکْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَکَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ❷ (23:27) پھر کہہ دیا کہ اس کشتی کے اندر یہ جتنے بھی اِدھر اُدھر کے تمہارے پاس یہ جانور وغیرہ ہیں' ان کے دو دو جوڑے اس کے ساتھ رکھ لو۔ نئی جگہ جانا ہے۔ وہاں ابھی نئی آبادی ہوگی۔ وہاں جا کر نئی زندگی شروع کرنا ہوگی۔ اندازہ لگائیے وحی کیا آتی ہے! اس کے ساتھ یہ وحی آ رہی ہے۔ اگر وہاں وہ چیزیں نہ ہوتیں اور وہاں تم نے نئی زندگی بسر کرنا ہے تو اس لیے یہ کچھ یہاں سے ساتھ لے جاؤ۔ کہا کہ میں آج یہ کہہ رہا ہوں کیونکہ سیلاب آنے والا ہے' یہ کچھ کر لو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اس کشتی کے اندر جو تیرے ''اہل'' میں سے ہیں ان کو بھی ساتھ رکھو۔ وہ بچا لیے جائیں گے۔ یہ اگلی بات ہے جو قرآن کہتا ہے کہ جو تیرے ''اہل'' میں سے ہیں انہیں بچا لیا جائے گا۔ آگے کہا کہ وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (23:27) اور دیکھنا ایسا کرنے سے تمہارے دل نہ پسیج جائیں کہ جن کے ساتھ ذرا کچھ زیادہ تعلق ہے اس کی بابت کہنے لگ جاؤ کہ یا اللہ! اسے نہ مار۔ یہاں قرآن نے ظَلَمُوْا ❸ (23:27) کہا ہے۔ سوال ہی نہیں ہے' جو بھی ظالم ہے وہ سارے یکساں ہو جاتے ہیں' پھر اس کے بعد ایسی بات نہ کرنا اور فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَکَ عَلَی الْفُلْکِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (23:28) جب تم اس کشتی میں بیٹھ جاؤ اور ان ہچکولوں کے اندر بھی اس کا توازن برقرار ہو جائے تو اس کے بعد پھر یہ کہنا کہ قابلِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہمیں اس ظالم قوم کے پنجۂ استبداد سے نجات دی۔

کسی چیز سے بچ جانا کافی نہیں ہوتا

یہاں تو صرف یہی چیز ہے کہ وہ اس سیلاب سے بچ گئے۔ یہ حصہ لا ہے۔ بچ جانا ہی کوئی بات نہیں تھی کہ کشتی میں وہاں سے نکل آئے۔ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (23:29) اور اس کے ساتھ پھر یہ کہنا کہ یا اللہ! وہاں سے تو نے ہمیں نجات تو دی' اب وہاں جا کر اتار جہاں زندگی' اس کی ضروریات اور آسائش' یہ ساری میسر آ جائیں۔ گویا دو چیزیں ہو گئیں:

---

❶ کہے بیٹی کو اور سنائے بہو کو۔

❷ پھر جب طے شدہ پروگرام کے مطابق پانی کے چشمے جوش مارنے لگیں (اور سیلاب امڈ آئے) تو کشتی میں ہر (ضروری) شے کے دو دو جوڑے ساتھ رکھ لو اور اپنے رفقاء کو بھی اس میں بٹھا لو بجز اس کے جس کے کفر و عدوان نے پہلے ہی سے بتا رکھا ہے کہ وہ تمہاری جماعت میں شامل نہیں ہوگا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 177)

❸ جنہوں نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 177)

ایک تو یہ کہ اس تباہی سے بچ جانا مگر صرف بچ جانا ہی تو کوئی کامیابی کی چیز نہیں ہے۔ اگلی چیز یہ ہے کہ نئی زندگی میں بھی ان ساری آسائشوں کا میسر آ جانا۔ وہ حصہ لاتا جسے بچ جانا کہا ہے لیکن اگر وہاں بھی یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو پھر؟ لہٰذا ہمیں یہاں یہ کہا گیا ہے کہ کسی عذاب سے بچتے وقت یہ بھی سوچو کہ یہاں سے نکل جانا ہی مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس نکلنے کے بعد پھر اگلی مستقبل کی زندگی کس قسم کی ہوگی۔ سو انسان یہاں بھی مار کھا جاتا ہے۔ بعض اوقات آدمی قدم اٹھاتا ہے اور فوری قدم اٹھاتا ہے کہ یہاں سے تو کسی طرح سے چھٹی ہو لیکن اگر آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے تو پھر یہ کتنی بڑی تدبیر کرتا ہے اس لیے کہا کہ بچنے کی ترکیب تو کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچو کہ اس بچنے کے بعد پھر جہاں جاؤ گے تو وہ مستقبل کس قسم کا ہوگا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا کیا چیزیں کہتا چلا جاتا ہے۔ یعنی یہ سوچنا کہ پہلے کسی چیز کو تباہ و برباد کرو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ یہ ایک غلط تدبیر ہے۔ لہٰذا غلط کو توڑنے سے پہلے یہ بھی سوچو کہ اس کے بعد مستقبل کیسا ہوگا۔ سمجھدار انجینئر یا مکان والا وہ ہوتا ہے جو پرانے بوسیدہ مکان کو گراتا ہے تو پہلے نقشہ بناتا ہے کہ جب اس کو گرا لیا جائے گا تو پھر اس خالی زمین پر کیا بنے گا' کیا یہ اس قابل بھی ہوگی کہ اس پر پھر کوئی نئی عمارت بن سکے؟ وہ پہلے یہ سوچتا ہے' پہلے اس کا نقشہ بناتا ہے' جب وہ پرانی شکستہ عمارت ابھی اس کے اوپر کھڑی ہوتی ہے تو وہ نقشہ بناتا ہے کہ جب اس کو گرا دیا جائے گا تو اس سفید زمین کے اوپر مستقبل کا نقشہ کس قسم کا استوار ہوگا' عمارت کیسی استوار ہوگی۔ یہاں یہ چیز کہی گئی ہے کہ صرف یہی نہ کہو کہ یہ جو تباہی ہے' اس سے بچ جانا ہے' ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ اس کے بعد جو زندگی ہے وہ کس طرح سے بابرکت گزرے گی۔

قرآنِ حکیم میں ''آیات'' کا مفہوم

قرآن حکیم نے یہ بات کہانی کی طرح نہیں کہی جیسے بچے دادی اماں سے رات کو سونے کے لیے کہتے ہیں کہ وہ کہانی سنائے۔ بچے سونے کے لیے کہانی سنتے ہیں مگر وحی خداوندی تو آپ کو جگانے کے لیے سناتی ہے۔ لہٰذا کہا کہ ان فی ذٰلک لاٰیٰت (33:30)۔ یہ جو ہم نے بات کہی ہے اس میں کہانی کی بات کہیں نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کے عربی زبان کے لفظ ''آیات'' سے' کسی ظاہری نشان سے' اس کی حقیقت تک پہنچنا ہوتا ہے مثلاً دھواں اس بات کی آیت ہوتا ہے کہ یہاں نیچے آگ ہے' اسی طرح صحرا میں کتے کی آواز سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بستی ہے' کہیں پرندہ اڑتا ہوا نظر آئے تو پتہ چلتا ہے کہ اردگرد پانی ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں' جو حقیقت تک پہنچاتی ہیں' انہیں عربی زبان میں ''آیات'' کہتے ہیں۔ یہ قرآن آیات دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (13:3)۔ ان سمجھنے سوچنے غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے کتنی بڑی نشانیاں ہیں کہ صحرا میں پرندہ نظر آئے تو دیکھ آئے

کہ یہاں کہیں پانی ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ (23:30)۔تمہارے لیے یہ محکم گیری کی نشانیاں ہیں۔ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ قوموں میں یوں گردشیں آیا کرتی ہیں۔

نوعِ انسانی میں نسلی امتیاز کی بنیاد قبیلے کی صورت میں اُبھری اور پاکستان کی مثال

عزیزانِ من! اب یہاں دوسری چیز آتی ہے اور وہ بڑی اہم ہے۔آپ پھر اس نکتے کی طرف آجایئے کہ نوعِ انسانی عالمگیر برادری کی حیثیت میں رہتی تھی۔اسمیں کوئی تفریق نہیں تھی' کوئی تقسیم نہیں تھی' پھر اس میں اختلافات پیدا ہو گئے' تو وہ بٹ گئی۔قرآن نے کہا ہے کہ پہلا اختلاف قبیلے کی شکل میں آیا ہے۔اس طرح قبیلہ نسلی امتیاز کی ابتدا ہے۔اس میں پہلی چیز تو بیٹا ہوتا ہے۔اس کے بعد اس بیٹے کا بیٹا آتا ہے یعنی اب یہ دو انسان اکٹھے نہ رہے بلکہ یہ اِس کا بیٹا ہوا' اور وہ اس کا بیٹا۔پھر اس بیٹے سے آگے شاخ چلی۔اسی سے خاندان بنا۔اسی سے قبیلہ بنا۔ ذرا اس سے آگے کے زمانے میں اسے ہی قبیلہ کہتے تھے۔اب یہاں نسل کے امتیاز سے ایک دادا ہے۔وہاں تک تو کوئی تفریق نہیں تھی۔اب اس کے بعد دو بیٹے (Sons) ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ یہ Biologically (حیاتیاتی انداز سے) اُن کے بیٹے ہونے ہیں لیکن اگر ان کے ہاں جو بیٹے ہوئے ہیں یا آگے' ان بیٹوں کے آگے بیٹے سے جو اولاد چلی' تو یہ دو الگ مستقل انسانیت کی بالذات' تفریق ہو گئی۔یہ اِدھر گروہ بن جائے وہ دوسرا اُدھر گروہ بن جائے اور پھر ان دونوں کے الگ الگ مفاد ہو جائیں' ان میں تصادم ہو تو یہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔یعنی بات تو ایک دادا کے دو بیٹوں کی اولاد سے چلی تھی اور آج یہ ساری دنیا کی قومیں بن گئیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ نسلی اعتبار سے جو قومیں بنیں وہ پہلا قدم ہے۔آگے قرآن بتاتا ہے کہ وطنی اعتبار سے بھی جو قومیں بنتی ہیں' ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔انسانوں میں جو پہلی تفریق ہوئی ہے' وہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ معاشرے کے اندر طبقاتی امتیاز سے ہوئی ہے۔یہ جو بڑے بڑے سردارانِ قوم ہیں' جن کے گھر بھرے ہوئے ہوتے ہیں' وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور کام کرنے والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔یہ پہلی تفریق ہے۔دوسری تفریق نسلی آتی ہے۔اب یہاں سے پہلی وحی کی ابتدا ہوئی تھی۔انسانیت کی تقسیم یہاں سے شروع ہوئی ہے۔

اب یہ دیکھیے پہلا نبی علیہ السلام ہے اور پہلی قوم ہے جس کی داستان سنائی جا رہی ہے۔ بات قرآن کریم نے یہ کہی ہے کہ یہ تفریق نسل کے اعتبار سے ہوئی ہے۔اسے ہی قرآن نے کہا تھا کہ ابلیس تمہارے کان میں یہ پھونک مارے گا کہ یہ میرا بیٹا ہے' یہ اس کا بیٹا ہے۔یہ جو کچھ میرا ہے یہ میرے بیٹے کو دو اور وہ جو اس کا ہے وہ اس کے بیٹے کو دو' خواہ تمہارا بیٹا بھوک سے مر رہا ہے۔اس میں ''تمہارا بیٹا ہے اور یہ میرا بیٹا'' بڑا ہی اہم ہے۔اس کے بعد آگے یہ شاخ چلی کہ یہ میرا قبیلہ ہے' یہ ان کے ہاں کا قبیلہ ہے۔یہاں سے بات شروع ہوئی۔

دیکھیے قرآن نے کیسے یہ واضح کیا کہ انسان نے کس طرح پہلے دن سے قومیت کا معیار مقرر کر دیا' اس کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ عزیزانِ من! آج اس معاملے پر آپ کے ہاں سر پھٹول ہوتا ہے۔ آپ ان کو تو چھوڑ دیجیے جنہوں نے وطنیت اور جغرافیائی تقسیم اور قوموں کا معیار اس طرح خطے کو قرار دیدیا یا نسلوں کو قرار دیا' حالت تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں قرآن کی حامل قوم بھی اسی کو معیارِ قومیت سمجھتی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ساری لڑائی اس Issue (مسئلے) پر تھی۔ نیشنلسٹ علما یہ کہتے تھے کہ ایک خطہ زمین' ایک Territory (علاقہ)' ایک وطن کے اندر رہنے والے مسلم و غیر مسلم ایک قوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مطالبہ پاکستان کے مدعی یہ کہتے تھے کہ اسلام میں یہ بات نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے' یہ جو ایمان کا اشتراک ہے' یہ جو دین کا اشتراک ہے' اس کی بنا پہ قومیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ قرآن آیا ہی اس گروہ کے لیے تھا اور قرآن تو بہت آخر میں آیا۔ عزیزانِ من! خدا کی طرف سے پہلی وحی یہی کہنے کے لیے آئی تھی اور کس حسین انداز میں یہی چیز بتا رہی ہے۔ یہی کچھ سورۃ ھود' اور اس سورۃ' میں کہا گیا ہے کہ خدا نے یہ کہا تھا کہ اے نوحؑ! ہم تمہیں اور تمہارے اہل کو بچا لیں گے۔

اہل کا یہ لفظ ہمارے ہاں بھی اہل و عیال کے لیے بولا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ''اہل'' میں نسلی امتیاز کے سوا اور کوئی نہیں آتا یعنی میرے اہل و عیال۔ اس کے بعد عیال تو آگے اولاد کے لیے اور اہل بنیادی طور پہ بیوی کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بیوی کو اہلیہ کہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اہل میں کیا تصور تھا۔ ابتداً خدا نے نوح علیہ السلام سے یہ کہا کہ ہم تیرے اہل کو بچا لیں گے۔ اب قرآن ایک بڑی اہم بات بیان کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں بیٹھ گئے۔ اپنے ساتھ جماعتِ مومنین کو بھی لا دلیا۔ اب یہ جو آیت (11:41) ہے' اسے اپنے سامنے رکھ لیجیے۔ اس کے بعد ہم آگے چلیں گے۔ پہلے میں (11:42-43) آیات کو ہی پیش کروں گا۔ درمیان میں جو کچھ ہے وہ میں بیان کر جاتا ہوں۔ حضرتِ نوح کشتی میں تھے۔ بہت تباہیوں والا سیلاب آ گیا' آپ نے اپنے بیٹے (Son) کو آواز دی کہ آ جاؤ بیٹے! کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ بیٹے نے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہتا۔ میں کہیں اور پناہ لے لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ او سیلاب بے بہا ہے' اس میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس نے کہا کہ کچھ بھی ہو' میں تمہاری جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا' تمہارے ساتھ نہیں آ سکتا۔ اس کا بڑا خوبصورت انداز ہے کہ بیٹے نے یہ بات کہی۔ اس کے بعد نوحؑ کچھ اور ہی کہنے والا تھا کہ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ (11:43) اتنے میں ایک اتنی بڑی موج درمیان میں حائل ہو گئی کہ بات آگے ہو ہی نہ سکی۔ کیا انداز ہے۔ بات کو ختم کرنے کا صاحب! گفتگو کو Aggressively (جارحانہ انداز سے) ختم نہیں کیا۔ کہا کہ موج حائل ہو گئی' بیٹا جو ڈوبا' قوم بھی ڈوبی' کشتی آگے چلی' کشتی منزل پہ پہنچ گئی' سلامتی سے اتر آئے۔

بیٹے کے ڈوبنے پر حضرت نوحؑ کے استفسار پر خدا تعالیٰ کا جواب

اب یہاں آپ یہ بات دیکھیے کہ حضرتِ نوحؑ کے ذہن میں خیال کیا آیا؟ قرآن کہتا ہے کہ **وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ** (11:45) نوحؑ نے اپنے رب سے کہا کہ جرأتِ عرض معاف ہو تو ایک بات پوچھ لوں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اے نوحؑ! جو تیرے اہل ہیں، ہم ان کو بچالیں گے اور **فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ** (11:45) کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میرا بیٹا تو سب سے پہلے میرے اہل میں سے تھا۔ اسے کیوں نہیں بچایا گیا؟ اب آگے یہ بات آئی ہے کہ **وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ** (11:45) تیرے وعدے تو ہمیشہ سچے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوگئی کہ تو نے تو وعدہ کرلیا تھا کہ تیرے اہل کو بچالوں گا مگر وہ تو ڈوب گئے۔ بیٹے سے زیادہ میرا قریبی اہل اور کون ہوسکتا ہے، وہ سامنے ڈوب گیا۔ تیرے وعدے تو سچے ہوا کرتے ہیں پھر یہ کیا ہوا؟ ویسے تو **اَنۡتَ اَحۡکَمُ الۡحٰکِمِیۡنَ**[1] (11:45) ہے۔ میں یہ بات کہہ دیتا ہوں کہ تو سب سے بڑا حکم ہے۔ میں یہ بات پوچھتا ہوں کہ جب تو نے وعدہ کیا تھا، تو وہ وعدہ کیوں نہ پورا کیا۔ پوچھنے کی یہ بات کوئی قابلِ اعتراض نہ تھی۔ قرآنِ کریم میں خدا نے اپنے وعدوں کے متعلق خود کہا ہے کہ **لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ** (13:31) ہم کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے اور ایک جگہ کہا ہے کہ **عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡئُوۡلًا** (25:16) بفرضِ محال اگر کوئی ہمارا وعدہ بھی تم دیکھو کہ پورا نہیں ہوا تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ ہم سے بھی پوچھو کہ وعدہ کیا تھا، تم نے اسے پورا کیوں نہیں کیا۔ عزیزانِ من! ''رب بنا اینوں سجدا ہیگا''[2] کہ جی! آپ نے تو یہ Promise (وعدہ) کیا تھا، اس کے متعلق کیا ہوا؟ کیوں پورا نہیں ہوا؟ وہاں بڑی گستاخی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اور تو اور اگر تمہاری زندگی میں کبھی ایسا ہو کہ خدا کا وعدہ بھی پورا نہ ہو، تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو۔

تشکیلِ قومیت کا ابتدائی فارمولا اور غیر متبدل اصول

حضرت نوح علیہ السلام نے اس لیے پوچھا تھا کہ آپ نے تو وعدہ کیا تھا۔ سنیے، عزیزانِ من! جو میں نے عرض کیا ہے کہ پہلی وحی آرہی ہے، پہلا نبی علیہ السلام ہے، پہلی داستان بیان ہورہی ہے اور اصول کیا بیان ہورہے ہیں؟ تشکیلِ قومیت کا اس زمانے میں اصول بیان ہورہا ہے، جب نسل کے سوا کوئی دوسری چیز اپنے اور بیگانے کے درمیان ذہن میں نہیں آیا کرتی تھی۔ قبائلی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ حضرتِ نوحؑ کے ذہن میں بھی یہ صحیح خیال آیا تھا کہ میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بیٹے سے زیادہ بڑا اہل کیا ہوسکتا ہے۔ کہا کہ اے نوحؑ! سمجھنے میں

---

1. اور تیرے اوپر کوئی حاکم بھی نہیں جو تیرے فیصلوں کو بدل دے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 502)۔
2. رب بننا اسے ہی جچتا ہے۔

غلطی کر رہے ہو۔ بیٹا Biologically (حیاتیاتی طور پر) بیٹا ہوتا ہے۔ تیرے ذہن میں اپنے اور بیگانے کا معیار یہ ہے کہ جو حیاتیاتی طور پر تمہارا بیٹا ہے وہ تمہارا ہے' تمہارا اہل ہے لیکن معیارِ خداوندی تو کچھ اور ہے۔ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (11:46) کہا کہ اے نوحؑ! وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ تو سمجھتا ہے کہ بیٹا صرف بیٹا ہونے کی حیثیت سے میرا ہے اور وہ اپنے اہل میں سے ہے' جب کہ یہ بات ہی غلط ہے۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (11:46) ۔ یہاں تو اپنے اور بیگانے کا معیار جو ہے وہ تو عملِ صالح اور عملِ غیر صالح ہے' یہاں معیار کفر اور ایمان ہے۔ لہٰذا جو معیار ہے' وہ تو یہ ہے۔ جو اس میں شریک ہو وہ تمہارا ہے۔ یہ سارے جو تمہارے ہاں کشتی میں آ گئے' ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ جو حیاتیاتی طور پر (Biologically) تمہارا اپنا ہو لیکن یہ سارے تمہارے "اپنے" تھے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم جو تمہارے اپنے ہیں' انہیں بچالیں گے اور یوں لفظ اہل آ گیا۔ تمہارے ذہن میں اپنے اور بیگانے کا جو معیار تھا' وہ طبعی معیار تھا۔ ہمارا معیار اس سے مختلف ہے۔ ہمارا معیار تو یہ ہے کہ نوحؑ کا بیٹا بھی اگر ایمان کے اس اشتراک میں نہیں آتا' تو اہل میں سے نہیں ہے' ابراہیمؑ کا باپ بھی اگر اس میں نہیں آتا وہ ابراہیم علیہ السلام کا اہل نہیں ہے' لوطؑ کی بیوی بھی اگر اس میں نہیں آتی تو وہ اہل میں سے نہیں ہے' محمد رسول اللہؐ کے حقیقی چچا ❶ بھی اگر اس میں نہیں ہیں تو ان کے اہل میں سے نہیں ہیں' حضورؐ کے داماد ❷ سے بھی کہہ دیا کہ نہیں' بھئی! بیٹی تمہارے گھر میں ہے' مگر تم میرے اہل میں سے نہیں ہو سکتے۔

عزیزانِ من! آج پوچھا جا رہا ہے کہ صاحب! اسلام نے معیارِ قومیت کیا بتایا ہے؟ معیارِ قومیت یہ بتایا ہے کہ حبشہ کا غلام بلالؓ اپنوں میں سے ہے' حقیقی چچا عباس اپنوں میں سے نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے کہ تم میں اور ہم میں ہمیشہ دشمنی اور عداوت رہے گی۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (60:4) تا نکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔ اب اس معیار پر بیٹا اپنا نہیں' باپ اپنا نہیں' بیوی اپنی نہیں' داماد اپنا نہیں' چچا اپنا نہیں۔ اس کے برعکس حبش کا غلام بلالؓ اپنا ہے' روم کا صہیبؓ اپنا ہے' فارس کا سلمانؓ اپنا ہے۔ یہ تو کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ معیارِ قومیت کی یہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ یہ تو حضرت نوح علیہ السلام سے بات شروع ہوئی تھی' جس میں کہا تھا کہ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (11:46) ۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے واقفیت کی بنا پہ ایسی بات کر دی ہے۔ یہ حقیقت سمجھ لو کہ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (11:46) میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ اس قسم کا سوال پوچھنے سے پہلے ہی یہ پوچھ لیا کرو کہ صاحب! یہ کیوں ہوا ہے؟ یہاں لفظ "اعظ" آیا ہے کہ "میں تمہیں اس بات کی نصیحت کرتا ہوں' جن چیزوں کے متعلق علم نہ ہو اور تم یوں سمجھو کہ یہ ایسا ہے تو پہلے یہ پوچھ لیا کرو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ جو خدا کے راستے پہ

---

❷ یہ اشارہ حضرت عباس کی طرف ہے۔

❸ ابوالعاص' حضرت زینبؓ کے شوہر تھے۔ حضرت زینبؓ نے جہیز کا وہ قیمتی ہار بھی بھیجا تھا جو 25 برس پہلے حضرت خدیجہؓ کو آپؐ نے دیا تھا۔

میرا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے، دوسرے کوئی میرے نہیں ہیں۔ اب آپ دیکھیے گا کہ دوسری کتنی ان گنت بنیادی تفریقات ہیں۔ یہاں ایک قصہ نوحؑ میں، پہلی وحی، پہلی قوم، پہلا نبی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قوم کیسے مٹ گئی۔ ہم آج تک یہی سمجھتے رہے کہ سیلاب آیا تھا تو کشتی بنائی وہ اس میں بچ گئے۔ مگر قرآنِ کریم نے انسانیت کی جو دو بنیادی تفریقات تھیں، ان کی تو جڑیں کاٹ کے رکھ دیں۔ نسلی امتیاز پر اپنے اور بیگانے کے اندر جو تفریق پیدا ہوئی، اس نے انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

نسلی امتیاز کے سلسلہ میں ہمارا اپنا باہمی برتاؤ

عزیزانِ من! ہم دوسروں کے ہاں کیوں جائیں کہ انہوں نے اپنے ہاں کیا کیا؟ یہ کہ محض شودر کے گھر میں پیدا ہونے سے ساری عمر شودر، برہمن کے گھر میں پیدا ہونے سے ساری عمر برہمن ہوتا ہے۔ ان پہ تو ہم اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے انسانیت کو ورنوں میں تقسیم کر دیا۔ آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ پتہ نہیں کہ وہ سید تھا بھی یا نہیں، مگر سید کے گھر میں پیدا ہونے والا سید ہے۔ ہم ساری عمر یہ فخر سے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ صاحب! کیا فخر ہے اس کے اندر کہ تم اس کے گھر میں پیدا ہوئے؟ کیا اس میں کسی پیدا ہونے والے بچے کی کاریگری ہے کہ وہ اس گھر میں پیدا ہو گیا؟ ساتھ ہی کے گھر کے اندر وہ جولاہا ہے، معاف رکھیے گا میرا مطلب یہ نہیں کہ میں ان کی تضحیک کرتا ہوں، میں عام معیار کے مطابق کہتا ہوں کہ ساتھ ہی گھر کے اندر وہ موچی ہے۔ اس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ وہ بچہ ناکردہ گناہ گار ہے۔ ساری عمر بیچارہ اسی بے عزتی کی زندگی بسر کر رہا ہے، موچی ہے موچی کا پتر۔ کون ہے جی؟ ''او تے موچی دا پتر اے نا۔''[1] چل بھئی! معاملہ ختم ہوا۔ یعنی اب اس کے بعد اس کی اپنی حیثیت کوئی نہ رہی۔ یہ جو آپ سوچ رہے ہیں کہ سید عبدالحکیم صاحب کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس میں کوئی ایسی فخر کی بات نہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر جناب موچی کے گھر میں پیدا ہو گئے تو کیا آپ اپنے نام کے ساتھ ساری عمر موچی عبدالحکیم لکھتے ہیں؟ نہیں، کبھی کسی نے نہیں لکھا بلکہ وہ تو چھپاتے پھرتے ہیں۔ کچھ اور نہیں مانا جاتا تو اپنے ساتھ آج بھی وہ قریشی لکھ دیتے ہیں۔ جو کفر ہے، قرآن نے پہلے دن اس کی جڑ کاٹ دی۔

عزیزانِ من! دنیا کی قوموں کو تو چھوڑیئے کہ وہ تو جاہل قومیں تھیں۔ اس قوم کو لیجیے جو اس قرآن کے وارث ہونے کی مدعی ہے۔ اس قوم کی بھی آج یہ کیفیت ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے جو تفریق پیدا ہوتی ہے زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔ پھر مجھے اس بات پر اعتراض ہو رہا ہے کہ صاحب! وہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والے کو برہمن سمجھتے ہیں مگر اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہو رہا کہ سادات کے گھر میں یہ کیا چیز ہے، جس کی نسبت سے اپنے آپ کو سید کہا جاتا ہے۔ حضورؐ کو خود صحابہؓ نے ''یا سیدی'' کہہ کر پکارا، تو آپؐ نے کہا: کیا

---

[1] وہ تو موچی کا بیٹا ہے۔

کہہ رہے ہو‘ سید تو صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے‘ میں تو تمہارے جیسا ایک بشر ہوں‘ جس کی حیاتِ طیبہ میں حجۃ الوداع کا آخری خطبہ یہ تھا کہ ’’یاد رکھو! عجم اور عرب کی تمیز‘ گورے اور کالے کی تفریق‘ جنسی تفریق‘ آج تمام تفریقات میں نے اپنے پاؤں کے نیچے مسل کے رکھ دی ہیں۔ تفریق صرف کفر اور ایمان کی ہے‘‘۔ اس ذاتِ اقدس واعظم کا فخر سے نام لینے والے اور اپنے آپ کو اس کی اولاد میں سے کہنے والے یہ دیکھیں کہ ان ﷺ کی اپنی یہ کیفیت ہے۔ معلوم نہیں آپ لوگوں کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں‘ میرے پاس اب بھی یہ سوالات پوچھنے کے لیے آتے رہتے ہیں کہ صاحب! وہ کہتے ہیں کہ غیر سید‘ سید زادی سے شادی نہیں‘ نکاح نہیں کر سکتا ہے‘ کہیں آپ کے علم میں بھی یہ بات ہوگی۔ ہمارے ہاں گاؤں میں تو اب بھی یہ صورت ہے کہ سید زادی کی شادی غیر سید کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جی! سید زادی سے کسی غیر سید کی شادی نہیں ہو سکتی!! ہر شادی کے وقت پہلی چیز یہ دیکھی جاتی ہے کہ ’’ذات کیہڑی ہے جی‘ برادری کیہڑی اے؟‘‘[1] یہ اس قوم کی حالت ہے جس میں خدا نے پہلے نبی سے پہلی وحی میں یہ کہہ دیا تھا کہ یہ کیا تفریق کہہ رہے ہو۔ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ وہاں تو سوال ہی یہ ہے کہ جس نے بھی یہ تسلیم کر لیا‘ اس صداقت کا اقرار کر لیا‘ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیا‘ اس کے بعد تو تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ اس ایک ہونے کے یہ معنی ہیں۔

عزیزانِ من! پہلی تفریق آپ نے دیکھ لی۔ یہ دو چیزیں ہیں جن کے متعلق کہا تھا کہ ہم نے نبی اس لیے بھیجے تھے کہ انسانوں نے جو اپنے اندر اختلافات پیدا کر لیے تھے‘ وہ ان کو مٹائیں۔ پہلے ہی نبی کی یہ دو چیزیں قرآن سامنے لے آیا ہے یعنی نسلی تفریق‘ جس نے ذاتوں‘ برادریوں‘ قوموں اور نسلوں کی شکلیں اختیار کر لیں اور دوسری معاشرے کے اندر دولت کے اعتبار سے طبقاتی تقسیم کو وجہ تکریم و تحقیر قرار دیا۔ سو قرآن حکیم نے ان دونوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور آج دونوں ہی چیزیں آپ کے ہاں ثبت ہیں۔ عزیزانِ من! وہ نکاح شادی کی بات ہی نہیں ہے۔ آج بھی آپکے ہاں یہ جو کمی‘ کام کرنے والے ہیں‘ یہ جو موچی‘ نائی‘ کنجڑے اور دھوبی ہیں اور یہ جو دوسرے ان کو اپنے برابر نہیں سمجھتے ہیں‘ یہ جرم تھا۔ حضرتِ نوحؑ کی قوم کا بھی تو یہی جرم تھا‘ جس کے لیے اُسے غرق کر دیا گیا۔ اب غرق کرنے کے بھی قدرت کے طریقے الگ ہوتے ہیں۔ اُس دور میں تو صرف پانی کا سیلاب ہی غرق کرتا تھا۔ آج اس قسم کی تفریق کرنے والی جو قومیں ہیں‘ آپ دیکھیے کہ آج دنیا میں قوموں کی قومیں ذلت و رسوائی کے سیلاب میں غرق ہیں۔ آپ کی یہ قوم جو خالص ایمان کی بنا پر پاکستان میں ایک قوم بنا کر لائے تھے‘ اس قوم کے اندر یہی تفریق ہے‘ جو نوحؑ کے زمانے کی تفریق تھی۔ کہیں نسلی امتیاز‘ کہیں برادریوں‘ ذاتوں اور گوتوں کے امتیازات کے اس سیلابِ بے پناہ نے آپ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ کشتی کے ذریعے تو سیلاب سے بچ سکتے تھے لیکن

---

[1] ذات (Caste) کیا ہے اور برادری کونسی ہے؟

ہم اس سیلاب سے تو بچ ہی نہیں سکتے۔ فرق یہ ہے کہ وہ آسان تھا: ایک دفعہ سیلاب آیا' بات ختم ہوگئی' لیکن یہ جہنم کا عذاب ہے۔ اس کے متعلق تو قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی (20:74) زندگی تو اس میں ہوتی نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت بھی اس میں نہیں آتی۔ آپ سوچتے ہیں کہ کس عذاب میں ہم جی رہے ہیں؟ سوچتے ہیں کہ سیلاب کی وجہ کیا ہے؟ ہر وقفے کے بعد' جب بھی آپ کے ہاں کہیں انتخابات ہوتے ہیں' وہ برادریوں کی بنا پر ہوتے ہیں' جتھے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

پہلی وحی کی اصولی ہدایت اور راہنمائی

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں دوسروں پہ تنقید نہ کیجیے۔ اپنے دل میں جھانک کر دیکھیے کہ ہمارے ذہن میں بھی کبھی یہ آتا ہے کہ یہ موچی واجب التکریم پیدا ہوا ہے۔ یہ پہلی وحی ہے۔ قرآن یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ انسان واجب التکریم پیدا ہوا ہے۔ خواہ وہ موچی ہو' کنجڑا ہو' خواہ وہ امیر ہو یا غریب' سیاہ ہو یا سفید' مرد ہو یا عورت۔ وہ پیدائش کے لحاظ سے قابلِ عزت وتکریم ہے۔

قرآن حکیم میں کوئی بات بھی مافوق الفطرت نہیں ہے

اب اگلی چیز بڑی اہم ہے کہ یہ سیلاب سے کیوں نہ بچ گئے۔ پہلی چیز تو آپ نے یہ دیکھی کہ جنہیں سیلاب سے بچایا گیا ہے' وہ کوئی فوق الفطرت (Supernatural) بات نہیں کی گئی یعنی یہ جو ایمان والی جماعت تھی اور ان میں ان کا نبی علیہ السلام بھی موجود تھا' تو انہیں کسی اور طریقے سے اس لیے نہیں بچایا کہ یہ بڑے نیک بخت لوگ ہیں۔ ان نیک بختوں کے سربراہ سے کہا گیا کہ سیلاب سے بچنا چاہتے ہو تو کشتی بناؤ۔ کشتی کے ذریعے بچ سکتے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ یہ نیک بخت' جنہیں ہم صاحبِ ایمان کہتے ہیں' خدا کی طرف سے دی ہوئی Directions (ہدایات) پہ ایمان لاتے ہیں اور پھر اس کے مطابق کشتی بنانے لگ جاتے ہیں تو ان کی اس میں نجات ہو جاتی ہے۔ اگر یہ اتنی سی بات نہیں ہے تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا تسبیح لی جائے اور دس ہزار مرتبہ روز پڑھا جائے کہ ''کشتی میں بیٹھنے سے نجات ہوتی ہے' کشتی میں بیٹھنے سے نجات ہوتی ہے' کشتی میں بیٹھنے سے نجات ہوتی ہے''؟ اور اگر سیلاب کا عذاب آیا ہوا ہے تو کیا کریں؟ کہ جی! ''کوٹھے تے چڑھ کے بانگاں دیا کرو''۔ [1] اس کے لیے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے علاج یہ بتایا گیا کہ اس سے بچنے کے لیے تم کشتی بناؤ۔ انہوں نے کہا کہ جی' ہمیں کشتی بنانے کا پتہ نہیں؟ ہم نے کہا کہ ہم بتائیں گے کہ کیسے بناؤ۔ مگر کشتی بناؤ' نہیں بناؤ گے تو بچو گے نہیں' ڈوب جاؤ گے۔

---

[1] مکان کی چھت پہ کھڑے ہو کر اذانیں دیا کرو۔

انسانی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ طبعی اسباب کی شکل میں سامنے آتا ہے

برادرانِ عزیز! یہ بڑا ہی اہم سوال ہے کہ قرآن جرائم تو اس قسم کے گناتا ہے اور ان کے بعد ان کی جو تباہیاں ہوتی ہیں وہ طبعی اسباب کے ماتحت ہوتی ہیں یہ کیوں؟ مثلاً ❶ یہاں سیلاب سے ہوئیں' کہیں ایک جھکڑ ❷ چلا اس سے ہوگئیں' کہیں آتش فشاں پہاڑ تھا' اس کے دامن ❸ میں اس کے لاوے سے ہوگئیں۔

قوم سبا ❹ کے متعلق کہا کہ انہوں نے بہت بڑا ڈیم بنایا تھا۔ یہ ان کی ایک بڑی عجیب داستان ہے۔ کہا کہ انہوں نے اپنی زرعی

---

❶ یہاں قومِ نوح علیہ السلام کی تباہی کی طرف اشارہ ہے۔

❷ یہ اشارہ قوم عاد کی تباہی کی طرف ہے۔ یوں سمجھیے کہ قوم نوح علیہ السلام کی بربادی کے بعد جب یہ علاقے دوبارہ آباد ہوئے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی تھی۔ یہی قوم عاد ہے جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بعثت وتبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طول و عریض ریگستان' جسے اب رُبع خالی کہا جاتا ہے' احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہِ تمثال ریت کے ٹیلے' خوف ودہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اُڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو' اسے اسطرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر وہاں محکمہ آثار قدیمہ والے ہی اس کا سراغ لگائیں تو پتہ چلے۔ یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے' اِلَّا ان کے جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچا لیے گئے اور پھر عادِ ثانیہ کہلائے۔ (ماخوذ از پرویزؒ۔ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ ص ص۔ 45-44)

❸ یہ اشارہ قوم ثمود کی طرف ہے جنکی طرف صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اس کا زمانہ 250 ق م سے 1600 ق م کا ہے۔

❹ ''اس قوم کا مسکن جنوبی عرب (یمن کا مشرقی علاقہ) تھا اور مآرب دارالسلطنت (Capital)۔ یہ اس زمانے کی مہذب اور طاقتور قوم تھی تجارت میں بہت آگے تھی۔ زمین زرخیز' قیمتی دھاتیں' جواہرات' ریشم اور بخورات کے مسالے بافراط ملتے تھے۔ ہندوستان کا مالِ تجارت یمن کے ساحل پر جا کر اترتا' وہاں سے یہ لوگ اس سامان کو شام' فلسطین اور مصر تک لے جاتے۔ تجارت اور اس کے ساتھ حکومت' نتیجہ یہ کہ شمالی عرب اور افریقہ تک مختلف آبادیوں پر ان کا تسلط رہا۔ قریب 1100 ق م زمانہ عروج سمجھیے۔ پہلی صدی قبل مسیح یہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اور ان کے کتبات آج تک ان کی مٹی ہوئی سطوت کی زندہ شہادتیں ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور قلعے تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لیے انہوں نے بڑے بڑے بند (Dams) بنا رکھے تھے چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دارالسلطنت مآرب کے قریب تھا جسے سدِ مآرب کہتے ہیں۔ حجاز کے عرب بند (Dam) کو ''سد'' اور عرب یمن ''عرم'' کہتے ہیں۔ یہ بند (Dam) پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اردگرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سرزمین ایک وسیع وعریض باغ بن گئی تھی۔ پہلے یہ بند (Dam) ٹوٹا جس سے شہر تباہ و برباد ہوا اور گردوپیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیریوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا (34:16-17)۔ (پرویزؒ۔ (1993ء)۔ برقِ طور۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص۔ 259)۔

قوم سبا کی ایک شاخ مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے حمیر کہتے ہیں۔ جب رومیوں نے اہلِ سبا کی تجارت کو مٹایا ہے تو حمیر کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا اور بڑی زبردست قوت اور دولت کے مالک بن گئے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نے اپنا لقب ''تبع'' اختیار کیا جس کے معنی حبشی زبان میں (باقی اگلے صفحہ پر)

معاشرت کے تحت اپنی معیشت کے لیے بڑے انتظامات کیے' پانی جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈیم بنائے لیکن اس کے بعد جو انہیں دولت کی ہوس ہوئی تو انہوں نے تجارت کے لیے لمبے لمبے سفر اختیار کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جو ڈیم (Dams) اپنی معیشت کے لیے بنائے تھے' یہ Neglect (فراموش) کر دیئے گئے' ان کی مرمت ہی نہیں کی۔ وہ سارے لوگ تجارت کے لیے چل پڑے کہ اس میں دولت زیادہ ملتی ہے۔ ان کا نبی علیہ السلام آیا' اس نے کہا کہ او کم بختو! تم نے پہلے یہ ڈیم بنالیا ہے۔ اس کے اندر اتنا پانی جمع ہے' اس ڈیم کے متعلق احتیاط برتو' اُس کی مرمت کرتے رہا کرو ورنہ اگر نیچے سے اس کی بنیاد نکل گئی' تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس وقت تمہیں یہ پڑی ہوئی ہے کہ تھوڑا سا مال حاصل کر لیا جائے اور تجارت کے لیے نکل جائیں۔ ہر فرد باہر چلا جا رہا ہے جیسے اب پاکستان میں ہے کہ کوئی کویت جا رہا ہے' کوئی ابوظہبی جا رہا ہے' کوئی لیبیا جا رہا ہے' کوئی سعودی عربیہ جا رہا ہے' ڈاکٹر اُدھر چلے گئے' انجینئر' اِدھر چلے گئے صاحب! چلے جاؤ اور یہاں ڈیم بنا بیٹھے ہو۔ ٹھیک ہے جی! ''آپے غرق ہون گے' جیہڑے ایتھے رہن گے [1]۔'' قرآن یہ بتا رہا ہے کہ نبی علیہ السلام ان سے یہ کہہ رہا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے تو یہ قرآن کیا کتاب ہے! یہ کہتا کیا ہے؟ اب اس نے کہا کہ بارش زور کی آئی۔ سیلاب آیا' پانی زیادہ جمع ہوا' نیچے سے بنیادیں نکل گئیں۔ بند جو ٹوٹا ہے تو اس نے کہا کہ پوچھو نہیں کہ اس کی تباہی کیا ہوتی ہے! ہم نے تو دیکھی ہے۔

طبعی چیزوں کا اخلاقیات کے ساتھ باہمی ربط

اب سوال یہ ہے کہ یہ جو قوم میں طبعی چیزیں ہوتی ہیں اور وہ جو اخلاقی چیزیں ہوتی ہیں ان کا آپس میں ربط کیا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم

(بقیہ حاشیہ) ''سلطان'' کے ہیں۔ یعنی غلبہ واستیلاء اور قوت وجبروت کا مالک۔ یہ خاندان بھی اہل سبا کی طرح شروع میں ''کواکب پرست'' تھا۔ (پرویزؒ: برقِ طور' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1993ء' ص ص۔ 94-293)۔ 1955ء میں ایک امریکن حفریات (Archaeologist) نے ان آثارِ قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کیے تھے۔ اس کی کتاب کا نام Qataban and Sheba ہے اور مصنف کا نام Wendell Phillips ہے۔ ان تفاصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں (34:19)۔ (حوالہ پرویزؒ۔ (1960ء)۔ لغات القرآن جلد دوم۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص۔ 831)۔ اہل سبا کی تاریخ کے حسب ذیل 4 ادوار ہیں: (ا) 650 ق م سے پہلے کا دور' جس میں ملوکِ سبا کا لقب ''مکرب سبا'' تھا' پایۂ تخت ''صرواح'' تھا۔ اس دور میں مآرب کے مشہور ڈیم کی بنیاد رکھی گئی۔ (2) 650 تا 115ء ق م کا دور' جس میں بادشاہ کا لقب ''مَلِک'' تھا' دارالسلطنت مآرب تھا جو سمندر سے 3900 فٹ بلند صنعاء سے 60 میل جانب مشرق ہے۔ (3) 115 ق م تا 300ء تک کا دور' جس میں ''ریدان'' پایۂ تخت تھا جو بعد میں ''ظفار'' شہر کے نام سے مشہور ہوا۔ (4) 300ء کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دور۔ یہ یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ کے زمانہ تک کا ہے۔ (ماخوذ: از Phillibs, Wendell: Qataban and Shaba)

[1] جو یہاں رہیں گے وہ خود ہی غرق ہو جائیں گے۔

سوال ہے کہ قوم معاشرے میں پیشوں اور ذاتوں کی بناپر تفریق کر رہی ہے۔ جو کمین ہیں انہیں ذلیل سمجھ رہی ہے، جو بڑے بڑے ہیں وہ پھنے خاں بنے بیٹھے ہیں۔ یہ سیلاب سے غرق ہو گئے یعنی اخلاقی جرائم میں اور ان میں ربط کیا ہے؟ ربط کے لیے تو عزیزانِ من! زیادہ دور جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ کے ہاں ہر سال سیلاب آتے ہیں۔ اس کے بعد جب آپ تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ جو بند بنایا تھا' اس میں سیمنٹ کی جگہ ریت ڈلی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کی جگہ ریت لگنا اخلاقی خرابی ہے اور بددیانتی ہے۔ اب اگر قرآن کہیں یہ کہدے کہ وہ قوم بڑی بددیانت تھی' اس واسطے سیلاب سے غرق ہوگئی تو بظاہر نظر آئے گا کہ صاحب! بددیانتی اور سیلاب سے غرق ہوجانا' اس میں باہمی ربط کیا ہے؟ ربط باہمی یہ ہے کہ جب کوئی قوم بددیانت ہوجاتی ہے' اس میں رشوت ستانیاں آجاتی ہیں' اس میں استبداد آجاتا ہے' ان کے ہاں پھر دولت کا چکر شروع ہوجاتا ہے' پارٹی بازی شروع ہوجاتی ہے اور ایک دوسرے کی Leg Pulling (فریب دہی) ہوتی ہے۔ جتنے ان کے فرائضِ منصبی ہوتے ہیں وہ ان کی طرف سے بے پرواہ ہوجاتے ہیں' انجینئر اگر جاتا ہے تو وہ ٹھیک طرح سے اس کی نگرانی نہیں کرتا' فرائض منصبی سے چشم پوشی کر لیتا ہے' ''ٹھیکہ دار جو ہے وہ سیمنٹ کی جگہ ریت ہی ٹھوک دیندا ہیگا۔ اونیں اڈھاتے پہلے دتا ہوندا' اوہدے وچوں'' [1]۔ یہ کچھ ہوجاتا ہے۔ اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو کرپٹ (بددیانت) معاشرے ہیں' ان کی تباہیاں مادی ذریعے سے آتی ہیں لیکن اس کی بنیاد ہمیشہ اخلاقی ہوتی ہے۔

جاپان کی مادی دنیا پر اخلاقیات کا اثر

عزیزانِ من! یاد رکھیں، جس قوم کے اخلاق درست ہوں تو انتظامی امور میں ان کے ہاں بند نہیں ٹوٹتا۔ کسی زمانے میں جاپان میں زلزلے سے اتنی تباہی ہوتی تھی' جس کا انتظام دنیا کی کوئی قوم آج تک نہیں کر سکی لیکن انہوں نے اپنے ہاں محنت و کاوش سے ایسے گھر بنا لیے ہیں کہ اب زلزلہ آتا ہے تو آتا رہے' وہ گھر کانپتا رہتا ہے' گرتا نہیں ہے۔ یہ ہے اخلاقی خرابیوں اور طبعی طور پر کسی قوم کے تباہ ہونے کے اندر ربط۔ قومیں طبعی طور پہ ہی تباہ ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! جسے ہم مافوق الفطرت بات کہتے ہیں وہ کہیں نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم میں خدا کہتا ہے کہ **فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (35:43) تم سنت اللہ میں تبدیلی ہرگز نہ پاؤ گے مثلاً سنت اللہ یہ ہے کہ جو قوم اپنے بند پکے سیمنٹ سے بنائے گی' وہ سیلاب سے محفوظ رہے گی۔ پکے سیمنٹ سے بنانے کے لیے دیانتداری اور تکنیک کی ضرورت ہے۔ یہ صلاحیت بھی موجود ہو اور دیانتداری کی یہ چیز بھی ہو تو بند بچ جائے گا۔ یہ چیز نہیں ہے تو بند ٹوٹے گا۔ یہ دوسری چیز' جو ہمارے سامنے آئی ہے' وہ یہ ہے کہ جو قرآن نے بتایا ہے۔ یاد رکھو!

---

[1] ٹھیکیدار سیمنٹ کی بجائے ریت ڈالتا ہے کیونکہ ٹھیکے کی رقم میں سے وہ آدھی رقم تو کام شروع کرنے سے پہلے ہی ادا کر چکا ہوتا ہے۔

حفاظت طبعی طور پر ہی ہوتی ہے۔اس کی پہلی جماعت [1] کو بھی کشتی کے ذریعے سے سیلاب سے بچنا ہوتا ہے۔اسے بچانے کے لیے ہم اسے اٹھا کر نہیں لے جاتے۔یہاں اگر قوم سے کچھ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز کرو تو جواب ہوتا ہے کہ دیکھیے! جی وہ تو ٹھیک ہے مگر خدا کی مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے' اس خدا کی مصلحت سے سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔پھر ہمیں وہ قصے سنا دیئے جاتے ہیں کہ صاحب! میدانِ بدر [2] میں بڑا مقابلہ تھا' تین سو تیرہ ایک طرف تھے' ہزار دوسری طرف تھے۔بڑا سخت مقابلہ تھا۔تین سو تیرہ تو جیت ہی نہیں سکتے تھے' شکست ہو جانی تھی' عین اس وقت بدر کے میدان میں' پھر' رسول اللہؐ نے کنکریوں کی ایک مٹھی لی اور ان کی طرف پھینکی' وہ سارے اندھے ہو گئے۔اب وہ اندھے ہو گئے اور یہ صاحب مارنے لگے:

بھاگے تھے ہم بہت تو اسی کی ہے یہ سزا
ہو کے اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

میں سوچ رہا تھا کہ بات بڑی اہم آ رہی ہے اور آپ کہیں گے کہ درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔بہتر ہے کہ کہہ ہی دوں۔اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ یاد رکھو! کبھی کبھی طوفان بھی ناخدائی کا کام کر دیا کرتا ہے بشرطیکہ طوفان میں گھرے ہوئے اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھیں۔ یہ ہے دونوں کے اندر ربط۔ہاں' بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ جنگِ بدر [2] کو مافوق الفطرت بتایا جا رہا ہے کہ آپؐ نے وہ کنکریاں پھینکیں اور وہ اندھے ہو گئے۔جہاں تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق ہے ہم کسی بات میں بھی نہیں کہتے کہ ناممکن ہے صاحب! اس کا سوال ہی نہیں ہے۔جو اتنے بڑے کُرّوں کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے' وہ یہ کیوں نہیں کر سکتا' لیکن اگلی بات جو اہم ہے' وہ یہ ہے کہ **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (33:21) رسول کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔عزیزانِ من! اگر سوال یہی ہے کہ جب شکست ہونے لگے' کوئی اور صورت نہ رہے تو کنکریوں کی مٹھی مار دیجیے' اگلے اندھے ہو جاتے ہیں۔یہ چیز ہمارے لیے کس طرح نمونہ بن سکتی ہے۔بات یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں مافوق الفطرت طریقے سے ہی ہونی ہیں تو یہ تو ہمارے لیے اسوہ نہیں بن سکتیں۔آج جب بھی کسی سے یہ کہا جائے کہ صاحب! دیکھیے' رسول اللہؐ اور ان کے صحابہؓ کبار دس سال کے عرصے میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے' کتنے ملک فتح کر لیے' کتنی قوموں کو انہوں نے فتح کر لیا' تو کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب! ان کی کیا بات ہے جی' وہ تو آپ دیکھیے وہ تو رسول تھے' صحابہؓ تھے۔سوال یہ ہے کہ قرآن نے یہ جو اسوہ حسنہ کہا ہے تو پھر یہ اسوہ حسنہ کیسے بنے گا؟ ان سے پوچھیے کہ جب وہی رسولؐ وہی صحابہؓ جنگِ احد [3] کے اندر پہاڑی پہ کھڑے تھے' وہاں ایک تکنیکی غلطی ہوئی حتیٰ کہ فتح مبدل بہ شکست ہو گئی اور وہ اتنی بڑی شکست

---

[1] یعنی وہ جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے۔ [2] جنگِ بدر 17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء

[3] دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص 291 (فٹ نوٹ 1 اور 2)

تھی کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کو بچانے کے لیے گھیرے میں لے لیا' بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور جتنے تیر آ رہے تھے ان کو اپنی پشت کے اوپر لے کر رسول اللہ ﷺ کو بچایا اور پھر یہ بھی کہ اس پہ بھی رسول اللہ ﷺ کو زخم آیا' دانت شہید ہوا' بے حد خون نکلا۔ اگر وہی چیز تھی کہ آپ ﷺ ایسے وقت میں پتھر مار دیا کرتے ہیں تو اس سے دشمن اندھا ہو جاتا ہے تو یہاں کیوں نہ مارے گئے۔ یہاں قرآن نے واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ آگے نہ بڑھنا' بات سوچنا کہ کیا ہوئی ہے' یہ کیوں شکست ہوئی ہے؟ یہ شکست اس لیے ہوئی ہے کہ ان کے کمانڈر نے جو پہاڑی کے درّے کے اوپر چھت پر کھڑا تھا' ان سے کہا تھا کہ یاد رکھو! کوئی صورت بھی ہو تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا' یہ ہمارے لیے بڑا نازک مقام ہے' یہاں سے دوبارہ حملہ ہو سکتا ہے' دوبارہ یہ نہ کرنا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ جب سامنے دیکھا' میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت پڑا ہوا ہے' تو وہ سپاہی وہاں سے بھاگے اور لگے لوٹنے۔ یہ صورت تھی۔ سوا اس ایک حکم کی نافرمانبرداری سے یہ کچھ ہوا۔ تم نے سوچا ہے' جاؤ اس گھاٹی کے اوپر دوبارہ ان کا تعاقب کرو' اس طرح تم بچو گے۔ یہ ہے ہمارے لیے اسوہ حسنہ' ورنہ فوق الفطرت باتوں سے اگر یہ سب کچھ ٹھیک ہو تو پھر وہ تو یہ کچھ اپنے وقت پر کر گئے' اب ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے اسوہ حسنہ نہ ہوا۔

عزیزانِ من! اسی گردش کا نتیجہ تھا کہ یہاں کہا کہ قوم نوح علیہ السلام تباہ ہو گئی۔ اب **ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ** (23:31) اس کے بعد ہم نے قوموں کا ایک اور دور شروع کر دیا۔ حضرتِ نوحؑ کے بعد قومِ عاد آئی۔ اس کے بعد آنے والی اس قوم میں **فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ** (23:32) ہم نے اپنا رسول بھیجا۔ اس نے بھی آ کر وہی بات کہی کہ **اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ** (23:32) قانون صرف خدا کا ہے' تم صرف اس کا اتباع کرو' دوسروں کا اتباع نہ کرو۔ ہر قسم کا اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے' سو تم بتاؤ کہ **اَفَلَا تَتَّقُوْنَ** (23:32) جو میں نے کہا ہے' تم اس کے قوانین کی نگہداشت کرو گے یا نہیں۔ اور پھر وہی بات کہی ہے کہ **وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا** (23:33)۔ یہاں وہی **الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ** ہیں یعنی وہی سرداران قوم آ گئے' وہی دولت مند طبقہ آ گیا جو مخالفت کر رہا ہے۔ آپ دیکھیے' عزیزانِ من! جہاں مخالفت ہوتی ہے وہاں سب سے پہلے یہی اوپر کا مترفین کا' سرمایہ داروں کا' طبقہ ہے جو مخالفت کرتا ہے' ورنہ مذہب پرست طبقہ کی مخالفت کا سوال نہیں ہے۔ جو چیز قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں انہیں شکست ہوتی ہے وہاں یہ مذہب پرست طبقے کو آگے کر دیتے ہیں۔ جب فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں شکست ہوئی تو اس نے اپنے ہاں کے بڑے بڑے پادری یعنی مذہبی پیشوائیت کے لیڈران کو بلایا اور کہا کہ یہ بات میرے بس کی نہیں رہی' تم بتاؤ کہ کس اسٹیج پر اس کو شکست ہو؟ پھر ساری قوم کے اندر ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ یہ ایسے لوگ آ گئے ہیں جو تمہیں تمہارے مذہب سے برگشتہ کر دیں گے۔

آ وَ اٹھو اس کے خلاف۔ یہ وہی تکنیک ہے: آپ مذہبی جذبات کو مشتعل کر دیجیے پھر جو جی میں آئے کرا دیجیے۔ یہی حکمتِ فرعونی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس قوم کے متعلق قرآن نے کیا بتایا ہے؟ یہ وہی بات ہے جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ اس عالمگیر برادری میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اس سے قوم میں تفریق پیدا ہوئی۔ اس سے تباہیاں آنی شروع ہوئیں۔ نبی علیہ السلام آیا اور اس نے آ کر کہا کہ یہ تفریق ختم کرو۔ یہ پہلی تفریق ہم نے حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں دیکھی۔ یہ دوسری قوم عاد آئی۔ اب دیکھیے عزیزانِ من! اس کا تذکرہ سورۃ الشعراء (26ویں سورۃ) میں کیا ہے۔ قرآن پہلے ان کا تعارف کراتا ہے۔ یہ قوم اس دور کی تاریخ بھی بتاتی ہے۔ بڑی مرفعہ الحال [1] ہے۔ مہذب بھی تھی۔ اب تو ہمارے ذہن میں کچھ یہ آتا ہے کہ تہذیب اور تمدن اور یہ ترقی وغیرہ ہمارے ہی دور سے مخصوص ہے۔ نہیں ایسا نہیں تھا۔ پرانی قوموں کے لیے بھی یہ جو کچھ محکمہ آثارِ قدیمہ والے سامنے لا رہے ہیں اس سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ یہ قومیں اتنی جاہل تھیں بلکہ ان قوموں کے اندر بڑا تمدن تھا۔ قرآن قومِ عاد کا تعارف کرا رہا ہے جو قوم حضرت نوح علیہ السلام کی Successor (جانشین) ہے یعنی اس قومِ نوح علیہ السلام کے بعد یہ قوم آئی ہے جس کا یہ ذکر ہے۔ شروع میں یہ قوم یمن کے اندر ہے اور وہاں سے چلتی ہوئی یہ شام تک چلی جاتی تھی۔ کہا یہ گیا ہے کہ تم دیکھو تو سہی' ان کی کتنی آسائش کی زندگی تھی۔ ان کے پاس کتنی فراوانیاں ہیں۔ قرآن نے کہا کہ حضرت ھود علیہ السلام نے جو ان کے بھائی بندوں میں سے تھا' ان سے کہا کہ **وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ـ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ـ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ** [2] (26:132-134)۔

انسانیت کے لیے سب سے بڑی نعمت اور دولت سمع و بصر ہے

عزیزانِ من! اس دور میں زیادہ سے زیادہ یہی چیز تھی: باغات' کھیتیاں' چشمے' پانی' مویشی' اتنی اچھی زراعت' پھر افرادی قوت بھی اتنی زیادہ۔ اس دور کے اندر کسی قوم کی مرفعہ الحالی کی یہی چیز ہوتی تھی۔ اتنا کچھ' اتنی افراط سے' تمہیں خدا نے دے رکھا ہے۔ یہ ساری

---

[1] طرح طرح کے سازوسامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتی تھی (206:129)' اونچی اونچی پہاڑیوں پر بڑے بڑے میموریل (یادگاریں) بناتے تھے (26:128)

[2] تم اس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس نے' جیسا کہ تم خود جانتے ہو' تمہیں سامانِ زیست کی اس قدر فراوانیاں عطا کر رکھی ہیں۔ مال مویشی کی کثرت' قبیلے کے افراد کی بہتات' لہلہاتے باغات' ان کی سیرابی کے لیے آبِ رواں کے چشمے (یہ سب خدا نے دے رکھے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بنیادی طور پر تمہاری پیدا کردہ ہو لیکن تم اس سامانِ زیست سے حاصل کردہ قوت کو دوسروں پر ظلم و استبداد کے لیے استعمال کرتے ہو۔ 26:130) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 848)۔

چیزیں تمہیں میسر ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور بات بھی کہی کہ وہ قوم جاہل قوم نہیں تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً** ❶ (46:26) علم وفن کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ انسان کی سماعت بصارت اور قلب ہیں۔ قرآن نے جہاں بھی کسی قوم کا ذکر کیا ہے کہ وہ علم اور بصیرت میں ان چیزوں میں آگے تھی تو انہی الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ان کو یہ بڑی سہولتیں حاصل تھیں اور یہی سمع بصر اور قلب کی قوتیں ہیں جو حقیقت میں انسان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ وہی ہے جسے آپ Perceptual knowledge (حسّی علم) کہتے ہیں۔ یہ علم By Perception (حواس کے ذریعے سے) حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ انہیں ہم حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حواسِ خمسہ سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے باہر کی چیزوں کی کچھ معلومات آپ تک پہنچتی ہیں۔ مثلاً ٹھاہ کی آواز کان میں آتی ہے۔ وہ آواز آئی۔ اب وہ آواز تو ایک پٹاخے کی سی آواز ہے۔ یہ آواز کیا کرتی ہے؟ یہ آواز ہمارے جو ذہن میں وہ جو سوچنے والی اندر قوت ہے اس تک پہنچتی ہے اور ہم تو شاید اتنا ہی کہہ سکیں کہ صاحب! بندوق کی آواز ہے لیکن اسی کو جاننے والے تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ بڑی بندوق ہے یا وہ چھوٹی ہے۔ اس آواز کے بعد ایک چیخ آتی ہے۔ چیخ بھی کان کے ذریعے آتی ہے۔ یہ چیزیں انسان کے ذہن تک پہنچتی ہیں اور ہمارا ذہن یہ کرتا ہے کہ اوہو یہ تو ہمارے بچے کی چیخ نظر آتی ہے۔ اسے کہتے ہیں Mind فواد جو ذہن کے اندر فیصلہ کرنے کی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بس یہ چیزیں ہیں جو قرآن کہتا ہے کہ جنہیں یہ حاصل ہوں اور وہ ان سے صحیح کام لیں تو وہ اس مادی کائنات کو مسخر کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس قوم عاد کے متعلق کہا کہ انہیں یہ کچھ حاصل تھا اس لیے انہی چشموں سے اسی زمین سے انہی باغات سے انہی کھیتوں سے اس نے اتنی بڑی توسیع حاصل کر لی تھی اس طرح وہ قوم پھیلی ہوئی تھی۔ اسی قوم کے لیے کہا کہ **وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ** ❷ (29:38)۔ وہ دانا و بینا قوم تھی آنکھیں رکھتی تھی۔ ہر چیز کو دیکھتی بھالتی تھی یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کن الفاظ میں قرآن ان کا تعارف کرا رہا ہے۔

خودنمائی کی ہوس کا نتیجہ قوموں کی تباہی کی شکل میں نکلتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے اس قومِ عاد کے متعلق بتایا ہے کہ یہ وہی قوم ہے جس کے افراد **وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ** (26:129) اس قسم کے محلات بنایا کرتے تھے ایسے پختہ قلعے بنایا کرتے تھے جیسے انہوں نے قیامت تک انہی میں رہنا

---

❶ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ...... سماعت بصارت اور قلب ...... حاصل تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 180)۔

❷ وہ لوگ اس قسم کا م بربنائے جہالت نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے سوچتے اور دیکھتے بھالتے کرتے تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 918)۔

ہے۔ یہ برسرِ اقتدار اتنے مضبوط قلعے بنایا کرتے تھے۔ یہ قلعے ہی نہیں بناتے تھے' قرآن کریم نے ایک بات اور بھی کہی ہے۔ اس میں پھر ہمارے لیے ایک چیز آ گئی ہے۔ کہا ہے کہ اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ (26:128)۔ وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر یادگاریں (Memorials) قائم کیا کرتے تھے' جن کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ ایک لفظ ہے' عزیزانِ من! جسمیں قومِ عاد کی کہانی بیان ہو رہی ہے' لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہ کیا کیا کرتے تھے؟ وہ ایسی یادگاریں (میموریل) بنایا کرتے تھے کہ جن کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ ان قوموں میں اتنی ہوس تھی۔ یہ ان کو پورا کرنے کے لیے بے فائدہ بلند و بالا یادگاریں کھڑی کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ کوئی یونیورسٹی قائم کر دی جائے۔ یہ وہ بلند و بالا یادگاریں بناتے تھے جن کا انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ان پر اتنے کروڑ روپیہ لگا دیا۔ اگر اس رقم سے ہسپتال بنا دیا جائے تو اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچے۔ اب اس کے اندر پہلی چیز یہ آئی جو قرآن نے کہی ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) یاد رکھو! یہ مٹی اور پتھر کی یادگاریں ہیں' جو تم کہتے تھے کہ تخلدون ہیں' کہ ہم ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے' ہمارا نام رہے گا۔ یہ نام مٹی اور پتھر کی یادگاروں سے نہیں رہتا۔ یہ اس سے رہتا ہے جو ینفع الناس ہو یعنی اس چیز سے جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہے' وہ یادگار ہمیشہ رہا کرتی ہے۔ پہلی چیز تو ان کی ذہنیت کی یہ بتائی کہ وہ قوم یہ کیا کرتی تھی۔ اب آئی وہ بات کہ معاشرے کے اندر وہ تفریق کیسی تھی' انہوں نے وہ کیا کیا تھا' اس قوم کا کیا نظام تھا؟ یہ بات (46:25)[1] میں کہی ہے۔ قرآن تو ایک دو الفاظ میں بات کہہ جاتا ہے۔

آخر قومِ عاد کیوں تباہ ہوئی؟ لفظ جرم کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! کہا کہ آؤ' تمہیں بتائیں کہ وہ قوم کیوں تباہ ہوئی؟ وہ قوم اس لیے تباہ ہوئی کہ وہ قوم الۡمُجۡرِمِیۡنَ (46:25) تھی۔ اب ہمارے ہاں مجرم لفظ ہی کچھ اور ہو گیا ہوا ہے۔ یہ وہ ہے جسے ہم جرائم پیشہ کہتے ہیں اور عدالت کی رو سے مجرم کہتے ہیں وہ خود Keep to the left (بائیں چلو) اور right (دائیں چلو) والا ہی جرم کیوں نہ ہو' ہمارے ہاں وہ جرم ہے۔ یعنی اس قانون کی خلاف ورزی کے لیے جو بات کی جائے وہ جرم ہے۔ ٹھیک ہے قانون کی خلاف ورزی ہے لیکن یہ تو عربوں کی زبان ہے۔ قرآن تو اس زبان کے اندر

---

[1] تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍۭ بِاَمۡرِ رَبِّہَا فَاَصۡبَحُوۡا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ (46:25) اس نے قانونِ خداوندی کے مطابق' ہر شے اکھاڑ پھینکی' اور چاروں طرف تباہی مچا دی چنانچہ اس بستی کی حالت یہ ہو گئی کہ اس کے مکانوں کے کھنڈرات باقی رہ گئے اور مکین سب ہلاک ہو گئے۔ اس طرح ہم مجرمین کو ان کے غلط اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے بھی اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا' تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1180)۔

آیا ہے۔ ان عربوں سے پوچھو کہ آپ عربی زبان میں جرم کسے کہتے تھے' مجرم کسے کہتے تھے؟ یہ تھا ''دوسروں کے ہاں کے درخت کے پھل کی شاخ کو' اپنے ہاں لے جانا''۔ جرم کے معنی یہ ہوتے تھے۔ ''بھیڑوں کی اُون کو مونڈھ کر لے جانے والا مجرم ہے''۔ قرآن بات ساری کہہ گیا۔ اس Exploitation (سلب ونہب) کے لیے کوئی جامع لفظ نہیں ہوسکتا: ''مونڈھ لینے والا' دوسروں کے ہاں کے پھل کے درخت کو کاٹ کر اپنے ہاں لے آنے والا''۔ یہ جرم ہے۔ عزیزانِ من! اس کی تفصیل کو پھیلاتے جایئے اور پھر دیکھتے چلے جایئے کہ جرائم کسے کہتے ہیں اور جب اس نے کہا ہے کہ وہ قوم المجرمین تھی تو اس کے معنی کیا تھے۔ یہ جرم تو آج دنیا میں کثرت سے پھیلا ہوا ہے۔

آج کی سیاست یہ ہے کہ کھیتی کوئی اور بوئے مگر اسے کاٹ کر کوئی اور لے جائے' کھیت کسی اور کا ہو اور اس میں چرنے والے کسی اور کے جانور ہوں۔ یہ ہیں وہ افعال جنہیں جرائم کہا گیا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی کیفیت۔ اب یہ چیز ہے کہ جو دوسروں کے ہاں کی کھیتی کو' فصل کو' محنت کو' جو Exploit (سلب ونہب) کرسکتا ہے وہ مجرم ہے۔ قرآنِ حکیم نے اسے دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ جب کہا کہ پھر اس قوم کی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (26:130) اور جب ضعیفوں کمزوروں پر ہاتھ ڈالتے تھے' تو ایسا ہاتھ ڈالتے تھے کہ ان کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قوم کے کیا جرائم گنائے جا رہے ہیں؟ ان کی طرف کیوں نبی علیہ السلام آ رہا ہے؟ میں کسی کی تحقیر نہیں کرنا چاہتا' آج تو جرم یہی ہیں کہ جس کا پاجامہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہوگا وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ قرآن یہ جرم گنا رہا ہے کہ جب وہ کسی کو پکڑتے تھے' کسی کے اوپر ہاتھ ڈالتے تھے' تو اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے تھے۔ یہاں ''جبار'' کا لفظ قرآن نے ان کے لیے استعمال کیا ہے۔ یاد رکھیے! خدا کے لیے بھی یہ الفاظ آتے ہیں۔ المتکبر بھی آتا ہے' جبار بھی آتا ہے۔ عزیز کا لفظ بھی اس کے لیے آتا ہے۔ ❶ جب کسی مظلوم کی حفاظت کے لیے یہ کیا جائے تو وہ خدائی صفت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دوسروں کے پھل توڑنے کے لیے' دوسروں کی بھیڑوں کو مونڈھنے کے لیے' جو کسی پہ ہاتھ ڈالتے تھے' اتنی سختی سے ہاتھ ڈالتے تھے کہ ان کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے تھے۔

صاحبِ اقتدار کے کردار کا قوم کی تمدنی زندگی پر اثر

عزیزانِ من! اب آگے قرآنِ کریم نے یہ بات بتائی کہ یہ اچھی بھلی قوم' انسانوں کی قوم' اس قسم کی کیسے بن جاتی ہے؟ یہ بڑی عجیب

---

❶ العزیز الجبار المتکبر (59:23) اسے ہر قسم کا غلبہ اور تسلط حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کی قوت رکھتا ہے (العزیز)۔ اس نے ہر شے کو اس طرح اپنے قانون کی جبائر (کھڑ پچوں۔ Splints جن سے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو باندھا جاتا ہے تاکہ وہ جڑ جائیں) میں باندھ رکھا ہے کہ وہ اپنے مقام سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتیں اور اس طرح نظامِ کائنات میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا (الجبار) اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ عظمت و کبریائی سب اسی کے لیے ہے (ماخوذ: پرویزؒ: ''مفہوم القرآن'' ص۔ 1301)۔

چیز ہے کہ عقل وفکر کی حامل قوم کو آخر ہو کیا جاتا ہے؟ ارشادِ خداوندی ہے کہ یہ اس لیے ہو جاتا ہے کہ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (11:59) جو اوپر کا اس قسم کا صاحبِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے' جو جابر یعنی ہڈیاں توڑنے والا طبقہ ہوتا ہے' یہ افرادِ قوم اس کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ امر بھی یعنی جو اس کے جتنے بھی صاحبِ اقتدار احکام ہوتے ہیں' ان کو ان کے احکام کی پیروی کرنا پڑتی ہے' اور اس طرح ساری قوم ہی وہ کچھ بن جاتی ہے جو کچھ وہ ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! معاف رکھیے گا' میں پھر عرض کر دوں کہ میں ہر ایک کے لیے نہیں کہنا چاہتا۔ یہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ عام انسانوں کے متعلق نہیں کہا کہ وہ نمازیں نہیں پڑھتے تھے' روزے نہیں رکھتے تھے۔ یہ نہایت ضروری چیزیں ہیں اور یہ ایک نظام کے پروگرام کے اجزاء ہیں۔ خرابیاں یہ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

المتکبر اور کبریائی کا حقیقی مقام

یہ یاد رکھیے کہ قرآن نے خدا کے متعلق جب یہ کہا ہے کہ وہ المتکبر ہے یعنی کبریائی اس کے لیے ہے تو وہ قوم جو خدا کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کرتی ہے اس کے لیے بھی کبریائی ہوتی ہے' لہٰذا مومن کے لیے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139) کہا ہے۔ لیکن اس کبریائی اور قوت کا جو استعمال تھا' اس میں اختلاف ہوتا تھا۔ ایک سلب و نہب کرنے والا صاحب اقتدار طبقہ وہ ہوتا تھا جو ہر کمزور کی ہڈی توڑنے کے لیے تھا اور یوں کہیے کہ ان کے ہاں کا ایک صاحب اقتدار طبقہ وہ تھا جس کی کبریائی ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے تھی۔ اب دیکھیے کہ اس قوم کے متعلق کہا ہے کہ وہ جبار تھے اور جب ضعیفوں' کمزوروں پر ہاتھ ڈالتے تھے تو ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ ان کے اوپر کے لیڈر اس قوم کے تھے۔ اس لیے یہی کچھ قوم ہوگئی تھی۔ کہا کہ اس کا جرم بتائیے۔ جواب دیا کہ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ❶ (41:15)۔ یہاں وہی فَاسْتَكْبَرُوْا آیا ہے یعنی انہیں کبریائی حاصل تھی' قوت حاصل تھی لیکن پھر جرم کیا ہے؟ الاعلون' جو تم مومن کو بھی کہتے ہو اور سب سے بڑی کبریائی خدا کو کہتے ہو تو اس کبریائی اور المتکبر میں فرق کیا تھا؟ اس کے لیے کہا کہ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ❷ (41:15)۔ تو فرق یہ ہو گیا کہ جب حق کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے مخالفین کی قوت روکنی پڑے' اس میں جو قوت استعمال ہوتی ہے' وہ خدائی قوت ہے' یہ خدائی صفت ہے۔ اس کے برعکس مظلوم کی ہڈیاں توڑنے کے لیے جب وہی استکبار ہو' تو وہ فرعونیت ہے' ابلیسیت ہے' غیر الحق ہے۔ اس طرح الحق کے ساتھ استکبار جرم نہیں' بغیر الحق جرم ہے۔ اور پھر کہا کہ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ❸ (41:15)۔ انکی کیفیت یہ تھی کہ جو بھی دوسرا ان کے سامنے آتا تھا' اس کے لیے ان کے پاس نہ دلیل تھی نہ برہان' وہ

---

❶ قوم عاد کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے ناحق تکبر اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1112)۔

❷ انہوں نے ناحق تکبر اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1112)۔

❸ اور انہیں اس کا زعم تھا کہ ان سے زیادہ طاقت ور کوئی نہیں (اس لیے جو جی میں آئے کر سکتے ہیں' انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں)

کہتے تھے کہ او! تم جانتے نہیں ہو کہ ہماری قوت کتنی زیادہ ہے۔ قوت کی بات تو آگے آئے گی لیکن قرآن ان کو یہیں کاٹ کے رکھ دیتا ہے کہ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَھُمۡ ھُوَ اَشَدُّ مِنۡھُمۡ قُوَّۃً (41:15) انہوں نے اس پر غور ہی نہ کیا کہ وہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا' ان سے کہیں زیادہ قوتوں کا مالک ہے۔ یہ نبی علیہ السلام آیا۔ اس نے ان کو بہت کچھ بتانے کے لیے بڑی محنت کی' جان لڑا دی کہ وہ یہ مانیں' اس کے پیغام کی تکذیب کی۔ ہوتا یہ ہے کہ نبی کا دل دوسروں کی تباہی پر کڑھتا ہے' لیکن جو خودکشی پہ ہی تلا ہوا ہو' اس کو کون بچا سکتا ہے۔ پھر ہوا کیا؟ قرآن نے ابھی ابھی کہا تھا کہ ان کو سمع' بصر' سماعت' بصارت اور فواد' شعور اور عقل و فکر سب کچھ حاصل تھا' لیکن کہا یہ کہ ان کے غلط نظام کے انجام میں جب اس قوم پر تباہی آئی تو اس وقت فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡھُمۡ سَمۡعُھُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُھُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُھُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَحَاقَ بِھِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَھۡزِءُوۡنَ (46:26) ان کی غلط کوششوں کا انجام اور نتائج تخریب کی صورت میں سامنے آئے اور تباہیاں ابھر کر آ گئیں تو گو وہ بڑی عقلمند قوم تھی' بڑی علم والی قوم تھی' بڑی ہنر والی قوم تھی' مگر ان کی سمع' بصارت اور قلب ان کے کسی کام نہ آیا۔ غلط نظام کا انجام یہ نہیں ہوتا کہ جو قوم جاہل ہوتی ہے وہ اُسی کو تباہ کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ قوم تو عقل و فکر کی بلندیوں پہ پہنچی ہوئی ہوتی ہے مگر غلط نظام کا انجام اس کو بھی تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہاں کہا کہ انہیں یہ چیزیں کچھ کام نہ دے سکیں۔ یہاں مَاۤ اَغۡنٰی (46:26) آیا ہے کہ یہ کچھ کام نہ دے سکیں۔ جب انہوں نے صحیح نظام کی مخالفت کی' غلط نظام کے بھروسے پہ دنیا کے کمزوروں پہ' ضعیفوں پہ' زندگی تنگ کر دی' تو اس کے بعد وہ ان غریبوں کی جس چیز کا مذاق اڑایا کرتے تھے انہی نے انکو آ کر دبوچ لیا اور ایسا دبوچا کہ ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئی۔ یہ وہ قوم تھی جو صحیح قوانینِ خداوندی کی تکفیر کیا کرتی تھی۔ اس کی جڑ کٹ گئی اور دوسری جگہ ہے کہ پھر ان کی کہانیاں اور داستانیں ہی بس رہ گئیں' قوم ختم ہوگئی۔ اب یہ دوسری چیز ہمارے سامنے آ گئی۔ دوسرا نبی علیہ السلام آتا ہے۔ وہ اس تفریق کو مٹانے کے لیے آتا ہے۔ کمزور اور طاقتور کی تفریق میں وہ کمزور خود کوئی پیدائشی کمزور نہیں ہوتے' پہلے ان کو کمزور کیا جاتا ہے اور کمزور ہونے کے بعد پھر یہ دو طبقے ہو جاتے ہیں: اوپر کا طبقہ' صاحبِ اقتدار اور صاحبِ قوت۔ وہاں صرف دولت کی بات کے ساتھ قوت کی بات کہی ہے اور دوسرا نیچے کا طبقہ جسے کمزور کر دیا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! بات یہ چلی آ رہی تھی کہ وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ وَاَتۡرَفۡنٰھُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مَا ھٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یَاۡکُلُ مِمَّا تَاۡکُلُوۡنَ مِنۡہُ وَیَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ (23:33) اُس کی قوم کے اکابرین نے' جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی' جو خدا کے قانونِ مکافات اور مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے' اور جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں اور وہ دیکھتے تھے کہ نظامِ خداوندی کی زد ان کے ذاتی مفادات پر پڑے گی'

مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص جو خدا کا پیغام بر ہونے کا مدعی ہے تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ یہ بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ یہ تم سے کس حیثیت سے ممتاز ہے جو تم اس کی بات مانو! ۔عزیزان من! یہ طبقہ عوام کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ یہ بات ذرا لمبی ہے۔اسے ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

آج وقت ہو گیا۔ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 33 تک آ گئے ہیں۔آیت 34 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

آٹھواں باب: سورة المؤمنون (34 تا 43)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۳۴ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ
وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝۳۵ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝۳۶ اِنْ هِيَ اِلَّا
حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۳۷ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۳۸ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝۳۹ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ
لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝۴۰ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَاۗءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۱ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۴۲ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۴۳

عزیزانِ من! آج جون 1977ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنوں کی آیت 34 سے ہو رہا ہے: (23:34)۔

گزشتہ سے پیوستہ

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ موضوعِ سخن قرآنِ کریم کا وہ بنیادی نکتہ ہے کہ آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کی ضرورت کیوں پیش آئی، حضراتِ انبیائے کرام علیہ السلام کو کیوں بھیجا گیا، ان سے مقصد کیا تھا؟ قرآن کریم میں یہ بتایا گیا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213; 10:19) نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری تھی، ایک امتِ واحدہ تھی **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لیے، آپس میں کچھ تقسیم پیدا کر لی۔ اس کے لیے **فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ** (2:213) اللہ

تعالیٰ نے پھر انبیائے کرامؑ کو بھیجا اور انہیں بتایا کہ یہ جو تمہارا فرضِ زندگی ہے، جس میں تم میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، طبقات پیدا ہو گئے ہیں، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہو گا اور اگر تم ایک برادری بن جاؤ گے تو پھر تمہاری زندگی بڑی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی حامل ہو جائے گی۔ وہ صرف یہ وعظ کہنے کے لیے نہیں آتے تھے، بلکہ ایک عملی نظام قائم کرتے تھے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ**(2:213) اور ان کے ساتھ ایک ضابطہ ہدایت، ایک ضابطہ قوانین آتا تھا کہ وہ اس کے ذریعے ان اختلافات کو مٹائیں جو انسانوں میں پیدا ہو چکے تھے۔

میں نے کہا ہے کہ یہاں اس (2:213) آیت میں لفظ یَحۡكُمَ آیا ہے۔ یہ حکم کی بات ہے، یہ حکومت کی چیز ہے، مذہب میں وعظ و نصیحت تھی۔ ان کے معاشرے کے اندر جتنے اختلافات، جتنی اونچ نیچ پیدا ہو گئی تھی اُسے مٹانے کے لیے انہیں امتِ واحدہ بنانا مقصد تھا۔ قرآن کریم نے یہ مقصد بتایا ہے۔ اس لیے انبیائے کرام کے بھیجنے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ یہ جو انسانوں نے تفریق پیدا کر لی تھی، اس کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھا۔ باہمی مفادات کی علیحدگی سے یہ تفریق پیدا ہوتی تھی کیونکہ ہر طبقہ، ہر فرقہ، ہر گروہ، ہر برادری، ہر خاندان، ہر قبیلہ، اپنا اپنا مفاد پیشِ نظر رکھتا تھا۔ اس لیے جب یہ مختلف گروہوں میں بٹے تو ان کے مفادات میں تصادم ہوا۔ انسان کی عقل کا فریضہ یہ ہے کہ یہ اس کی عقل ہے، جو اس کے اپنے مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے، دوسروں کے مفاد کا تحفظ نہیں۔ اگر وہی افراد ایک گروہ بن جاتے ہیں تو وہی عقل ایک گروہ کی ہو جاتی ہے۔ وہ جو ایک گروہ کی عقل ہوتی ہے، وہی اس کی سیاست ہوتی ہے۔ پھر اس کا ٹکراؤ دوسرے گروہ کی عقل کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کو جو عقل دی ہے، اس کا فریضہ بھی اپنے ہی مفاد کا تحفظ ہے۔ اگر دوسرے سے ٹکراؤ ہے تو وہ اس ٹکراؤ، اس تصادم اور اس تفریق کو کیسے مٹا سکتی ہے؟ اس کے لیے انسانی فکر اور عقل سے ماورا کوئی سرچشمہ ہونا چاہیے جو اس قسم کی Directions (ہدایات) احکام و قوانین دے جو تمام نوعِ انسانی کے مفاد کو یکساں طور پر دیکھے اور ان کی حفاظت کرے۔ یہی فرق ہے عقلِ انسانی میں اور وحی خداوندی میں۔ خدا تمام انسانیت کے لیے رب العٰلمین ہے۔ وہ کسی ایک فرد، گروہ، قبیلے، قوم، نسل، کا رب نہیں ہے۔ قرآن کریم سے ربوبیتِ عالمینی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لیے بہتری، وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی، اسی لیے قرآن کریم نے انبیائے گزشتہؑ اور امم سابقہ کی داستانیں ہمارے سامنے پیش کیں۔ ان میں نمایاں طور پر یہی بات بتائی گئی کہ جس زمانے میں بھی کوئی نبی آیا، وہ معاشرے میں تفریق کو مٹانے کے لیے ہی آیا۔

عزیزانِ من! یوں تو تفریقات کی مختلف قسمیں ہوں گی لیکن جو اس دور کی سب سے نمایاں تفریق تھی، اس کو قرآن سامنے لاتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ اس نبی علیہ السلام نے اسے کس طرح بٹایا۔ قرآن اس زمانے کی رکھی گئی، تفریق کی پہلی بنیاد سب سے پہلے حضرتِ نوحؑ سے شروع کرتا ہے۔ وہ نسلی تفریق ہے۔ جب یہ بیٹا، میرا بیٹا ہوا، تو اب اس بیٹے سے بات آگے بڑھی ہے اور اس سے ایک خاندان بنا اور پھر

اس سے ایک قبیلہ بنا۔ ان افراد میں اشتراک کیا ہے؟ صرف یہ کہ یہ تمام کسی ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ اگر یہ اس سے ذرا اونچا چلے جاتے تو تفریق ہی کوئی نہیں تھی۔ وہ جس ایک باپ یا جدِ امجد کی اولاد کہتے ہیں' وہ بھی تو کسی کا بیٹا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ اپنی تفریق کے لیے یہ بات کہیں سے بھی شروع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' اگر آپ ذرا اونچا چلے جائیں تو یہ جو پہلے انسان تھے' جو پہلے یہاں امتِ واحدہ تھی' ان میں تو یہ کوئی نسلی امتیاز نہیں تھا۔ یہ پہلا امتیاز نسلی تھا۔ یہاں سے قرآن نے ابتدا کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے یہ کہا کہ طوفان آنے والا ہے' کشتی بنالو' اس کے ذریعے تم محفوظ ہو جاؤ گے' ہم تمہیں اور تمہارے اہل کو محفوظ رکھیں گے۔ اب حضرتِ نوح علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کا حقیقی بیٹا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ وہ سرکشی برتتا تھا۔ جب یہ کشتی میں سوار ہوئے' وہ اُدھر کھڑا تھا۔ انہوں نے آواز دی کہ آؤ' تم بھی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ نہیں' میں تمہارے ساتھ نہیں آتا' میں اپنا انتظام آپ کرلوں گا۔ میں بات مختصر کرتا ہوں۔

وحدتِ انسانیت کے اعتبار سے خونی رشتہ کوئی نہیں ہوتا

قرآن نے بات سمجھانے کے لیے ہمیں یہ بتایا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام نے کہا کہ یا اللہ! جرأتِ عرض معاف ہو تو یہ گزارش کروں: آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل کو بچا لونگا' بیٹے سے زیادہ قریب اہل اور کون ہو سکتا ہے' یہ کیوں غرق ہو گیا؟ تیرے وعدے تو سچے ہوا کرتے ہیں۔ کہا کہ بات یہ ہے کہ ہمارے وعدے سچے ہوتے ہیں' تمہاری سمجھ کا ذرا سا پھیر ہے۔ تم نے اپنے بیٹے کو نسل کے اعتبار سے اپنا اہل سمجھا ہے۔ ہمارے معیار کے مطابق یہ اہل نہیں ہوتے بلکہ تمہارے اہل وہ تھے جو ایمان میں تمہارے ساتھ شامل تھے۔ جب وہ ایمان میں مشترک نہیں ہیں تو وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہیں۔ تمدنی اعتبار سے' معاشرے کے اعتبار سے' تم اپنے تعلقات رکھو جیسے ہوتے ہیں لیکن جب یہ وحدتِ انسانیت' عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کا وقت آئے گا تو وہاں یہ صورت نہیں ہوگی کہ ''یہ میرا بیٹا ہے' یہ اُس کا بیٹا ہے''۔ اس میں تو یہ دیکھا جائے گا کہ ایمان میں' آئیڈیالوجی میں' مشترک کون ہے۔

قرآن نے پہلے ہی نبی علیہ السلام کو پہلی بات یہ کہہ دی' جسے آج آپ اتنا بڑا اہم مسئلہ بنا رہے ہیں کہ قرآن میں معیارِ قومیت کیا ہے؟ معیارِ قومیت تو قرآن نے حضرتِ نوح علیہ السلام اور اس کے بیٹے کے تعلق میں بتا دیا۔ بیٹا اس قوم میں سے نہیں ہو سکتا جس قوم میں حضرتِ نوحؑ تھے۔ دوسرے کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ تو وطنی اعتبار سے قومیت بناتے ہیں' جغرافیائی اعتبار سے بناتے ہیں۔ وہ تو اس گھر میں رہتا تھا' ملک تو ایک طرف رہا۔ آپ زبان کے اعتبار سے قومیت بناتے ہیں۔ باپ بیٹے کی تو زبان بھی ایک تھی۔ آپ نسل کے اعتبار سے قومیت بناتے ہیں' یہی چیز حضرتِ نوح علیہ السلام کے ذہن میں آئی کہ ''میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے'' لیکن وحیِ خداوندی نے یہ تمام معیار کاٹ

کر رکھ دیئے۔ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ معیار قومیت یہ ہے: فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ❶ (14:36)۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ خدا کی راہ میں جو میرے نقشِ قدم پہ چلتا ہے' وہ میرا ہے' جو یہاں اس پہ نہیں چلتا وہ میرا نہیں۔ ہمیں اس سے واسطہ کیا ہے جو تجھ سے نا آشنا رہنا چاہے۔ قومیت کی پہلی بنیادی اینٹ یہاں سے رکھی گئی۔ یہ وہی ہے جو کہا ہے کہ ہم نے انبیاء کو اس لیے بھیجا تھا کہ اختلاف کو مٹائیں۔

تقسیمِ کار کی بنیاد پر قومیت کا تصور اور طبقاتی تفریق خلافِ قرآن ہے

حضرتِ نوح علیہ السلام کے قصے میں دوسرا اختلاف یہ ہے کہ معاشرے میں مختلف کام مختلف لوگوں نے کرنے ہوتے ہیں۔ اب یہ کوئی دھوبی ہے' کوئی موچی ہے' کوئی لوہار ہے' کوئی ترکھان ہے' کوئی کنجڑا ہے' کوئی سبزی بیچتا ہے' اور ان کے اندر یہ سردارانِ قوم ہیں' جو کچھ نہیں کرتے اور چوہدری بنے ہوئے ہیں۔ بات تقسیم کار کی تھی۔ انہوں نے اس بنا پر طبقات پیدا کر لیے تھے۔ یہ جو کام کرنے والے تھے' یہ کام کرنے کے اعتبار سے کمی ہو گئے۔ یعنی کام کرن والے تے کمی ہو گئے' فیر او ہدے بعد کمین ہو گئے ❷۔ اب یہ ایک ایسی مستقل تفریق پیدا ہوئی کہ آج تک چلی آ رہی ہے۔

ان کے ہاں برادریاں کہتے ہیں۔ یہ پیشوں کے اعتبار سے تفریق کرتے ہیں۔ آج بھی یہ ہے کہ او دھوبی ہوندا اے۔ او کپڑا دھوندا ہیگا۔ دھوبی ہے۔ او تیری بیوی کپڑے دھوندی۔ اے دھوبن ہو جاندی ہیگی اے۔ ❸ ذہن انسانی کس طرح تفریق پیدا کرتا ہے! اس معاشرے میں یہ دوسری تفریق تھی۔ ان مخالفین نے حضرت نوح علیہ السلام پر اعتراض ہی یہ کیا کہ جو بات تم کہتے ہو کہ بھئی! ہم تو اس پہ آنے کو تیار ہیں لیکن اسکا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اور ہمارے یہ کمی' اے دوویں برابر ایک جگہ تے بیہہ جان گے۔ ❹ طبقات کی تقسیم کی بنیاد پر' یہ ہے ذہنیت انسان۔ حضرت نوحؑ نے کہا کہ پھر تمہاری خاطر میں یہ تقسیم نہیں کر سکتا۔ یہاں اسلام میں تو یہ ہے کہ ''تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے''۔ ❺ تمہاری خاطر میں ان کو دھتکار نہیں سکتا۔ اس طرح یہ تفریق مٹ گئی۔ پہلے نبی کا قصہ دیکھ رہے ہیں آپ! کہ کاہے کے لیے نبی علیہ السلام آتے تھے اور قرآن کیا بتاتا ہے کہ وہ آ کر کرتے کیا تھے۔

---

❶ میرا ''اپنا'' وہ ہوگا' جو اُس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔575)۔

❷ یعنی کام کرنے والے ''کامی'' کمی ہو گئے اور پھر وہ ''کمی'' سے ''کمین'' ہو گئے۔

❸ وہ دھوبی ہوتا ہے' یہ کپڑے دھونے والا دھوبی ہے' ارے تمہاری بیوی کپڑے دھوتی ہے' یہ دھوبن بن جاتی ہے۔

❹ ہم اور ہمارے یہ ''کمی'' یہ دونوں برابری کی بنیاد پہ ایک ہی جگہ بیٹھیں گے۔

❺ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبالؒ: شکوہ)

قومِ عاد میں حاکم اور محکوم کی تفریق

عزیزانِ من! حضرت نوح علیہ السلام کے بعد قرآن نے قومِ عاد میں حاکم اور محکوم کی تفریق کا ذکر کیا: ارے ایک ہی قوم کے اندر یہ تفریق؟ کیا یہ بھی کوئی تقسیمِ کار ہے؟ حقیقت میں کچھ لوگوں کے ذمے جو کام لگا دیا گیا' وہ تو یہ تھا کہ وہ بہ ہیئت مجموعی ملک وقوم کا کچھ انتظام کیا کریں۔ اب انتظام کرنے والے نے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اختیارات کا مطلب اقتدار ہو گیا۔ اقتدار کے معنی طاقت ہو گئے۔ اور پھر طاقت کے معنی حاکم ہو گئے اور جو وہ حاکم ہوئے تو وہ دوسرا محکوم ہو گا یعنی کوئی تو حاکم بنے گا۔ باقی محکوم ہو گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تفریق ہے کیا؟ صرف یہ کہ انتظامی امور جس کے سپرد کیے' وہ حاکم ہو گیا۔ حاکم ہو کر سر پہ بیٹھ گیا۔ حاکم تو بہت تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ جن میں جرأت نہیں ہوتی' وہ محکوم۔ ہم کس بے تکلفی سے یہ بات کہتے ہیں کہ عوام نے یہ سب کچھ کیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ ان کو عوام قرار دینے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ خود خاص بننا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ عوام ہیں' تو وہ خواص ہیں۔ قرآن حکیم نے قومِ عاد کے اندر حاکم اور محکوم کی تفریق کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو کچھ تفریق نہیں۔ یہ تو انتظامی امور ہیں۔ گھر کا سا نقشہ سامنے رکھو۔ یہ تو تمہارے لیے تقسیمِ کار ہے۔ یہ تو ذمہ داریاں ہیں۔ یعنی یہ کہ تم ایسا کرو۔ یہ وہی کچھ ہے جسے تم آج حکومت کہتے ہو۔ وحی نے تو یہ تفریق بھی مٹا دی۔

قومِ ثمود کا ذکر: گلہ بانی کی بنا پر باہمی تفریق یعنی ایک زمیندار دوسرا مزارع

عزیزانِ من! اب آگے آتی ہے قومِ ثمود۔ یہ وہ دور ہے جب معیشت کا معیار گلہ بانی پہ تھا۔ پہلے دور میں مویشی پالنا گلہ بانی تھی۔ یہ بہت پہلے دور کی چیز تھی۔ اس گلہ بانی میں مویشی بڑی قیمتی متاع ہوتے تھے۔ جس کے پاس یہ زیادہ ہوتے تھے وہ وہاں کا سردار ہو جاتا تھا۔ جس کے پاس یہ کم ہوتے تھے وہ غریب رہ جاتا تھا۔

اب جس کے پاس یہ مویشی زیادہ ہیں اس کے مویشیوں کے لیے چراہ گاہوں کی' چشموں کی' پانی کی' ضرورت زیادہ ہے۔ اب وہ اس پر لکیریں کھینچ لیتے ہیں کہ یہ میری زمین ہے' یہ میری چراہ گاہ' یہ میرے چشمے ہیں' ان میں ان کے مویشی نہیں آ سکتے' ان کی بھیڑیں یہاں سے پانی نہیں پی سکتیں۔ یہ ہے جو قومِ ثمود ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ تفریق زمین کی بنا پہ ہوئی: ایک زمیندار ہو گیا' دوسرے کو اس کا مزارع کہہ لیجیے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق پہلے دن سے ہے۔ جس نے ایک غلط اینٹ رکھی ہے کس طرح وہ آج تک چلی آ رہی ہے۔ سارے ادوار گزرتے چلے جا رہے ہیں مگر زمیندار اور مزارعوں کی تفریق یا جو کچھ ہوتا ہے' اس کی تفریق' آج بھی اسی طرح سے باقی ہے۔ اسی لیے تو قرآن میں آیا ہے کہ شیطان نے ایک ہی بات تو خدا سے کہی تھی کہ مجھے اس طرح دھتکارا تو گیا ہے لیکن اب ذرا تماشا دیکھنا' اس حضرتِ آدم کی حالت میں کیا بناتا ہوں۔ اس کو یہاں تگنی کا ناچ نچا دونگا' جس کی خاطر یہ کچھ کیا گیا ہے۔ میں آپ سے صرف ایک

بات کہتا ہوں' آپ رب العزت ہیں' صاحبِ اقتدار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب میرا ہاتھ اس کی گردن پر ہو اور آپ عین اس وقت میرا ٹینٹوا دبا دیں۔ یہ تو برابر کی لڑائی نہیں ہوگی۔ آپ درمیان میں دخل نہ دیجیے گا اور اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ جب تک آدم اس کرہ ارض پہ رہے اس وقت تک میں بھی رہوں۔ لہٰذا اگر یہ ہے تو ٹھیک ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ لیں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرتِ نوحؑ کے دور میں بھی ابلیس موجود تھا اور آج بھی ابلیس موجود ہے؟ سچ کہا تھا مفکرِ قرآن اقبالؒ (1877-1938) نے:

اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات ❶

حضرت نوحؑ کے زمانے ❷ کی تفریق آج بھی موجود ہے اور حاکم اور محکوم کی شکل میں قومِ ثمود ❸ کی تفریق' نیز زمیندار اور مزارع کی تفریق آج ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآنِ کریم ان کے متعلق یہ بتا رہا ہے کہ حضرتِ صالحؑ اس قوم کی طرف آئے تھے (47:45)۔

غلط نظام کے اندر ہر قسم کا مادی سہارا تباہ ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! میں بات یہیں سے شروع کرتا ہوں جو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا تھا کہ اَتُتۡرَكُوۡنَ فِىۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيۡنَ ۔ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۔ وَّزُرُوۡعٍ وَّنَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ ۔ وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا فٰرِهِيۡنَ (26:146-149) یہ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے چشمے تمہارے پاس ہیں' چراگاہیں تمہارے پاس ہیں' باغات تمہارے ہیں' کھیتیاں تمہاری ہیں' پہاڑوں کے اندر پتھروں کو تراش کر تم اتنے محکم اور مضبوط محلات و قلعے بناتے ہو' اپنے ذہن میں تم سمجھتے ہو کہ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور بڑی حفاظت کا سامنا بھی اپنا کر لیتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے طبعی طور پہ تم نے یہ سب کچھ کر لیا ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو قوم غلط نظام کی پیروکار ہے' وہ اس سے بھی زیادہ سامانِ خوشحالی اور سامانِ زینت کو لے کر ڈوب جایا کرتی ہے۔ بات تو نظام پہ ہے۔ جو نظام تم نے چلا رکھا ہے'

---

❶ بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

❷ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ قریب 5000 ق م کا ہے۔ (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور' 1994' ص۔2) نیز اس کتاب (مطالب القرآن فی دروس الفرقان) کا باب چھٹا' ص 136 کا فٹ نوٹ دیکھیے

❸ اُمم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادِ اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ حجر' ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادیٔ قریٰ کے گرد و پیش کا میدان بڑا سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادے سے لبریز۔ قرآن کریم نے اس قوم کو عاد کا جانشین بتایا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پیشتر ان کی تباہی ہو چکی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق م سے لے کر 1600 ق م تک کا ہے۔ قوم عاد کی طرح یہ لوگ بھی میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے' جو فنِ سنگ تراشی کے نمونے تھے (7:74; 15:82) (حوالہ پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 1994' ص ص۔ 69-68)۔

اس کا نتیجہ تمہاری تباہی ہوگا۔ نہ یہ باغات' یہ کھیتیاں' یہ چراہ گاہیں اور یہ چشمے تمہارے پاس رہیں گے' نہ یہ محلات اور تمہارے یہ قلعے تمہارے پاس رہیں گے۔ یادرکھو! تمہاری صرف داستانیں باقی رہ جائیں گی۔قوم سے کہا کہ وَلَا تُطِيعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ [1] (26:151)۔اس سے نظر آتا ہے کہ انہوں نے حد سے تجاوز کرنے والے ان لوگوں سے کہا کہ یادرکھو! یہ وہ لوگ ہیں جو مسرفین ہیں' جن کی اطاعت تم کررہے ہو۔

یہ بات بڑی عجیب سی ہے۔ ہمارے ہاں تو عام طور پہ فضول خرچ کو اسراف کہتے ہیں اگر اس کا یہ ترجمہ کیا جائے کہ یہ جو فضول خرچ لوگ ہیں' ان کی اطاعت نہ کرو۔ ان سے کہا جائے گا کہ صاحب! ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ فضول خرچ ہیں یا پیسہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔فضول خرچ ہیں تو اپنی دولت ہے جسے اڑاتے ہیں۔ اسراف کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ Originally (اصلاً) اسراف ہوتا ہے: ''کنویں سے پانی نکالنا''۔ Irrigation (آبپاشی) کیلیے نالیاں بناتے ہیں۔ پنجابی اچ ساڈے آڈ کیندے نے اونوں۔ آڈاں بناؤندے نیں [2] ان سے یہ پانی بہتا ہوا جاتا ہے۔ جس کھیت تک یہ جانا ہوتا ہے' وہاں تک وہ چلا جاتا ہے۔ اسی سے جا کر یہ کھیت سیراب ہوتا ہے۔ اگر راستے میں نالی یا آڈ میں اِدھر اُدھر کہیں شگاف ہو جائیں تو وہ پانی اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔ جہاں اس کو پہنچنا ہوتا ہے' وہ وہاں نہیں پہنچتا۔یعنی اس طرح جو پانی راستے میں ہی بہہ جائے اور کھیت تک نہ پہنچے' اسے اسراف کہتے ہیں یا کوئی اس پانی کو راستے میں ہی' اونوں وڈ کے اپنی کھیتی ول لے جائے' اسے اسراف کہتے ہیں [3] ۔

یہ راستے میں ہی کاٹ کر اپنے کھیتوں میں لے جاتے ہیں اور تم ہو کہ ان کی اطاعت کرتے ہو۔ کیا بات ہے' عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ تمہارا ہمدرد ہو' مشفق ہو' مہربان ہو' اُسے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس کھیت کو پانی کی زیادہ ضرورت ہے' یہ اسے وہاں تک خود پہنچائے لیکن ان کی کیفیت تو یہ ہے جو قرآن نے بتائی ہے کہ مُسْرِفِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ [4] (26:151-152)۔اس کا نام فساد فی الارض ہے۔ ہمارے ہاں تو فساد ''دنگا فساد'' کو ہی کہتے ہیں۔اصل فساد تو یہ ہے۔اس کے مقابلے میں اسی آیت میں ''اصلاح'' کا لفظ آیا ہے۔ اصلاح کا مادہ ص ل ح ہے۔اصلح کے معنی ہوتا ہے ''ہمواریاں''۔ صلح کے معنی ہوتا ہے ہمواری پیدا کردینا۔اس آیت میں آیا ہے کہ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (26:152) یعنی یہ جو نا ہمواری پیدا کرنے والے ہیں' ان کی کیفیت یہ

---

[1] اور اپنے لیڈروں کا کہا مت مانو' جو عدل وانصاف کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔850)۔

[2] ہمارے ہاں اسے پنجابی میں ''آڈ'' کہتے ہیں۔وہ یہ ''آڈیں'' بناتے ہیں۔

[3] یا کوئی اس پانی کو راستے میں ہی اس ''آڈ'' کو کاٹ کر اپنے ہی کھیت کی سیرابی کے لیے لے جائے تو اسے ''اسراف'' کہتے ہیں۔

[4] عدل وانصاف کی حدود سے تجاوز کرکے ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔850)۔

ہے کہ ''تمہیں جو پانی پہنچنا چاہیے تھا'' تم اسے وہاں تک نہیں پہنچنے دیتے' راستے میں ہی روک کر' کاٹ کر' اپنے کھیتوں میں لے جاتے ہو۔ ان کی تو یہ کیفیت ہے جبکہ دعویٰ تم ان کی اطاعت کا کرتے ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کیا کہنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ حکومت اس کا کیا جواب دیتی' یا جو بڑے تھے' وہ اس کا کیا جواب دیتے۔ عزیزانِ من! اس دور میں بھی اس کا کوئی جواب بن نہیں سکا۔ دیکھیے قرآن حکیم نے اس سلسلہ میں کہا ہے کہ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (26:153) انہوں نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں ابھی بتاؤں گا کہ نبی ہمیشہ قوم کے اونچے گھرانے کا فرد ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے آیت [1] ہے' اور بڑی عجیب آیت ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ تمہیں تو چاہیے تھا کہ تم ہم میں سے ہوتے' بڑے گھرانے کے آدمی ہو۔ ہمارے اس معاشی نظام کو اور زیادہ مضبوط کرتے لیکن تم خود ہی اس کی جڑ کاٹنے لگے ہو اور جو کچھ کر رہے ہو وہ سوائے اس کے کہ کوئی پاگل ہے جو اس قسم کا کام کر رہا ہے۔ ہم تو نہیں سمجھ سکتے۔ ''اس منڈے نوں کہو: او تیری کی مت ماری گئی اے' کی کرنا پیا ایں؟ قرآن کے کیا الفاظ ہیں! تہاڈی کی مت ماری گئی!'' [2]

ان مزارعوں کو کیا سکھا رہے ہو' ان غریبوں کو کیا پٹی پڑھا رہے ہو' پاگل ہو گئے ہو۔ ظاہر ہے نبی کی اس بات پر انہوں نے لبیک کہا ہوگا۔

معاشرے میں یہ کمزور اور غریب سرمایہ داروں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں

عزیزانِ من! یہ بات ٹھیک ہے کہ جن کے حق میں یہ کہا جا رہا تھا کہ ساری محنت تم کرتے ہو' صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کر دیتے ہو' سال بھر کے بعد جو تم پیدا کرتے ہو' یہ گھروں میں بیٹھے ہوئے اس کا آدھا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ارے! یہ اٹھا کر کیوں لے جاتے ہیں؟ ان کے مقابلے میں ان کی کمزوری کی وجہ یہی تھی۔ یہ نہیں تھی کہ یہ محنت نہیں کرتے تھے۔ محنت تو وہ کرتے تھے۔ دراصل انہیں کمزور کر دیا گیا تھا۔ قرآن کی کیا بات ہے! کہا کہ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (7:75) اس پر اُس قوم کے سرکش اکابرین نے' جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا' جماعتِ مومنین سے کہا۔ یہاں الملا الذین کے الفاظ آئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن ان کے لیے الملا یعنی سردار کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے پنجابی میں کہا: جناں دیاں کوٹھیاں

---

[1] یہ آیت یوں ہے: قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (11:62)۔ انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں (کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے اور ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اپنی قابلیت سے اس مذہب کو دور دور تک پھیلاؤ گے۔ لیکن تم نے اب ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو سہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو' ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 806-805)۔

[2] اس لڑکے کو صاف صاف کہہ دو: ابے! تمہاری سمجھ پہ پردہ پڑ گیا ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ قرآن کے کیا خوب الفاظ ہیں! تمہاری عقل پہ کیا ہی پردہ پڑا ہے!

دانے نال بھریاں ہویاں ہون۔ الملأ' سردار' جناں دے پانڈے بھرے ہوئے ہون۔ بھرے ہوئے دانیاں دی کوٹھیاں تو انہی کی ہوسکتی ہیں۔ ❶ قرآن نے "اسکتبروا" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ یہ جوان کا استکبار ہے' یا تکبر ہے' یہ رعونت تھی' فرعونیت تھی۔ یہ کس بنا پہ تھی؟ اس لیے کہ "کوٹھیاں دانے نال بھریاں ہویاں سن۔ اے دانے تے ایناں غریباں دے پیدا کیتے ہوئے سن ❷۔ کیا الفاظ ہیں! قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا (7:75)۔ یہ تو انہوں نے اُنہیں خود کمزور کر رکھا تھا' یہ بیچارے خود کمزور نہیں تھے۔ اتنی محنت کرنے والا کیسے کمزور ہوسکتا ہے۔ ان اوپر والوں نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ وہ تو ان کی محنت کا سارا ماحصل لے جاتے تھے اور اپنی کوٹھیاں دانوں سے بھر لیتے تھے۔ یہ نانِ شبینہ تک کے لیے محتاج ہوجاتے تھے۔ لہٰذا کمزور ہوگئے۔ قرآن نے وجہ بتادی۔ یہ وہ لوگ تھے لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ (7:75) جنہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی آواز پہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی آواز پہ لبیک کہا۔ وہ جو قوم کا "کمی" طبقہ تھا' جسے کمین کہتے تھے' انہوں نے حضرتِ ھود علیہ السلام کی آواز پہ لبیک کہا۔ محکوم طبقے نے حضرت صالح علیہ السلام کی آواز پہ لبیک کہا۔ یہ مزارعین کا طبقہ تھا' جو نیچے والا تھا۔ میں آج کی اصطلاح میں مزارعے کہہ رہا ہوں۔ ان کی تو ان سے بھی بری حالت ہوتی تھی۔ وہ Slavery (غلامی) کا دور تھا' غلامی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے لبیک کہا۔

دراصل یہ مخالفت انبیائے کرام کی نہیں تھی بلکہ خدا کے پیغام کی تھی

اب ان الملا یعنی مترفین' سردارانِ قوم نے یہ پوچھا کہ کیا تم اس کی باتوں میں آ گئے ہو؟ یہ کہا کہ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ❸ (7:75)۔ یہ چیزیں حضرتِ صالح علیہ السلام کے خلاف نہیں ہیں' بلکہ خدا کے پیغام پہ اعتراض ہو رہا ہے۔ بات تو ساری پیغام کی ہوتی ہے۔ جو انبیائے کرام علیہم السلام آتے ہیں' ذاتی حیثیت سے تو ان کے ساتھ کوئی عناد ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے معاشرہ کے معزز ترین اشخاص ہوتے ہیں۔ وہ جو پیغام دیتے ہیں' جو دعوت پیش کرتے ہیں' وہ دعوت ان کی نہیں ہوتی' خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ تو اسے پیش کرتے ہیں۔ یہاں کہا کہ کیا تم بھی اسی طرح کہتے اور سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے خدا کی طرف سے بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے؟ واہ! نہ کہیں دیکھا' نہ کہیں سنا۔ دوسرا یہ طبقہ جسے کمزور کر دیا گیا تھا' یا یوں سمجھیے کہ جسے وہ کمزور سمجھتے تھے' قرآن کے لفظ میں' فی الحقیقت وہ کمزور نہیں تھے۔ قرآن ایک لفظ استعمال کرتا ہے' جس میں یہ ساری بات آجاتی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام اونچے گھرانے کے افراد ہوتے ہیں۔

---

❶ جن کے گھر رزق کی فراوانی ہو۔ یعنی جن کی کوٹھیاں (بنگلے) اناج سے بھرے ہوں۔ الملاوہ سردار وہ ہیں جن کے گھروں میں رزق کی بہتات ہو۔ اناج سے بھری ہوئی کوٹھیاں' بنگلے تو انہی کے ہوسکتے ہیں۔

❷ ان کے ہاں رزق کی بہتات تھی مگر یہ بہتات تو ان غریبوں کے خونِ جگر کا نتیجہ تھی۔

❸ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 358)۔

معاشرے میں پہلے بھی ان کا مقام بڑا اونچا ہوتا تھا۔

عزیزانِ من! کہنے کی یہ بات اسی کو سجتی تھی جو آپ سید ہو اور یہ کہے کہ ''نہیں' جولاہا اور سید ایک ہوتا ہے''۔ اگر جولاہا یہ بات کہے کہ جولاہا اور سید ایک ہیں تو کہا جائے گا کہ جا جا بابا! بات ایسے نہیں ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! طاقت و دولت والا اگر کسی کو جھک کر سلام کرتا ہے تو بات ہوتی ہے۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام جو آ کر یہ کچھ کہتے تھے' اونچے طبقے کے تھے۔ انہیں ہم آج کی اصطلاح میں اوپر کا طبقہ (Elite Class) کہتے ہیں۔ اگر یہ نچلا طبقہ ہوتا تو فوراً اوپر کا طبقہ یہ بات کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے تمہاری اپنی زمین کہاں ہے جو یہ کہتے ہو کہ یہ اونچ نیچ مٹا دو۔ اب یہاں وہ کہہ رہا ہے جسے باپ کی طرف سے خود وراثت میں اتنی جاگیر مل رہی ہے' ممتاز گھرانے کا آدمی ہے کہ تمہیں انہیں کمین کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے' وہ ان سے کہتا ہے کہ تم درمیان میں یہ کرنے والے کون ہوتے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کو اونچے گھرانے میں کیوں پیدا کیا جاتا تھا۔ اب وہ آیت سنیے۔ کہتے ہیں کہ **قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ** (11:62) انہوں نے کہا کہ اے صالح! تمہارے ساتھ تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں' ہم تو کہتے تھے کہ اللہ کا شکر ہے کہ قوم میں ایک بڑا ہونہار بچہ پیدا ہو رہا ہے' بڑا ذہین' بڑا فطین بچہ ہے۔ عزیزانِ من! ایسے نظر آتا ہے کہ قرآنِ کریم نے اس ایک لفظ میں یہ بات بتا دی کہ حضرت صالح علیہ السلام خود کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہمیں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ان کی امیدوں پہ پانی کیسے پھر رہا ہے؟ کہا کہ یہ بات جو تم کہہ رہے ہو' نہ ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی سنی' نہ دیکھی۔

عزیزانِ من! قرآن ان کی وہی ایک دلیل دیتا چلا آ رہا ہے کہ یہ تو ہماری موروثی زمین ہے' ہم نے یہ وراثت میں پائی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ تمہیں ان زمینوں پر کیا حق ہے' ذرا پیچھے چلے جاؤ تو وہ جو پہلا انسان تھا اس نے تو کہیں سے وراثت نہیں پائی تھی۔ اب سوچو کہ اس نے یہ کیسے لے لی تھی۔ تمہاری یہ دلیل تو ختم ہو جاتی ہے۔ برادرانِ عزیز! میں نے کہا تھا کہ یہ سارا قصہ ہی برادری اور نسل کا قصہ ہے۔ برادری و نسل سے وراثت آئی لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ **اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ** (11:62) کیا ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں؟ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو' ہمارے دل میں تو اس کی وجہ سے بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے تو انہیں پرستش سے روکا ہی نہیں ہے۔ یہ تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد جس نظام' شعار اور مسلک پر چلے آ رہے ہیں' تم اُس سے روک رہے ہو۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ تو معاشرے کے اندر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ نظام آج کا نہیں ہے۔ یہ تو صدیوں سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ تم اس نظام کو الٹنا چاہتے ہو۔ ہمیں تو تم سے بڑی توقعات تھیں۔

میں نے یہ گزارش کیا تھا کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ اگر داستان بیان کرتا ہے تو وہ بچوں کی طرح کہانی نہیں سناتا۔ بچے تو ذرا ذرا سی Detail (تفصیل) بھی نانی اماں سے پوچھتے ہیں کہ نانی اماں! پھر وہ لال بیگ کتھے گیا [1]۔ یہاں یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو دانا و سمجھدار آدمی کو بات سناتا ہے، ساری کڑیاں نہیں بیان کرتا۔ ایسے بیان کرتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں خود بخود ذہنِ انسانی مرتب کیے چلا جاتا ہے۔

معاشرے کی تمام ناہمواریاں دارالسلطنت میں بیٹھے چند ایک سرغنوں کی وجہ سے ہوتی ہیں

یوں نظر آ رہا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف معاشرے میں طوفان مچ گیا، مخالفین نے وہ ہجوم لا کھڑا کیا کہ طوفان برپا ہو گیا۔ انہوں نے سب میں Agitation (اشتعال) برپا کر دیا۔ اس پر حضرت صالح علیہ السلام نے خدا سے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا ہجوم، یہ مکھیوں کا چھتہ، جو انہوں نے مجھ پہ چھوڑ دیا ہے یعنی ان لوگوں کو اس قدر زیادہ مخالفت میں ابھار دیا ہے، تو میں کس کس کی اصلاح کروں گا؟ یہ مقابلہ کرنا تو میرے بس کی بات نظر نہیں آتا۔ سنیے عزیزانِ من! یہ کوئی انہی کی داستان بیان نہیں ہو رہی، آج کی بھی ہو رہی ہے۔ انہیں کہا گیا کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ جو تمہیں اتنا ہجوم نظر آتا ہے یا یہ جوان کے پاس محافظ کھڑے ہو گئے ہیں، یہ وہ بالکل کچھ نہیں ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ **وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ** (27:48) بات یہ ہے کہ یہ جو Capital City یعنی دارالسلطنت ہے، اس میں ۹ بڑے بڑے سرغنے ہیں جن کے ذمے معاشرے کا نظم و نسق ہے۔ وہی تمام شرارتوں کی جڑ ہیں، بس ان کا علاج کر لو تو ان سب کا علاج خود ہی ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے اور قومِ ثمود کی داستان سنا رہا ہے۔ حضرتِ صالح علیہ السلام کی کم از کم بھی تاریخ کہیے تو قریباً یہ پانچ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یہ قرآن آج کی بات سنا رہا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام سے کہا کہ ڈرتے کیوں ہو؟ کہ ''جسمِ قوم پہ چیچک کے اتنے سارے دانے نکلے ہوئے ہیں، میں کہاں کہاں مرہم لگاؤں گا، میں تو تھک جاؤں گا۔'' کہا کہ بات یہ نہیں ہے۔ یہ تو خون کا فساد ہے۔ خون کے جراثیم مارنے کے لیے ایک انجکشن دیجیے، سارے کے سارے ٹھیک ہو جائیں گے۔ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ مدینہ یعنی جو کیپٹل سٹی ہے، جو ان کا بڑا دارالسلطنت ہے، بس ان کی یہ ساری بحث وہاں سے ہی ہے کہ **يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ** (27:48) وہ فساد کا منبع ہیں، وہ اصلاح نہیں ہونے دیتے۔ بس ایک ہی بات ہے، جو کرنے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کا دارومدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار اور نظم و نسق ہوتا ہے۔ وہی عوام کو بگاڑتے ہیں اور انہی کے سنوارنے سے معاشرہ سنورتا ہے۔ اب تک جھگڑے ہوئے، معیاد بھی لے لی، باہمی مذاکرات بھی ہوئے، ہر مرحلے پہ یہ اکھڑتے ہی چلے گئے۔ ان کے پاس کوئی دلیل

---

[1] پھر وہ لال بیگ کہاں گیا؟

ہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے یہ دھاندلی کی ہوئی ہے۔ دھاندلی تو ہوتی ہی یہ ہے جو قاعدے قانون کے بھی مطابق نہ ہو اور دلیل وبصیرت کے مطابق بھی نہ ہو۔ اس کی Support (مدد) میں آپ کوئی دلیل نہیں دے سکتے۔

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ وہاں اس دھاندلی کا جواب کیا ملتا ہے؟ قرآن ایک فقرے میں جواب دے جاتا ہے۔ چونکہ جس نظامِ عدل کی طرف حضرت صالحؑ دعوت دیتے تھے اس سے ان ارباب اقتدار کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی' اس لیے وہی سب سے زیادہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی' اور مل بیٹھے۔ قرآن کہتا ہے کہ **قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ** [1] (27:49)۔ انہوں نے کہا کہ لو بھئی! سارے قسم کھاؤ کہ یہ بات باہر نہیں نکلے گی۔ آج کی تاریخ میں یا تو اس کے گھر پہ چھاپہ مارو' اس کے سب گھر والوں کو تہ تیغ کر دو اور صبح کو قسمیں کھالینا کہ بھئی! ہمیں پتہ ہی نہیں' ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس نے مارا ہے۔ وہ ادھر یہ کچھ کر رہے تھے مگر اُدھر سے ہم بھی کچھ تدبیریں کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی قوت کے نشے میں مدہوش تھے۔ اس لیے ان کے شعور میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ [2] یہاں آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ کچھ کہنے کے بعد باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔ کیا بات ہے قرآن کی داستانوں کی! عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب داستانیں ہیں۔ اگر قرآن کی داستانوں پہ آ جائیں تو دوسری تمام داستانیں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ سنیے! قرآن کیا بات کہتا ہے۔

نوعِ انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل میری اور تیری کی تفریق مٹانے میں مضمر ہے

آج یہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں معیشت کا مسئلہ حل نہیں ہوتا' تو اس کے حل ہونے کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟ اس پہ دو الفاظ ہیں اور سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ چراگاہیں ہیں' زمین ہے' ان میں کھیتیاں ہیں۔ اب ان سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ہماری ہیں تو بتاؤ کہ یہ تمہاری کس طرح سے ہیں؟ پھر اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہماری بھیڑیں تو آ کر اسمیں پانی پی لیں مگر ان کی بھیڑیں نہیں پئیں گی۔ ہماری اور ان کی بھیڑوں کی یہ تفریق کیسے ہوئی؟ غور کیجیے گا کہ کیا بات ہو رہی ہے؟ پہلی تفریق تو یہ ہے کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ''ہماری زمینیں اور چراگاہیں ہیں' ان کی نہیں ہیں'' تو یہ کیسے ہے اور پھر یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ''ہماری بھیڑیں ہیں' یہ ان کی بھیڑیں ہیں'' تو سوال یہ ہے کہ جب بھیڑ پیدا ہوتی ہے' تو کیا اس کی اون پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ ''فتو دی بھیڑ ہیگی اے' تے اے چوہدری فتح اللہ

---

[1] آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر' صالح علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے اور ہم مقتولین کے ورثاء کے سامنے مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں ہلاک ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص871)۔

[2] وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (27:50) وہ ادھر یہ تدبیر سوچ رہے تھے اور ہم اپنے قانونِ مکافات کی رو سے ایک اور تدبیر کر رہے تھے جس کا انہیں شعور واحساس تک نہ تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 871)۔

دی بھیڑ ہیگی [1] ۔ یہ کہا کہ ان ساری چیزوں کی نسبتیں تم نے خود قائم کر لی ہوئی ہیں۔

میری اور تیری کی اور خود تمہاری قوم کی بھی خود قائم کردہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ چوہدری فتح اللہ کی بھیڑیں ہیں۔ بھیڑ کو اگر فتح اللہ کی نسبت سے الگ کر دیا جائے تو وہ تو بھیڑ ہی ہوتی ہے اور اسی طرح اگر فتو جولاہے کا نام بیچ سے نکال دیں تو ان بھیڑوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ تو بھیڑیں ہوتی ہیں۔ کہا کہ یہ ساری تباہی اس میری اور تیری کی نسبت نے پیدا کی ہوئی ہے۔ تم نے یہ چوہدری صاحب کی بھیڑیں، یہ فتو کی بھیڑیں اور دوسری طرف یہ چوہدری صاحب کی چراہ گاہ اور یہ فتو بیچارے کی، کہہ کر تباہی مچائی ہوئی ہے۔ کہا کہ یہ اتنا سا، اس کا ہے ہی نہیں، بلکہ یہ تفریقات جو تم نے اپنے ہاں زمینوں کے اندر بھی اور ان مویشیوں کے اوپر بھی پیدا کی ہوئی ہیں، یہ سارا فساد ان کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سنیئے، عزیزانِ من! اپنے ان چار الفاظ کو لکھ رکھیے۔ قرآن حکیم کا کہنا ہے کہ یہ جو درمیان میں نسبتیں ہیں، ان نسبتوں کو مٹا دو۔ یہ انسانوں کی خود وضع کردہ ہیں۔ اب ان کی مصالحت ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک معاہدہ ہوا ہے۔ اس معاہدے میں کیا چیز لکھی گئی ہے؟ عزیزانِ من! سنیے اور جھوم جایئے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ایک روشن مثال

میں نے یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے ابدی طور پر معاشی نظام (Economic System) کا حل بتا دیا ہے۔ کہا کہ **هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ** (7:73)۔ یہ ایک اونٹنی ہے۔ یہ نہ چوہدری فتح اللہ کی ہے، نہ یہ فتو جولاہے کی۔ کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کرنی۔ یہ صرف اونٹنی ہے بس اونٹنی ہے۔ البتہ یہ کہو کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور جب بھی آپ اللہ کی کوئی چیز کہہ دیں گے تو انسانوں کی نسبت اور ملکیت اس سے نکل جائے گی، ورنہ اس کی نسبت کچھ بھی کہیں گے تو اس میں کسی نہ کسی انسان کی بات آ جائے گی۔ یہ اگر چوہدری فتح اللہ کی نہیں ہے تو یہ منتقل ہو کر کسی دوسرے انسان کی طرف آ جائیگی، دوسرے کا مال کسی دوسرے کی طرف چلا جائے گا، انسان کی طرف نسبت رہے گی اور جونہی آپ نے یہ کہا کہ نہیں، یہ اللہ کی ہے تو پھر انسانوں کی ملکیت کا سوال اٹھ گیا۔ انسانوں کی نسبت سے ہی ملکیت ہوتی ہے ورنہ ملکیت کچھ شے نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ دو چیزیں یاد رکھو: ایک تو یہ جو تم نے مویشیوں کی نسبتیں مقرر کر رکھی ہیں کہ یہ اُن کی بھیڑیں ہیں اور وہ ان کی بھیڑیں۔ ان کی اور اُن کی کیا بھیڑیں؟ یہ تو **نَاقَةُ اللّٰهِ** (7:73) ہے۔ اللہ کی اونٹنی ہے۔ **فَذَرُوْهَا** (7:73) جو پابندیاں تم نے عائد کر رکھی ہیں وہ پابندیاں اٹھا دو، انہیں چھوڑ دو، تا کہ **تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ** (7:73) اللہ کی زمین ہے، اس کے اوپر اللہ کی اونٹنی کو چھوڑ

---

[1] یہ فتو کی بھیڑ ہے اور وہ چوہدری فتح اللہ کی بھیڑ ہے۔

دو' تا کہ یہ بھی کھائے۔ بات ختم ہوگئی۔ ارض اللہ کہنے سے انسانوں کی ساری ملکیت کا تصور ختم ہوگیا۔ کہا کہ ملکیت کچھ نہیں ہوتی۔ تم اس کی نسبت مقرر کر لیتے ہو' اس کی یہ اضافت ہوتی ہے۔ درمیان کی یہ اضافت اٹھا دیجیے ملکیت کا تصور ختم ہو جائے گا: اللہ کی زمین' اللہ کی مخلوق۔ اللہ کی مخلوق کو اللہ کی زمین میں چھوڑ دو۔ یہ جو تم نے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں ان کو ہٹا دو۔ بس ٹھیک ہے' اللہ کی زمین' اللہ کی مخلوق: چلے پھرے کھائے۔ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا کہ یہ تم ہمارے کھیت میں آ گئے۔ یہ جو ہمارے کھیت میں' دوسرے کا بیل آ تا ہے' تو پتہ ہے' وہ لاٹھی مار مار کر اسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ خبردار! اگر اس کو تم نے Touch (مس) بھی کیا۔ خدا کی زمین میں' خدا کی اونٹنی ہے وہ چرے گی۔ اگر تم نے یہی نسبتیں قائم رکھیں تو یاد رکھیے پھر ایسی دردناک تباہی آئے گی کہ اس کا مداوا کوئی نہیں کر سکے گا۔ یہ تفریق ابدی نہیں رہ سکتی۔ یہ ہے' عزیزانِ من! سارے معاشی نظام کا بنیادی نکتہ: خدا کی اونٹنیاں' خدا کی زمین۔ حضرتِ صالح علیہ السلام نے اپنے دور کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کے متعلق حضور کی ایک حدیث

نبی اکرم ﷺ کی ایک روایت (ابوداؤد کی) ہے۔ وہ صحیح حدیث پتھروں کے اندر بھی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عزیزانِ من! اسی عنوان پہ حضور اکرمؐ نے یہ فرمایا کہ اللہ کی زمین' اللہ کے بندوں کے لیے خالی چھوڑ دو۔ انہوں نے [1] صرف ناقۃ اللہ کہا تھا' حضور ﷺ نے عباد اللہ کہا: اللہ کے بندے' اللہ کی زمین۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہے اس پر مبنی حضور ﷺ کا ارشاد۔ حضرت صالح علیہ السلام کے سلسلے میں یہاں سمجھوتا نظر آتا ہے۔ وہ مجبور ہوگئے تھے۔ انہوں نے سمجھوتا کر لیا' دستخط کر لیے' لیکن اس پر کیسے قائم رہتے۔ یہی تو چیز تھی کہ وہ ان مجبوریوں سے سمجھوتے کر لیتے ہیں مگر اس پر کاربند نہیں رہتے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ** (91:13) ان کے رسول نے ان سے کہا تھا کہ **نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيَاهَا** [2] (91:13)۔ اللہ کی اونٹنی ہے' تم باریاں مقرر کر لو۔ اگر تم کہتے ہو کہ اس چشمے پہ جگہ تھوڑی ہوتی ہے' سب کی سب ایک وقت میں پانی پینے کے لیے نہیں آ سکتیں' تو ان کی باریاں مقرر کر لو۔ یہ باریاں یکساں ہونگی' ان سب کی نسبت کسی کی طرف نہیں ہوگی۔ یہ کہہ لو کہ اتنی بھیڑیں ہیں' ایک وقت میں فلاں چشمے پہ اتنی بھیڑیں آئیں گی' فلاں چراہ گاہ پہ اتنی بھیڑیں آئیں گی۔ بس یوں باریاں مقرر کر لو۔ یہ سب کچھ طے ہوگیا' دستخط ہوگئے' لیکن یہ دستخط پر کیسے قائم رہ سکتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ انسان کا خون نمکین ہوتا ہے اس لیے اگر کسی درندے کو اس کا خون لگ جاتا ہے تو پھر وہ کسی دوسرے کا خون پیتا ہی نہیں ہے۔ انسان ہی کو

---

1. یہ اشارہ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف ہے۔
2. یہ ''خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی ہے۔'' اسے اس کی باری پر پانی پینے دو (26:155; 7:73) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1454)۔

تلاش کرتا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں لیکن انسان کا خون منہ کو لگا ہوا ہو تو پھر چھٹتا ہی نہیں۔ کسی مجبوری کے ماتحت' انہوں نے یہ معاہدہ تو کر لیا لیکن **فَكَذَّبُوْهُ** (91:14) معاہدے کو جھٹلا دیا اور **فَعَقَرُوْهَا** (91:14) آخر کار اونٹنی کو مار مار کے جان سے ہی مار دیا۔

طبقاتی نظامِ حیات کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی ہے

عزیزانِ من! قرآن درمیان کی تفاصیل نہیں دیتا کہ پھر آخر میں اس طبقاتی نظام کی تباہی کس طرح آتی ہے۔ دو الفاظ سنیئے' سارا مسئلہ زمین کا تھا' جس پہ انہوں نے اپنے قبضے جما رکھے تھے۔ اسی سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوئی تھیں' اونچ اور نیچ پیدا ہوئی تھی۔ قرآن تفصیل میں گئے بغیر انجام بتاتا ہے۔ کہا کہ انہوں نے یہ کچھ کیا' اپنا نظام اسی طرح سے قائم رکھا۔ اس معاہدے کے اوپر بھی قائم نہ رہے مگر یہ طبقاتی تفریق اور شدید ہوتی چلی گئی۔

اس معاہدے کے بعد کیا ہوا؟ میں نے کہا ہے کہ سارا مسئلہ زمین کا تھا اور اونچ نیچ کا تھا۔ قرآن استعارے میں بات کیا کرتا ہے۔ اس کے انجام کے متعلق کہا کہ **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ** [1] (91:15) ہم نے ان کے اوپر روڈ رولر پھیر دیا۔ یہ یونہی دھاندلی سے نہیں کیا تھا **بِذَنْبِهِمْ** (91:15) ان کے جرائم کی بنا پر کیا تھا اور اس کے نتیجے میں **فَسَوّٰهَا** (91:15) ساری زمین ایک جیسی ہوگئی' دمدمہ آ گیا یعنی روڈ رولر پھیر دیا' یہ طبقات ختم ہو گئے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ یہ ہیں: **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ** (91:15)۔ ان الفاظ میں کیا بات ہے! آپ دیکھیے کہ صوتی اعتبار سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ ایک گرج سی ایسے آ رہی ہے' جیسے وہ روڈ رولر چلنے کی آواز ہے: **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ** (91:15) یہ کچھ دھاندلی نہیں' بلکہ ان کے جرائم کی وجہ سے ہوا۔ جرائم تو ہم ذنب کا ترجمہ کرتے ہیں۔ عربی زبان میں ''ذنب'' کی بات ہی وہ ہوتی ہے ''جو چیز کسی کے پیچھے لگی ہوئی ہو''۔ دُم کو ''ذنب'' کہتے ہیں کہ پیچھے چپکی ہوئی جہاں جائے' ساتھ جائے' تو اس قسم کے غلط نظام کے انجام باہر سے نہیں آتے بلکہ اس کے نتائج تو اس کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اس کے پیچھے چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔

ظہورِ نتائج کے وقت خدا کا ہاتھ کانپتا ہی نہیں

ظہورِ نتائج کے وقت یعنی' **ذَنْبِهِمْ** اور اس کا نتیجہ **فَسَوّٰهَا** (91:15) انہیں تہس نہس کر کے' زمین کے ساتھ ہموار کر کے' رکھ دیتا ہے' انہیں پیس کر خاک راہ گزر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ طبقاتی امتیازات ختم کر کے ساری زمین یکساں کر دی جسے آپ کہتے ہیں کہ اونچ

---

[1] خدا کے قانونِ مکافات کا دمدمہ آیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1454)۔

نیچ کو Level (ہموار) کر دیا۔ اور سنیے، عزیزانِ من! یہاں کہنے کے بعد یہ کہا کہ **وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا** [1] (91:16)۔ جب کسی کے جرائم کے نتیجے میں یہ تباہیاں آتی ہیں تو پھر خدا کا ہاتھ کانپا نہیں کرتا۔ جب وہ ہاتھ ڈالتا ہے پھر وہ کسی بھی چیز سے ڈرتا نہیں ہے کہ کیا ہوا۔ کہا کہ یہ ہوتا ہے انجام، اس قسم کے غلط نظام کا، جس میں یہ طبقاتی تفریق پیدا کر دی جاتی ہے۔ یہ تیسری چیز آ گئی۔

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ وہ اختلافات کیا تھے جن کو مٹانے کے لیے انبیائے کرام آتے تھے۔ ہم تو اپنے ہاں یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اختلافات کچھ ایسے ہی تھے کہ کوئی نبی آ گئے یا اگر کوئی نبی آتے تو یہ کہتے تھے کہ آمین اونچی آواز سے نہیں کہنا چاہیے، نیچی آواز سے نہیں کہنا چاہیے، یہ اختلاف مٹا دیتے اور یہ بھی کہ ہاتھ یہاں نہیں، یہاں باندھنے چاہئیں۔ یعنی وہ آ کر اس قبیل کے اختلاف مٹا دیتے تھے جب کہ وہ تو غلط نظام کو مٹانے کے لیے آتے تھے۔ اسی لیے کہا کہ **فَسَوّٰىهَا** (91:15) ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں تہس نہس کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔ وہ یہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ عزیزانِ من! وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری تھی۔ اس میں انسانوں نے اختلافات پیدا کیے، انبیاء آئے اور انہوں نے کتاب کے ذریعے اختلافات کو مٹانا شروع کیا اور اس طرح اب یہ داستانیں ہمارے سامنے آئیں کہ وہ اختلافات، تفرقے اور تفریقات، طبقات کیا تھے، جنہیں مٹانے کے لیے یہ حضرات آتے تھے۔

پورے کا پورا نظامِ دین انہی تفرقوں کو مٹانے کی وضاحت میں مضمر ہے

آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہوگا؟ وہ تو یہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے جو کچھ نوح علیہ السلام سے کہا تھا، وہی کچھ اصولی طور پر حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ ہم نے ہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی کچھ کہا تھا۔ یہ باتیں حضرتِ نوح علیہ السلام، حضرت ھود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کی نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے، وہ ہدایت یا ضابطہ قوانین ہیں۔ یہ تو اس کے مختلف ٹکڑے بیان ہو رہے ہیں اور وہ سارے کے سارے یہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک آ کر مکمل ہو گئے اور کہا کہ **وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** (6:116) آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ان کی کتاب کے اندر آ کر یہ سارے ضابطے مکمل ہو گئے۔ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:116) اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ نے یہ دیکھنا ہے کہ وہ اسلامی نظام اور اقامتِ دین کیا چیز ہے تو وہ یہاں سے دیکھیے جو قرآنِ کریم نے خود انبیائے کرام علیہم السلام کی داستانوں میں بیان کیا ہے۔ یہی جب آپ

---

[1] اور ایسا کرتے وقت وہ اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے کہ یہ بات، ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آ گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1455)۔

آخر میں نبی اکرم ﷺ کے دور کے اندر دیکھیں گے تو یہ تکمیل تک پہنچے گا۔ یہ نظام ایک ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے ہاتھوں سے متشکل ہو کر سامنے آ گیا۔ لہٰذا یہ ہے وہ دین جس کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام آیا کرتے تھے۔

معاشرے میں طبقاتی تفریق پیدا ہونے کی وجہ اور اس کی اصلاح

اب آگے وہ بات آ گئی جس کے بعد ہم آج کا یہ درس شروع کر رہے ہیں۔ پہلے کہا تھا کہ یہ طبقاتی تفریقات کیوں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے بعد باوجود اتنا کچھ سمجھانے کے یہ مٹتی کیوں نہیں ہیں' لوگ پھر وہی کچھ کیوں کرنے لگ جاتے ہیں' بتایا کہ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے اور اسی پہ اصلاح کا سارا دار و مدار ہے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں جو قانون بناتے ہیں' جو معاہدے پہ دستخط کرتے ہیں' پھر اس معاہدے کو توڑ کیوں دیا جاتا ہے؟ اس میں بنیادی بات جو سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک مسئلہ کی حیثیت سے ''آخرت'' پر رکھ چھوڑا ہے۔ یعنی وہ آخرت پہ ایمان ہے۔ ایمان کے پانچ اجزاء ہیں' ان میں ایک ''ایمان بالآخرت'' بھی ہے۔ بس یہ ایک لفظ ہے جو ہم بول دیتے ہیں۔ انسانی ذہنیت (Human Mentality) کی ساری بنیاد یہ ہے کہ آپ کے ہاں زندگی کا تصور کیا ہے؟

میں نے شروع میں یہ کہا تھا کہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسانی بچہ اور حیوانی بچہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو اس بچے کی ساری زندگی فزیکل لائف (طبعی زندگی) ہوتی ہے: طبعی زندگی یعنی جسم کی زندگی' کھانا پینا' اس کی پرورش۔ یہ سب کچھ حیوانی سطح کے مطابق ہوتا ہے' اس کے اندر افزائشِ نسل کا جوہر رکھا ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے۔ ایک وقت کے بعد تارِ نفس کی یہ مشینری چلنے سے بند ہو جاتی ہے' اور یہ مر جاتا ہے۔ حیوان تک تو یہ چیز چل سکتی ہے کیونکہ اس نے اپنی ساری زندگی میں کوئی جرم اور گناہ نہیں کیا ہوتا' وہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ انسان بھی اسی طرح ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' جیسے وہ حیوان کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد چونکہ وہ انسانی بچہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے' قدم قدم کے اوپر یہ گناہ کرتا ہے' جرائم کرتا ہے' استحصال کرتا ہے' سلب و نہب کرتا ہے۔ یعنی یہ سارا کچھ کرتا ہے جو حیوان نہیں کرتا۔ یہ کون سی چیز ہے جو اسے اس سے روک سکتی ہے؟ یہ آپ کے ہاں کے معاشرتی قوانین ہیں۔ یہ وہی ہیں' جنہیں تمدنی قوانین یا سوسائٹی کے قوانین کہتے ہیں۔ سوسائٹی کے قوانین نے تو یہ اطلاع کر دی ہے کہ یہ کچھ آپ نے جرائم کیے۔ اگر آپ کے ہاں اپنا ملک نہیں ہے' تو آپ دنیا بھر کے ممالک لے لیجیے اور بتائیے کہ وہ کون سا ملک ہے' جہاں یہ قوانین موجود نہیں ہیں کہ دھوکا دینا بڑا جرم ہے' چوری کرنا جرم ہے' جھوٹ بولنا جرم ہے' دوسرے کو ستانا جرم ہے' دوسرے کی چیز دھاندلی سے لینا جرم ہے۔ بتائیے کون سا ملک ہے' کون سی قوم ہے' جہاں یہ قوانین نہیں ہیں اور پھر یہ بھی بتائیے کہ کیا کوئی ملک بھی ایسا ہے جس میں یہ جرائم نہ ہوتے ہوں؟ یہ جرائم کیوں نہیں مٹ رہے؟ جیسا کہ میں مثال دیا کرتا ہوں: بیل کو بھوک لگتی ہے' وہ باہر چلا جاتا ہے۔ جو کھیت پہلے سامنے آتا ہے اس میں منہ مارتا ہے۔

وہ کھیت اپنے مالک کا ہو یا دوسرے کا ہؤا سے اس سے غرض ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان دونوں میں تمیز کرے۔ لہٰذا اگر انسان کی زندگی بھی حیوان کی زندگی کے لیول پر ہے تو وہ بھی یہی کچھ کرے گا۔

انسانی سطح کا تصور ہی معاشرتی مصائب و آلام کا حل ہے

انسان بیل نہیں ہیں' ان سے قومیں بنتی ہیں۔ ان کم بختوں کی کیفیت بیل سے کم نہیں۔ یہ اپنے کھیت کے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی کاٹتا ہے۔ حیوان تک تو یہ چیز گناہ یا جرم نہیں ہے۔ اس چیز کو انسان نے آ کر جرم قرار دیا ہے۔ یہ بھی ہر معاشرے نے قانون بنایا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اور قانون اسے روک نہیں سکا۔ سوال یہ ہے کہ قانون اسے کیوں نہیں روک سکا؟ اس لیے کہ انسانی زندگی' حیوانی زندگی قرار پا گئی۔ یعنی کھانا پینا' عیش کرنا' بچے پیدا کرنا' ان کے لیے کچھ چھوڑ جانا اور اس کے بعد مر جانا۔ اگر Concept of Life (تصور حیات) یہی ہے تو کوئی اصلاح انسانی زندگی میں ہو ہی نہیں سکتی۔ حیوانی زندگی ہؤ اور اس کم بخت کو قوتیں لا انتہا ملی ہوں' تو شیر کسی کو' کیا پھاڑے گا' جو انسان پھاڑتا ہے۔ اس کو قوتیں اتنی مل گئیں اور ذہن ہوا' حیوانی لیول کا' عزیزانِ من! پھر سوچیے تو سہی' ذرا نظر تو دوڑایئے' ہمارے سامنے اس سے کوئی زیادہ لائف کا تصور ہے؟

تمدنی سوسائٹی کے قانون کا لحاظ صرف وہ کرتا ہے' جسے ڈر ہوتا ہے کہ میں پکڑا جاؤں گا تو کوئی چھڑا نہیں سکے گا۔ جو صاحبِ اثر نہیں ہے' صاحبِ سفارش نہیں ہے' کوئی دولت نہیں کہ رشوت دے سکے' تو وہ غریب مارا جاتا ہے۔ جن کے پاس یہ سہارے ہوتے ہیں' وہ دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کو کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ ان پر کوئی ہیئت حاکمیہ بھی ہے۔ جو صاحبِ اثر و رسوخ ہوتے ہیں وہ قانون ہی بدل دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! اگر اس کے برعکس Concept (تصور) یہ ہو کہ انسان کی زندگی' حیوانی طبعی زندگی کی طرح نہیں ہے تو اس میں یہ ہوتا ہے' کہ اس کا ایک رول ہے جس میں اس کا ایک ایک عمل' ایک ایک فعل' حتیٰ کہ قرآن کے الفاظ میں دلوں میں' گزرنے والے خیالات تک نتیجہ پیدا کر کے رہتے ہیں' خواہ وہ سوسائٹی کی گرفت میں آئے یا نہ آئے یہ بھی کہ اور اگر یہ چاہے کہ یہاں سے مر جانے کے بعد چھوٹ جائے تو یہ نہیں چھوٹ سکتا کیونکہ اس تصور کے لحاظ سے اسے معلوم ہے کہ مر جانے سے اس کا جسم تو مر جاتا ہے' یہ نہیں مرتا' جس نے یہ کچھ کیا تھا۔ اگر آپ کا ارادہ نہ ہو تو یہ جسم تو کچھ کرتا ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کا ارادہ ہی نہ ہو تو آپ کا ہاتھ اسے چرا ہی نہیں سکتا۔ یہ ارادہ ہاتھ تو نہیں کرتا' ارادہ تو ''میں'' (I-am-ness) کرتا ہے۔ میں نے یہ کہا کہ اس ''میں'' نے یہ ارادہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ بس یہ ہے فرق انسان میں اور حیوان میں۔ آپ سمجھ لیجیے' عزیزانِ من! کفر اور ایمان کا فرق ہی یہ ہے۔

یہ جسے آپ خدا پہ ایمان لانا کہتے ہیں' تو وہ بات تو عملاً یہ ہے یعنی انسان کا اپنی ذات پہ ایمان لانا' اس بات پہ ایمان لانا کہ میری

زندگی حیوانی زندگی نہیں۔ یہ ایک اور ''چیز'' ہے جس پر میرے ہر عمل اور ہر فعل کا نتیجہ ثبت ہو کر رہتا ہے۔ وہ ایک اسٹور ہاؤس ہے' وہ ایک ''لوح'' ہے جس پہ انسان کے ہر فعل وعمل کا وہ نقش ثبت ہوتا چلا جاتا ہے جو اس کے مرنے سے نہیں مٹتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں یہاں معاشرے کے جرائم سے بچ بھی جاؤں تو یہ ''میں'' اس کے باوجود نہیں مٹتی حتیٰ کہ معاشرہ بھی اگر کسی جرم کی سزا دیتا ہے تو دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے کسی چیز کے چرانے کا ارادہ کیا' سامنے بیٹھے رہے' وہ بھی بیٹھا رہا' جس کی چیز تھی۔ گھڑی میز پہ رکھی تھی۔ ذہن میں یہ تھا کہ یہ کہیں ادھر ہٹ کر جائے تو میں اس گھڑی کو لے جاؤں' وہ ہٹ کر نہیں گیا' آپ نے اسے چرایا نہیں' تو یہ کسی قانون کی رو سے جرم نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جو انسانی زندگی کے اندر ایک شے ہے جسے میں نے ابھی کہا کہ قرآن اسے ''میں'' کہتا ہے' یہ اس ''میں'' نے جرم کر دیا۔ سوسائٹی تو صرف اسے سزا دے سکتی ہے جو جرم اس کی گرفت میں آتا ہے۔ میں نے Actually (حقیقت میں) کوئی چیز چرائی تو وہ اس کی نگاہ میں جرم ہے۔ وہ اس کی سزا تو دے گی یعنی یہ جو آپ ارادے کرتے ہیں سوسائٹی کے قانون کی گرفت میں یہ بات نہیں آتی اور پھر آپ اس میں کامیاب بھی نہیں ہوتے' تو یہ تو قانوناً جرم ہی نہیں ہے لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ یہ جرم وہ خود اپنے خلاف کرتا ہے' جب وہ اس کا ارادہ کرتا ہے۔ قرآن اس کے اس ارادے کو اس کے جرم کی بنیاد کہتا ہے: وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ [1] (22-45)۔ یہ تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس کی چوری کر لی ہے۔ نہیں' تم نے اپنے اس ارادے سے کچھ اپنی چوری کی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اس پہ زیادتی کی ہے۔ نہیں بلکہ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (16:118) اپنے آپ پہ کچھ زیادتی کی ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں اور جسے اقبال ؒ (1877-1938) نے مجذوبِ فرنگی کہا ہے' وہ نیٹشے (Nietzsche, Friedrich 1844-1900) ہے۔ بڑی عجیب شخصیت ہے' خدا کا منکر ہے۔ لیکن سوچیے بات کیا کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو جرم تم نے میرے خلاف کیا تھا' اسے تو میں معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے خود اپنے خلاف کیا' اسے کون معاف کرے گا' اسے تو میں بھی معاف نہیں کر سکتا۔

جہانِ فردا کی تصویر کشی: بآواز بلند اپنے جرم کا اعتراف

وہ جرائم جو انسان کی ذات اپنے ساتھ لے کر آگے چلتی ہے' کبھی فرصت ہوئی تو وہ بھی سمجھاؤں گا کہ یہ کیا ہے؟ آگے اور پیچھے کا سوال ہی نہیں ہے۔ زندگی مسلسل چلتی ہے۔ یہی جو ذاتِ انسان ہے' یہ اپنے تمام اعمال کے نتائج کو' اپنے اندر لیے ہوئے' خود چلی آتی ہے۔ کہاں چلی آتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ عدالت کی طرف خود چلی آتی ہے۔ یہ کیا ہی خوب بات ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو گرفتاری

---

[1] ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ برآمد ہو جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1169)۔

کے لیے پیش کر دیا۔ پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں سے جو چلے گئے تو قصۂ زندگی ختم ہوا۔ سن رکھیے' یہ قصہ ختم نہیں ہوا بلکہ تمہارے معاشرے سے چل کر یہ قصہ زندگی ہماری عدالت کے اندر آ گیا۔ کس طرح سے آ گیا؟ اس کے لیے کہا کہ وہ اس کا جو اعمال نامہ پہلے لپٹا ہوا تھا وہ اس کو کھول کر لے آیا' صرف اتنا ہی فرق تھا کہ وہاں وہ اس کی گردن میں سامنے لپٹا ہوا تھا' یہاں آیا تو اسے کھول کر ہمارے سامنے لے آیا۔

اس نے اپنا وہ اعمال نامہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ ہم نے کہا کہ ہمیں پڑھنے کی ضرورت نہیں' بلکہ **اِقْرَاْ كِتٰبَكَ** (17:14) لو اپنا نامۂ اعمال خود پڑھ لو۔ ذرا اونچی آواز سے پڑھنا تا کہ سب سن لیں۔ عزیزانِ من! جب میں یہاں پہنچتا ہوں' پوچھیے نہیں کہ کیا حالت ہوتی ہے۔ کتنے ہی ایسے افراد ہیں جن کے خلاف ہم نے اپنے دلوں میں کیا کچھ نہیں سوچا' کتنی ہی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو ظاہر نہیں ہوتیں یا جن کا علم نہیں ہو سکتا تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں علم نہ ہونے پائے۔ یہاں کہا ہے کہ وہ سب وہاں موجود ہوں اور یہ اسے وہاں ان کے سامنے بآوازِ بلند پڑھ رہا ہو تو جسے جہنم کہتے ہیں' اس سے بڑا جہنم اور کیا ہوگا۔ کسی ایک کے سامنے' جسے آپ نے دوست کہہ رکھا ہے' اس کے خلاف جو آپ نے کوئی سازش کی ہے' اس کا پردہ اگر چاک ہو جائے تو آپ ساری عمر اس کے سامنے منہ نہیں دکھاتے۔ وہاں یہ کیفیت ہوگی کہ یہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ سوال ہوگا کہ کیا اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لیا ہے؟ اقرارِ جرم تو ہو گیا' عدالت میں کھڑا ہے۔ کہا کہ ہمیں کسی اور کو بلانے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ ہی کچھ پوچھنے کی۔

جرم کی سزا از خود وارد ہوتی ہے

''لو اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لو' کے آگے بات ہوئی کہ لو' سزا بھی تم خود ہی مقرر کر لو۔ مقرر کیا کر لو؟ وہ تو اس کے اوپر وارد ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ ہے جہنم' عزیزانِ من! یہ جتنی دھاندلیاں آپ دیکھتے ہیں' اور جو ہم نے ان داستانوں میں سے تمہیں سنائی ہیں' اب آگے آیئے سنیے کہ قرآن کہتا ہے کہ **وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا** (23:33) وہ مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے' وہ اس سے انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ زندگی بس یہاں کی زندگی ہے۔ ہم نے اتنا سامان کر رکھا ہے کہ ہم یہاں کسی کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔ یہاں وہ کہتے تھے کہ **اَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (23:33)۔ دیکھیں ہم کیسے موج کر رہے ہیں' ہمیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ کچھ نہ کیجیے' دیکھیے پھر وہاں جہنم میں جانا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! تمہیں پتہ نہیں ہے' ہم نے انتظام کر لیا ہے' ہم یہاں عیش کر رہے ہیں' اللہ نے چاہا تو ہم وہاں بھی عیش کریں گے' مولوی صاحب نے کہا تھا کہ مسجد بنا دیجیے' جنت میں گھر بن جائے گا' میں نے بنا رکھی ہے۔ ہم وہاں بھی عیش ہی کریں گے: **اَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (23:33) انہیں بڑی خوشگواریاں' بڑی سہولتیں حاصل ہیں۔ یہ یہاں ان کی جنت کا ذکر کرتے ہیں' جن کے پاس اتنی دولت

ہوتی ہے۔ وہ بیچارے جو یہاں کی روٹی نہیں خرید سکتے' ان کے لیے کہاں کی جنت۔ بس یہی کہ مرے کو ماریں شاہ مدار ❶ ۔

وہ اکابرین جنہیں اَتۡرَفۡنٰهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (23:33) ہے یعنی سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں' دیکھتے تھے کہ نظامِ خداوندی کی زد ان کے ذاتی مفادات پر پڑے گی' مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (23:33) یہ شخص جو خدا کا پیغامبر ہونے کا مدعی ہے' تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ يَاۡكُلُ مِمَّا تَاۡكُلُوۡنَ مِنۡهُ وَيَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ (23:33) یہ بھی تمہاری طرح روٹی کھاتا ہے' تمہاری طرح پانی پیتا ہے' تمہاری طرح رہتا سہتا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ چیز بٹھائی کہ ایسا کہنے والا کوئی مافوق البشر ہونا چاہیے۔ اس کی بات مانو۔ جو مافوق البشر نہیں ہے اس کی بات کیا ماننی! کیونکہ وہ کسی حیثیت سے بھی ممتاز نہیں ہے۔ وَلَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَكُمۡ اِنَّكُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ (23:34) اگر تم نے اس اپنے ہی جیسے انسان کی اطاعت اختیار کر لی' تو سمجھ لو کہ تم تباہ ہو گئے اور ہماری اطاعت تو تم اس لیے کرتے ہو کہ ہم بڑے ہیں' کرنی چاہیے مگر وہ تو مِّثۡلُكُمۡ ہے یعنی تمہارے ہی جیسا انسان ہے۔ جو تمہارے جیسا ہے اس کی اطاعت چہ معنی دارد۔ اطاعت تو بڑوں کی کیا کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہتا کہ میں کوئی بڑا انسان ہوں۔ یہی چیز اس کے خلاف پیش کی جا رہی ہے: مِّثۡلُكُمۡ یہ آپ کے جو خواص ہیں' اپنے آپ کو عوام میں سے نہیں کہلاتے۔

سرکش اکابرین کہتے تھے کہ دولت ہمارے پاس' اقتدار ہمارے پاس' ہم جو چاہیں کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں لیکن یہ رسول کہتا ہے کہ نہیں! خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے جس کی گرفت سے تم بچ نہیں سکتے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ سرکش اکابرین کہتے ہیں کہ اَيَعِدُكُمۡ اَنَّكُمۡ اِذَا مِتُّمۡ وَكُنۡتُمۡ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمۡ مُّخۡرَجُوۡنَ (23:35) یہ تمہیں دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تم پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ مرنے کے بعد پھر ایک ایک بات کا حساب کتاب دینا ہوگا' وہاں عدالت میں جاؤ گے' ذرا سوچو کہ هَيۡهَاتَ هَيۡهَاتَ لِمَا تُوۡعَدُوۡنَ (23:36)۔ اس نے انہونی بات کہہ دی! کیسی عقل و قیاس سے بعید بات ہے جس سے یہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔

عزیزانِ من! زبان سے کوئی یہ نہ بھی کہے مگر کیا آج عملاً ہماری زندگی یہی نہیں ہے؟ ناجائز طریقے پر یہ کچھ خریدتے ہوئے کیا کسی کو بھی یہ خیال آتا ہے؟ اگر وہ سوسائٹی کے قانون کو Satisfy (راضی) کرتا ہے یا اس کا انتظام کر لیتا ہے کہ قانون کی گرفت میں نہ آئے تو معاشرے میں اس کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ کیا کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی حساب دینا ہے؟ جس کو یہ خیال آ جائے گا وہ

---

❶ یہ مثل ہے ''مصیبت زدہ کو اور ایذا پہنچانا''

کبھی بھی' خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے' اور خواہ معاشرے میں قانون بھی نہ ہو' وہ کبھی یہ نہیں کہے گا مگر وہ تو یہ کہتا ہے کہ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ (23:37) زندگی یہی اسی دنیا کی زندگی ہے اور بس۔ یہیں بچے پیدا ہوتے ہیں' یہیں ہمارے سامنے لوگ مرجاتے ہیں' اللہ اللہ خیر سلا[1] لہٰذا یہ غلط ہے کہ ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔[2] جیسا کہ یہ داعی انقلاب کہہ رہا ہے کہ صاحب! اس کے بعد حساب کتاب دینا ہوگا اور تمہارا کہنا یہ ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

اس کی کچھ نہ مانو۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ نِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا (23:38) یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بناتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے حالانکہ وہ یہ کچھ نہیں کہتا' وہ تو خدا کی طرف سے باتیں کر رہا ہے اور خدا نے جو کچھ کہا ہے وہ بتا رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِیْنَ (23:38) ہم اس کی بات کبھی نہیں مانیں گے۔ جو مرضی کرلو ہم کچھ نہیں مانیں گے۔ اس پر قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ (23:39) اس رسول نے نصرتِ خداوندی کو پکارا' اے میرے پروردگار! یہ لوگ میری بات سنتے ہی نہیں اور اندھا دھند تکذیب کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے اے صحیح نظامِ خداوندی! آ' ذرا میری مدد کرو۔ مگر وہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ ذرا ان کی خبر لی جائے۔ اس کی چھوٹی سی ہی جماعت سہی۔ وہ وہاں سے کسی دوسری جگہ جا کر صحیح نظام کو قائم کرتا ہے۔ قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ (23:40) خدا نے کہا کہ عنقریب ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آ جائیں گے۔ کچھ لمبا عرصہ نہیں لگے گا۔

عزیزانِ من! اب پھل پک چکا۔ نظر آتا ہے کہ انبیائے کرام آتے ہی اس وقت تھے جب یہ چیز شدید شدت تک پہنچ جاتی تھی' نظام آخر تک چلا جاتا تھا کہ اب کچھ زیادہ دیر کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد تم دیکھو گے کہ تم اپنی اس روش پہ کس قدر نادم اور پشیمان ہوتے ہو' جس پہ آج اتنا اترا رہے ہو۔ چنانچہ وہ وقت گزرنے نہ پایا تھا کہ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً (23:41) خدا کے عذاب کی گرفت نے انہیں آ پکڑا۔ اور ہم نے انہیں خس و خاشاک کی طرح پامال کر دیا۔ وہ چار الفاظ ہیں۔ کہا کہ یہ "جو یوں اتنے بڑے بنے پھرتے تھے' یہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کے رہ گئے"۔ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (23:41) سو دیکھو کہ یہ لوگ جو ظلم و استبداد کی روش اختیار کرتے ہیں' وہ کس طرح زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ محرومیاں کیوں ہوئیں؟ اس لیے کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے تھا' اسے یہ وہاں نہیں رکھتے۔ عربی زبان میں

---

1. فراغت ہوئی' فرصت ملی' اور کچھ نہیں۔
2. مادی تصورِ حیات (Materialistic Concept of Life) کچھ ہمارے ہی دور (Period) کی اختراع نہیں ہے۔ یہ تصور بہت پرانا ہے۔

ظلم کے معنی یہ ہیں۔ لہٰذا کہا کہ یہ کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ **ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ** (23:42) پھر ان کے بعد' ہم نے اور قوموں کا دور شروع کیا۔ قومِ نوح علیہ السلام کو' قومِ عاد کو' قوم ثمود کو' تم نے دیکھا۔ ان کے بعد پھر اسی طرح سے قومیں آئیں اور اسی طرح سے پھر یہ سارا کچھ ہوتا رہا۔ وہ اختلافات مٹانے کے لیے آتے رہے' یہ اختلافات پیدا کرتے رہے۔ اتنا لمبا وقت تو اس قوم کو لگ جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کوئی پروسیس (عمل) بھی ہو' اس کے متعلق کسی سائنٹسٹ سے پوچھیے کہ کتنا لمبا عرصہ لگتا ہے۔ وہ لیبارٹری میں یہ کچھ کررہا ہوتا ہے کہ یہ یہاں ملاؤ' یہ یہاں کرو' اسے اتنے ٹمپریچر (درجہ حرارت) پر اتنے دن رکھو' اتنا یہ کچھ کرو۔ بڑا لمبا پروسیس (عمل) ہوتا ہے۔ آخر میں پھر ایک وہ مرحلہ آجاتا ہے' جس میں وہ سارا پروسیس (عمل) ختم ہوجاتا ہے' تو پھر اس میں اچانک وہ نتیجہ برآمد ہوجاتا ہے جو اس وقت تک لیبارٹری میں کیا گیا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ میرے سامنے ٹیسٹ ٹیوب کے اندر یہ یونہی پانی سا تھا' اس کے اندر ہم نے یوں دیکھا تو اس سے یہ کچھ بن کر نکل آیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ یونہی اسی وقت بن کر نہیں نکل آیا۔ اس میں بڑا لمبا عرصہ لگتا ہے۔ یہ قوموں کے ان جرائم کا Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے لیکن جب وہ نقطہ سامنے آجاتا ہے تو پھر اسے کوئی قوت بھی روک نہیں سکتی۔ اس لیے کہا کہ **مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ** [1] (23:43)۔ نہ تو ایک سیکنڈ پہلے اس ٹیسٹ ٹیوب میں سے رنگ بدلتا ہے اور نہ ہی اس میں ایک سیکنڈ کی تاخیر ہوتی ہے۔ خدا کا یہ قانون ہے' جو کبھی نہیں بدلتا۔ اس کے بعد یہ کہا کہ پھر ہم نے اور رسول بھیجے اور یہ سلسلہ آگے چلتا جارہا ہے۔ یہی جو ان کے ہاں کی تفریقات ہیں اور جو طبقاتی چیزیں ہیں انہی کو مٹانے کے لیے یہ سلسلہ چلا آرہا [2] ہے۔

عزیزانِ من! آج وقت ہوگیا۔ ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 43 تک آگئے۔ 44ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] یاد رکھو! ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے' نہ تو کوئی قوم ظہورِ نتائج سے پہلے تباہ ہوتی ہے اور نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ ظہورِ نتائج کے بعد زندہ رہ سکے۔ اس میں کمی پیشی ہو نہیں سکتی (7:34;13:38;15:5) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 780)۔

[2] انبیائے کرام کا یہ سلسلہ رُشد و ہدایت ہمارے نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔

نواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 44 تا 49)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا
وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۴۴ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ڏ
بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۴۵ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
عَالِيْنَ ۝۴۶ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝۴۷ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا
مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝۴۸ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۴۹

عزیزانِ من! آج جمعہ کا دن ہے اور جولائی 1977ء کی پہلی تاریخ ہے۔ قرآنِ کریم کا یہ درس قریب پچیس سال [1] سے جاری ہے۔ پہلے کراچی میں تھا' 1958ء میں جب میں منتقل ہو کر لاہور آیا تو اس کے بعد سے یہ یہاں مسلسل جاری ہے۔ چونکہ دفاتر وغیرہ میں تعطیل اتوار کو ہوتی تھی' اس لیے درس بھی اتوار کی صبح کو ہوتا تھا۔ اب حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کو ہوا کرے گی' اس لیے ہم نے بھی درس کا یہ دن اتوار کی بجائے جمعہ مقرر کر لیا ہے اور آج پہلا ہی جمعہ ہے کہ جب اتوار کے بجائے جمعہ کو تعطیل ہو رہی ہے اور اس پہلے جمعہ کو ہی ہم درس کا بھی آغاز اس کے مطابق یعنی اتوار کی بجائے جمعہ کو' کر رہے ہیں۔ آئندہ بھی یہ بتوفیق ایزدی جمعہ کی صبح ہی کو ہوا کرے گا جب تک یہ تعطیل جمعہ کی رہے گی۔

---

[1] ان ہفتہ واری دروسِ قرآن کی مکمل تاریخ کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص۔ 29 تا 30' نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 49 تا 51 اور انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

اپنے اپنے دَور میں انبیائے کرام کی تعلیم کا خلاصہ

درس کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 44 سے ہوتا ہے: (23:44)۔ پچھلے اتوار کو بارش کی وجہ سے باقاعدہ درس نہیں ہوا تھا' اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کردوں کہ موضوع زیرِغور یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد کیا تھا؟ خدا کی طرف سے' وحی کی رو سے' یہ ہدایات کس مقصد کے لیے دی گئی تھیں؟ میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم نے خود اسے واضح کیا ہے کہ نوعِ انسان پہلے بغیر کسی قسم کی تفریق کے ایک قوم' ایک امت' اور ایک برادری کی حیثیت سے رہتی تھی' اس میں اختلافات' تفرقات' طبقات نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد انسانوں نے اس میں اختلافات پیدا کیے اور ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور انبیائے کرام کی تشریف آوری ہوئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس وحی کے ذریعے جو خدا انہیں عطا کرتا تھا' وہ انسانوں کی پیدا کردہ اس تفریق کو' اختلاف کو مٹا کر پھر سے نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا دے۔ انبیائے سابقہ کی تمام کتابوں اور اقوامِ گزشتہ کی تاریخ کے احوال وظروف قرآنِ کریم نے خود بیان کیے ہیں اور وہاں بتایا ہے کہ ہر نبی اپنے دور میں' جو بین اختلاف انسانیت کے اندر پیدا ہو گئے تھے' اپنے دائرہ کے اندر' ان کو مٹانے کی کوشش کرتا تھا۔

اس سلسلے میں حضرتِ نوحؑ' حضرتِ ہودؑ' حضرتِ صالحؑ' یعنی قومِ نوحؑ' قومِ عادؑ اور قومِ ثمود کی داستانیں ہمارے سامنے پہلے آ چکی ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرتِ نوحؑ نسلی امتیاز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے آئے۔ حضرتِ ہودؑ نے یہ کہا کہ ایک قوم محض قوت کے زور پر دوسری قوموں کو دبا کر اپنا محکوم بنا لیتی ہے اور ان پہ ظلم اور استبداد کرتی ہے' یہ تفرقہ مٹنا چاہیے۔ حضرتِ صالحؑ کے دور میں یہ بات بتائی گئی کہ یہ جو جاگیردار طبقہ' زمینوں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے' اور اسے اپنی ملکیت تصور کرتا ہے اور غریب چرواہے' آج کی اصطلاح میں انہیں کاشتکار یا مزارع کہیے' کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا' یہ بالکل غیر فطری چیز ہے' خدا کی منشا کے خلاف ہے۔ وہ اسے مٹانے کے لیے آئے۔

عزیزانِ من! اس تک کے سلسلۂ رشد وہدایت کے بعد قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا** (23:44) اس کے بعد پھر رسولوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور وقفے وقفے کے بعد' عند الضرورت ایک رسول کے بعد دوسرا رسول آیا **كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوۡلُهَا كَذَّبُوۡهُ** (23:44) رسول آتا رہا' وہ تفرقے مٹانے کی کوشش کرتا رہا' اس کی قوم نے اس کی تکذیب کی' اس کی بات نہیں مانی' اس کی مخالفت کی' اس نے اسکی پیش کردہ تعلیم کی تکذیب کی **فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا** (23:44) چنانچہ وہ جو اس سے پہلے ان قوموں کا حال ہوا تھا' اس تکذیب اور اس انکار اور سرکشی کی وجہ سے' یہی انجام ہر قوم کا ہوتا رہا۔ قرآنِ کریم نے دو الفاظ میں بات کہدی

کہ وَّجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ (23:44) پھر انکے افسانے باقی رہ گئے' قومیں ختم ہوگئیں'اس کے نتیجے میں وہ یکے بعد دیگرے ہلاک ہوتی رہیں۔ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ (23:44)ان اقوام کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کردیتے ہیں اور اپنی غلط روش پر اڑے رہتے ہیں' وہ زندگی کی خوشگواریوں اور کامرانیوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔اس طرح جو قوم بھی خدا کے اس بنیادی اصول سے انکار کرے گی' وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوجائے گی۔ یہ کہنے کے بعد قرآنِ کریم فرعون [1] کے زمانے تک آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ . اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ (23:45-46)اسی پروگرام کے مطابق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنے واضح قوانین' مضبوط دلائل کے ساتھ فرعون اور اس کے اکابرین کی طرف بھیجا- دونوں بھائیوں نے اُن کے سامنے ہمارا سچا دین پیش کیا لیکن فَاسۡتَكۡبَرُوۡا (23:46)فرعون (اور اس کے ملاء) نے قوت کے نشے میں مدہوش ہوکر اس سے سرکشی اور تکبر برتا۔ وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ (23:46) وہ تھے ہی بڑے سرکش' مغرور اور برخود غلط۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں یوں تو مختلف انبیائے کرامؑ کی داستانیں اور ان کی قوم کے قصے آتے ہیں لیکن جس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ قومِ بنی اسرائیل کا قصہ اور فرعون کی داستان ہے یا کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیم یعنی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان ہے' کسی دوسری قوم کی یا دوسرے نبی کی داستان اس تفصیل سے نہیں آئی [2] ۔اس کی خاص اہمیت ہے۔ پہلی قوموں کے اندر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ایک اختلافی چیز تھی' ایک طبقاتی چیز تھی۔اس میں ایک نئی چیز سامنے آتی ہے یعنی پہلے یہ چیز تھی کہ وہ قوم اپنے دائرے کے اندر ایک قوم ہوتی تھی' نسل کی جہت سے تو پھر بھی وہ ایک قوم تھی' وطن کی جہت سے بھی وہ ساری کی ساری ایک قوم تھی۔ یہاں ایک بالکل نئی چیز آتی ہے کہ ایک وطن کے اندر رہنے والے بھی ایک قوم کے افراد نہیں ہیں۔آج کی اصطلاح میں' جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے افراد' آج بھی قومیت کے معیار کے مطابق ایک قوم تصور کیے جاتے ہیں' مگر فرعون کی یہ داستان یہ چیز نہیں ہے۔میں عرض کرونگا کہ اس اعتبار سے قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ داستان بنی اسرائیل ہمارے حالات پر منطبق ہوتی ہے۔ایک مملکت کے اندر ایک ہی خطہ زمین ہے' اس کے اندر کچھ لوگ بستے ہیں' اس کے اندر بھی یہ تفریق ہے کہ ایک سلطان قوم ہے اور دوسری محکوم قوم یعنی بجائے اس کے کہ چلیے

---

[1] فرعون اور خاندانِ فراعنہ کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سوۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص 119' نیز فٹ نوٹ 1' نیز پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورہ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص 109 اور فٹ نوٹ 1۔

[2] اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

جغرافیائی حدود معیار مقرر کر لیجیے' اس کے اندر بسنے والی تو ایک قوم ہو جائے۔ نہیں' یہاں فرعون کی داستان میں جو چیز پہلی بار ہمارے سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس ایک ہی خطہ زمین کے اندر بسنے والے جو لوگ ہیں' وہ بھی باہمی طور پر تقسیم کیے گئے ہیں۔ ایک حاکم قوم ہے دوسری محکوم۔ یعنی وہی دوسری محکوم قوم یہاں اچھی خاصی تعداد میں بس رہی ہے گویا یہ ایک نئی چیز پہلی بار ہمارے سامنے آئی ہے۔ آج ہمارے سامنے تو ایک خطہ زمین کے اندر بسنے والے ایک ہی قوم تصور کیے جاتے ہیں' ان میں طبقاتی تفریق بھی ہوتی ہے' مگر یہاں یہ ایک الگ چیز آئی ہے اور عجیب طرح سے مؤثر ہے۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ بڑی ہی مؤثر ہے۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو یہ پورا واقعہ ہمارے واقعات پر منطبق ہوتا ہے۔

فرعون کا سب سے موثر حربہ' قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا

اس کے لیے فرعون کرتا کیا تھا؟ کس طرح یہ اپنا بیلنس (توازن) قائم رکھتا تھا؟ کس طرح اپنا غلبہ قائم رکھتا تھا؟ یہ ہے جسے حکمتِ فرعونی یا میکاوَلی سیاست کہا جاتا ہے اور جو آج کے ہمارے زمانے میں عام روش ہوگئی ہے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ ایک شخص جسے بادشاہ کہا جاتا تھا' آج کی اصطلاح میں اسے آپ ڈکٹیٹر کہہ لیجیے' حاکم کہہ لیجیے' یا چند نفوس کا ایک گروپ ہی سہی' یہ ایک گروہ' ہزاروں نہیں' لاکھوں نہیں' کروڑوں انسانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ وہ ہر باشندے کے سر پر ایک سپاہی تلوار یا شمشیر دے کر یا بندوق دے کر' کھڑا نہیں کر سکتا۔ یہ سیاستِ ابلیسی ہے۔ اس کی بنا پہ یہ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے عزیزانِ من! یہ جو داستان ہمارے سامنے آرہی ہے' اسے بڑے غور سے سنیے گا کہ ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔ یہ فرعون کرتا کیا تھا؟ **اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ** (10:83) فرعون اپنی مملکت میں بڑا ہی سرکش اور مستبد تھا۔ اس نے بہت بڑی قوت حاصل کر لی تھی اور جو لوگ اس کے مخالفین کے ساتھ جاملیں' ان سے انتقام لینے میں کسی حد پر رکنے والا نہیں تھا۔

اسے یہ قوت کیسے حاصل ہوگئی تھی؟ وہ اس قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا۔ غور فرمایئے' عزیزانِ من! بنیادی بات قرآن نے بتادی کہ اس حکمتِ فرعونی کا راز یہ تھا کہ وہ اس محکوم قوم کے اندر پارٹیاں بناتا تھا اور پھر پارٹیاں بنانے کے بعد کبھی ایک پارٹی کو کمزور کرتا اور دوسری کو اوپر چڑھا دیتا' غور فرمایا آپ نے! عزیزانِ من! اس تین چار ہزار سال ق م کے عرصہ میں اسے اگر آپ کم از کم چار ہزار سال ق م بھی کہہ لیں' تو بھی ذہنِ انسانی نے چکر کاٹ کے' پھر پھرا کے' اتنا کچھ تباہیوں کے بعد جو نظامِ حکومت جاری کیا' وہ جمہوریت ہے اور جمہوریت کی بنا ہی یہ ہے کہ وہ کم از کم دو پارٹیاں بنائے یعنی جمہوریت تصور میں ہی نہیں آتی اگر پارٹیاں نہ ہوں کہ صاحب! Majority (اکثریت) کا تو ہونا ضروری ہے یا آج کی اصطلاح میں اپنے Division کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی اس قوم کے اندر مستقل طور پہ کچھ

لوگ ہوں جن کا کام ہی یہ ہو کہ وہ ان کو Oppose (مخالفت) کریں۔ اسے جمہوریت مسلمہ مانا جا رہا ہے' خدا کی رحمت تصور کیا جا رہا ہے' اس پر فخر کیا جا رہا ہے کہ صاحب! انسانوں نے بالآخر وہ راز ڈھونڈ لیا اور راز یہ ڈھونڈ لیا کہ وہاں تو پھر بھی کبھی چانس ہو سکتا تھا کہ ایک ملک میں بسنے والی ایک قوم بن جائے۔ یہاں بنیاد ہی یہ ہے کہ جمہوریت کے لیے ہر وقت کم از کم دو پارٹیوں کا وجود لازم ہے' جب تک اپوزیشن ایوان میں نہیں بیٹھے گی' وہ حکومت کر نہیں سکتی۔ اپوزیشن کی وجہ سے اب وہ جوان کے ہاں ویٹو پاور ہے' وہ آ گیا ہے' ذرا سا اِدھر سے' کچھ توڑ کے اُدھر لے گئے' اُدھر سے توڑ کے اِدھر لے گئے۔ اس طرح حزبِ اقتدار پارٹیوں کو کمزور کرتا رہتا ہے یا کسی کو اوپر چڑھاتا رہتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے! یہ سیاستِ فرعونی ہے اور یہ بات کوئی چار ہزار سال (ق م) کی نہیں ہو رہی' آج بھی یہی ہے:

اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات ❶

یعنی وہی جو قرآن نے کہا تھا کہ ان اختلافات کو مٹانے کے لیے وحی بھیجنی پڑی۔ عزیزانِ من! اس سے پتہ چلتا ہے کہ عقل و فکرِ انسانی تنہا اس قابل ہی نہیں کہ اس مسئلے کو حل کر سکے۔ آپ یہ دیکھ لیجیے کہ فکرِ انسانی کم از کم چھ ہزار سال کے پیہم تجارب کے بعد بطور ایک کسوٹی ابھری ہے۔ یہ مختلف حکومتی طریقوں کو آزما کر' تجربے کر کے' غلط اقدامات کو چھوڑ کر اور صحیح نتائج کو اختیار کر کے' آخر میں جمہوریت کے نظام پہ پہنچتی ہے جو بالآخر وہی حکمتِ فرعونی ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ فرعون عوام کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا اور پھر کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھاتا تھا اور کبھی دوسری پارٹی کو۔ اگلی بات یہ ہے کہ جس محکوم کے اندر وہ دیکھتا تھا کہ اس میں ایسے انسان پیدا ہو رہے ہیں جن میں جوہرِ انسانیت ہے' جن میں کچھ غیرت ہے' کچھ حمیت ہے' جنہیں آپ ابنائے قوم کہتے ہیں' وہ انہیں ذبح کر دیتا تھا۔ ذبح کرنے کے معنی سر قلم کر دینا نہیں ہوتا' اس کے معنی ''کمزور کر دینا' ضعیف کر دینا' ایسی کیفیت میں مبتلا کر دینا کہ وہ مؤثر نہ رہیں''۔ کسی کو غیر مؤثر کرنے کے لیے عربی زبان میں قتل اور ذبح کا لفظ آتا ہے۔ نظر آتا تھا کہ ان میں جو ذرا با صلاحیت و باحمیت لوگ ہیں' وہ انہیں غیر مؤثر بنا دیتا تھا۔

فرعونی سیاست میں سرفرازی یا حمیت کا اظہار موت کو دعوت دیتا ہے

اس طرح غیر مؤثر بنانے کے لیے میں باغ کے مالی کی مثال دیا کرتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جونہی اس نے دیکھا کہ کسی اچھی بھلی' ہری بھری' بڑی خوبصورت کونپل نے ذرا سر اوپر نکالا' اس نے اُسے وہیں کرچ ❷ کر دیا کیونکہ وہ کونپل اس کے ذہن و تصور کی Shape (شکل) کے مطابق نہیں رہتی' اس سے کونپل کا سر ذرا اونچا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے فرعونی سیاست۔ وہ اس قوم کو زندہ رکھنا چاہتا ہے'

---

❶ بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

❷ کاٹ کر رکھ دیا۔

اس لیے کہ اگر زندہ نہ رکھے تو حکومت کس پہ کرے۔ حکومت تو محکوم کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یعنی حاکم کا تصور نہیں ہوتا جب تک محکوم ساتھ نہ ہو۔ وہ اپنے محکوم لوگوں کو حکومت کرنے کے لیے ضرور زندہ رکھتا تھا۔ مالی کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ باغ کی شاخیں اس کے نقشے کے مطابق ہری بھری رہیں' اور جنہیں دیکھے کہ ابھر رہی ہیں وہ انہیں وہیں کاٹ کر رکھ دے۔ فرعون یہ دیکھتا تھا کہ جن میں جوہر نہیں ہیں وہ انہیں اوپر لے آتا تھا قتل عربوں کا یہ محاورہ ہے یعنی جوہر مردانگی دحمیت کو ختم کر دینا۔ اس جوہر مردانگی کے محاورے سے عورت کی تحقیر اور تذلیل مقصود نہیں ہوتی۔ یہ محاورۃً کہا جاتا ہے۔ فرعون دیکھتا تھا کہ جن میں قوت اور جوہر مردانگی ہے' وہ ابھر رہے ہیں' وہ انہیں فوراً ذلیل وخوار کر دیتا تھا تا کہ اس جوہر کی نمود نہ ہو سکے۔ وہ صرف انہیں آگے لاتا تھا جنہوں نے چوڑیاں پہن رکھی ہوتی تھیں یعنی ان میں سرفرازی اور حمیت نہیں تھی۔ غور فرمایئے یہ سیاستِ فرعونی کیا ہے۔ کیا آج آپ کے ہاں یہی سیاست نہیں ہے؟ یہ ہے اس کی ابتدا۔ یہیں قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِی الۡاَرۡضِ** [1] (10:83)۔ اس کا راز یہ ہے کہ ایک طبقہ ضرور محکوم رہے۔ محکوم طبقے میں پارٹیاں بناتے چلے جایئے: کبھی اِس کو ابھارا' کبھی اُس کو چڑھایا' کبھی اس کو نیچا کیا اور ان میں سے جس میں دیکھا کہ ذرا سرفرازی ہے یعنی سر ابھارنے کی تھوڑی سی بھی صلاحیت یا حمیت یا خواہش یا آرزو پیدا ہوئی ہے' اسے کڑچ کر کے رکھ دیا' یعنی اس کو آگے نہیں بڑھایا' جنہوں نے وہی محاورۃً چوڑیاں پہن رکھی ہوں' انہیں ابھار کر آگے بڑھا دیا۔ قرآن اس مظہر (Phenomenon) کے لیے لفظ فساد لایا ہے۔ دیکھیے یہ لفظ کہاں لایا ہے۔ [2]

قرآن میں آپ نے دیکھا کہ فساد کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ ''دنگا فساد'' یا وہ ''جھگڑا وگڑا'' ہی ہوتا ہے ''فسد'' کے معنی ''ناہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے'' اور اصلاح کے معنی ''ہمواری پیدا کرنا ہوتا ہے۔'' کہا کہ یہ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے خدا کی طرف سے' انبیائے کرام علیہم السلام کے توسط سے وحی آتی تھی۔ انبیائے کرام علیہم السلام وہ انقلاب لاتے تھے' جس کی رو سے یہ فساد اصلاح میں بدل جائے' یہ ناہمواریاں ہمواریوں میں تبدیل ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ سیاست کی رو سے تو وہ ایسا کرتا تھا۔ سیاست کی

---

[1] فرعون اپنی مملکت میں بڑا ہی سرکش اور مستبد تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 481)۔

[2] اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَ جَعَلَ اَهۡلَهَا شِیَعًا یَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَ هُمۡ وَ یَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَ هُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ (28:4)۔ واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے اپنی مملکت میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لیے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا اس کے لیے اس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہر مردانگی نظر آتے' ذلیل وخوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا اور جوان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کر کے' ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا (2:49; 7:141; 40:25) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 883)۔

رو سے یہ بڑھاؤ چڑھاؤ ہو بھی سکتا تھا لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنی بڑی تعداد کے اندر لوگ اس قسم کے استبداد کو، ظلم کو، ناانصافیوں کو، برداشت کرتے چلے جائیں؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کے لیے وہ محکوم طبقے میں پارٹیاں بناتا چلا جاتا تھا۔ معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے والی تکنیک استعمال کیا کرتا تھا۔

فرعون کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار دوسروں کی روٹی پر قبضہ تھا

عزیزانِ من! یہ میں آگے بتاؤں گا کہ جب حضرتِ موسیٰ ﷺ گئے اور انہوں نے جا کر اپنا یہ مطالبہ پیش کیا تو اسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ یہ ایک شخص آ گیا ہے۔ یہ اس قوم کو ابھار دے گا، اس کے جوہرِ مردانگی میں نکھار پیدا کرے گا، تو اس نے پروپیگنڈہ شروع کیا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انقلابی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اس قدر خائف تھا کہ **وَنَادٰى فِرۡعَوۡنُ فِىۡ قَوۡمِهٖ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَيۡسَ لِىۡ مُلۡكُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِىۡ‌ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَؕ** (43:51) وہ ملک میں اس قسم کے اعلان کرتا رہتا تھا کہ اے میری قوم! کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت چل رہی ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دارومدار ہے، میری نہیں ہیں؟ کیا تم ان باتوں پر غور نہیں کرتے؟ یہاں سے وہ بات آ گئی کہ پروپیگنڈہ سے کس طرح ایک اتنے بڑے طبقے کو محکوم رکھا جاتا ہے؟ کیسے اس کو اپنی اطاعت پہ مجبور کیا جاتا ہے؟ کہ وہ راز کیا ہے۔ وہ راز ہے روٹی پر قبضہ، اسے اپنے ہاتھ میں رکھنا۔ یہاں بات سمجھ میں آ گئی کہ اگر تم نے ذرا سرکشی برتی تو پتہ ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک وقت کیلیے روٹی کھانے کو نہیں ملے گی۔ اس لیے عقل و ہوش سے کام لو، اس معاملے کو سوچو کہ بات کہاں تک جائے گی، کس کی باتوں میں آ رہے ہو۔ **اَمۡ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ مَهِيۡنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيۡنُ** [1] (43:52)۔ اسی بنا پر دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى** [2] (79:24)۔ کہا کہ رب پرورش کرنے والا ہے اور میں ہوں جو سب سے اعلیٰ ہے، یہ چھوٹے چھوٹے دوکاندار، یہ ڈپو راشن والے، یہ فوڈ والے، تمہیں یہ چیزیں نہیں دیتے۔ یہ سارے کے سارے میرے اس انتظام کی وجہ سے دیتے ہیں۔ رزق کے سرچشموں پر میں ہوں۔ **اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى** میں تمہاری پرورش کرتا ہوں، کھانے پینے کو میں دیتا ہوں، میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں۔ اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ **اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى** [2] ہے اور حقیقت میں غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑنے کا یہی راز ہے۔ فرعون کا کہنا تھا کہ یہ جو موسیٰ علیہ السلام کہتا ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا خدا ہے، یہ غلط ہے۔ وہ رزق کے سرچشموں کے اوپر اپنا قبضہ جماتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى** [2] (79:24)۔ فرعون نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص تمہیں بھڑکانے اور اکسانے کے لیے آیا

---

[1] کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلے میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے اسلیے نہایت پست اور کمزور۔ پھر یہ ایسا دہقانی اور گنوار ہے کہ اسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں آتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1150)۔

[2] تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا میں ہوں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1410)۔

ہے۔سنو: اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (43:52) کیاتم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلے میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے' نہایت پست اور کمزور ہے' دہقانی اور گنوار ایسا کہ کھل کر بات کرنے کے اسلوب سے بھی ناواقف ہے؟اس کے پاس کیا ہے؟ کچھ نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت کا معاملہ اور حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت کی التجا

آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اتنا عرصہ باہر گاؤں میں' دیہات میں' صحرا میں' جنگلوں میں رہے تھے۔آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ کہا تھا کہ مجھے فرعون کی طرف بھیج تو رہے ہو'وہ بڑی قوت کا مالک ہے'ان کے ہاں اگر مناظروں مباحثوں کے اندر آ گیا تو کیا ہوگا۔ تو جانتا ہے کہ میری زبان میں لکنت ہے [1]۔میں وہیں کا تو رہنے والا ہوں اس لیے رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ . وَيَسِّرْ لِىْٓ اَمْرِىْ . وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْ . يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ (20:25-28) اے میرے نشوونما دینے والے! یہ مہم بڑی سخت ہے' اس کے لیے تو میرے سینے میں وسعت اور کشادہ عطا کردے۔اور جو جو دشواریاں میری راہ میں آئیں انہیں مجھ پر آسان کردے اور میری زبان میں ایسی طاقت اور روانی پیدا کردے کہ میں تیرے پیغامات کو بطریقِ احسن فریق مقابل تک پہنچا سکوں اور میری بات ان کی سمجھ میں آجائے اور سیدھی ان کے دل تک اتر جائے۔چونکہ یہ مہم مشکل ہے اس لیے وَاجْعَلْ لِّىْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِىْ . هٰرُوْنَ اَخِى . اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِىْ . وَاَشْرِكْهُ فِىْٓ اَمْرِىْ (20:29-30) میرے اہل خاندان میں سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرے ساتھ کردے تاکہ وہ میرا بوجھ بٹائے۔اس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہوجائے گی۔وہ اس عظیم مہم میں میرا شریک کار رہے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی (26:13)۔لکنت کا بھی ہمارے ہاں بڑا عمدہ افسانہ ہے۔بہرحال میں اس پر کیوں وقت ضائع کروں۔ایک مدت تک مدین کے بیابانوں میں' بدوّیت کی زندگی بسر کرنے سے' آپ علیہ السلام کی زبان میں وہ طلاقت نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر حسنِ خطابت کے لیے ضروری ہے۔یہ عظیم مناظرہ ہوا ہے۔حضرتِ موسیٰؑ اور ان کے ہاں کی مذہبی پیشوائیت سامنے آئی ہے۔اس میں تو یہ ساری چیزیں تھیں جو مناظرہ میں ہوتی ہیں۔اس میں واقعی بڑی ضرورت تھی۔اس کا صحیح اندازہ حضرت موسیٰؑ نے لگایا تھا جب فرعون نے کہا تھا کہ اس کی حالت کو دیکھو اور کہتا یہ ہے میں خدا کی طرف سے آیا ہوں۔خدا کی طرف سے آتا تو اس کے ساتھ فرشتے ہونے چاہئیں اور میرے مطابق ان کے ہاں نورتن ہونے چاہئیں اور وہ ایرانیوں کے ہاں بھی پرانے زمانے کے اندر یہ چیز تھی۔وہ صاحب کنگن ہوتے تھے۔انہیں نورتن کہا جاتا ہے۔رتن کی ایک نشانی ہوتی تھی سونے کا کنگن۔وہ ان کو پہنا دیا جاتا تھا۔فرعون نے کہا کہ خدا کی طرف سے اس کا ایک بہت بڑا' کم از کم سونے کا' کنگن بھی ہونا چاہیے' کوئی فرشتوں کی قطار ساتھ ہونی چاہیے۔چلے آئے' صاحب! وہاں پہ اور آکر کہنے لگے کہ ہاں صاحب! میں خدا کا پیغام لایا ہوں۔

---

[1] یہ تاریخ کے قیاسات ہیں۔

فرعون کی سیاست اور پروپیگنڈا کی مشینری نے انسانی جذبات کو مدہوش کر دیا تھا

عزیزانِ من! فرعون نے ان کے خلاف اتنے زور سے ڈگڈگی بجائی' اتنے وسیع پیمانے پر مؤثر پروپیگنڈہ کیا' کہ قوم کو الو بنادیا۔ فرعون نے اس کے خلاف ان کی سٹی گم کردی' وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہ رہی۔ پروپیگنڈہ یہ کرتا ہے۔ یہ عجیب نفسیاتی کیفیت ہے' عزیزانِ من! مسلسل ایک جھوٹ کو اس طرح دہراتے چلے جایئے اور نہایت زوروشور سے دہراتے چلے جایئے' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی اور اس کے لیے تو اب ہمیں کسی دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا تو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ایک طبقے کے جذبات کو اس طرح انگیخت کیا جاتا ہے کہ وہ بالکل مدہوش ہوجاتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اس مسلسل پروپیگنڈے سے قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہی۔ کیا بات ہے قرآن کی! عزیزانِ من! یہ بات کررہا ہے چار ہزار [1] سال ق م کی' فرعون نے اس زوروشور سے پروپیگنڈہ کیا کہ ان کی عقل وفکر کو ماؤف کردیا۔ اب آپ دیکھیے کہ قرآن نے کیا نقشہ کھینچا! ہمارے سامنے ایک ہی خطہ زمین کے اندر بسنے والے باشندے دو حصوں میں تقسیم ہورہے ہیں: ایک حاکم قوم ہے' دوسری محکوم' محکوم قوم میں وہ پارٹیاں بناتا رہتا ہے' کبھی اِس کو چڑھایا اور اُس کو اتارا' اور کبھی اُس کو چڑھایا اور اس کو اتارا۔ جن میں ذرا جوہرِ مردانگی ہوا' ان کو غیر مؤثر بنادیا اور جن کو دیکھا کہ اپنے مطلب کے ہیں' خوشامدی ہیں' ان کو آگے بڑھادیا اور یہ سارا کچھ کیا۔ اب یہ ہوئے عناصر ترکیبی کہ اچھے بھلے' اپنے جیسے انسانوں کو' اپنا مطیع بنانے کے لیے ان کی پارٹیاں بناؤ' جن میں ذرا سا بھی سرفرازی کا جوہر دیکھو کرچ کرکے رکھ دو' رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں رکھو' اور مسلسل پروپیگنڈہ کرتے چلے جاؤ۔ عزیزانِ من! اس سیاستِ ابلیسی کے عناصرِ ترکیبی دیکھ رہے ہیں۔ قرآن ایک لفظ میں کیا بات کہہ گیا۔ مسلسل پروپیگنڈے سے ان کی عقل وہوش گم کردی۔

فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ: ''قوم بنی اسرائیل کی آزادی''

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے آکر صرف اتنا کہا تھا کہ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26:17) تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ راستے میں رکاوٹ نہ بنو' ہم تم سے الگ ہوجاتے ہیں' بڑی وسیع زمین پڑی ہوئی ہے' تم یہاں خیریت سے حکومت کرو' لیکن یہ جو محکوم قوم ہے اس کو اجازت دو کہ یہ اپنے طور پر ایک خطہ زمین میں جاکر آپ خود بھی آزاد فضا میں سانس لے اور آزادی کی زندگی بسر کرے' تم بھی آزاد رہو' یہ بھی آزاد رہے۔

---

[1] اس تمام کی تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005۔

قوم موسیٰ علیہ السلام کے روپ میں تحریک پاکستان کی کہانی تاریخ کی زبانی

یہ تھا جی مطالبہ۔ یہ کس قدر بے ضرر اور معقول سا مطالبہ ہے! اس میں ان کا کیا نقصان ہوتا ہے۔ ''نقصان کیا ہوتا ہے؟'' اسے آج سے پچاس ❶ برس پہلے کے ہندو سے پوچھیے اور عزیزانِ من! یہاں سے ہم تحریکِ پاکستان پہ آ گئے۔ اس ایک خطہ زمین میں بسنے والے سارے انسان دو حصوں میں تقسیم تھے۔ وہ (ہندو) جمہوریت کا نام لیتے تھے' کسی اور نظام کا نہیں' گویا کہ یہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نظام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ سیاست میں کتنے گھاگ تھے۔ یہ ایسی چیز ہے جس سے کوئی گلہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں ڈیموکریسی (جمہوری) نظام نہیں ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں ڈکٹیٹر شپ نہیں ہوگی' جمہوریت ہوگی یعنی یہ ایسی بات تھی کہ جو ماننی پڑی' ماننی پڑتی تھی' ساری دنیا کہہ رہی تھی کہ بھئی! بات تو ٹھیک ہے' اس جمہوریت کا نتیجہ آزادی تھا اور اکثریت ملک کے باشندوں کی حکومت ہوگی۔ لوگ اکثریت (Majority) اور اقلیت (Minority) میں بٹتے تھے اور مذہب کی بنا پہ یہ جو مسلمان تھے' وہ اقلیت (Minority) میں رہتے۔ یہ ہندو مستقل طور پر اکثریت (Majority) میں۔ اقلیت تو اکثریت میں آ ہی نہیں سکتی۔ اس طرح مسلمان دوسرے کے اندر مستقل طور پر محکوم رہتے۔ یہ کس قدر ایک معصوم سی چیز تھی' کس قدر بظاہر غیر ضرر سی بات تھی' جسے ساری دنیا معقول مانتی تھی کہ یہاں ایک Democratic Rule (جمہوری طرزِ حکومت) ہوئی' ایک ہی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے سارے لوگ' ایک قوم ہوتے۔ نیشنلٹی (قومیت) جغرافیائی حدود پر ایک پوزیشن بن جاتی' ایک ملک کے اندر بسنے والے تمام انسان ایک ہی قوم ہوتے۔ ہندو ساری دنیا کو یہ کہتا تھا کہ بتاؤ' ہم کہاں باہر نکل رہے ہیں' ہم کونسی غیر معقول بات کر رہے ہیں؟ دنیا والو! سوچو تو سہی' یہ مسلمان لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہمیں ساری دنیا کہتی تھی کہ یہ صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ یہ ایک قوم ہے اور اب اس ایک قوم کے اندر یہ لوگ یہ نہیں کہتے ہیں کہ ہم ہندو حاکم رہیں گے۔ اس کا سوال ہی نہیں۔ اس کے برعکس ہم مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ جغرافیائی حدود کی بنیاد پر یہ تقسیم غلط ہے۔ یہ ایک قوم نہیں۔ جب تک یہ مسلمان اپنا مذہب بدل کر ہندو نہ ہو جائیں' یہ اقلیت ہے' یہ اکثریت میں آ ہی نہیں سکتے تھے اور جب تک یہ مذہب نہیں بدلتے تھے' مستقل طور پر اقلیت میں رہتے تھے' وہاں ڈیموکریسی (جمہوریت) کے اعتبار سے' ڈیموکریسی کے خلاف اگر کبھی کوئی آواز اٹھاتے تھے تو وہ بغاوت ہو سکتی تھی۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا' عزیزانِ من! کہ یہ داستانِ بنی اسرائیل غور سے سنیے گا۔ یہ آپ کی داستان' ہماری داستان' ہم پہ لکھی ہوئی ہے۔ وہاں جھگڑا ہی وہ تھا جو فرعون اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ یہ جو محمد علی جناح (1876-1948) ہیں' زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام

---

❶ یاد رہے یہ بات جولائی 1977ء کی پہلی تاریخ کو کہی گئی تھی۔

آیا! اللہ انہیں جنت عطا فرمائے' کہاں سے یہ لوگ آ جاتے ہیں! اس نے ان سے آ کر وہی کہا تھا جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا کہ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ❶ (26:17)۔ان کو الگ ہونے کی اجازت دیدو' تم اپنے گھر میں خوشی خوشی بسے رہو' ان کو الگ ہو کر بسنے دو۔ بات تو یہی کہی تھی۔ کوئی فرعون بھی دنیا میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ عزیزانِ من! اب پھر درمیان میں "میں" آ ہی جاتی ہے' کیا کہوں! اس دَور (Period) کے طلوعِ اسلام دیکھیے۔ یہ چیز آپ کو اس طرح سے طلوعِ اسلام میں ملے گی کہ یہ ساری صرف سیاستِ فرعونی ہے' آج اس نے دوسرا نقاب اوڑھ رکھا ہے اور پردہ ڈال رکھا ہے' دوسرے الفاظ اپنا رکھے ہیں' اس کا نام ڈیموکریسی رکھا ہوا ہے۔ یہ ساری فرعونی سیاست کی چیز ہے۔ ہمارا مطالبہ کیا ہے؟ یہی کہ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26:17) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دو۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کتنی معقول دلیل دی تھی۔ فرعون اپنی قوم سے کہتا تھا کہ یہ کس کی بات سن رہے ہو! تمہیں معلوم ہے کہ یہ کون ہے؟ سنو! وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) یہ ہماری محکوم قوم کے فرد ہیں۔ واہ! تحریک پاکستان میں اس قدر استہزا کے ساتھ ہمیں یہی جواب ملتا تھا۔ محمد علی جناحؒ (1948-1816ء) اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا تھا کہ یہ مسلمان یہاں اپنا مستقل الگ کلچر مانگتے ہیں' اس کی حفاظت چاہتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں جو سمجھتا ہوں' وہ یہ ہے کہ مسلمان کا کلچر دینِ اسلام کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ ہندو نے کہا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں بستی ہیں: ایک ہندو اور دوسرے انگریز۔ انگریز اس تیسری قوت ❷ کو قوت ہی نہیں مانتا تھا۔ شروع میں یہ ہندو اتنا عرصہ کوشش کرتے رہے کہ مذاکرات ہی نہ ہوں' کہیں بیٹھ کے بات طے ہی نہ ہو۔ وہ کہتے تھے کہ صاحب! یہ قوم اس قابل ہی نہیں ہے کہ ان سے بھی بات کی جائے۔ قوم کیا ہے؟ وہ تو کانگریس ہے۔ یہ وہی ہے جو فرعون نے کہا تھا کہ میں اس شخص سے کیا بات کروں! وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) وہ محکوم قوم کا فرد ہے۔ کیا اس قابل ہے کہ حاکم قوم کے فرد سے بات کرے اور کہے کہ ہم سے بات کرلو؟ اس پہ ان کو جھگڑا رہا کہ بات ہی ان سے نہیں کی جاسکتی۔ دنیا کو کہتے تھے کہ ساری دنیا میں اصول تو یہ ہے کہ جو اکثریتی پارٹی ہوتی ہے بات تو اس سے کی جاتی ہے۔ وہ برٹش گورنمنٹ سے یہ کہتے تھے کہ یہاں آ کر ہم سے بات کرو۔ تم نے جو Minority (اقلیت) سے الگ بات کرنی شروع کردی یہ تو تمہارے اپنے ہی اصول کے خلاف ہے۔ یہ ہیں جو محکوم قوم کے افراد ہیں اور عزیزانِ من! ہندو نے یہی دلیل دی۔ ایک ہی دلیل کافی ہے۔

ہندوؤں کی نظر میں مسلمان اچھوتوں سے بھی کم تر تصور کیے جاتے تھے

ہندو اپنے اچھوتوں کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتا جتنا مسلمان کو ذلیل سمجھتا ہے۔ میں تو اس علاقے کا رہنے والا تھا جہاں اکثریت ہماری تھی'

---

❶ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔

❷ یعنی مسلمان قوم

اس شہر کا رہنے والا تھا' جہاں ممتاز حیثیت مسلمانوں کے گھرانوں کی تھی۔ اب تک یاد ہے' عزیزانِ من! صد شکر کہ اس ہماری نئی نسل نے ہندو نہیں دیکھا' اور بدقسمتی آپ کی کہ آپ نے ہندو کو نہیں دیکھا۔ آپ کو یہ پتہ نہیں کہ ہندو کیا تھا؟ اسی لیے آج یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ صاحب! ہم نے پاکستان بنا کے کیا کرلیا۔ وہاں رہتے تو بڑا ٹھیک تھا' اچھے رہتے بستے۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ ہندو کیا تھا؟ آپ کو میں سناتا ہوں۔ معاف رکھیے گا یہ جو یہاں بات آ گئی۔ پہلے میں نے شہر کہا ہے' علاقہ کہا ہے' جہاں ہماری اکثریت تھی' محلّہ چودہریاں اس کا نام تھا' ہم لوگوں کی بڑی ممتاز حیثیت تھی۔ وہاں اسی محلے میں' ہمارے بھروسے پر' دودھ بیچنے والا دوکاندار ہندو بھی تھا۔ گاہک آتے تھے۔ یہ ہندو دکاندار ہندو گاہکوں کے لیے الگ دودھ کی بالٹیاں رکھتا تھا۔ ہندوؤں کے لیے یہ بالٹیاں صاف کر کے رکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ ان سے لیتے تھے اور پیتے تھے۔ اس نے چھینکے کے اندر ایک پرانا مٹی کا پیالہ رکھا ہوتا تھا۔ مسلمان اس کے ہاں جاتا تھا تو وہ اس کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ہم وہ پیالہ وہاں سے اٹھاتے تھے۔ اس نے اپنی وہ ''گڑوی'' ہمارے پیالے کی نسبت اونچی رکھی ہوتی تھی کہ ہمارے پیالے کے پانی کی ایک چھینٹ تک ان کی ''گڑوی'' پر نہ پڑ جائے۔ وہ اس میں پانی ڈالتا تھا' ہم اسے خوب دھوتے تھے' پھر اس سے وہ دودھ لیتے تھے۔ دودھ پینے کے بعد پھر اسی طرح سے وہ پانی نکالتا تھا' اس سے اسے ہم دھوتے تھے اور اس چھینکے میں رکھتے تھے۔ وہ دو چھینکے ہوتے تھے' ایک بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف۔ اس علاقے کے چوہدری' وہ محلّہ چوہدریوں کا تھا' اس دوکاندار سے قیمتاً دودھ لیتے تھے۔ شاید وہ ہم سے چار پیسے زیادہ ہی لیتا ہو لیکن کیفیت یہ تھی کہ دو الگ الگ پیالے تھے' مگر ردِعمل وہی تھا کہ میں ہندوؤں کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ میں نے ساری عمر نہیں کھائی۔ اس کے بعد معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے' کہ ہندو کیا تھا۔

عزیزانِ من! اس سے اندازہ لگایئے کہ جب کہا کہ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَاَخَاہُ ہٰرُوۡنَ بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ . اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِہٖ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَکَانُوۡا قَوۡمًا عَالِیۡنَ (23:45-46) پروگرام کے مطابق ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو بھیجا۔ انہیں بھی ہم نے اپنے قوانین عطا کیے تھے اور ان کے ساتھ ایسے واضح دلائل دیئے تھے' جن سے ان قوانین کی صداقت اور محکمیت نکھر کر سامنے آ جائے۔ انہیں ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے اکابرین کی طرف بھیجا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے ان کے سامنے ہمارا سچا دین پیش کیا لیکن انہوں نے سرکشی اور تکبر برتا۔ وہ تھے ہی بڑے مغرور سرکش اور برخود غلط۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ جو کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرتے' فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47) کہا کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو انسان ہونے کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے ہیں۔ مافوق البشر نہیں ہیں اور جہاں تک مرتبہ اور درجہ کا تعلق ہے' وہ اس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔ وَقَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (23:47)۔ وہ محکوم قوم کا فرد برابری کا دعویٰ کر کے' ہم سے بات کہنے کے لیے آ گیا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں جناب پرویزؒ کو قائداعظمؒ کا فرمان

عزیزانِ من! ہماری غیر منقسم انڈیا میں وہاں یہ حالت تھی۔ قدم قدم پہ بارگاہِ خداوندی میں سجدہ شکرانہ ادا کرو کہ تم اس ذلت سے بچے۔ ہم سے پوچھو کہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا تھا۔ میں نے تو ذرا سی مثال آپ کو دی ہے۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23:47)۔ محکوم اور پھر آہستہ آہستہ محکوموں کی حالت بھی یہ ہو جاتی تھی۔ ہماری یہ اپنی ہی قوم کے لوگ تھے۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے نقشِ قدم پہ چلنے والا محمد علی جناحؒ (1876-1948ء) بھی صرف یہ کہتا رہا کہ اس قوم کو جانے کی اجازت دو۔ اس میں اسی قوم کے افراد تھے جو اس کی اور اس کے مطالبے کی اس قدر مخالفت کر رہے تھے کہ ہمارے لیے ہندو کا مقابلہ کرنا تو آسان تھا' عزیزانِ من! انگریز کا مقابلہ کرنا بھی آسان تھا لیکن جیسا کہ قائداعظمؒ محمد علی جناح نے مجھ کو بلا کر کہا تھا کہ یہ جو اپنی ہی قوم کے افراد ہیں' اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر مخالفت میں آ گئے ہیں' ان کا مقابلہ کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔

علامہ اقبالؒ کی نظر میں محکوم قوم کی ذہنی پستی کی حالت

وہاں یہ نظر آتا تھا کہ محکوم قوم کی ذہنیت کس قدر پست ہو جاتی ہے' پھر وہ لوگ کتنے سستے بکتے ہیں۔ ان کے بکنے کی داستانیں یہاں نہیں' میں کسی دوسری جگہ لکھوں گا کہ وہ کتنے سستے بکتے ہیں۔ اف! یہی وہ مقام ہے جہاں چیخ کر مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ

دین و دانش را غلام ارزاں دہد

محکوم ذہنیت تو یہ ہو جاتی ہے کہ وہ دین کو بھی اور اپنی عقل کو بھی بیچتا ہے' بڑا سستا بیچتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہ کس چیز کو سستا کہتا ہے؟

تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لیے جان بیچ دیتا ہے۔ یہ مفکرِ قرآن محمد اقبالؒ نے اس وقت کہا تھا جب وہاں ہمارے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے مقدسین بھی تھے' عالم فاضل بھی تھے جو آ رہے تھے' انہیں علمائے دین ہونے کا بھی بڑا دعویٰ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ

گرچہ برلب ہائے اونامِ خدا ست قبلۂ او طاقتِ فرمانروا ست
طاقتے نامش دروغ با فروغ از بطونِ او نزاید جز دروغ
ایں صنم تا سجدہ رش کر دی خدا ست چوں یکے اندر قیام آئی فناست

ان کا قبلہ اکثریت (Majority) ہے' اِسی اکثریت کی طاقت ہے' اِس طاقت کی فرماں روائی ہے اور یہ طاقت دراصل جھوٹ کی

طاقت ہے اور یہ جھوٹ بھی ایسا جسے بڑا بلند کر کے بیان کیا جائے۔

ان کی یہ باتیں چاہے جتنی بھی خوش آئند ہوں' انہیں اگر ماضی کے آئینے میں دیکھا جائے تو وہ سارا جھوٹ ہی کا پلندہ ہوتا ہے۔ انہیں یہ پتہ نہیں کہ جن کی طاقت سے یہ مرعوب ہوتے ہیں' جنہیں یہ خدا سمجھتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب تک ان کے سامنے سجدہ کرتے رہو یہ خدا نظر آئیں گے۔ ذرا اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ تو یہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

جب کوئی قوم اُٹھ کھڑی ہو تو پھر خدا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! تحریک پاکستان میں مٹھی بھر مسلمان تھے جو اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ ہندو ہم سے چار گنا زیادہ تھے اور ان سمیت پوری انگریز کی سلطنت کانپ اٹھی تھی۔ بس بات یہ تھی کہ ''وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے''۔ فرعون یہ کہہ رہا ہے کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** (79:24) تمہاری پرورش میں کرتا ہوں اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ یہ جو موسیٰ علیہ السلام کہتا ہے کہ تمہارا نشو و نما دینے والا خدا ہے' یہ غلط ہے۔ اس پر اقبالؒ (1877-1938) کہتے ہیں کہ رب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے رب ہونے میں فرق ملاحظہ فرماؤ:

آں خدا نانے دہد جانے دہد
ایں خدا جانے برد نانے دہد

ایک وہ خدا ہے جو جان عطا کرتا ہے اور روٹی بھی عطا کرتا ہے مگر یہ خدا روٹی تو دیتا ہے' جان نکال دیتا ہے۔ یہ تھی وہاں لڑائی' عزیزانِ من! جو چار ہزار سال قم فرعونِ مصر کے ایوان گاہ میں لڑی جا رہی تھی۔ ''جرم موسیٰ علیہ السلام'' یہی تھا کہ اس نے فرعون سے یہ کہہ دیا تھا کہ **اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ** (26:16) تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔

عزیزانِ من! ہم ہندو سے کچھ بھی نہیں مانگتے تھے۔ ہم صرف یہ کہتے تھے کہ تم اپنے علاقے میں بلا خوف و خطر سکھی رہو' حکومت کرو۔ صرف اتنی سی بات کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا وہ اتنا سا طبقہ ہے' اسے خدا کی زمین میں سانس لینے کے لیے اجازت دے دیجیے۔

فرعون اس لیے فرعون تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنا عبد بنا کر رکھنا چاہتا تھا

یہاں (23:47) میں ایک لفظ میں قرآن نے اصل بات کہہ دی۔ جی نہیں چاہتا کہ اسے سامنے لائے بغیر آگے بڑھوں۔ فرعون نے تو یہ کہا تھا کہ **وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ** (23:47) یہ ہماری محکوم قوم' ہمارے عبد ہیں۔ خدا کی زمین میں یہ جتنے افراد بھی بستے ہیں' ان کے مقابلے میں ایک لفظ' عزیزانِ من! حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ لفظ ''عبد'' کے متعلق اب آپ کو معلوم ہے۔ اسی لفظ سے یہ لفظِ عبادت نکلا ہے۔ اس کے معنی محکومیت کے ہیں' پرستش کے نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ یہ ہمارے محکوم' ہمارے عبد ہیں۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا تھا کہ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَـیَّ عِبَادَ اللّٰهِ (44:18) خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دو' بس میرے ساتھ جانے دو۔ ان آیات سے دونوں سیاستوں کا فرق سامنے آ گیا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ ہمارے بندے نہیں ہیں' یہ ان کو عباد اللہ کہہ رہا ہے یعنی کہہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی زمین میں سانس لینے کے لیے میرے ساتھ جانے کی اجازت دو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون کی ایک سرمایہ دارانہ چال

نظر آتا ہے کہ وہاں یہ قومِ بنی اسرائیل اقلیت (Minority) میں تو تھی لیکن بہر حال مؤثر تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے نزدیک ایک خاص مقام تھا' ورنہ وہ اس کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اب تیار ہوا تو سنو' فرعون سودے بازی پہ اتر آیا۔ یہی ڈھنگ ہوتا ہے' عزیزانِ من! جب وہ کسی قوت سے مرعوب نہ ہو تو پھر اسے خریدنا چاہتا ہے' اس پہ اپنے احسانات جتانا چاہتا ہے۔ بڑی خوبصورتی سے قرآن نے یہ بات کہی ہے۔ فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! آ و تم تو ہمارے اپنے ہو' تمہیں یہ کیا ہو گیا۔ توں بہکی بہکی گلاں کر دیا پیاں ❶ موسیٰ علیہ السلام! تم تو بنی اسرائیل کے بچے تھے' جنہیں یہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہ بیٹھی ہوئی ہے جس نے تمہیں گود میں لیا ہے۔ ❷ میں تمہارا باپ بنا' ان محلوں میں تمہاری پرورش ہوئی' شہزادوں کی طرح ناز و نعمت میں پلے' تمہارا اتنا بلند مقام ہم نے کیا۔ یہاں تک کہ تم نے یہاں ہمارے فرد کو' ایک دوسری قوم کے فرد کو' قتل بھی کر دیا۔ ❸ ہم نے اس میں بھی تمہارا پیچھا نہیں کیا' تم چلے گئے۔ اب تم واپس بھی آ گئے ہو' تو ہم نے تم سے ہاتھ نہیں مانگا' مجھے وہ پرانے تعلقات یاد ہیں۔ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا' تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ کیوں' موسیٰ! یہ ہیں باتیں اور کہا کہ اسکے بعد ہمارے احسانات کا بدلہ یہ دے رہے ہو کہ ہماری حکومت کو ہم سے ہی چھین رہے ہو۔ اتنے احسان فراموش تو نہ بنو۔

خدا کے نور سے دیکھنے والی ہستی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو جواب

غور سے سنیے' عزیزانِ من! فرعون کے اس احسان کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے' آپ نے بہت سے احسانات گنائے لیکن یہ سب سے بڑا احسان جو تم بھول گئے' میں تمہیں یاد دلا دیتا ہوں کہ تمہارا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وَتِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (26:22) ان تمام احسانات کے بدلے میں تم یہ چاہتے ہو کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی میں رکھ سکو۔ یہ بھی تو

---

❶ تم بہلی بہکی باتیں کر رہے ہو۔

❷ یہ اشارہ ہے فرعون کی بیوی کی طرف ہے۔

❸ حوالہ قرآن ہے (26:19)

احسان جتاؤ کہ میں نے بنی اسرائیل کو تمہاری قوم کو غلامی میں رکھا ہوا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے۔ عزیزانِ من! آپ نے موسیٰ علیہ السلام کا جواب سن لیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح (1876-1948) کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا گیا تھا کہ تم یونائیٹڈ انڈیا (متحدہ ہندوستان) کو غیر منقسم ہندوستان ہی رہنے دو، ہم تمہیں ہندوستان کا پہلا وزیراعظم بنائیں گے اور یہاں اپنی مرضی کی حکومت بنالینا۔ اس پر قائداعظم محمد علی جناح نے برمحل کہا تھا کہ جاؤ کسی اور کو اس فریب میں لاؤ۔ قائداعظم بکنے والی جنس نہیں ہے اور یہ تھا وہ Tribute (خراجِ عظمت) جو انہیں انگریزوں کے ہاں سے Pay (ادا) کیا گیا تھا اور برملا کیا گیا تھا کہ وہ Unpurchaseable (بکاؤ مال نہیں) ہیں یعنی انہیں کسی قیمت پر خریدا نہیں جاسکتا اور یہ وہی ہے جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: احسانات جتاتے ہو تو یہ بھی جتاؤ کہ اس کے بدلے میں یہ چاہتے ہو کہ قومِ بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنائے رکھو۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں نیشنلسٹ علما حضرات کی طرف سے مخالفت میں دیئے گئے دلائل

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ کانگریس شکست کھا گئی۔ وہاں ہندو کی کوئی دلیل نہیں چل سکی، جو کیا انہوں نے کیا، پھر اس کے بعد مذہبی پیشوائیت نے علمائے دین کو آگے بڑھایا، جماعت اسلامی کو بھی آگے بڑھایا۔ انہوں یعنی جماعت اسلامی اور نیشنلسٹ علماء نے وہاں ان مسلمانوں سے، جو اس تحریک کا ساتھ دے رہے تھے، کہا کہ جسے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں جا کر یہ ایک ایسی حکومت قائم کریں گے جو اسلامی حکومت ہوگی، خدا کی بادشاہت ہوگی، تو یاد رکھو! یہ سب فریب دے رہے ہیں، وہاں کی جو حکومت ہوگی، وہ کافروں سے بھی بدتر ہوگی، اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ یہ کچھ ان کی کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوئم [1] کے اندر آج بھی موجود ہے کہ کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ ان سے بھی بدتر حکومت ہوگی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ تحریک (Movement) بہت زور پکڑ رہی ہے تو یہ مذہبی پیشوائیت اسلام کے تجریدی نظریئے یعنی Abstract (غیر محسوس) چیزوں کو سامنے لے آئی کہ خدا کی حکومت آسمانوں پہ بھی ہے، تمام Universe (کائنات) پر اس کی مملکت ہے۔ انہیں کہا کہ یہ تمہیں کس فریب میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اسلام کے لیے ایک الگ خطہ زمین کی ضرورت ہے، وہاں اسلام پہنچے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے سارے ہندوستان کو مسلمان بنادیں۔ یہ دلیل دی جارہی تھی کہ ان کے مطابق اس اتنے سے حصے کے اندر سمٹ کر اسلام کیا آئے گا اور ان کی یہ دلیل تھی کہ اسلام کے زندہ ہونے کے لیے کسی الگ خطہ زمین کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لیے خطہ زمین رہنے دو۔ ان کے لیے وہ سعدی شیرازی (1184-1291) کا دو بھائیوں کا قصہ مشہور ہے کہ دو بھائیوں

---

[1] اس کتاب سے مزید اقتباسات کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005، ص ص۔ 223-230 نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

میں جائیداد پر جھگڑا ہوا تھا۔ ایک ہی مکان تھا اور فیصلہ ہوتا نہیں تھا تو اس بڑے بھائی نے کہا کہ ہاں' ٹھیک ہے تھوڑا سا حصہ میں لے لیتا ہوں' تم چھوٹے ہو' تمہاری پرورش مقصود ہے' تمہارے پیچھے میں ہاتھ رکھونگا' تم سب سے بڑا حصہ لے لو۔ بس یہ ذرا سا' یہاں صحن سے لے کر چھت تک' بس اتنا سا کمرہ مجھے دیدو' میں اتنے پہ ہی راضی ہو جاؤنگا۔ چھت سے لے کر آسمان تک سارا تمہارا رہا۔ وہاں کہا یہ جا رہا تھا کہ اتنے سے خطہ زمین کے اندر اسلام کا احیا دیکھو! یہ اسلام کہاں لیے جا رہے ہیں۔ یہ اتنا بڑا وسیع ملک ہے' یہاں سب کو مسلمان بنایا جائے گا اور اگر ایک الگ مملکت کا اتنا ہی بڑا چاؤ ہے' تو اس کے لیے انہوں نے یہ اسکیم بھی دی کہ چلیے الگ چھوٹی سی مملکت بنا لیتے ہیں۔ وہ ایک صوبے کی طرح ہوگی دونوں کے اختیارات ہوں گے لیکن سنٹر کے پاس سارے اہم سبجیکٹ ہونگے: امورِ خارجہ' ڈیفنس' اقتصادیات یعنی فنانسز وغیرہ۔ یہ سنٹر (مرکز) میں دیدیجیے۔ بس ٹھیک ہے صحن خانہ سے بام تک ان کو دیدیجیے اور آگے پھر سارا تمہارا حصہ ہے۔ دلائل میں اِدھر ہندو شکست کھا گیا اور اُدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون شکست کھا گیا۔ پھر یہ اگلی بات سوجھی۔

لوگوں کو مذہبی جذبات برانگیختہ کرنے والی فرعون کی ایک چال

عزیزانِ من! فرعون کی سیاست تھی کہ جب دلائل سے کام نہ چلے' وہ قوت کے سامنے مرعوب نہ ہو' کسی قیمت پہ بھی خریدا نہ جائے' تو پھر لوگوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ فرعون نے کہا کہ صاحب! اچھا' ہم یہ مذاکرات کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرتے ہیں اور میں خود اس کے لیے کچھ انتظام کرتا ہوں۔ اس نے سارے ملک میں اپنے ڈھنڈورچی بھیج دیئے۔ اس زمانے میں یہ مذہبی پیشوائیت عجیب چیز تھی۔ اس نے شروع سے ہی یہ چیز رکھی ہے مثلاً جو گائے کا سینگ ہے' وہ تو مملکت کے ہاتھ میں دیدیتی ہے کہ دودھ آپ نکالتے رہیں' خود برسرِ اقتدار آ کر ذمہ داریاں نہیں لیتی۔ یہ مذہبی پیشوا مہاراج دوسرے کو بناتے ہیں' تاج اس کے سر پہ اپنے ہاتھ سے رکھتے ہیں' لیکن حکومت خود کرتے ہیں۔ یہ شروع ہی سے چلا آ رہا ہے۔ فرعون کے ہاں بھی یہی تھا۔ اگرچہ وہ خود ایک "رَع دیوتا" کا اوتار مانا جاتا تھا لیکن اصل حکومت ہامان [1] کی تھی اور قرآن نے ہامان کے ساتھ جنود کہا ہے: اس کا بڑا لاؤ لشکر ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ پھر فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا ہے کہ تھوڑے دن کے لیے ذرا آرام کرو اور خود سارے ملک میں ڈھنڈورچی دوڑا دیئے۔ ہامان کو بلایا اور کہا کہ اپنے سارے لاؤ لشکر بلاؤ اور یہ جتنے تمہارے ہاں کے بڑے بڑے نامور ہیں' مہاپنڈت ہیں' ان سب کو اس کے مقابلے میں لے آؤ' اور اس مقابلے کے لیے ساری مملکت میں ایک عظیم دن مقرر کر دیا۔ دنیا اکٹھی کر لی اور ان سے یہ کہا کہ

---

[1] مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ' تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص 24 (فٹ نوٹ 2)

اگر یہاں تم اسے شکست دیدو' پھر اس کی نہیں چلنے دیں گے' تم ثابت یہ کردو کہ یہ تمہیں تمہارے دین سے پھیرنا چاہتا ہے' یہاں نیا دین مسلط کرنا چاہتا ہے۔ بس لوگوں کے سامنے یہ کردو۔

فرعون کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سودے بازی کا مطالبہ

قرآن تو ہر مقام پہ' عزیزانِ من! بڑی دکھتی ہوئی رگ پکڑتا ہے۔ یہ قصہ تو وہ یونہی بیان کرتا چلا آ رہا ہے لیکن چلتے چلتے بات کہہ جاتا ہے کہ یہ مذہبی پیشوائیت کیا ہوتی ہے۔ اسمیں خدا کے نام پر یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب یہ اور ان کے نمائندے آ بیٹھے' تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ سرکار! دیکھو تو سہی' ہم انہیں چٹکیوں میں اڑا دیں گے۔ اس کی قوم نے کہا کہ یہ بہت اچھی بات ہے' یہ مذہب کا معاملہ ہے' مذہب کی حفاظت ہے۔ یہ کہنے لگے کہ ٹھیک تو ہے' یہ مذہب کا معاملہ ہے لیکن پہلے یہ بتائیے کہ اگر ہم نے اسے شکست دیدی تو ہمیں کیا ملے گا۔ پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ یہ پیسے گنا تے ہیں' اس لیے فرعون سے پوچھا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا ملے گا۔ دیکھیے' ملائیت پہلے کیا کر رہی ہے۔ یعنی آ رہے ہیں اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کے لیے اور کہہ یہ رہے ہیں کہ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا دو گے۔ وہ بھی کاریگر تھا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے' دیں گے تو تمہیں بہت کچھ۔ پہلے بھی تمہیں دیا ہوا ہے۔ اب بڑی بات یہ ہے کہ ہم تمہیں خان صاحب بنا دیں گے' خان بہادر بنا دیں گے' شمس العلماء بنا دیں گے' خطابات سے نوازیں گے' تم ہمارے مقرب بن جاؤ گے۔ یہ بھی ان کی ایک دکھتی ہوئی رگ ہوتی ہے۔ ان میں بڑا Inferiority Complex (احساسِ کمتری) ہوتا ہے۔ اس لیے فرعون کا یہ کہنا ہے کہ ہم تمہیں مقرب بنا دیں گے۔ اسے پتہ ہے کہ یہ مذہبی پیشوائیت اس پر زیادہ اعتماد کرتی ہے' چنانچہ اس نے بلا لیا' اکٹھا کر لیا۔ عزیزانِ من! اس تفصیل میں' اس مقام پر' چونکہ قرآن آیا ہی نہیں' اس لیے میں بھی تفصیل میں نہیں جاتا۔ آگے آؤ نگا تو وہ جو مناظرے ہیں' وہ آپ کو بتاؤ نگا' یہاں تو اتنا ہی کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنی فریب کاریوں سے' رسیوں کو بھی سانپ بنا بنا کر دکھا دیا۔ مگر بات نہ بنی۔ یہ ہمیشہ رسیوں کو سانپ بنا بنا کر دکھاتے ہیں۔ ❶

ہندوستان میں انگریز کے غلبہ اور ہندوؤں کے تغلب کے بالمقابل مسلمانوں میں ابھرنے والا جوہر مردانگی

عزیزانِ من! وحی پر مبنی دلائل کا اژدھا ان رسیوں کو یوں نگل گیا کہ انکا کوئی نام ونشان تک نظر نہ آیا۔ دین کے مقابلے میں مذہب کہاں ٹھہر سکتا ہے۔ یہ ساری' جتنی بھی یہ کشمکش ہے' اس میں ایک چیز قرآن نے بتائی ہے کہ خدا نے کہا کہ ''ہماری مشیت کبھی یہ بھی کیا کرتی ہے۔'' اب آپ اس میں دیکھیے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہی وہ مشیتِ خداوندی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ محکوم قوم میں اگر جوہر مردانگی

---

❶ ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 2005۔

اُبھر آئیں تو وہ فتحیاب ہو جاتی ہے۔ وہاں تحریک پاکستان میں بھی ہمیں یہ نظر آتا تھا کہ اگر یہ ہندو اور انگریز اس بات پر اڑ گئے' انہوں نے مزید اپنی ساری قوت لگا دی تو معاملات بگڑ جائیں گے۔ عزیزانِ من! انگریز جیسی یہ قوم جسکی اس زمانے کی مملکت' سلطنت' اسکا غلبہ' تغلب اور حکومت کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس کی مملکت میں The Sun Never Sets سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں وہ ایک پارٹی تھی جس میں یہ پورے ہندو تھے۔ پوچھو کہ کتنا بڑا اقتصادی تغلب تھا اور ہندوستان کے اندر پھیلے ہوئے چھوٹی چھوٹی جگہ پر مسلمان تھے۔ پھر انہوں نے جس طرح ہمارے مقابلے کے لیے وہاں پرائیویٹ آرمی تیار کر دی تھی' اس میں نظر بظاہر ایسا دکھائی دیتا تھا کہ یہ آزادی بہت مشکل ہے۔ یہی حالت وہاں فرعون کے زمانے میں' اس اقلیت بنی اسرائیل کی تھی۔ نظر بظاہر یہ شکل نہیں تھی کہ کبھی فرعون کے ساتھ بھی یہ کچھ ہوگا لیکن قرآنِ کریم یہاں اپنے انداز میں ایک بات کہتا ہے کہ ''کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے لیے یہ اس قسم کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں کہ انکو آزادی حاصل ہو جائے''۔

قرآن کہتا ہے کہ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ (28:5)۔ ہماری مشیت کے پروگرام میں کچھ یہ ہوا کہ یہ قوم جو بڑی کچلی گئی ہے' بڑی ہی کمزور کر دی گئی ہے' ہم انہیں اپنی رحمت سے نوازیں۔ قرآن اس قسم کے الفاظ وہاں استعمال کیا کرتا ہے جہاں اس قسم کے مواقع فراہم کرنے کے ہوں' جہاں یہ ہو کہ وہ بظاہر لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں کہ یہ مواقع کس طرح سے فراہم ہو گئے۔ واقعی اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ یہ Believe (یقین) ہی نہیں کرتا تھا: نہ انگریز نہ ہندو کہ واقعی ایسا ہو جائے گا' یا ایسا ہونا ممکن ہوگا۔ ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten 1900-79) انگلستان سے تہیہ کر کے آیا تھا کہ میں جا کر اس تقسیم کے مسئلے کو روکتا ہوں۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ کیوں؟ کیا تم نے اس تقسیم کے مسئلے کو روک دیا؟ یہ لوگ بیلف (Bailiff) ❶ وغیرہ تھے جو انگلینڈ نے بھیجے ہوئے تھے۔ انہی میں ماؤنٹ بیٹن کو سلیکٹ (منتخب) کیا گیا تھا۔

یہ ماؤنٹ بیٹن (1900-79) تو ایڈمرل تھا' جہاز ران تھا' اور اس کو خاص جذباتی طور پر ہندوستان بھیجا گیا تھا' اس لیے کہ یہ رائل فیملی ❷ (شاہی خاندان) کا تھا۔ ہندوستان کا' جو انگلستان کی ملکہ یعنی بادشاہ کے تاج کا ہیرا ہے وہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ خود اس خاندان

---

❶ Bailiff. Chiefly British. An Official who assists a sheriff and who has the power to execute the writs, processes, and arrests. (P.126) Sheriff. In England and Wales, the Chief Officer of the Crown (P.1405)(Ref. Reader`s Digest (1990) Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited)

❷ یہ ملکہ وکٹوریہ (Queen Victoria) کا پوتا تھا۔ لارڈ ویول کی جگہ مارچ 1947ء کو وائسرائے آف انڈیا کی حیثیت سے آیا اور 31 مارچ 1948ء تک ہندوستان میں رہا۔

(Sawar, gul shahzad (2005) pakistan studies, An Analytical Approach to Pakistan Affairs. Karachi: Rehbar Publishers. pp 154.156)

پر بھی تو اس کا بڑا اثر پڑتا تھا' انگریز قوم پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ اس سے پہلے کا وائسرائے اس تحریک آزادی کو نہ مٹا سکا تھا' نہ کچل سکا تھا۔ اب یہ Select (منتخب) ہو کر آیا تھا۔ یہ وہاں انگلینڈ سے یہ کرنے کے لیے آیا تھا کہ میں جا کر یہ معاملہ سلجھاتا ہوں کہ یہ تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ اس نے آخر سر توڑ کوشش کر دیکھی مگر یہ معاملہ نہیں رکا۔ یہ ہم سے پوچھیں۔ میں تو ادھر وہاں بھی گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ وہاں ساری سیاست ہوتی تھی۔ وہاں کی چیزیں بھی میرے سامنے ہیں کہ اس شخص نے آ کر اس تحریک آزادی کو فیل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہ ہوا تو خود ہی وہ وہاں سے بھاگ کر انگلینڈ چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر کہا کہ بابا! کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے۔ اس کے یہ بیانات حال ہی میں چھپنے والی کتاب میں آئے ہیں۔

پرویزؒ کی چشم دید گواہی اور ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

اس کے یہ بیانات اس زمانے میں تو میرے سامنے تھے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ اس معاملے کے اندر میں ہر طرح سے کامیاب تھا' کوئی مشکل نہیں تھی' لیکن وہ معاملہ صرف اس ایک شخص [1] کے سر تھا کہ جسے یوں کرنا تھا جو میں اسے یوں میں نہیں بدل سکا۔ اس کا یہ بیان آیا ہے کہ میں نے ہر طرح کی چالاکیاں بھی کر دیکھیں' مگر یہ شخص ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس نے کہا ہے کہ اس قدر بڑا سیاستدان میں نے کہیں نہیں دیکھا' جو اپنی بات پر اس قدر راڑا ہے۔ یہ وہی ہے جسے بے لچک اصولوں کا مالک کہا گیا ہے۔ میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے جو میری شکست کا باعث ہو۔ وہاں جا کر وہ رویا ہے۔ انہوں نے پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جون 1948ء میں یہ کیا جائے گا۔ اس نے انگلستان جا کر کہا کہ بابا! تمہیں اس شخص کا پتہ نہیں ہے۔ اگر اس وقت تم نے اتنا لمبا عرصہ ڈال دیا تو معلوم نہیں کہ وہ شخص کیا قیامت برپا کر دے گا' خدا کے لیے ابھی دو تین مہینوں کے اندر اندر فیصلہ کر دو۔ 1947ء میں ہمیں وہاں ہوم ڈپارٹمنٹ میں Instructions (ہدایات) تھیں کہ جون 1948ء تک ٹرانسفر آف پاور (انتقالِ اختیارات) کا پروگرام بناؤ۔ وہ انگلستان جا کر واپس آیا اور آتے ہی اس نے ایک کلینڈر چھپوایا جو ہم سب کو تقسیم کیا گیا۔ اس نے یہ تین جون (1947ء) [1] کو بانٹ دیا تھا۔

اس نے اس کلینڈر پر 14 اگست ڈالی تھی' ڈالی کیا ہر صفحہ کے اوپر یہ تاریخ درج کی ہوئی تھی اور نیچے لکھا ہوا تھا کہ تقسیم ہند کے لیے اتنے دن رہ گئے۔ اگلا دن آیا تو اس میں پھر ایک دن کم ہو جاتا تھا۔ مثلاً پہلے میں نوے دن رہ گئے' ایک دن بعد نواسی دن رہ گئے' اٹھاسی دن رہ گئے۔ ہمیں یہ ڈائریاں دی تھیں کہ یہ دن گنتے جاؤ اور اس کے مطابق تقسیم کا پروگرام بناؤ۔

---

[1] ڈوگر پبلشرز (Latest) who is who&what is dhat' اردو بازار' لاہور' 2007ء ص 23۔

عزیزانِ من! اس درس میں دو چار منٹ شاید دیر ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ ایسا ہے کہ جسے بیان کیے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ یہ غالباً مارچ 1947ء کا واقعہ ہے۔ میں قائد اعظمؒ ❶ کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان قرآن کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں باتیں کرتا کرتا قرآنِ کریم میں سورۃ الرعد میں آنے والی بات کہہ گیا کہ نبی اکرمؐ نے خدا کے حضور یہ آرزو پیش کی کہ تیئیس سال ہوئے ہیں' اس کشمکش میں اتنا عرصہ لمبا ہو گیا' مشقتیں مصیبتیں صعوبتیں تکالیف یہ ساری کی ساری میرے حصے میں آئی ہیں۔ یا اللہ ایسا بھی ہوگا کہ میں اپنی زندگی میں اس چیز کو کامیاب ہی دیکھ لوں؟ یہ بڑی مقدس اور معصوم سی آرزو تھی۔ پھر پتہ ہے کہ وہاں سے اس کا جواب کیا آیا؟ وہ قانون والا خدا ہے۔ اس نے یہ کہا کہ اے رسول! یاد رکھو: عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:48) تیرا کام اس چیز کو عام کیے چلے جانا ہے' یہ ہم دیکھیں گے کہ ہمارے قانون کی رو سے یہ کب واقع ہوگا' یہ تیرا کام نہیں ہے۔ اب آگے کہا کہ یہ ضرور ہوگا' چاہے تیری زندگی میں ہو اور یہ ہو سکتا ہے کہ تیرے بعد ہو۔ ❷ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اپنا کام کیے جاؤ۔

قائد اعظم کے آنسو ان کی بلند ہمتی کا اظہار اور ایک نصیحت کا ''کام تیز کر دو''

عزیزانِ من! میں نے روا روی میں قرآن کی آیت میں یہ کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہو۔ وہ بات کیا کرتے تھے تو آنکھ میں آنکھ ڈال کر کیا کرتے تھے۔ اس طرح سے ان سے کوئی بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ کوئی ڈر ہوتا تھا۔ اس کے اندر احترام اتنا ہوتا تھا اور وہ ساتھ ساتھ ''ہوں'' اور ''ہوں'' کہتے رہتے تھے جس سے ہم سمجھتے تھے کہ بات چل رہی ہے۔ میں نے روا روی میں یہ کہا۔ اس کے بعد دیکھا تو وہ جو ''ہوں'' تھی' وہ نہ آئی۔ سامنے یوں کر کے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے اور مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ یہ ایسا کیوں ہو گیا۔ میں نے وہ کیا بات کہہ دی۔ میں نے کہا کہ پتہ نہیں' مجھ سے کیا چیز ہو گئی۔ منٹ کے بعد میں نے یہ عرض کیا کہ کیا کوئی ایسی چیز ہو گئی؟ کہنے لگے: نہیں' تم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی' یونہی میرے ذہن میں یہ آیا کہ وہ خدا کے جو اپنے آخری رسولؐ ہیں' جو اتنی عظیم ہستی ہیں' اُس معصوم کی' اس آرزو کے اوپر بھی' اس نے اپنی قانونی استثنیٰ نہیں کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ تیری زندگی میں ہو' ہو سکتا ہے کہ تیرے بعد میں ہو۔ اس کے متعلق مت گھبراؤ' کام کرتے جاؤ۔ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اتنا عرصہ یہ کرتے رہے' میں زندگی کے آخری دنوں میں پہنچ چکا ہوں۔ آرزو یہ ہے کہ شاید اپنے سامنے اس کو دیکھ لوں لیکن تم نے خدا کی یہ بات جو کہی ہے' اس سے تو

---

❶ قائد اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)۔

❷ قرآن کریم کی وہ پوری آیت یوں ہے: وَ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:40) جن باتوں کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ تو بہر حال ہو کر رہیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں تیرے سامنے وقوع پذیر ہو جائیں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اس سے پہلے ہی وفات پا جائے (لہٰذا اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتا جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق' نتائج کب ظہور میں آتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 563)۔

مجھے نظر آتا ہے کہ وہ اس پہ کوئی گارنٹی نہیں دیتا' تو اس پہ تھوڑا سا احساس پیدا ہوا۔ میں نے ان آنکھوں میں آنسو بھی ڈبڈبائے ہوئے دیکھے' جن پر انہیں اتنا ضبط تھا۔ وہ آنکھوں میں آئے ہوئے ان آنسوؤں کو بھی پھیر کر لے جایا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یا اللہ! یہ میں نے کیا کہہ دیا! میں نے کہا کہ جی' کوئی بات نہیں' یونہی بات بتائی تھی۔ پھر میں نے بتایا کہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں وہ سارا کچھ ہو گیا۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے' وہ تو ہو گیا لیکن خدا نے تو اس کے لیے کوئی گارنٹی نہیں دی تھی۔ یہ مارچ 1947 کی بات ہے۔ اس وقت تک نہ انہیں اس کا یقین تھا' نہ ہمیں یقین تھا کہ یہ ہو جانیوالا ہے۔ اور اب تک ان کی نصیحت' جو ہم سے بھی آگے چلے گئے تھے' یہ تھی کہ کام تیز کر دو۔ وہ تو عزیزانِ من! میں وہاں سے کچھ افسردہ سا ہی اٹھا۔ جانے لگا تو کہنے لگے کہ !Well, my boy وہ پیار سے ''بچے اِدھر آؤ'' کہتے تھے۔ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کے اس جواب کے باوجود' رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس پروگرام کو جاری رکھا تھا۔ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگے: ''بیٹا! پروگرام کو جاری رکھنا' خدا کی اس بات پہ نہ جانا'' [1]۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں مارچ 1947ء میں بھی کوئی یقین نہیں تھا کہ یہ ہو جائے گا اور وہ [2] انگلستان سے واپس آیا اور تین جون کو اس نے آ کر یہ بالکل غیر متوقع اعلان کرایا ہے۔ تین جون کے یہ ایسے مواقع ہیں' جہاں قرآن کی یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ [3] (28:5) ہم نے چاہا کہ یہ قوم' جسے یہ بڑا ہی کچل رہے ہیں' اس پہ کچھ احسان کریں' کچھ اُسے اپنی نوازش سے بہرہ یاب کریں اور وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۔ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (28:5-6) انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ اور فرعون' اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار' ہامان اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے اور جس سے بچنے کے لیے وہ اسقدر محکم تدابیر اختیار کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی تباہی اور بربادی۔ اس طرح ہم نے یہ چاہا کہ پانسہ پلٹ دیا جائے' انہیں ان کی زمینوں کا وارث بنایا جائے اور یہ جس چیز کی اتنا عرصہ مخالفت کرتے رہے کہ کہیں یہ تقسیم نہ ہو جائے' وہ ہو کے رہے اور پھر وہ ہو کے رہی۔

---

[1] یہ واقعہ انہوں نے طلوع اسلام بابت فروری 1983' ص ص 15-14 پر بھی رقم کیا ہے۔ اسی کے لیے مزید دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص 329 (فٹ نوٹ 1)

[2] ماؤنٹ بیٹن (79-1900)۔

[3] اس کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیش نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کیے جا رہا تھا' اسے ہماری نعمتوں سے نوازا جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 884)۔

نوعِ انسان کے لیے قرآن حکیم کا ابدی پیغام اور ابدی اُصول

عزیزانِ من! قرآن یہ چیز کہتا ہے کہ اس میں کچھ یہ پہلو بھی آجاتا ہے۔ اب ہوا یہ کہ **فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ** (23:48) انہوں نے ان دونوں کی تکذیب کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی ان قوموں میں سے ہو گئے جو تباہ ہو چکی تھیں اس لیے کہ جو قوم بھی زندگی کے صحیح اصولوں سے انحراف کرے گی' تباہ ہو جائے گی حالانکہ **وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ** (23:49) ہم نے موسیٰؑ کو ضابطۂ قوانین دیا تھا تاکہ وہ لوگ اس کے مطابق چل کر' اس تباہی سے بچ جائیں۔ عزیزانِ من! میں نے یہاں آکر یہی لکھا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں وہ ایسا خطۂ زمین پاکستان کے نام سے مل گیا۔ ہم نے اس کے ساتھ آج تک کیا کیا؟ اُف! کسی کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے: قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا۔ پھر یہ درخواست کی ہے کہ ہم خطاکار ہیں' ہم سے بھول ہو گئی' ہم نے خطائیں کی ہیں' یا اللہ! ان کو نظر انداز کر دے' ہمیں توفیق عطا کر دینا کہ تو نے ہمیں جس انعام سے نوازا تھا ہم اس کے حقدار ثابت ہوں۔

عزیزانِ من! اس اگلی بات میں ایک ٹکڑا ہے جو درمیان میں آیا ہے کہ مذہبی پیشوائیت آکر کیا کیا کرتی تھی۔ یہاں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کے فوری بعد یہ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر لے آیا ہے۔ یہاں یہ حق و باطل کی ساری کشمکش اقتدار کے ساتھ تھی' حکومت کے ساتھ تھی' یہ ٹکراؤ فرعون کے ساتھ تھا۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام آتے ہیں تو ان کا سارا ٹکراؤ مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی ان کی زندگی ہے۔ اب یہ چیز ہم اگلے درس میں لیں گے۔ آج کے درس کا وقت' عزیزانِ من! ختم ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

دسواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 50 تا 56)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿٥٠﴾ يٰٓاَيُّهَا
الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٥١﴾ وَاِنَّ
هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿٥٢﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ
زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى
حِيْنٍ ﴿٥٤﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي
الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٦﴾

عزیزان من! آج جولائی 1977ء کی 8 تاریخ ہے' جمعہ کا دن ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 50 سے ہو رہا ہے: (23:50)۔

تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ بات اس اہم نکتہ سے چلی ہوئی ہے کہ دین کا مقصد کیا تھا' انبیائے کرام علیہم السلام کس غرض سے آیا کرتے تھے' وحی کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟ قرآن کریم نے یہ بتا دیا تھا کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (19:10) نوع انسانی ایک واحد عالمگیر برادری کی طرح رہتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اختلافات شروع کیے۔ جب اس طرح اختلافات پیدا ہوئے تو فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (2:213) اللہ تعالیٰ نے ان کے اختلافات مٹانے کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا' انبیائے کرام علیہم السلام اسی غرض سے آیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب بھیجی۔ وہ کتاب کے ذریعے ان کے اختلافات مٹایا کرتے تھے۔ گویا انبیائے کرام خدا کی طرف سے ایک ضابطہ قوانین لے کر آتے تھے اور اس کا مقصد انسانوں کے خود وضع کردہ اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنا دینا ہوتا تھا۔ یہ ہے وحی کا' دین کا اور انبیاء کی بعثت کی غایت' منتہا اور مقصود و

ومطلوب۔ لہٰذا قرآن کریم نے اپنے ہاں یہ جو انبیائے کرام علیہم السلام کی داستانوں کے سلسلہ میں اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کیں تو اس میں اہم بات یہی تھی کہ اس خاص دور میں ان اختلافات کی نوعیت کیا تھی۔ اختلاف کے یہ معنی نہیں تھے کہ مناظرے ہوتے تھے بلکہ ان اختلافات نے انسانوں کو مختلف امتوں میں بانٹ دیا' مختلف قوموں میں' مختلف قبیلوں میں' گروہوں میں' خاندانوں میں اور پارٹیوں میں تقسیم کردیا۔

عالم گیر سطح پر وحی کی تعلیم کا مقصد امتِ واحدہ کی تشکیل ہے

ہر نبی کے زمانے میں یہ انسانیت جو گروہوں میں بٹ جاتی تھی تو اس تقسیم کی ایک خاص وجہ اور کچھ خاص بنیاد ہوتی تھی اور وہ نبی خاص طور پہ اس بناو بنیاد کو مٹانے کے لیے آتے تھے۔ کہیں نسل کی بنیاد پر وہ بٹتے تھے' کہیں قبائلی بنیاد پہ' کہیں طبقاتی تقسیم پہ' کہیں پیشوں کے اعتبار سے' اور کہیں وہ جاگیرداریوں' مزارعوں اور کاشتکاروں کی تقسیم پہ گویا یہ انسان مختلف طبقات کے اندر بٹے ہوئے ہوتے تھے اور انبیائے کرام علیہم السلام آتے تھے کہ ان کے طبقات کو مٹا کر انہیں پھر امت واحدہ بنا دیا جائے۔ قرآن نے آ کر یہ بتایا ہے اور یہی ہے وہ غایت جسے ''پنجابی میں ساری گل دا تت کڈیا ہویا کیندے نیں [1]''۔ ہر وہ نظریہ' عقیدہ' تحریک اور اقدام جو عالمگیر انسانیت کو ٹکڑوں میں بانٹ دے' تفرقے پیدا کردے' فرقے پیدا کردے' پارٹیاں بنادے' قومیں بنادے' وہ خلافِ دین' خلافِ وحی' خلافِ منشائے خداوندی ہے اور ہر وہ اقدام جو ان کو پھر سے ایک امت بنادے' ایک برادری بنادے' وہ دین کا مقصود ہے۔

قرآن کریم ایک تواتر کے ساتھ یہ سلسلہ بیان کرتا چلا آ رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ھود علیہ السلام' حضرت صالح علیہ السلام' حضرت شعیب علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں سابقہ درس میں یہ چیز سامنے آئی تھی اور اب یہ بات Climax (عروج) پہ آ پہنچی تا آنکہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا پیغام بر بنا کر بھیجا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ انہیں خدا کے صحیح دین کی طرف دعوت دیتا تھا اور اس کی والدہ' مریم علیہا السلام' کی بھی کیونکہ اس نے ان کی خود ساختہ شریعت کی خلاف ورزی [2] کی تھی۔ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے حالات نہیں بتائے بلکہ ایک آیت میں ان کی اور ان کی ماں کی طرف اشارہ کیا کہ **وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّآوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ** (23:50) ہم نے ان دونوں کو اس قوم کی نجات اور تباہی کی نشانی بنا دیا یعنی اگر وہ

---

[1] جسے پنجابی زبان میں ساری بات کا ملخص کہتے ہیں۔

[2] اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکہف وسورۃ مریم' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء (حصہ سورۃ مریم)۔

ان کی مخالفت سے باز آ کر ان کا احترام کرتے اور جو دین خداوندی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا' اسے اختیار کر لیتے تو وہ تباہی سے بچ جاتے' اگر وہ اس روش سے باز نہ آتے تو ہلاک ہو جاتے لیکن انہوں نے اس کی' سخت مخالفت کی یہاں تک کہ ہم نے ان دونوں کو ان کی دستبرد سے محفوظ کر کے ایک مرتفع مقام پر پناہ دی جو ان کے رہنے کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ اس میں صاف اور شفاف پانی کے چشمے رواں تھے جن کی وجہ سے وہ جگہ نہایت سرسبز و شاداب تھی۔

یہی کچھ ناقہ حضرت صالح علیہ السلام کے سلسلہ میں کہا تھا کہ دیکھیں کیا یہ لوگ قانون خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور ایک برادری بنتے ہیں یا نہیں؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا وہ قوم وحی خداوندی کا اتباع کرتی ہے' کسی شے کو اس اتباع کے جانچنے کا ایک Symbol (علامت) بنا دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے' کہ وہ قوم اتباع کرتی ہے اور وہ Symbol (علامت) ہمیشہ محسوس ہونا چاہیے جس سے پتہ چل جائے کہ یہ جو اس علامت کے لیے انہیں کہا جا رہا ہے اس پر عمل پیرا ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے۔ یہاں محسوس طور پہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی والدہ کو Symbol (علامت) بنایا جا رہا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ انہوں نے ناقہ صالح علیہ السلام کے ساتھ کیا' وہی کچھ اس قوم بنی اسرائیل نے اپنے اس آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا اور یہاں یہ تفرقہ' یہ تفریق' یہ اختلاف' Climax (نقطۂ عروج) پہ پہنچ گئے تھے۔ آپ نے پہلے یہ دیکھا کہ یہ اختلافات نسل کی بنیادوں پر' طبقاتی بنیادوں پر' پیشوں کی بنیادوں پر' دولت کی بنیاد پر' قومیتوں کی بنیادوں پر نظر آتے ہیں اور یہاں آ کر ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرام کے اس دنیا میں آنے کی تو بنیاد ہی ایک بنتی ہے یعنی یہ کہ دین میں اختلافات کو مٹا کر ایک امت بنانے کے لیے اور یہ دین کے نام لیوا جنہیں مذہبی پیشوائیت کہا جاتا ہے' دین کے نام پہ' اس بنی ہوئی امت واحدہ کے اندر' تفریق پیدا کرتے تھے یعنی یہ انتہا ہے کہ یہی گروہ پہلے تفریق پیدا کرتا ہے۔ ان میں خدا کو بھی نہ ماننے والے کیوں نہ ہوں لیکن یہاں قیامت یہ تھی کہ یہ خدا کے نام پہ ایک تحریک لے کر اٹھتے تھے مگر مقصد و منشا ان کا کچھ اپنا تھا۔ لہٰذا یہ تھا جو خدا نے کہا ہے کہ کسی طریقے سے پہلے نبی نے کچھ تفرقے مٹائے ہیں' تو یہ اس سے بھی زیادہ شدید تفرقے پیدا کر دیتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر بننے والے فرقوں کے علاوہ جو باقی تفرقے تھے وہ Common Sense (عقل عامہ) کی بنیاد پہ ہی سہی' Reason (عقل) کی بنیاد پہ ہی سہی' کوئی شخص بھی اس تفرقے کو اختلاف کو' مستحسن قرار نہیں دیتا لیکن یہ مذہبی بنیاد پر پیدا کردہ وہ تفرقہ ہے جس میں اس پہ فخر کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم یہ جو آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر لایا ہے اور یہ جو انبیائے کرام علیہم السلام کی کڑی تھی' اس میں بھی بنی اسرائیل کے انبیاء میں یہ آخری کڑی ہے تو وہ اسی لیے ہے کہ یہاں پہنچ کر مذہبی پیشوائیت کے پیدا کردہ اس تفرقے نے وہ شدت کی گہرائی اختیار کی کہ جس کی مثال اس سے پیشتر تفرقوں میں کہیں نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ دعویٰ تو ان کا یہ ہوتا ہے کہ ہم تمہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے پہ چلا رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے اس راستے میں روک بن کر کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کے لیے احبار و رہبان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہاں فرمایا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ❶ (9:34)۔

احبار و رہبان کی اصطلاحات کا مفہوم

عزیزانِ من! یہودی اور عیسائیوں کے ہاں یہی اصطلاحات ہیں۔ احبار، حبر کی جمع ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں ''علماء''۔ رہبان، راہب کی جمع ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ''پیرانِ طریقت، مشائخ''۔ احبار شریعت کے علمبردار ہیں اور رہبان طریقت کے علمبردار ہیں۔ یہودیت میں بھی یہ دونوں گروہ ہوتے تھے۔ یہودیت کی ابتدائی زندگی میں تو صرف شریعت اور قانون تھا لیکن آخر میں آ کر ان کے ہاں بھی یہ طریقت آئی، باطنیت آئی، یہی تصوف آیا اور ان کے ہاں علما کے علی الرغم یہ مشائخ کا، پیروں کا، گروہ پیدا ہوا اور یہ تھے وہ جن کو رہبان کہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں کے تصوف کے لیے رہبانیت کی یہ Term (اصطلاح) استعمال ہوتی ہے اور پھر جب مشائخ کا ذکر آ جائے تو پھر تو سوال ہی نہیں ہے کہ ان کا نام نہ آئے، خواہ آپ ان کا نام کچھ بھی رکھ لیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہودیوں کے ہاں تو یہ پیدا ہو چکے تھے اور جب عیسائیت میں یہ چیز آئی تو جسے آپ علما کا یہ گروہ کہتے ہیں، جنہیں آپ احبار کہتے ہیں، انہوں نے تو ایک پوری گدی سنبھالی ہے۔ وہ جو ہیکل سلیمانی❷ چلا آ رہا تھا، وہ تو اس زمانے میں اس مملکت کا کیپٹل (دارالخلافہ) تھا لیکن جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو یہ جتنی چیزیں، ایوانات حکومت ہوتی ہیں، مملکت کے مرکز ہوتے ہیں، وہ پھر آپ کے ہاں پرستش گاہیں بن جاتی ہیں، تو وہ ہیکل انہوں نے بعد میں پرستش گاہ بنایا اور خود اس کے ہاں فریادی بن بیٹھے لیکن کیفیت عجیب تھی۔ یہاں ایک عجیب قسم کی تفریق شروع ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنی اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں۔ انہوں نے انہیں انسانوں کی غلامی سے چھڑایا تھا اور خدا کی غلامی میں لے آئے تھے۔ یہی احبار و رہبان، انہی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے اور انہی کے دین پر چلنے کے مدعی تھے مگر ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ رومن ایمپائر (سلطنتِ روما)❸ کے تابع رہتے تھے اور بڑے خوش تھے۔ انہوں نے ان سے یہ اجازت لے رکھی تھی کہ وہ ان

---

❶ ان کے علماء و مشائخ میں سے جنہیں یہ خداوندی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے، لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔424)۔

❷ ہیکل سلیمانی کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء، دوسرا باب، ص ص 50-28۔

❸ رومن ایمپائر (سلطنتِ روما) کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص 92، فٹ نوٹ 1 اور ص 91 فٹ نوٹ 6۔

کے اعتقادات، مذہبی رسوم، Presonal Laws (شخصی قوانین) میں دخل نہیں دیں گے یعنی اگر کسی حکومت کی طرف سے اس قسم کی اجازت مل جائے کہ ''جاؤ، جس طرح جی چاہے گھنٹے بجاؤ، باجے بجاؤ، گیت گاؤ، جیسے جی چاہے عبادتیں کرو، اپنے نکاح طلاق کے مسئلے آپ طے کرو، لیکن ہمارے معاملے میں دخل نہ دو تو وہ اس حکومت کے تابع رہیں گے۔ اگر اس حیثیت سے دیکھا جائے تو عین وہی چیز تھی جو ہندوستان میں تحریک پاکستان کے زمانے میں مذہب کے نام پہ پیش کی جاتی تھی کہ ان چیزوں کی یعنی شخصی قوانین کی اجازت دی جارہی ہے، وہ گارنٹی (ضمانت) دیتے ہیں کہ مذہبی آزادی حاصل ہوگی، باقی رہی مملکت تو مملکت کے قوانین جمہوری طریقے پر ہونگے اور جمہوریت تو پھر ان کے ہاں مذہب سے بھی زیادہ مقدس ہو چکی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ''جرم''

عزیزانِ من! یہ تھی بنی اسرائیل کی، یہودیوں کی صورت۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو کلیسا نے، چرچ نے، ان کی جو تاریخ زندگی پیش کی ہے وہ عجیب چیز ہے۔ انہیں جوگی، سادھو، سنیاسی، تارک دنیا قسم کا بنا کر رکھ دیا کہ کوئی ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسری گال آگے کر دو، کوئی گالی دے تو کہو اللہ تیرا بھلا کرے۔ یعنی وہ یہ کچھ دینے کے لیے آئے تھے، لیکن اس ساری مسخ کردہ تاریخ میں وہ تختی [1] کو اتارنا بھول گئے۔ ان رومن کے ہاں یہ قاعدہ تھا کہ جسے موت کی سزا دی جاتی تھی، صلیب پہ چڑھایا جاتا تھا، اس کے نیچے تختی پر اس کا جرم لکھا جاتا تھا۔ وہ جو تختی ہے وہ محفوظ رہی۔ اس پہ لکھا ہوا جو جرم تھا، وہ یہ تھا کہ یہ ''شخص رومن ایمپائر (سلطنت روما) کا تختہ الٹ کر بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اس بغاوت کی سزا میں اس کو یہ صلیب دی جاتی ہے۔'' یہ بنی اسرائیل میں نبی پیدا ہوا۔ اب اس تختی نے بتا دیا کہ ان کی تحریک (Movement) کیا تھی؟ تحریک یہ تھی کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرعون کی غلامی (Slavery) سے نکالا تھا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انہیں رومن ایمپائر (سلطنتِ روما) کی غلامی سے نکال کر، دین کی بنیادوں پر، ایک آزاد قوم بنانا چاہتے تھے اور یہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ یہودیوں کے احبار نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف مرتد ہو جانے کے یعنی ارتداد کے، جرائم عائد کیے۔ یہ جو آپ کے ہاں بھی مرتد کی سزا قتل ہے تو دراصل یہ سزا یہودیوں کے ہاں تھی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہ جرم عائد کیا اور ان کے ہاں کے مذہبی پیشواؤں یعنی احبار نے سزائے موت کا فتویٰ دے دیا۔ احبار یہ سزا خود نہیں دے سکتے تھے، وہ تجویز کرتے تھے، انہیں حکومت سے اس کی Approval (منظوری) لینا پڑتی تھی۔ اس Approval

---

[1] اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکھف وسورۃ مریم (کا حصہ سورۃ مریم)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء، (بالخصوص، ص۔294)۔

(منظوری) کے لیے وہ گورنر کے پاس گئے تھے۔ اور اُس پہ یہ Pressure (دباؤ) ڈالا کہ اگر تم نے اس سزا کی منظوری نہ دی تو تمہاری حکومت کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔ انہوں نے وہاں سے اس کی سزا کی Approval (منظوری) لی تھی۔

غور کیجیے گا کہ یہ لوگ کہاں تک جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک وہ شخص اٹھتا ہے، وہ ان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، ان کو غلامی کے چنگل سے نکال رہا ہے۔ یہ ایک غیر قوم کی محکومیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اسی کے خلاف اٹھتے ہیں اور اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ وہ ان کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ان کے ہاں کا انجیل کا وہ بیان صحیح ہے تو خود ان کے جو حواری یا شاگرد بنے ہوئے تھے، ان کے اندر غدار گھسے ہوئے تھے۔ بقول انجیل انہی میں سے ایک نے انہیں کل تیس [1] روپے میں پکڑوایا تھا کہ جو جی میں آئے ان سے کرالو۔ یہ وہی ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ بس ان کو چند ٹکے دے دیجیے۔ اندازہ لگائیے کہ ان کے علما کا، ان کی مذہبی پیشوائیت کا، کتنا سنگین جرم ہے۔

یہ جو طریقہ تھا، وہ میں ابھی آپ کے سامنے پیش کرونگا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف ان کے جذبہ انتقام کو کس قدر بے نقاب کرتا تھا کہ موت کی سزا دی، رومن ایمپائر (سلطنتِ روما) سے Approval (منظوری) لی، انہی میں سے ایک نے کچھ پیسے لے کر اس کو بیچ دیا، اور ان کے حوالے کر دیا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ داستان آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ صلیب کا یہ سارا کچھ افسانہ ہے۔ وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ [2] بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم خدا کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، اسی لیے دنیا تمہارے پیچھے لگتی ہے لیکن اس سلسلہ میں دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (9:34)۔ یہی چیز تو ہے کہ یہ علما ہوں یا یہ مشائخ ہوں، ارباب شریعت ہوں یا اصحاب طریقت ہوں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے، لوگوں کے مال پہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے تو یہی سب سے بڑا جرم ہے کہ معذور تو الگ رہا جو کسب رزق کے قابل ہے وہ خود کمائی نہ کرے اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ اسے ہی تو وہ باطل کہتا ہے۔ ان دونوں (احبار اور رہبان) کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا رزق تو اس طرح سے باطل ہوتا ہے اور اگلا جرم یہ ہے کہ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (9:34)۔ کہتے ہیں کہ ہم تم لوگوں کو خدا کی طرف جانے والے راستے پہ ڈالتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کی طرف لے جانے والے راستے کے اندر سب سے بڑی روک یہی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ روک بن کر

---

[1] انجیل متی باب 26، آیت 15

[2] اس ہجرت کی تفصیل و وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الکھف و سورۃ مریم، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء، حصہ سوم مریم۔

کھڑے ہوجاتے ہیں کہ لوگ اس راستے پر جانے نہ پائیں۔

عزیزانِ من! اس نقطے پر قرآن کریم نے کسی خاص قوم کے احبار ورہبان نہیں کہے بلکہ جہاں بھی یہ چیز آئے گی وہاں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کہا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (9:34)۔ دیکھیے ایک ہی آیت میں، ایک ہی سانس میں، قرآن ان دونوں (احبار ورہبان) کے متعلق کیا کیا گنا گیا ہے: ایک تو یہ کہ خود کمائی نہیں کرتے، دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس آیت کا باقی حصہ یہ ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) ان کو بھی اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی، جن کے سرمایہ داری کے نظام کو یہ شریعتِ خداوندی کہہ کر فتویٰ دے دیتے ہیں، یہ سارے کے سارے جو گروہ ہیں، ان کو اس کی خوشخبری دید یجیے کہ ان کے انجام میں بڑا دردناک عذاب ہوتا ہے۔ یہ سب کے متعلق ہے۔ آپ غور کر رہے ہیں کہ کس طرح ہم لوگوں کے لیے یہ چیزیں بطور فریب دی جاتی ہیں کہ یہ قصہ تو یہودیوں کے متعلق ہے، جی یہ تو عیسائیوں کے متعلق ہے، قرآن کی یہ بات مجوسیوں کے متعلق ہے یعنی ہمارے متعلق یہ ہے کہ بس جو جی میں آئے کرتے رہیں، شفاعت محمدی ﷺ ہمیں جنت میں داخل کر دے گی۔ وہی یہودیوں کا اور نصاریٰ کا جو عقیدہ تھا کہ وہ جنت ہمارے لیے مختص (Reserve) ہے، ہمارے سوا کوئی دوسرا اس میں داخل ہی نہیں ہوسکے گا، جو جی میں آئے ہم کریں جبکہ قرآن کریم یہ بتا رہا ہے کہ یہ خدا کی طرف جانے والے راستے کے اندر روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ خدا کی طرف جانے والا جو راستہ تھا اس کی شناخت تو یہ تھی کہ وہ قوم میں تفرقے کو مٹا کر وحدت پیدا کرے گا، لیکن ان کا تو وجود ہی تفرقے کی نشانی ہوتا ہے، اس لیے قرآن کریم نے دین کے اندر جو فرقہ پیدا کرنے والے ہیں ان کو مشرکین کے گروہ کے اندر رکھا ہے: مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ . مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا (32۔30:31) دیکھنا اے جماعت مومنین! ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہوجانا یعنی ان میں سے نہ ہوجانا جو دین میں فرقے پیدا کر لیتے ہیں اور خود اس کا ایک فرقہ بن جاتے ہیں اور پھر کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ [1] (32:30)۔ اتنے فرقے ہوتے ہیں اور ہر ایک ہی یہ سمجھتا ہے کہ بس ہم حق پر ہیں، دوسرے باطل پر ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جو قرآن کریم نے ان یہود ونصاریٰ کے متعلق کہی ہے۔

---

[1] فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہوجاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق وصداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔937)۔

اب اسی سلسلہ میں آگے ایک دلچسپ چیز بیان کی کہ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (2:113) وہ اس کتاب کی پیروی کرتے ہیں جس کا سرچشمہ ایک ہے مگر قَالَتِ الْيَهُوْدُ (2:113) یہودی کہتے ہیں کہ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ (2:113) یہ نصاریٰ باطل کے اوپر ہیں' یہ سب جہنم میں جائیں گے وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ (2:113) اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ یہودی سب باطل پہ ہے' جہنم میں جائیں گے۔ اب تماشہ دیکھیے کہ یہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم خدا کی کتاب کے پیرو ہیں۔ خدا کی کتاب کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کے خدا کی طرف ہونے کا ثبوت اور دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہوتا' تو دو متضاد گروپ جو ایک دوسرے کو جہنمی بتائیں' وہ جو دعویٰ کریں کہ ہم خدا کی کتاب کے متبع ہیں اور ان کے تفرقے کی باہم کیفیت یہ ہو یہ تو خود اس بات کا ثبوت ہو گیا کہ یہ خدا کی کتاب نہیں۔ اب دوسری جگہ اس نے یہ بتا دیا کہ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79)۔ یہ تباہی اور بربادی کا موجب ہے کہ یہ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ شریعت خداوندی کا حکم ہے اور لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (2:79) یہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ چار پیسے مل جائیں۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ یہ وہ چیز تھی جسے میں نے Crisis (بحران) کہا ہے' یہ چیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آ کر Climax (نقطہ عروج) پہ پہنچ گئی تھی۔ یہودیوں کے ہاں ان کو رومن ایمپائر (سلطنت روما) کی Protection (حفاظت) مل گئی تھی۔ اس میں وہ ان کی محکومی میں رہ رہے تھے' ہیکل کو انہوں نے اپنی قوت کا گڑھ بنا رکھا تھا۔ اس دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ قرآن کریم میں تو یہ تفاصیل دی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے ہاں کی تورات یا انجیل دونوں ہی بالکل محرف ہیں' اصلی نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ باتیں تو رہ ہی جاتی ہیں' جن سے نظر آتا ہے کہ صحیح تھیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دورِ نبوت میں مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری کی کیفیت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی' ان کا مشن' ان کی مساعی' ان کی جمعیت' انہی احبار و رہبان کے خلاف ایک کھلا ہوا جہاد تھا۔ ان کے مفاد کے نقطہ نگاہ سے تو وہ سچے تھے کہ وہ ایسا آدمی ہے' جسے واقعی اپنے شکنجے میں کس لے لینا چاہیے۔ یہ اناجیل ان کے متعلق کیا کہتی ہیں کہ وہ کرتے کیا تھے'[1] یہ تو جب میں ان کی زندگی کے متعلق آگے چل کر' قرآن میں جو یہ واقعات آئیں گے' تو عرض کروں گا کہ کس طرح بچپن میں ان کی والدہ ان کو لے گئی تھیں۔ یہ جو یہاں ہے کہ وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ[2] (23:50) بچے کو' ان

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شعلہ مستور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994' بالخصوص ص ص۔ 55 تا 65۔

[2] ہم نے ان دونوں کو' ان کی دستبرد سے محفوظ کر کے' ایک مرتفع مقام پہ پناہ دی' جوان کے رہنے کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ اس میں صاف اور شفاف پانی کے چشمے رواں تھے (جن کی وجہ سے وہ جگہ نہایت سرسبز و شاداب تھی۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 781)۔

یہودیوں سے بچانے کے لیے اس کی والدہ اور وہ [1] وہاں سے فلسطین کی سرزمین کی طرف چلے گئے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کہیں مصر میں جا کر حضرت مریمؑ اور ان کے شوہر یوسف نجار گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے اور یہ بچہ بھی جو پیدا ہوا تھا۔ وہ میں پھر بتاؤں گا کہ حضرت مریم کو وہ کیا خوف تھا' جو وہ یہاں سے گئیں لیکن بہر حال وہ وہاں چلے گئے۔ یہاں قرآن نے لفظ ''ربوۃ'' کہا ہے۔ آپ سمجھتے ہونگے کہ پتہ نہیں لاہور ریلوے اسٹیشن سے انہوں نے ٹکٹ لی اور ربوہ جا پہنچے۔ یہ آپ کے ہاں کا ربوہ تو اب بنایا گیا ہے۔

عزیزان من! ربوہ کہتے ہیں سطح مرتفع کو۔ یہ ذرا اونچی زمین ہے' تھوڑا سا پہاڑی علاقہ ہے' اس میں ان کو رہنے کی جگہ بھی ملی اور چشمے بھی تھے۔ اس لیے کہ وہ بنجر زمین نہیں تھی۔ اس زمانے میں اگر کہیں پانی ہوتا تھا اور پانی کے ساتھ تو بہر حال کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان مل جاتا تھا' زندگی بڑی سادہ ہوتی ہے' پھل مل جائیں یا عام طور پہ جو پیداوار ہوتی ہے اس میں سے کھانے کو مل جائے اور رہنے کو قرار کی جگہ مل جائے تو گزارہ ہو جاتا تھا۔ یہاں کہا کہ وہاں یہ جگہ مل گئی تھی۔ آپ اس قصے کو چھوڑ دیجیے۔ انجیل بھی یہ بتا رہی ہے کہ اس کے بعد جب آپ کوئی تیس برس کے ہوئے پھر وہاں سے واپس ہیکل میں آئے۔ یہاں آنے کے بعد ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ ہیکل کی سیڑھیوں [2] پر کھڑے ہو کر اپنے عقیدت مندوں کو مخاطب کرتے تھے۔ یہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور احیائے بنی اسرائیل کی آخری کوشش تھے۔

ہیکل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انقلابی خطاب

عزیزان من! اب آپ اس میں دیکھیے کہ وہ جو ہیکل تھا' وہ نہ صرف ان کی پرستش گاہ تھی بلکہ ان کی اپنی تھیا کریسی (مذہبی حکومت) کا مرکز بھی تھا۔ وہ احبار اور رہبان دونوں کا ہی مرکز تھا۔ آج کی اصطلاح میں' یہ ان کی وہ خانقاہ تھی' جہاں حضرت مریمؑ چڑھاوا چڑھانے گئی تھیں۔ انجیل بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیکل کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ جو عقیدت مند تھے وہ سارے وہاں آ جاتے اور یہ وہاں کھڑے ہو کر ان کو مخاطب کر کے' انجیل کے الفاظ میں اسے یہ کہا جائے گا' کہ وہ وعظ کہتے تھے۔ میں کہونگا کہ اس سے بڑا انقلابی خطاب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ احبار و رہبان اور ان کے نمائندے ہیکل میں ہوتے اور یہ ان کو کھڑے ہو کر پکار کر کہتے: ''اے ریا کار فقیہو!'' یہ ہوتا ہے ایک انقلابی۔ کس مقام پہ کھڑے ہیں؟ ذرا سوچیے تو سہی کہ یہ سارے آنے والے ان کے اتنے بڑے عقیدت مند ہیں اور ادھر وہ فقیہ ہیں جو ان کے ہاں کے یہ رہبان تھے۔ اندازہ لگائیے کہ ادھر وہ موجود ہیں جنہیں اتنے زیادہ اختیارات حاصل ہیں کہ موت

---

[1] ڈاکٹر انعام الحق نے داستانِ فلسفہ تالیف وِل ڈیورینٹ' مترجم عابد علی عابد' ص 370 کے حوالے سے ''حکمت کی باتیں'' کے عنوان سے مجلّہ طلوع اسلام اگست 2007ء میں لکھا ہے کہ ''ہیگل نے حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات قلمبند کی۔ اس تالیف میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مریمؑ اور یوسف کے لڑکے تھے اور بعد میں کتاب کو ضائع کر دیا۔''

[2] ہیکل کی سیڑھیوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریر کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سوہ الکھف وسورۃ مریم' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص۔207۔

سے ورے تو ہر سزا وہ خود دے سکتے ہیں اور موت کی سزا دینے کے لیے صرف ان کو Approval (منظوری) لینے کی ضرورت ہے۔ یہ تو قانونی بات ہوگئی اور قانون کے علاوہ یہ اتنا بڑا ان کا جمہور ہے اور ادھر ان کے عقیدت مند چلے آرہے ہیں۔ یہ احبار و رہبان اوپر موجود ہیں۔ ان میں یہ شخص کھڑا ہے۔

یہ ہوتا ہے نبی اور عزیزان من! وہ خطاب کر رہا ہے کہ ''اے ریاکار فقیہو! تم پر افسوس ہے''۔ میں نے قرآن کی آیت پڑھی تھی کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف لے جاتے ہیں اور عمل یہ ہے کہ اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں (9:34)۔ انہوں نے کہا کہ ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے [1] ہو''۔ یہ وہی ہے جو قرآن کریم کی آیت ہے کہ **یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** [2] (9:34)۔ ظاہر ہے کہ جو راستے میں روک بن کر کھڑا ہوا ہوتا ہے وہ نہ تو خود وہاں اندر پہنچا ہوا ہوتا ہے اور نہ کسی اور کو جانے دیتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے کہا تھا کہ اس قسم کی جو تحریک ہے اس کے متعلق کتابوں کے اندر بھی اس قسم کے ٹکڑے موجود ہیں جن سے نظر آتا ہے کہ واقعی یہ خدا کی چیز تھی۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے کہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ تم تو ہو ہی جہنمی۔ ''اپنے سے دگنا جہنم کا فرزند اس کو بنا دیتے ہو''۔ اصطلاح ملاحظہ فرماؤ' عزیزان من! اگرچہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ محرف انجیل ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خطابات کا انداز اس زمانے کا نظر آتا ہے۔ تمثیلی انداز ہے اور بڑی خوبصورت مثالیں ہیں۔ وہ ساری بات تمثیلات و استعارات میں کرتے ہیں۔ ایک اصطلاح یہ دی کہ ''اے اندھے' راہ بتانے والو!'' کیا بات ہے' خدا کا رسول یہ ہوتا ہے! عزیزان من! بھولنا نہیں کہ یہ کہاں کھڑے ہیں' کس قوم میں کھڑے ہیں' کن لوگوں میں کھڑے ہیں' اور کہہ یہ رہے ہیں کہ ''اے اندھے' راہ بتانے والو! تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں''۔ وہ ہیکل کو مقدس کہتے تھے' ہم بیت المقدس کہتے ہیں۔ اس مقدس کے معنی ہیں جس میں ایک مقدس چیز رکھی ہوئی ہو۔ ''تم یہ کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھالے تو کوئی بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے! سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ پودینے اور

---

[1] یہ جملے متی کی انجیل میں موجود ہیں (متی 23:10)

[2] خدا کی طرف آنے والے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

سونف اور زیرے پر تو وہ یکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو"۔ ❶

قرآن حکیم نے انسانی ذہنیت کی ترجمانی کی ہے

عزیزانِ من! کیا یہ دو ہزار ❷ سال پہلے کی بات ہو رہی ہے؟ میں نے کہا تھا کہ جب قرآن میں احبار و رہبان کا ذکر آئے تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ کسی خاص قوم کے نہیں ہیں۔ قرآن تو ان کی ذہنیت (Mentality) بیان کرتا ہے' ان کی نفسیات بیان کرتا ہے' ان کا کیریکٹر بیان کرتا ہے' خواہ وہ کسی بھی قوم میں ہو' کسی زمانے میں ہو' کسی مذہب میں ہو' کسی پارٹی میں ہو۔ قرآن خاص طور پہ کسی زمانے کی بات نہیں کرتا۔ اس سے پہلے جتنی بھی چیزیں ہم نے دیکھی ہیں' وہ اس قوم کی اضافت کے لحاظ سے' ریفرنس یا حوالے کے لحاظ سے' تو نظر آتی ہیں کہ وہ قوم ھود اور قوم ثمود کی ہیں لیکن وہ جو کیریکٹر بیان کرتا ہے' وہ عالمگیر ہے' وہ ہر دور میں پایا جائے گا۔ قرآن کریم نے تو ان کی داستانیں بیان ہی اس لیے کی ہیں کہ تم جو قرآن کے ماننے والے ہو' دیکھنا کہیں یہ کچھ نہ ہو جائے۔ سنیے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا "اے ریاکار فقیہو اور فریسیو' تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" آگے سنیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیا کہتے ہیں: "اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔" اپنے متبعین (Followers) کو Warn (تنبیہ) کرتے ہیں کہ "دیکھنا' یہ فقیہ جو موسیٰ علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں' جو کچھ بتائیں' وہ سب کرو اور مانو لیکن وہ جو کریں وہ بالکل نہ کرو' یہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں' وہ اپنے لیے بڑے بڑے تعویذ اور قبے بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔" ❸ عزیزانِ من! یہ آج کی بات نہیں ہے۔ یہ مخصوص نظام ہوتا ہے' اس کی خاص وضع قطع ہوتی ہے اور یہ چیز بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔

احبار و رہبان کی ذہنیت کی بنا پر فرقہ بنتا ہے

یہ جنہیں احبار کہتے تھے' (یا کہتے ہیں)' یا علما کہتے تھے' (یا کہتے ہیں)' اس سلسلے میں یاد رکھیے کہ دراصل ہوتا یہ ہے کہ پہلی کتابوں کے اندر جو کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے' اس کی معلومات ان کے پاس ہوتی ہیں۔ بس پھر یہی ہوتا ہے۔ مثلاً انجینئر کے پاس معلومات ہوتی ہیں' ڈاکٹر کے پاس معلومات ہوتی ہیں' آرکیٹکچر کے پاس معلومات ہوتی ہیں' اپنے فن کے مورخ (Historian)، Professor

---

❶ متی (23:1-34) ❷ یاد رہے یہ 8 جولائی 1977ء کو کہا گیا تھا۔ ❸ حوالہ (متی 23:1-36)

(پروفیسر) ہوتے ہیں' ان کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ اگر ہسٹری (تاریخ) کے پروفیسر ہیں' تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہسٹری (تاریخ) میں کیا لکھا ہے۔ ان معلومات کی بنا پہ کیا کبھی آپ نے دیکھا یا کہا کہ انجینئر ایک فرقہ بن گئے ہوں اور ڈاکٹر ایک فرقہ بن گئے ہوں؟ نہیں' لیکن تماشہ یہ ہے کہ ان احبار و رہبان کے پاس وہ معلومات ہوتی ہیں' جو دوسروں کو نہیں ہوتیں۔ اب جس کا جی چاہے وہ ان کتابوں کو لے' اور وہ معلومات حاصل کر لے لیکن یہ لوگ اپنے ہاں ایک گروہ بندی عنصر کو بھی شامل کر کے' باقی لوگوں سے' جو اسی شریعت کے متبع ہوتے ہیں' الگ ایک فرقہ بنا لیتے ہیں اور جو اس میں داخل نہیں ہوتا خواہ اس کی معلومات ان سے بھی زیادہ ہی کیوں نہ ہوں' وہ اسے صاحب اختیار نہیں قرار دیتے بلکہ اس کے خلاف کفر کا فتویٰ دے کر ایک الگ فرقے کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ تفرقہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانے والے ہیں۔

قومیت کے معیار پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ میں فرق

عزیزانِ من! یہ بات دُور کی تاریخ کی نہیں ہے' اپنی ہی تاریخ کی ہے۔ آپ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1879-1957) اور علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1938 - 1877) کے درمیان جو کشمکش ہوئی تھی اسے پڑھیے۔ وہ قومیت کے معیار پر تھی۔ ❶ آپ اندازہ لگائیے کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے مقابلے میں دوسری طرف کہنے والا اقبال رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ ہزار برس میں دین خداوندی پہ صحیح نگاہ رکھنے والا' ان جیسا شاید ہی کوئی دوسرا پیدا ہوا ہو۔ کم از کم میری بصیرت میں تو نہیں ہے۔ وہ شخص' یعنی مولانا حسین احمد مدنی مرحوم' جواب میں یہ لکھتے ہیں کہ ''ٹھیک ہے' انہوں ❷ نے بہت سی قرآن کی آیات بھی دی ہیں اور احادیث کے حوالے بھی دیئے ہیں' لیکن آپ سوچیے کہ ڈاکٹر سر اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایک اسکالر (Scholar) ہو سکتے ہیں' عالم تو نہیں ہو سکتے''۔ آپ اسکالر (Scholar) تو جھٹ سے کہہ دیں گے اور بھول جائیں گے کہ صاحب! اس لفظ کا ترجمہ عالم ہے۔ یہ ترجمے کی بات نہیں ہے۔ بقول ان کے یہ عالم ایک مخصوص گروہ کا فرد ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب عالم یا علما کہتے ہیں تو وہ ایک خاص گروہ ہوتا ہے جو اس سے باہر ہے۔ ❸ وہ جو کہہ رہے ہیں اس کا اندازہ لگایئے۔ مدنی صاحب ❸ نے یہ جواب دیا۔ یہ لکھی ہوئی کتاب میں موجود ہے کہ ''ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن اقبال رحمۃ اللہ علیہ عالم نہیں ہے' اس لیے دین کے

---

❶ قومیں اوطان سے بنتی ہیں' دین سے نہیں' علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے ہاں ''ارمغانِ حجاز (اردو)'' میں حسین احمد کے عنوان سے یہ لکھا تھا:

عجم' ہنوز نداند رموزِ دیں' ورنہ ... زدیو بند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است ... چہ بے خبر زمقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ... اگر بہ او نرسیدی' تمام بولہبی است

❷ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)

❸ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1879-1958)

موضوع پر گفتگو کرنے کا انہیں حق نہیں ہے۔'' جی' میں احبار و رہبان کے متعلق یہ کہہ رہا تھا کہ یہ اپنے لیے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں' اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں' ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں رکھتے ہیں' اور بازاروں میں سلام لینا اور مولانا کہلانا پسند کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ (1865-1935) آخری دور میں آئے تھے۔ حالانکہ وہ دیوبندے کے بہت بڑے عالم تھے لیکن وہ بڑا انقلابی ذہن لے کر آئے۔ ساری عمر وہ افغانستان' ترکی اور روس میں رہے۔ وہ مسلم امہ میں اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔ دیوبند گروہ کے ساتھ شامل ہونے کے جتنے بھی ''شناختی کارڈ'' ہوتے ہیں' ان کے خلاف کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ یہ چیز کہہ دی کہ یہ خاص قسم کا لباس ایک علامت بن جاتا ہے تو مولانا کفایت اللہ مفتی نے یہ کہا کہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ لباس میں کیا رکھا ہے' کوئی سا بھی پہن لیا جائے۔ اس پر انہوں ❶ نے جواب دیا کہ ''مجھے خوشی ہوئی کہ مفتی صاحب نے یہ فرمایا ہے' تو میں عرض کرونگا کہ اگر لباس میں کچھ نہیں رکھا' تو اگلے جمعہ کو مفتی صاحب نیکر (Knicker) پہن کر' سر پہ ٹوپ (Hat) رکھ کر' ذرا مسجد میں آئیں''۔

آپ دیکھ رہے ہیں' کہ یہ پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں' ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں رکھتے ہیں' اور بازاروں میں سلام لینا اور دوسروں سے مولانا کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ یہ شخص ❷ ہیکل کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کر ان کے علی الرغم ان لوگوں کو یہ کچھ کہتا ہو تو کیا وہ اس کو چھوڑ دیں گے؟ نظر یہ آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا اثر ہو رہا تھا اور وہ بات جو ابھی میں نے کہی ہے کہ وہ تختی ❸ پہ لکھی ہوئی تھی کہ ''یہ بادشاہ بننا چاہتا تھا''۔ یہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اس سے نظر آتا ہے کہ ان کا مشن وعظ کہنا نہیں تھا' بلکہ بنی اسرائیل کو رومن ایمپائر (سلطنت روما) کی محکومیت کے چنگل سے چھڑا کر' ان کی آزاد مملکت یا آزاد حکومت قائم کرنا تھا' اور یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔

انجیلوں کی کہانی' حقائق کی زبانی

عزیزان من! سنیے! یہ احبار و رہبان کیوں مخالفت کرتے تھے۔ یہ جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے' وہ سب اناجیل میں لکھا ہوا ہے۔ یہ

---

❹ مولانا عبید اللہ سندھیؒ (1865-1935)

❺ یہاں اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔

❻ ''صلیب کے سلسلے میں تختی کی عبارت'' کے لیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکھف وسورۃ مریم' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص۔294۔

عبارتیں میں نے پڑھی ہوئی ہیں۔ اناجیل اربعہ (متیٰ، مرقس، لوقا، یوحنا) عیسائیوں کے نزدیک مستند صحف مقدس ہیں۔ یہ اناجیل کس طرح وجود میں آئیں؟ یہ کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ کبھی وقت آیا تو میں آپ کو عرض کرونگا۔ اس کے متعلق میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" دیکھیے۔ اس میں، میں نے دنیا کے سارے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی لکھی ہے کہ یہ کیسے بنیں، کن مراحل سے گزریں، آج ان کا کیا حال ہے اور کیا ان کتابوں کے ماننے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ وہی انجیل ہے جو ان کو نبی سے ملی تھی؟ یہ ساری کہانیاں میں نے اس کتاب کے اندر لکھ دی ہیں۔ اس میں آپ کو ملے گا کہ انجیل کی یہ چار کتابیں کیسے بنی تھیں۔ یہ 34 کے ❶ قریب تھیں جن کے متعلق دعویٰ تھا کہ یہ (Original: اصلی) ہیں۔ ان کی ایک کونسل ❷ ہوئی تھی اور اس میں کوئی متفقہ فیصلہ ہی نہیں ہوا تھا کہ ان میں سے کونسی کتاب Original (اصلی) ہے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہنشاہ قسطنطین نے خود اس کونسل کی صدارت کی تھی۔ آخر میں اس نے یہ فیصلہ دیا کہ جاؤ، یہ فیصلہ خدا پہ چھوڑو۔ انہوں نے فرش کے اوپر وہ کتابیں بکھیر دیں اور کہا کہ صبح آ کے دیکھیں گے کہ ان میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور پھر بقول ان کے وہ تبدیلی روح الامین کی طرف سے ہوئی۔ ان میں سے چار کتابیں اور کچھ خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ کہا

---

❶ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان ارامی تھی لیکن حیرت ہے کہ ان 34 اناجیل میں سے (سوائے ایک کے جواب مفقود ہے) کوئی بھی ارامی زبان میں نہ تھی۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان خطوط کی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ ان کی تعداد قریب (113) تک شمار ہوتی تھی۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (The Council of Nicaea) (منعقدہ 325ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار اناجیل (متیٰ، مرقس، لوقا، یوحنا) رسولوں کے اعمال، پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا، اور یہودا کے خطوط اور مکاشفاتِ یوحنا منتخب کر لیے گئے اور باقی اناجیل اور خطوط کو وضعی (Apocrypha اپوکریفہ) قرار دے دیا گیا۔ جو کچھ منتخب کیا گیا اسے عہد نامہ جدید کہا جاتا ہے۔ (ص 40)

نیقیہ کی کونسل (The Council of Nicaea) میں ان کتابوں کا انتخاب بھی عجیب وغریب طریق سے عمل میں آیا۔ یہ کونسل شاہنشاہ قسطنطین کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سلطنت روما کے اطراف وجوانب سے دو ہزار اڑتالیس مندوبین شامل ہوئے۔ قسطنطین نے خود اس کی صدارت کی۔ اس کونسل کے انعقاد سے مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں، ان میں باہمی تطبیق وتوثیق کی صورت پیدا کر کے ایک متفقہ علیہ مذہب کی تشکیل ہو جائے۔ کونسل کی بحث وجدل نے ایسی شدت اختیار کی کہ 1730 مندوبین کو باہر نکال دینا پڑا۔ بقایا 318 بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے کہ مختلف فرقوں کی اناجیل میں سے کسے باقی رکھا جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے۔ (ص 41)

جس طرح چوتھی صدی عیسوی میں نیقیہ (Nicaea) کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تھی، اسی طرح سولہویں صدی (1545ء لغایت 1563ء) میں ٹرنٹ (Trent) کے مقام پر ایک اور عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی۔ (ص۔46) اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1996، ص ص۔40 تا 59۔

❷ اس کونسل کا نام نیقیہ (Nicaea) ہے جو 325ء کو منعقد ہوئی تھی۔

کہ یہ ہیں 4 کتابیں اصل ❶۔ ایک انجیل ❷ اور بچ گئی۔ اس کی بھی کہانی خود ان کے ہاں کے ایک حواری کی ہے۔ بہرحال یہ ان کی ان انجیلوں میں سے نہیں ہے۔ عزیزان من! اس کی تفصیل میری کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں'' میں ملے گی۔ اس میں دیکھ لیجیے۔

ہیکل میں کاہن کے منصب کی کیفیت اور احبار و رہبان کی مخالفت کی وجہ

حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت مقدسہ کی غایت' ایک طرف بنی اسرائیل کو رومیو کی غلامی ومحکومی سے نجات دلانا اور دوسری طرف ان کے معاشرہ کو قوانین خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شدت تکرار سے ''خدا کی بادشاہت'' کا اعلان حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانِ اقدس سے ہوا آپ علیہ السلام سے پیشتر کتب تورات میں اس انداز سے کہیں نہیں ملتا۔ آپ اس حقیقت کو انجیل برناباس میں سنیے! لکھا ہے کہ ''تب (ملک کے) لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنانا چاہیے'' ❸۔ اس لیے یہودی احبار و رہبان بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی مخالفت میں پرتل گئے۔ ''تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ ❹ کیا''۔ یاد رہے کہ ہیکل کے اندر سب سے بڑا منصب کاہن کا ہوتا تھا۔ یہ طبقہ لوگوں کی قسمتیں بتانے والا' تقدیریں بتانے والا' پیش گوئیاں کرنے والا ہوتا ہے' جب کہ نبی تو یہ کہتا تھا کہ صاحب! مجھے اپنے متعلق بھی علم غیب نہیں' میں تمہارے متعلق کیا تقدیر بتاؤں گا لیکن مذہب میں آ کر یہ سب پیش گوئیاں کرنے والے' تقدیریں بتانے والے' ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں انہیں کاہن کہتے تھے۔ یہاں ہمارے ہاں انہیں ''حضرت جی'' کہا جاتا ہے۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ ''ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے البتہ ہم

---

❶ نیقیہ کی کونسل (The Council of Nicaea) میں بقایا 318 مندوبین نے بالآخر ایک رات تمام کتابوں کو فرش پر بکھیر دیا۔ صبح آ کر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ ان صحیفوں کو مقدس سمجھ کر منتخب کر لیا اور باقی کتابیں مسترد قرار پا گئیں۔ چنانچہ اس کونسل کی روئیداد میں مذکور ہے کہ ''جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا' اسے خداوند کی خوشنودی سمجھ لینا چاہیے۔ بالخصوص اس لیے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سما رہا تھا جس نے انہیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔ (حوالہ پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' طلوع اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ' لاہور' 1996' ص۔ 41)

❷ یہ انجیل (برناباس) ان متروک اناجیل میں سے ہے جنہیں عیسائیوں نے ایک عرصہ تک دنیا کے سامنے نہیں آنے دیا کیونکہ اس کا اکثر حصہ دیگر اناجیل سے مختلف اور عیسائیت کے مسلمات کے خلاف ہے۔ اس کا اطالوی نسخہ وائنا کے کتب خانہ میں موجود ہے' جو شروع بیسویں صدی میں بعض مستشرقین کی کوششوں سے دنیا کے سامنے آ گیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو گئے (برناباس حضرت مسیح کے ایک حواری تھے) حوالہ پرویزؒ: (1994ء) شعلۂ مستور (پنجم بلا ترمیم ایڈیشن) لاہور: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' ص۔ 14

❸ انجیل برناباس فصل ص۔ 139

❹ انجیل برناباس فصل ص۔ 142

پر بڑی مصیبت ہوگی۔یعنی روٹی کما کے کھانی پڑے گی۔آگے یہ فقرہ آتا ہے''ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لیے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ ہماری تقالید (رسومات) باطل سے اس کی نبھ نہیں سکتی''۔یعنی وہ مذہب کو دین سے بدلنا چاہتا ہے۔تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے۔اس لیے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہونگے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پر مانگیں''۔ ❶

عزیزانِ من! مسئلہ ہی سارا یہ ہے۔یعنی وہ انہیں ان کی محکومی کی زندگی سے نکال کر آزادی کی فضا میں لا رہا ہے' رزقِ حلال کی طرف لا رہا ہے اور یہ کاہنوں کے سردار سے مشورہ کر رہے ہیں جو روٹی کے معاملے میں سب سے بڑا تھا کہ اگر کل کو یہ حکومت اس کے ہاتھ میں آ گئی تو ہم کیا کریں گے' ہماری اولاد کیا کرے گی؟ یہ جو سروس (خدمت) کا لفظ ہے یہ وہی چیز ہے۔یہ اپنے آپ کو دین کے امام کہتے تھے۔لہٰذا اس امامت سے تو یہ ہم کو نکال دیں گے' اس لیے کہ جو خدا کے قوانین کی حکومت ہوتی ہے اس میں نہ ان کا کوئی مقام ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی وجود ہوتا ہے۔یہ کہتے ہیں کہ''ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے' تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں''۔❶ پھر ہمیں ان سے روٹی مانگ کر کھانی پڑے گی اور آگے سنیے! کہا کہ''اس وقت یہ خدا کا شکر ہے'' یعنی یہ ان کا شکر ملاحظہ فرماؤ ''کہ ہمارا ایک باشادہ' اور ایک حاکم ❶'' جو یہاں بیت المقدس میں رہتے تھے' یہاں گورنر تھا اور بادشاہ روم میں رہتا تھا۔کہتے ہیں کہ ''ہمارا ایک باشادہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں ❶'' یعنی یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ وہ Interfere (مداخلت) کرتے' وہ یہ کچھ بھی نہیں کرتے ''جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے''❶ یعنی ان کی شریعت میں Interfere (مداخلت) نہیں کرتے۔

سیکولر نظام میں یہی تو سارا سمجھوتہ ہوتا ہے۔ان کی یہ مملکت دو دائروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ایک میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین ہوتے ہیں اور دوسرے میں شریعت کے اعتقادات' نظریئے' رسوم' Personal Laws (شخصی قوانین) وغیرہ ہوتے ہیں۔معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان میں Interfere (مداخلت) نہیں کریں گے' یہ ان میں Interfere (مداخلت) نہیں کریں گے۔اس کا جو انہوں نے ترجمہ کیا وہ یہی ہے کہ مداخلت نہیں کرتے۔آگے کہا کہ''اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کریں''❶۔وہ جانتے نہیں ہیں کہ شریعت کیا ہے اور ادھر جو عوام ہیں ان کی کیفیت کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ سوچتے ہی نہیں کہ حقیقت کیا ہے لہٰذا عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ کتاب کو ناظرہ پڑھنا ہی جانتے ہیں۔اس کے معنی نہیں جانتے اور یہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اسی لیے

---

❶ حوالہ: انجیل برناباس فصل ص۔142

قرآن کریم نے کہا کہ یَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (2:79) خود لکھتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ بھئی! یہ خدا کا ارشاد ہے۔ اور وہ صرف ناظرہ پڑھنا جانتے ہیں۔ ابھی بات بادشاہ اور گورنر کی ہو رہی تھی۔ ان احبار و رہبان نے کہا کہ ''ہمارا بادشاہ اور گورنر'' یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ ہماری شریعت حقیقت میں کیا ہے اس لیے ہمیں یہ قدرت حاصل ہے کہ جو ہمارا اختیار ہو وہ کرلیں۔ ''پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے''۔ اس سے تو معافی لے لیں گے، مگر ایہدے کولوں معافی نئیں ملنی۔ ❶ وہ ''ہمارا اللہ رحیم ہے' قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جا سکے گا جب تک اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی کہ موسیٰ علیہ السلام نے لکھی ❷ ہے''۔

عزیزان من! یہ تھے مذہب کی دنیا کے حالات جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ قرآن کریم نے تو اپنے ہاں یہی کچھ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور اسے شریعت خداوندی بنا کر بیچتے ہیں: لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا (2:79)۔ ذریعہ رزق بنائے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں' نہ خود وہاں جاتے ہیں' نہ کسی کو جانے دیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان لوگوں نے گرفتار کرنا چاہا' موت کا فتویٰ دے دیا لیکن وہ جو مشیت کا پروگرام ہوتا ہے کہ اس کے تحت آپ وہاں سے ہجرت کر گئے اور اس طرح ان کی گرفت میں نہیں آئے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں' ان یہودیوں کے مظالم' جو انہوں نے کیے' کا نتیجہ یہ ہوا کہ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ (4:160) زندگی کی وہ تمام خوشگواریاں' جو پہلی تعلیم کی رو سے' ہم نے ان پر کھول دی تھیں کہ انہیں بافراط ملتی چلی جائیں' وہ ان پہ حرام کر دیں اور یہ ان سے محروم ہو گئے۔

نظام سرمایہ داری کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ لفظ محروم' وہی لفظ حرام سے ہی تو ہے۔ قرآن نے ان سے کہا تھا کہ وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ (4:161)۔ معاوضہ سرمایہ کا نہیں ہوتا' محنت کا ہوتا ہے۔ اس سے انہیں روک دیا گیا تھا کہ روپے کے زور پہ دوسرے کی محنت کا استحصال نہ کرو' لیکن کیا یہ باز آنے والے تھے؟ نہیں' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دیئے گئے۔ یہ محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے' انہیں کچھ قرض دیتے تو اصل سے زیادہ واپس لیتے۔ یہ ظلم ہوتا تھا اور اس طرح دولت اکٹھی کی جاتی تھی اور پھر یہ چیز عام ہو گئی تھی۔

---

❶ مگر اس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) سے معافی نہیں ملے گی۔

❷ انجیل برناباس فصل ص 142

عزیزانِ من! معاشرے کی عام کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ **وَ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ** (5:62) تو دیکھے گا کہ وہ سرکشی کے ان کاموں میں جو انسان کو محنت کے قابل نہ رہنے دیں، میں سب سے زیادہ تیز ہیں۔ یہ سارا سرمایہ داری کا نظام تھا یعنی یہ دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھا۔ وہ اس کام میں ''یسارعون'' تھے یعنی وہ تیزی سے دوڑ لگا کر آگے آگے چل رہے ہیں۔ اس طرح ان کے اندر حرام کی کمائی کی ریس (Race) ہوتی تھی کہ دیکھیں اس میں کون ان سے آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے اس آیت (5:62) میں کہا ہے کہ تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ جرم و سرکشی اور حرام خوری میں سب سے تیز ہیں۔ اور کیا ہی بُرے ہیں یہ کام، جنہیں یہ دن رات کرتے رہتے ہیں اور تماشا یہ ہے کہ **لَوۡ لَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ** (5:63) ان کے یہ احبار اور رہبان، یہ علما اور مشائخ بھی انہیں ان کے جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکتے۔ انہوں نے بھی مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ چونکہ یہ چیزیں بڑے بڑے لوگ کرتے تھے، یہ بھی انہیں کبھی نہیں روکتے تھے۔ کیوں نہیں روکتے تھے؟ اس کے لیے، عزیزانِ من! ایک لفظ ہے، جو استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ سے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ **لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ** ❶ (5:63)۔ یہ جو انہوں نے انڈسٹری کھول رکھی تھی، وہ کتنی بُری انڈسٹری تھی، کس قدر گھناونا ہے ان کا یہ کاروبار! یہاں یصنعون آیا ہے یعنی یہ صنعت ہے صرف اس کو Commerce نہیں کہا۔ وہ تو کسی دوسرے کی بنائی ہوئی چیز ہوتی ہے جسے کوئی دوسرا آ کر بناتا ہے اور وہ بیچتا ہے۔ صنعت (Industry) تو وہ ہے جو خود ڈھالتا ہے۔ روز نت نئے ماڈل ڈھالتا ہے۔ اس لیے کہا کہ کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار!

سامری کا کردار

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ پر غور کر کے آگے جائیں۔ اگر خدائے خبیر و علیم کی طرف سے نہ بتایا جاتا تو کیا کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ قرآن ایک لفظ میں یہ ساری بات بتا گیا کہ وہ کرتے کیا ہیں۔ دراصل سامری ❷ ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جسے قرآن حکیم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں پکارا ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ سامری کسے کہتے ہیں؟ سامری وہ ہے جو قوم کو سلانے کے لیے داستاں گوئی کرے۔ یہاں قرآن کریم نے **یَصۡنَعُوۡنَ** (5:63) کہا ہے کہ وہ اپنے پلے سے کچھ خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ

---

❶ کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار!

❷ اس کی تشریح و مفہوم کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص۔ 250 نیز فٹ نوٹ 1۔

اسی قوم بنی اسرائیل سے، جو وہاں سے چلے تھے، کہا تھا کہ تم جو زیورات وغیرہ وہاں سے لے کر آ رہے ہو، تو بھاڑ میں پڑے وہ سونا، جو کانوں کو کھائے، یہ خوامخواہ کے لیے بوجھ ہے، آؤ میں تمہیں اس کا خدا بنا کے دکھاؤں۔ اس نے ان کو ڈھالا: یصنعون۔ انہی کے پیسوں سے ان کے لیے خدا بنا دیا۔ یعنی یہ وہ انڈسٹری ہے جس میں انہیں کچھ Investment (لگانا) نہیں پڑتا، ان کو صرف ڈھالنا پڑتا ہے اور یہ سارا کچھ جو ہو رہا ہوتا ہے، یہ ''فضل ربی'' ❶ سے ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بہت پرانی بات ہے۔ انڈیا کے دور کی نئی نئی یہ فلمیں آئی تھیں، اس میں ایک بڑی عجب فلم تھی۔ اس فلم میں ایک بڑا چار سو بیس قسم کا ایکٹر (اداکار) تھا۔ گھر میں اس کی ایک بہن تھی اور کوئی نہیں تھا۔ گھر قدامت پرست تھا۔ وہ بہن مذہبی تھی۔ اس نے بھائی سے کہا کہ مجھے شیو جی کی پوجا کرنے کے لیے مندر میں جانا پڑتا ہے، یہ مندر دور ہے، میں اکیلی ہوتی ہوں، تم عام طور پہ ہوتے نہیں ہو، میں اکثر جا نہیں پاتی۔ اگر یہ مورتی ہمارے گھر میں ہی آ جائے تو بہت اچھا ہو، میں تکلیف سے بچ جاؤں۔ ان کے ہاں تو ہوتا ہے کہ مورتی گھر میں رکھ دیتے ہیں۔ بھائی کہنے لگے: بہت اچھا، میں تمہیں لا دونگا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ مندر میں کوئی بڑا پجاری نہیں تھا، تو وہ خوبصورت سونے کی مورتی چرا لایا اور گھر میں رکھ دی۔ بہن نے دیکھا کہ اتنی خوبصورت ہے اور قیمتی بھی ہے۔ اس نے کہا کہ بھائی جی! یہ تو بڑی چنگی مورتی ہے۔ اے کنے دی لے آئے ہوتسی۔ ❷ کہنے لگا: بھولی! اے بھگوان قیمتاں دے وکدے ہیگے نیں؟ پسیاں نال اونہ دین۔ اے جناں تے فضل کرن، اوہدے نال آپ ٹر آوندے نیں۔ ❸ ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ سب انہیں روکتے نہیں تھے، فتوے دے دیتے تھے۔

ربو کو قرآن نے یہاں کہا ہے کہ ''دوسرے کی کمائی ہو تو اسے لے اُڑنا''۔ سود حرام ہے لیکن اگر کوئی غریب مزارع آپ زمیندار کے پاس آ کر کہہ دے کہ صاحب! وہ زمین کا ٹکڑا ہزار روپے میں بکتا ہے، اگر مجھے مل جائے تو میں محنت کر کے کماؤں گا، بچوں کا پیٹ پالونگا، اور آپ کے پیسے بھی ادا کرتا چلا جاؤں گا۔ زمیندار نے کہا کہ تمہاری مت ماری ہوئی ہے، یہ خوامخواہ کے لیے مول لے رہے ہو۔ ہم تمہیں دیتے ہیں۔ اس پر مزارع نے کہا کہ جی! ہزار روپے آپ دے دیں گے تو میں اس پر دوکان کر سکتا ہوں۔ زمیندار نے کہا کہ نہیں، ارے، یہ سود ہے، سود تو حرام ہے۔ یہ بات تو نے کیا کہہ دی! یہ ٹھیک ہے کہ سود بالکل حرام ہے، لیکن اگر اسی ہزار روپے میں وہ زمین کا ٹکڑا لے کر

---

❶ یہ کیسے ہو رہا ہوتا ہے؟ اس کے لیے دیکھیے: صلاح الدین اکبر: ایک قطعہ زمین رہائشی، در ''ہم لوگ''، مکتبہ اخوت، لاہور، (سالِ اشاعت درج نہیں)، ص ص۔ 1 تا 26۔

❷ یہ آپ کتنے کی خرید لائے ہیں؟

❸ اے معصوم بھولی بھالی بہن! کیا یہ بھگوان قیمتاً بکتے ہیں؟ نہیں، یہ قیمتاً نہیں آتے۔ یہ جن پر ''فضل'' کریں، ان کے پاس یہ خود بخود ہی چلے آتے ہیں۔

دے دیا تو کہا کہ یہ بٹائی پہ لے لو تم محنت کرو یعنی ہزار روپے کے اوپر تو پچاس روپے کاٹتے تھے اور یہ جو بٹائی پہ دی تو آدھی پیداوار گھر لے گیا اور جو انوسٹ (لگایا) کیا تھا' وہ اپنی جگہ کھڑا ہے بلکہ اس زمین کی قیمت کچھ اور بڑھ رہی ہے۔ اس کا نام ان کے ہاں ربو نہیں' مزارعت ہے اور یہ حلال وطیّب ہے۔ یہ کاروبار کرنے والے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' صاحب! کچھ تھوڑے سے پیسے چاہییں۔ میں نے کاروبار میں لگائے ہیں۔'' اس کے لیے تو صاحب! پیسے دینا سود ہے۔ یہ حرام ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟ ٹھیک ہے' بھئی! ہم یہ کیے دیتے ہیں' اس کاروبار کے نفع کے اندر ہمارا حصہ بھی ہے' گھر میں بیٹھے ہیں' یہ حصہ مل رہا ہے۔ سود نہیں' ربو نہیں' یہ مزارعت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جتنا ربو کے متعلق ان سے کہا تھا' ان کی کیفیت یہ ہے۔ یہ پھر اس کے لیے یَکْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (2:79)۔ اس کے صرف الفاظ بدل دیتے ہیں' یہ اس فتوے کو خود لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شریعت خداوندی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ سود کا لفظ استعمال کیجیے تو وہ حرام ہے۔ یہ ساری شکلیں' جتنی بھی ہوئی ہیں' یہ شریعت کی رو سے حلال ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد ان کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ زندگی کی ساری خوشگواریوں سے محروم کر دیئے گئے۔ یہ سند تھی کہ وہ یہ کچھ کرتے تھے۔ یہ اس کے جائز اور حلال ہونے کے فتوے دیتے تھے۔ برادران عزیز! وہ جو تھوڑی بہت دل میں کھٹک ہوتی ہے کہ بہر حال یہ ایک ناجائز دولت آ گئی ہے' ناجائز پیسہ ہے' کسی برائی کی وہ کھٹک بھی اگر دل سے دُور ہو جائے تو پھر اس کو کوئی نہیں روکتا:

کبھی آ جاتے تھے ہنسنے' میرے رونے کو
تم کو یہ عیش بھی اب میرا گوارہ نہ رہا

کیا انداز ہوتا ہے بات کہنے کا! کہ اس طرح ان پر زندگی کی حلال خوشگواریاں بھی حرام ہو گئیں۔ یہ انسان کی بھول اور غلط فہمی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس قسم کی جو کمائیاں (Earnings) ہیں' ان سے بڑی افراط سے عیش سامانیاں ملتی ہیں۔ یہ غلط ہے۔ یہ تو چہرے کی سرخیاں ہوتی ہیں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1938-1877) نے یہ کہا تھا کہ

یا غازہ ہے یا ساغرو مینا کی کرامات

لیکن اس سے پہلے اور کرامات بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو حکیموں کا خاندان تھا۔ اس میں بھی یہ ڈاکٹر حکیم اجمل خان وغیرہ [1] مغلیہ زمانے کے

---

[1] حکیم اجمل خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد شہنشاہ بابر کے زمانے میں ہرات سے آئے تھے۔ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں شاہی خاندان سے منسلک ہوگئے۔ ان کے باپ کا نام حکیم محمود خاں تھا جو کہ حکیم محمد شریف خاں کے پوتے تھے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے پہلے قرآنِ پاک حفظ کیا پھر عربی اور فارسی کا مطالعہ کیا' اس کے بعد اپنے بڑے بھائی حکیم محمد واصل خاں کے زیر سرپرستی ادویات زیر مطالع لائے۔ 1892 میں نواب آف رام پور کے شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ آپ نے 1916ء میں طبیہ کالج دہلی قائم کیا۔ 1921ء میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے چمپئن (Champian) تھے۔

بڑے مشہور خاندان چلے آتے تھے۔ ان کے ہاں کے جس حکیم کو دیکھیے ان کی رنگت بالکل زعفرانی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ حکیم بھورے یا بھورے میاں ان میں سے ایک تھے۔ برف باری کے زمانے میں مال روڈ پر وہی ململ کا کرتہ پہنے ہوئے اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھنے کی حد تک ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی لیکن کوئی بھی ان میں سے پچاس برس سے زیادہ نہ جیا۔ یہ جو ساری سرخیاں رنگینیاں تھیں' وہ کشتوں کا نتیجہ تھیں۔ دراصل کشتہ خود نہیں مرتا بلکہ دوسرے کو مارتا ہے۔ کشتے تو یہ خود ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں' حالانکہ یہ سنکھیے کا جو کشتہ تھا یہ تو اس سے مرتے تھے اور پھر زندگی کی خوشگواریاں ان پر حرام ہو جاتی تھیں۔

سلطانی و ملّائی و پیری کے کشتہ نے قوموں کو ہلاک کر دیا

مفکر قرآن اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) نے بھی ان کو بتایا ہے کہ تم کونسے کشتے کے مرے ہوئے ہو' سنو:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری! (1)

سنکھیے کے کشتے سے مرنے والا تو اچھا ہے کیونکہ عذاب سے تو چھوٹ جاتا ہے لیکن یہ سلطانی وملائی و پیری والا جو کشتہ ہوتا ہے اس سے تو انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔ عزیزان من! یہ وہی ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ موت آتی ہے' پر نہیں آتی۔ چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے مگر یہ مرتا نہیں ہے:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

(غالب)

اس کشتہ سلطانی وملائی و پیری سے نہ معلوم اب تک کتنے سفینے ڈوب چکے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے کہا کہ اس قوم پر زندگی کی خوشگواریاں حرام ہو جاتی ہیں جو کشتۂ سلطانی وملائی و پیری ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ

---

(1) اقبالؒ: ارمغانِ حجاز (اردو): نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 47۔

یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ [1] (23:51)۔اب یہاں رُسل کو مخاطب کیا ہے کہ اے خدا کے پیغامبرو!تم اور جو تمہاری تبع قوم ہے' سب طیباتِ زندگی یعنی زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہو' خوب کھاؤ لیکن **وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا** (23:51) کام کرو جو صالح ہوں' انسان کی جو صلاحیتیں ہیں' وہ ان کی نشو ونما کرنے والے ہوں۔یعنی کھاؤ پیؤ لیکن ایسے کام کرو جن سے انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔اور یہ نہ سمجھو کہ کھا پی رہے ہیں' عیش سے گزر رہی ہے۔**اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ** (23:51) ہماری نگاہ' ہمارا قانون مکافات عمل تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔یہ ہے شریعت:**مِنَ الطَّیِّبٰتِ** بالکل کھاؤ' زندگی کی خوشگواریاں انسان پہ حلال کی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ **وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا**(23:51) کام بندے آلے کرو' فیر ستے خیراں۔ [2] ہاں تو عزیزانِ من!بات چلی آ رہی تھی کہ **وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً**(10:19) نوع انسان ایک امت واحدہ ہے' **فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) انہوں نے اختلاف پیدا کیا' اس لیے **فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ** [3] (2:213)۔

نوع انسانی میں رنگ' نسل' وطن' زبان اور زمان و مکاں کے بعد کے باوجود امت واحد کا قرآنی تصور

انبیائے کرام کے سلسلہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر قوم میں نبی بھیجا' ہر ملک میں نبی بھیجا' اور ہر قوم کی زبان میں نبی آیا ہے۔تو انبیا کا زمانہ مختلف ہے' جن قوموں میں وہ آئے وہ قومیں مختلف ہیں' ان کی زبانیں مختلف ہیں' ان کے وطن مختلف تھے۔ان سارے اختلافات کے بعد ہیں' پھر سوچیے کہ بات وہاں سے شروع ہوئی تھی' جو میں نے ابھی کی ہے کہ **وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (23:52)۔ان نسبتوں سے' انسانیت کی برادری میں' بڑا تفرقہ پڑتا ہے' اختلافات پڑتے ہیں' قوم گروہوں میں' خاندانوں میں' قبیلوں میں' وطنوں میں' بٹ جاتی ہے۔یہ سب چیزیں تمہارے ساتھ تھیں لیکن اس کے باوجود یہ تمہاری ایک امت ہے۔اب سوال یہ ہے کہ امت واحدہ کس طرح سے رہی؟ اس کے لیے کہا کہ **اَنَا رَبُّكُمْ** (23:52) تم نے ایک رب کو رب مانا۔یعنی اس کے دیئے ہوئے غیر متبدل اصولوں کو علمی اور عملی طور پر تسلیم کیا۔یہ ہے' عزیزانِ من! قرآن کی رو سے معیارِ قومیت۔

---

[1] اے خدا کے پیغامبرو!تم زندگی کی تمام پاکیزہ خوشگواریوں سے متمتع ہو۔

[2] کام انسانیت کو سنوارنے والے کرو' پھر تو بہتری ہی بہتری ہے۔

[3] اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو وحی دے کر بھیجا۔وہ انہیں اختلافی زندگی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوش خبری سناتے۔ہر نبی اپنے ساتھ قوانین خداوندی کا ضابطہ (الکتاب) لاتا جو حق پر مبنی ہوتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔79)۔

بات تو قرآن کے ایک ایک لفظ سے حل ہو جاتی ہے۔ ان تمام اختلافات واختراعات کی بنا کے باوجود، جس کی بنا پہ دنیا نے یہ قومیں الگ الگ بانٹی ہیں، وہ ان انبیائے کرام کے اندر سب چیزیں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ تمہاری یہ امت، امتِ واحدہ تھی۔ یہ کیوں تھی؟ اس لیے کہ **وَاَنَا رَبُّكُمْ** (23:52) وہ صرف ایک خدا کے قوانین کو ہی اپنا ضابطہ حیات مانتے تھے اور **فَاتَّقُوْنِ** (23:52) یہی تھا وہ قانون جس کا تم اتباع کرتے تھے، یہ تمہاری تعلیم تھی۔ اس کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوا کہ تم تو یہ تعلیم دے کر جاتے تھے، ہر نبی نے یہ تعلیم دی لیکن اس کے باوجود، عزیزانِ من! یہ سارے کے سارے، دین کے خلاف، یہ تفرقے اور یہ چیزیں ہیں اور انہی کے نام لیوا دوسروں سے اپنا ایک الگ ٹولہ بنانا تو ایک طرف، اپنے اندر تفریق پیدا کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ جیسا میں نے کہا ہے کہ اس پہ کھٹک پیدا ہو کہ صاحب! یہ چیز تو خدا کے دین کے خلاف ہے، انبیا کی تعلیم کے خلاف ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (23:52) ان میں سے ہر ایک دین سے برگشتہ ہو کر الگ الگ ٹولہ بناتا ہے اور پھر اس روش پر صرف ہر ایک مطمئن ہی نہیں رہتا بلکہ اپنے اپنے ہاں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ یہ راستہ بالکل صحیح شریعت کا ہی راستہ ہے، جس کے اوپر ہم چل رہے ہیں اور پھر کوئی بھی ان میں سے اپنی اس روش کے متعلق نہیں کہتا کہ یہ فرقہ بجائے خویش قرآن کے نزدیک شرک ہے اور انبیا کی بعثت کے خلاف ہے۔ عزیزانِ من! میں تو قرآن کی ایک ایک آیت آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ ساری چیزیں سامنے تھیں لیکن ہر ایک اپنے اپنے فرقہ پر مگن ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ میں چالیس پچاس سال سے یہ پکار بلند کر رہا ہوں یعنی قرآن کی یہ آواز پہنچا رہا ہوں، جس سے کچھ تھوڑا بہت، لوگوں میں احساس بیدار ہو رہا ہے کہ واقعی یہ فرقہ بندی تو بالکل اسلام کے خلاف ہے۔ اب مقام آ رہا ہے کہ لوگوں نے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا ہے۔ جس پر یہ جز بز ہوتے ہیں مگر یہ ہیں کہ نئی چالیں چل رہے ہیں۔

فرقہ بندی کی بنیادیں مستحکم رکھنے کی ایک نئی چال

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ **يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ** (114:5) کان میں آ کر پھونک دیتا ہے اور اس طرح لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا کر کے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہ ابلیس ہے۔ اس نے آ کر کہا کہ فرقہ بندی کرو حالانکہ اللہ نے اس کو شرک کہا ہے مگر یہ ہیں جو کہتے ہیں کہ فرقے ہیں ہی نہیں، یہ تو مکاتب فکر (Schools of Thought) ہیں۔ چل بھئی! یہ سارے مکاتب فکر ہو گئے اور مکاتب فکر کہنے والوں کا، آپ کو پتہ ہے، کہ بھانڈا کہاں پھوٹا۔ انہی اماموں نے یہ کہا تھا کہ یہ فرقے نہیں، مکاتب فکر ہیں۔ اسی ملک کے صدر نے ایک دفعہ انہی مکاتب فکر والوں سے کہا کہ اگر تم تین آدمی بھی، جو اپنے اپنے فرقوں والے ہو، مکاتب فکر والے ہو، ایک جگہ اکٹھے ہو کر نماز پڑھ لو تو ہم اپنا دعویٰ مسترد کر دیتے ہیں۔ یہ مکاتب فکر ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ تین اکٹھے ایک

جگہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتے۔

عزیزانِ من! یہ ظاہر ہے کہ جب رسولوں کی تعلیم ایک تھی' تو ان کے متبعین کو بھی ایک ہونا چاہیے تھا لیکن امر واقعہ یہ نہیں۔ مختلف انبیائے کرام کے نام لیوا' ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کے چلے جانے کے بعد اس کے متبعین' اُس کے پیغام کو فراموش کر کے' اپنی خود ساختہ شریعتوں کا اتباع کرنے لگ جاتے ہیں جس سے ہوتا یہ کہ **فَتَقَطَّعُوٓا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ زُبُرًا** (23:53) وہ مختلف گروہوں' فرقوں میں بٹ جاتے' ان میں فرقے پیدا ہو جاتے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ اس مقام پہ پہنچ گئے ہیں جہاں **كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ** (23:53) ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک پر جم کر بیٹھ جاتا ہے اور اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ وہی فرقہ حق پر ہے باقی فرقے باطل ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ علم کی لائٹ آف کر دو[1]۔ انہوں نے تو اپنے اوپر کیفیت یہ طاری کر رکھی ہے کہ جو بھی خدا کی طرف دعوت دینے والا آتا ہے یہ اس پر متفقہ طور پر کفر کے فتوے لگا دیں گے۔ ایک تو علم کی تاریکی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ جو تاریکی کے اندر ڈوبنے والا ہوتا ہے اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ پانی کے اندر ذرا گرا' اسے باہر کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ اگر پانی شفاف ہو' باہر روشنی ہو' تو ہو سکتا ہے کہ کسی حد تک اسے گہرائی میں کچھ نظر تو آئے' اگر تاریکی ہو اور پھر وہ ڈوبا ہو' تو نہ آنکھیں کام کریں' نہ کان کام کریں:

جاں بھی گروِ غیر' بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے' نہ مکیں ہے

اس وقت' اے رسول! ان انبیائے سابقہ کے نام لیوا اسی طرح مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اس دین کی مخالفت کر رہے ہیں جسے تو پیش کرتا ہے اور کسی طرح سمجھائے نہیں سمجھتے سو اب ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ **فَذَرۡهُمۡ فِىۡ غَمۡرَتِهِمۡ حَتّٰى حِيۡنٍ** (23:54) تو انہیں کچھ وقت کے لیے غفلت میں مدہوش پڑا رہنے دے تا آنکہ تمہارے دین کا نظام متشکل ہو کر سامنے آ جائے اور اس کے انسانیت ساز نتائج انہیں بتا دیں کہ حق و صداقت پر کون ہے۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ اب ظہورِ نتائج کا وقت آیا ہی چاہتا ہے **اَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ وَّبَنِيۡنَ** (23:55) کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ دولت اکٹھی کر لی' اتنا بڑا جتھہ بنا لیا' ہم ان کو اس قسم کی روش پر بڑھتے چلے جانے دیں گے؟ ٹھیک ہے' ڈھیل دی جاتی ہے لیکن اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ **نُسَارِعُ لَهُمۡ فِى الۡخَيۡرٰتِ** (23:56) اسی طرح سے جتنا کچھ وہ اکٹھا کیے چلے جا رہے ہیں کرتے چلے جائیں گے' کرتے چلے جائیں گے اور ہم ان کے

---

[1] علم کی شمع گل کر دو۔

اعمال سے صرفِ نظر کر کے انہیں فی الواقعہ زندگی کی خوشگواریاں عطا کرتے چلے جائیں گے۔ کہا کہ انہیں پتہ نہیں کہ جب تباہی آتی ہے تو ان راستوں سے آتی ہے جو **بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ** (23:56) ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہاں سے تباہیاں آیا کرتی ہیں اور ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ بھی ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عذاب سے بچتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسا گروہ ہے؟

عزیزانِ من! سورۃ المؤمنون کی آیت 56 تک آ گئے' آئندہ درس میں 57 ویں آیت سے ہم پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

گیارھواں باب: **سورۃ المؤمنون** (آیات 57 تا 65)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ
رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ
مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ﴿٦٠﴾ أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ
فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ﴿٦١﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا
كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٢﴾ بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِنْ هَٰذَا
وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا عَامِلُونَ ﴿٦٣﴾ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْنَا
مُتْرَفِيهِمْ بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْأَرُونَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْأَرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُمْ مِنَّا
لَا تُنْصَرُونَ ﴿٦٥﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1977ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 57 سے ہو رہا ہے: (23:57)۔

انبیائے کرام کی تعلیم کا مرکزی نکتہ

آپ کو یاد ہے کہ مسلسل موضوع یہ چلا آ رہا تھا کہ دین کا مقصد تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں منسلک کر دینا ہے۔ ان کے اختلافات نے انسانیت ساز معیاروں کے برعکس انہیں خواہ مخواہ مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب ان اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے ایک عالمگیر برادری بنانا ہے اور آخر میں یہ تھا کہ فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (23:53) انبیائے کرام تو یہی تعلیم دے کر

انہیں پھر سے ایک عالمگیر برادری بنانا ہے اور آخر میں یہ تھا کہ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (23:53) انبیائے کرام تو یہی تعلیم دے کر جاتے تھے لیکن اِن کے بعد ان کے نام لیواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ یہ ان اختلافات کی لکیروں کو مٹاتے' خود اپنے اندر ہی اختلافات پیدا کر لیتے تھے۔ اس طرح ہر دین لانے والے کے بعد ان اختلافات میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ پھر اس کا انجام کیا ہوتا تھا۔ اب اس کے برعکس قرآن ایک دوسرا گروہ سامنے لایا ہے۔

نوعِ انسانی کا دو گروہوں میں تقسیم ہونے کا معیار

یہ یاد رکھیے کہ قرآن کی رو سے پوری نوعِ انسانی تو دو ہی گروہوں کے اندر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو خدا کے دیئے ہوئے ان قوانین اور اصولوں کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو' کسی ملک میں ہو' کسی نسل سے ہو' کوئی زبان بولتا ہو' ان سب میں وجہ اشتراک یہ ایمان ہے۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ میں وہ تمام انسان ہیں جو ان قوانین اور اصولوں سے انکار کرتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے عربی زبان میں کفر کہا جاتا ہے۔ پوری انسانیت ان دو گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا اور وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو ان قوانین کی صداقت کو صحیح تسلیم کرتا' دوسرا وہ ہے جو ان سے انکار کرتا ہے اور اسی کا نام ہماری سیاست میں دو قومی نظریہ ہے۔ اس کا تعلق ہندوستان کی سیاست سے نہیں ہے۔ یہ صرف پاکستان بنانے کے لیے ایک چیز اختیار نہیں کی گئی تھی' یہ قرآن کا بنیادی اصول ہے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو انہی دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ کسی اور تقسیم کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ قرآن اس دوسرے گروہ کے متعلق کہتا ہے کہ اس نے دین کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے برعکس پہلا گروہ اس قسم کے طرزِ عمل کے نتائج سے خائف رہتا تھا۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (23:57) یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔ اب خوف' خشیت اور خضوع قسم کے الفاظ ہیں جو خدا کے متعلق قرآن میں آتے ہیں۔ آپ کسی آیت کا ترجمہ' کسی مترجم قرآن شریف میں دیکھ لیجیے گا' وہاں لکھا ہوگا "جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔" یہ خوف ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے نہ کسی تشریح کی ضرورت ہے' نہ کسی توجیح کی۔

خوف و حزن کے سلسلہ میں پیغامِ خداوندی

ہمارے ہاں یہ ایک مسلمہ ہے کہ ہم بچوں کو ڈرانے کے لیے بچپن سے خدا کے خوف اور ڈر کی تعلیم دینا شروع کر دیتے ہیں اور ساری عمر دیتے رہتے ہیں حالانکہ ڈر وہ چیز ہے جسے دل سے نکالنے کے لیے یا اس احساس کو دور کرنے کے لیے خدا نے اپنی اس وحی کو بھیجا۔ اس

نے تو کہا یہ تھا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ❶ (2:38)۔ یہاں پہلی چیز جو نوعِ انسانی سے کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی خدا کے ان قوانین کا اتباع کرے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے کسی قسم کا خوف یا غم نہیں ہوگا' خوف ہی نہیں' غم' ملال' پریشانی ہی نہیں بلکہ حزن تک نہ ہوگا۔ یہ ایک عظیم چیز ہے جو قرآن نے چودہ سو سال پہلے بیان کی ہے جب ساری دنیا میں کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور ہی ڈر کا تھا۔ آپ اس مافوق الفطرت ہستی کو دیوتا کہہ لیجئے' God کہہ لیجئے' خدا کہہ لیجئے' یزداں کہہ لیجئے' اس کا تصور ہی ڈر کا تھا۔ اصل میں جب خوف یا ڈر کا تصور پیدا کیا تو وہ انسانیت کا اولین دور تھا جو ویسا ہی تھا جیسا ایک فرد کا بچپن کا دور ہوتا ہے۔

خوف و ہراس کے ماحول میں پرورش پانے سے بچے کی ذہنی کیفیت

بچپن میں بچہ ابھی Reason (عقلی استدلال) کو نہیں سمجھ سکتا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کے ذہن میں Reason (عقلی استدلال) نہیں آتا۔ اس سے آپ نے کچھ منوانا ہوتا ہے' تو آپ ڈر سے اس سے منواتے ہیں۔ پھر ''اوہ خوف و ہراس لگ گیا۔ تے فیر تینوں پتہ اے ناکہ فیر کی کردے ہوندے نیں: دساں امی نوں؟ میں نئیں اج سکول جانا' میں کم نئیں سی کتا' ماسٹر جی ماردے ہیگے نے۔''❷ وہ ڈر اس لیے ہے کہ ابھی وہ Reason (عقلی استدلال) سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہمارے ہاں یہ چیز عام ہے کہ ڈر سے کراتے ہیں۔ یہ بڑی غلط چیز ہے۔ بچے کے دل میں اس دور میں بھی ڈر نہیں ڈالنا چاہیے اور یہاں تو ڈر کے لیے پوچھو نہیں کہ ڈر ڈالنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے دیوی دیوتاؤں کے نام تھے: وہ کالی دیوی' اور ہیرو دیوی اور اسی قسم کے کہ وہ ''بھاؤ❸ آ گیا' وہ بھاگ❹ آ گیا''۔ بچہ ان الفاظ سے سہم جاتا ہے اور آپ کی سائیکولوجی یہ بتاتی ہے کہ ڈر کی وجہ سے اس قدر Psychological complexes پیدا ہو جاتے ہیں' اس قدر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر ان کے نتیجے میں اس قدر اعصابی امراض پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن بچوں کے دل بھی بچپن ہی میں زیادہ ڈر ڈال دیتے ہیں' ڈر کا تصور ڈال دیتے ہیں تو اس کے بعد اگلی عمر میں جا کے دیکھیے کہ ان کے اندر کس قدر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ نوے فیصدی جو آپ کے ہاں امراض ہوتے ہیں اور ان کا جو اب

---

❶ جو لوگ (ہماری طرف آنے والی) رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے (20:123-124) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔14)۔

❷ پھر وہ خوف و ہراس لگ گیا۔ پھر تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا کرتے ہیں: میں بتاؤں امی کو؟ مجھے آج اسکول نہیں جانا ہے' میں نے اسکول کا کام (Homework) نہیں کیا ہے' ماسٹر صاحب ماریں گے۔

❸ خوف کا چھلاوا

❹ بخت' قسمت

سائیکولوجیکل (نفسیاتی) علاج کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دل سے ڈر کا جذبہ نکالتے ہیں۔ آج یہ چیز سامنے آئی ہے کہ ڈر ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے انسانیت کے جوہر کچلے جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس دور کی بات ہے جو قرآن نے کہی جب دنیا میں انسانیت ابھی عہدِ طفولیت میں تھی' بچپن میں تھی۔ اس لیے ہر چیز ڈر سے کرائی جاتی تھی۔ جب انسانوں کو ابتدائی تصور دیا گیا تو ابتدا میں انسانوں نے اپنے ذہن سے کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور دیا' اسے آپ دیوی دیوتا کہہ لیجیے' اسے اہرمن ویزداں کہہ لیجیے' اسے کوئی نام دے لیجیے' وہ ایک غیر محسوس ہستی ہے جس کے متعلق ڈر پیدا کیا۔ یہاں تو غنیمت ہے کہ آپ کے ہاں وہ کالی دیوی کے مندر نہیں ہیں۔ وہ تو ہم سے پوچھیے۔ اتفاق سے دہلی میں تو وہ مندر' دور ہوتا تھا۔ میرا تو پوچھو نہیں' میں نے تو ہر حرم اور دیر کے مندروں کی پوجا کی ہوئی ہے۔ وہ راستے میں' شملے میں' جو مین سڑک دفتروں کو جاتی تھی' وہاں مندروں میں ہوتی ہوئی جاتی تھی۔ بنگالیوں کے ہاں جو کالی ماتا ہے' وہ سب سے بڑی دیوی ہوتی ہے۔ وہاں شملے میں بالکل عین سڑک کے اوپر' ذرا بلندی پہ مندر تھا۔ مندر کے باہر انہوں نے جو اپنی کالی دیوی ہے یا جس کو کالی ماتا کہتے ہیں' اس کا مجسمہ' اس کا بت' مندر سے باہر رکھا ہوا ہے۔ یہ بہت بڑا مجسمہ ہے۔ ایک تو اس کو بالکل سیاہ پینٹ کیا ہوا ہے' اس میں اس کے خون کے رنگ سے رنگے ہوئے' اتنی بڑی زبان باہر نکالی ہوئی ہے بالکل خونی آنکھیں بھی سرخ خون کی سی ہوتی ہیں۔ چار ہاتھ اور ان ہاتھوں کے اندر نیزہ اور وہ ایک تلوار سی ہوتی ہے اور یہ پورا ذبح کرنے کے اور مار دینے کے اوزار' دو میں بھی نہیں' بلکہ چاروں ہاتھوں میں اور گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کی مالا ہوتی ہے۔ اب آپ سوچیے کہ جب اس قسم کے خداؤں کے مجسمے سامنے رکھے جائیں اور یہ تو مرئی مجسمے تھے جو نظر آتے تھے' وہ جو اس کے متعلق ان کا ڈر تھا' جو ڈالا جاتا تھا' اس کا کیا کہنا!! ہر وہ شے جس سے ڈر آجائے' وہ دیوتا بن جاتی ہے: بادلوں کی گرج' بجلی کی کڑک' تند و تیز طغیانیاں' دریاؤں کے سانپ' یہ آگ' یہ شیر' ہر ڈرنے والی چیز سب دیوتا تھا۔ تو یہ جو انسانیت کا ابتدائی دور تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے آپ بچے سے ہر کام ڈر سے کراتے ہیں۔ وہاں وہ ڈر جو تھا' ان کے جو پروہت تھے' انہوں نے ذہن میں ایک موہوم ہستی Create (پیدا) کی ہوئی تھی اور جب میں نے موہوم کہا ہے تو وہم تو ہوتا ہی ڈر رہے' خوش کن وہم ہوتا ہی نہیں۔ یہ وہم ہے جسے قرآن حکیم نے حزن (Anxiety) کہا ہے۔ یہ اندر ہی اندر کوئی دل گرفتگی ہے یعنی بظاہر اس سے پوچھیے کہ تو کس چیز سے ڈر رہا ہے' کہتا ہے کہ پتہ نہیں ہوتا کس چیز سے ڈر رہا ہے:

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

او کیوں ڈوبا جا رہا ہے؟ پتہ نہیں۔ یہ وہ نفسیاتی کشیدگی ہوتی ہے۔ یہ تھا خدا کا تصور جو دیا گیا تھا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے اس دور میں آ کر یہ کہا ہے کہ خدا کی اطاعت یا اس کے قوانین کے اتباع کا پہلا لازمی فطری نتیجہ

ہی یہ ہے کہ معاشرے میں فَـــلَا خَـوْفٌ عَـلَيْهِـمْ وَ لَاهُـمْ يَـحْـزَنُـوْنَ (2:38) ہوتا ہے: کوئی خوف (Fear) اور حزن (Anxiety) باقی نہیں رہتا۔ خوف (Fear) باہر کے ڈر کو کہتے ہیں' حزن (Anxiety) وہ ہے کہ ''دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے''۔ خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے قطعاً یہ بات نہیں ہوتی۔ وہاں تو قلب مطمئن ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں تو یہ الفاظ ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے؟ قرآن ہی نے یہ بات بتا دی جہاں یہ کہا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) اب قانون کا دور شروع ہو گیا ہے جو بھی اس قانون کا اتباع کرتا چلا جائے گا' اسے کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا یعنی قرآن نے اس قدر قانون کی حکمرانی کا تصور دیا اور آج بھی Law abiding citizen کے یہ الفاظ باقی رہ گئے ہیں: یہ الفاظ اس دور کی یادگاریں ہیں جنہیں کھنڈرات کہتے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ جتنے بھی Law abiding citizens (قانون کے مطابق چلنے والے شہری) ہوں گے ان کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا۔ اگر واقعی کہیں قانون کے مطابق معاشرے کا نظام قائم ہو تو جو Law abiding (قانون پر چلنے والے) ہیں' انہیں کسی قسم کا خوف نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن تو چاہتا ہی یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی ہو' اور قانون Reason یعنی دلیل و برہان کی بنا پر سمجھایا جائے۔ وہ قانون بھی دھاندلی سے نہیں نافذ ہوگا کیونکہ لَآ اِكْـرَاهَ فِـي الدِّيْنِ ❶ (2:256)۔ اس قانون کے تابع تم نہیں رہنا چاہتے تو نہ سہی' ٹھیک ہے چلے جاؤ' اگر اس مملکت کے دائرے میں رہتے ہو جہاں یہ قانون ہوگا اور قانون کا اتباع کرتے رہو گے تو پھر فَلَا خَوْفٌ عَـلَيْهِمْ وَ لَا هُـمْ يَـحْزَنُوْنَ (2:38) تمہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ انسانیت بچپن سے' عہد طفولیت سے' آگے نکل گئی ہے' بچہ جوان ہو چکا' آپ جوان بچے کو ڈرا کر کام نہیں لے سکتے۔ اس طرح وہ یا تو سرکش ہو جاتا ہے' یا کچلا ہی جاتا ہے۔ کیا آپ نے کسی بڑے بچے کو' جو کچلا ہوا ہو' دیکھا ہے' کہ گھر کے خوف اور ڈر کے مارے اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس کے سارے جوہر انسانیت جل کر راکھ ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر وہ سرکش ہو جاتا ہے۔ قرآن اس دور میں آیا جب اس نے انسانیت کو کہا کہ اب اس کا عہد شباب شروع ہوتا ہے۔ بچپن والے' جو ہمارے ہاں کے طریق کار تھے وہ سب غلط تھے۔ اس نے یہ کہا کہ جو بھی قانون کا اتباع کرے گا اس کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔

عربی لغت میں خوف کے معنی ''کسی عمل کے انجام سے آگاہ ہونا ہے''

عزیزانِ من! اب اگلی بات سے اس کی وضاحت ہو گئی کہ جو قانون شکنی کرے گا' اسے اس کے عواقب سے' اس کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔ یہ خدا سے ڈرنا نہیں ہے۔ یہ تو جو اس کے قوانین ہیں ان کے توڑنے سے' ان کی خلاف ورزی کرنے سے' جو انسان کا اپنا نقصان

---

❶ دین میں زبردستی نہیں ہے۔

ہوتا ہے یا اس کے جو عواقب ہوتے ہیں‘ ان کے احساس سے‘ خود اس کے اپنے اندر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اس کا تو انجام بڑا خراب ہوگا‘ یہ ہے جسے خوف کہا جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنا ہے تو جسے محاورہ عرب کہا گیا ہے اس کی رو سے قرآنِ کریم سمجھیں۔ یہ میری لغات [1] میں آپ کو ملے گا کہ عرب ان الفاظ کے معنی کیا لیتے تھے۔ وہاں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے ان لفظوں کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ خود لفظ خوف کے معنی عربی محاورہ کے مطابق ’’کسی بات کے انجام کا علم ہونا ہے۔‘‘ خوف کے معنی ’’علم ہونا‘‘ ہے۔ کیا بات ہے اس زبان کی‘ اور کیا بات ہے اس قرآن کی! ٹھیک ہے کہ آپ نے مصری یا چینی سمجھ کر سنکھیا پھانک لیا‘ وہ علم نہیں تھا۔ آپ کے دل میں کوئی خوف نہیں پیدا ہوگا۔ جونہی کسی نے کہا کہ وہ سنکھیا تھا‘ آپ دیکھیے کہ اس کے بعد کیا کیفیت تھی: اس کے متعلق یہ علم ہو گیا۔ جو اس طرح کیفیت پیدا ہوتی تھی‘ عرب اسے خوف کہتے تھے۔ یہ جو چیز ہے کہ قوانین اس نے دے دیئے۔ یہ کہا کہ میں علیٰ وجہ البصیرت سمجھا تا ہوں۔ علی بصیرۃ کہا یعنی یہ بھی نہیں کہ اس کی علت نہ بتائی ہو‘ The why of it (اس کی علت) نہ بتایا ہو اور قانون نافذ کر دیا ہو۔ قانون سے پہلے یہ سمجھایا کہ یہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ اگر اس قانون کے مطابق چلو گے تو یہ نتائج ہوں گے‘ خلاف ورزی کرو گے تو یہ ہو جائے گا۔ اب اس کے بعد یہ کہا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے ان قوانین کو مان کر‘ ان کے تابع زندگی بسر کرنے والے معاشرے کے اندر رہیں‘ جس کا جی نہیں چاہتا وہ دوسرے معاشرے کے اندر جائیں‘ رہیں‘ لیکن جب اس معاشرے کے اندر ایمان لا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر قانون شکنی کے جو نقصان دہ نتائج ہیں‘ تم ان سے بچ نہیں سکتے۔ اسے ایمان کہتے ہیں‘ اگر کسی سے اس معاملے میں قانون کے خلاف کچھ ہو گیا ہے تو اس کا جو احساس ہے کہ وہ اس سے بچ نہیں سکتا‘ یہ ہے جس کا نام آپ خوف رکھ لیجیے۔

انسانی معاشرہ میں نظامِ عدل کی اہمیت

آج انسانی معاشرہ کے اندر کمزوری اور سقم موجود ہے۔ اس معاشرے کی خلاف ورزی کرنے سے بھی انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کے عواقب سے کس طرح بچوں؟ کیونکہ ہمارے ہاں نظامِ عدل کمزور ہوتا ہے‘ اس میں اسقام ہوتے ہیں‘ نقائص ہوتے ہیں‘ اس لیے قانون شکنی کرنے کے بعد سوال اس طرف جاتا ہے کہ اب کیا کیا جائے جس سے میں اس کے عواقب سے بچ جاؤں۔ یہاں کے اس نظام سے بچ سکتا ہے۔ اصل میں اگلی بات یہ ہے کہ جسے آپ کہیں گے کہ اس کے نتائج سے خوف پیدا ہوتا ہے‘ وہ یہ بات ہے کہ میں اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ پولیس کے ہاتھوں سے بچ سکتا ہوں‘ عدالت کے ہاتھوں سے بچ سکتا ہوں‘ جیل سے بھی بھاگ سکتا ہوں مگر خدا

---

[1] لغات القرآن

کے قانون کی گرفت سے میں کہیں بھاگ نہیں سکتا۔

ایمان بالآخرت کی حقیقت اور اس کے نتائج

یہ جو احساس ہے، جسے ایمان بالآخرت، یا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کہتے ہیں اس سے مفر نہیں ہے۔ میں بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ قرآن تو لفظ ہی عجیب لاتا ہے۔ جیل سے دیوار توڑ کر بھاگا ہوا جو مجرم ہے، وہ تھانوں سے، جیل سے، عدالتوں سے، سپاہیوں سے، دور دور بھاگتا ہے کہ ان کی نگاہ مجھ پہ نہ پڑ جائے، اس کا ہمیشہ یہ کام ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ جو ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل ہے تم اپنے ذہن میں اس سے دور بھاگنے کے لیے قدم اٹھاؤ گے تو تمہارا ہر قدم وہ ہوگا جو تمہیں اس کی طرف لے کر آئے گا، یہ ہے اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّـآ اِلَيْـهِ رَاجِعُوْنَ (2:156)۔ جو عجیب چیز ہے، وہ یہ بات ہے کہ تم اپنے ذہن میں سمجھتے ہو کہ میں بھاگ کر دور جا رہا ہوں، تمہیں پتہ نہیں۔ تم نے راستہ چھوڑ دیا ہے۔ جس راستے پہ بھاگتے چلے جا رہے ہو کہ میں دور جا رہا ہوں وہ یوں نہیں ہے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ تمہارا ہر قدم اس کی طرف جا رہا ہے، اب آگے جاؤ گے ''تے تہانوں تھانہ نظر آ جائے گا۔''[1] او میرے اللہ! خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ اب یہ سوچ لیجیے کہ قانون کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ ہے، اس کا علم ہوگا اور علم یہ ہے کہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا، یہ نتیجہ تو سامنے آئے گا۔ اس سے آپ کی جو کیفیت پیدا ہوگی، وہ خدا کا ڈر نہیں ہے، وہ تو اپنے کیے ہوئے کا جو نتیجہ نکل رہا ہے، جس سے مفر نہیں ہے یہ تو وہ احساس ہے۔

عزیزانِ من! اب اگلی چیز اس نے پھر یہی کہہ دی کہ بھاگ کر دور کیوں جا رہے ہو۔ یہاں سے فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے کہ انسان بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اس لیے جھکی ہوئی نگاہوں سے، خمیدہ گردن سے، ندامت سے، پیشانی کے اوپر عرقِ انفعال کے ساتھ خود ہی آ جاؤ کہ مجھ سے بھول ہوگئی، غلطی ہوگئی، مجھے اس وقت علم نہیں تھا جب میں نے یہ کیا تھا۔ اب مجھے اس کا علم ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس غلطی سے جو میرا نقصان ہوا ہے میں اس کی تلافی بھی کروں گا اور آئندہ کے لیے محتاط بھی رہوں گا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم بتاؤ تو سہی کہ کیا تمہیں عذاب دے کر خدا خوش ہوتا ہے؟ نہیں وہ Sadistic (اذیت پسند) نہیں ہے کہ کسی کو اذیت دے کر خوش ہوتا ہو۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا ہے، اگر اس کا احساس بیدار ہوا ہے تو اس کی تلافی کرو، ہمارا نہ پہلے تم نے کچھ بگاڑا تھا، نہ اس سے کچھ بگڑے گا۔ یہ ہے قرآن کی رو سے قانونِ جزا و سزا، اور یہ ہے کہ جس کو ہم خوف کہتے ہیں۔ میں نے پھر یہ عرض کیا ہے کہ اس کو خدا کا خوف نہیں کہنا چاہیے۔ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے کے جو نتائج ہیں، یہ ان کے احساس اور علم کا نام ہے، جسے آپ خوف کہتے

---

[1] تو تمہیں تھانہ نظر آئے گا۔

ہیں۔اب جہاں بھی قرآن میں یہ چیزیں آئیں گی تو انہیں غور سے سمجھیے۔میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو جب ہمارے ہاں ترجمہ ہو جاتا ہے تو اس سے قرآنِ کریم کے صحیح تصورات سمجھ میں نہیں آتے اور دوسرا یہ کہ وہی بچپن سے خدا کا خوف والا تصور ذہن میں' ڈر کے ساتھ' ڈالا ہوا ہے اور پھر اس کے بعد آگے چلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں حضرت صاحب ساری عمر خدا کے خوف سے' ڈر کے مارے' روتے رہے' صاحب! ساری عمر رونے میں ہی گزر گئی بس ساری عمر یہی کام کیا۔اب جتنا زیادہ کسی کے اندر جسے یہ خدا کا ڈر کہتے ہیں' ہوتا ہے' اتنا ہی وہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔جس سے آپ ڈرتے ہیں کیا کبھی آپ اس کا قرب بھی حاصل کرتے ہیں؟''اوتھوں تے نٹھدا ہیگا آدمی' کہ سامنے ای نا آوے کسی طرح نال ❶ ۔'' بچے کو جو ڈر ہوتا ہے آج اسکول میں مار پڑنی ہے تو اس دن وہ اسکول ہی نہیں جانا چاہتا مگر یہاں کہتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے' وہ سب سے زیادہ مقرب ہوتا ہے۔''او تے لاگے ای نہیں اونا چاہندا۔'' ❷ برادرانِ عزیز! قرب تو انسان' دوست کا چاہتا ہے' دشمن کا قرب تو نہیں چاہتا اور جس سے کوئی ڈرتا ہو اس کا قرب نہیں چاہتا۔کیا کہیں کہ ہمارے ہاں کیا سے کیا ہو گیا ہے!!

خدا کے صحیح تصور کا جاننا اور ماننا ایک بنیادی امر ہے

عزیزانِ من! میں نے متعدد بار یہ لکھا ہے کہ دین یا انسانیت یا زندگی سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک خدا کا صحیح تصور سمجھ میں نہ آئے۔ ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔جناب! ''مانتا ہوں'' ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہی تو اب آپ کے ذہن میں کچھ نہیں۔ مانتا ہوں' کا کیا مطلب ہے؟ یہ مانتا ہوں والی بات نہیں ہے۔میں نے پہلے بھی بتایا تھا اور قرآن خود بھی یہ کہتا ہے کہ جنہیں وہ کفار پکارتا ہے' مشرک پکارتا ہے' ان کے متعلق کہتا ہے کہ ان سے بھی جب پوچھا جائے کہ بادلوں سے یہ بارش کون برساتا ہے تو کہیں گے خدا برساتا ہے۔جب ان سے پوچھا جائے کہ کھیتیوں میں یہ فصلیں کون پیدا کرتا ہے' کہیں گے خدا پیدا کرتا ہے۔مشرکین اور کفار کا یہ جواب قرآن دیتا ہے۔وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ جو خدا کو مانتے ہیں' وہ ہمارا لفظ جو' مانتا ہے' اس کو تو وہ مانتے ہیں۔اس کے باوجود وہ پھر یہ کہتا ہے کہ جب تمہیں خدا کی طرف بلایا جاتا ہے تو پھر تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے کہ آتے نہیں ہو یعنی وہ مانتے تو ہیں۔کس چیز کی طرف بلایا جاتا ہے؟ یہ جو کفار اور مشرکین تھے' یہ جو اہل کتاب تھے ان کے متعلق تو بہر حال یہ ہے کہ وہ خود اس کے مدعی ہیں کہ وہ نہ صرف خدا بلکہ وہ خدا' وحی' رسالت' کتابیں' آخرت ہر چیز کو مانتے تھے اور قرآن ہے کہ وہ ان کو بھی ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔اگر ماننا ہی اس شرط کو

---

❶ وہاں سے تو آدمی بھاگتا ہے کہ کسی طرح سے سامنے ہی نہ آئے۔

❷ وہ تو نزدیک ہی نہیں آنا چاہتا۔

پورا کر دیتا ہے تو وہ تو اس شرط کو تم سے پہلے پورا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہی ماننے والے تھے تو رسول اللہ ﷺ کی تو اس زمانے میں نبوت سے پیشتر یہ کیفیت نہیں تھی وہ تو اہل کتاب میں بھی نہیں تھے۔ وہ تو مانتے تھے۔ ان ماننے والوں سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ۔ کیا بات ہے! کہا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ (2:137)[1] اگر یہ لوگ اس تصور کے مطابق ان چیزوں کو مانیں جو اپنا تصور خدا تعالیٰ نے دیا ہے اور جس کے مطابق تم اسے (خدا کو) مانتے ہو پھر اسے ایمان کہا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے اہل کتاب سے ہی یہ نہیں کہا' یہود و نصاریٰ سے ہی یہ نہیں کہا' مشرکین عرب' مجوسیوں اور تابعین سے ہی یہ نہیں کہا' مسلمانوں سے بھی یہ کہا ہے کہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136)[2] یہ کہنے والو! کہ ہم تو اللہ کو مانتے ہیں' ذرا اُسے مان کے دکھاؤ۔ یہ کچھ ہم سے بھی کہا جا رہا ہے۔

قرآنِ کریم میں جہاں یہ خوف کے' خشیت کے' خشوع کے الفاظ آتے ہیں' ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ڈر ہوتا ہے یعنی خدا سے ڈرتے رہتے ہیں' خوف کھاتے رہتے ہیں۔ خدا کا تصور یہ ڈرانے والی ہستی کا ہے اور پھر اس کے عذاب کا پوچھو نہیں کہ اس کی کیا کیا تفاصیل بیان کی جاتی ہیں۔ اگر کہیں اس کے ہاں کی کوئی رحمت بھی ہوتی ہے' بخشش بھی ہوتی ہے تو شفاعت کے ذریعے سے ہوتی ہے یعنی خدا خود نہیں کرتا' کوئی جا کر وہاں اس کو کہنے والا ہوتا ہے کہ ''ٹھنڈا اوی ہو تھوڑا اجیا''[3] یعنی وہ جا کے ان سے کہتے ہیں' ورنہ ''او ہدا غصہ ٹھنڈا ای نہیں ہوندا''۔[4] عزیزانِ من! جسے ایمان کہتے ہیں' قرآن جس تصور کو پیش کرتا ہے' وہ تصور کیا ہے' وہ Concept کیا ہے' خدا کا وہ تصور کیا ہے؟ قرآن ان چیزوں کے تصورات بدلتا ہے' ورنہ یہ سارے ایمان تو پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں' ہر ملک میں' ہر زمانے میں' ہم نے اپنی طرف سے نبیوں کو بھیجا ہے۔ پھر اسی قوم کی طرف بار بار نبی بھیجنے کے کیا معنی تھے؟ یہی کہ رسول اللہ ﷺ آ کر یہود و نصاریٰ سے کہتے ہیں کہ ایمان لاؤ' اور وحی کی روشنی میں ان دیئے گئے تصورات کے مطابق ان چیزوں کو مانو۔

---

[1] اگر یہ لوگ بھی' اُسی طرح اس ضابطہ حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اُس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 49)۔

[2] اے جماعت مؤمنین! تم بھی ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھو (2:62)۔ اور وہ بنیادی اصول ہیں: اللہ پر ایمان' وَرَسُوْلِهٖ (4:136) اس کے رسول پر ایمان' وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ (4:136) اور اس کتاب پر ایمان جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی' وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (4:136) اور ان تمام کتابوں پر ایمان جو اس نے اس سے پہلے نازل کی تھیں۔ (اور ملائکہ اور حیات اخروی پر ایمان۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 223)

[3] تھوڑے سے نرم بھی ہو جاؤ۔ غصہ تھوک دو۔

[4] ورنہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کے تراجم کا معیار

اب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ قرآن جب ہم سے بھی کہتا ہے کہ ایمان لاؤ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ایمان کو ذرا اس پہ پرکھ لیا کرو کہ کیا وہ ایمان ان تصورات کے مطابق ہے' کیا خدا کو تم ان تصورات کے مطابق مانتے ہو جو قرآن نے خدا کے متعلق دیئے ہیں یا وہ تصور جو ذہن انسانی کے پیدا کردہ اور مروج چلے آ رہے تھے۔ اُن کے پیروکاروں سے یہ کہا ہے۔ عزیزانِ من! آج کے درس کی یہ آیت شروع ہی اس سے ہوتی ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ❶ (23:57)۔ آپ کسی بھی ترجمے میں دیکھیں' اس میں لکھا ہوا ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں یعنی خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ایک تو یہی دیکھیے کہ یہ زبان کیا ہوئی۔ ڈر اور خوف تو ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ اب یہاں خَشْيَةِ (23:57) اور مُشْفِقُوْنَ (23:57) آ گیا تو صاحب! اب ان کے لیے کیا کریں۔ پہلے لفظ خوف کہہ دیا پھر ڈر کہہ دیا یعنی خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ وہی ڈر والا تصور ہے۔ خشیت خداوندی تو ہمارے ہاں بھی عام کہا جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ اور مشفقون کیا بات ہوتی ہے؟ قرآنِ کریم صحیح اعمال کے نتائج کو عام طور پہ کھیتی کی' زراعت کی' مثال دے کر بیان کرتا ہے۔ اچھا بیج ہو' زراعت کے قانون کے مطابق اس بیج کو بویا جائے' پرورش کی جائے' مناسب پانی دیا جائے' حرارت ہو' احتیاط برتی جائے' تو پھر وہ ایک ایک دانے کے سات سات سو دانے نکلتے ہیں: مفلحون۔ قرآن نے مومن کے متعلق کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ❷ (2:5) یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ وہ مثال ہی یہ دیتا ہے اور یہ صحیح چیز ہے کہ جس دور میں ابھی یہ Industries (صنعتیں) یا اس قسم کی اور چیزیں نہیں تھیں' یہ Agriculture (زراعت) ہے' اسی پہ انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے' اب بھی یہی صورت ہے۔ یہ باقی چیزیں تو Wealth Produce (پیداوارِ دولت) کرتی ہیں' انسان کی زندگی کا جن چیزوں پہ دار و مدار ہے' وہ تو یہی زمین پیدا کرتی ہے لہٰذا قرآن ہمیشہ یہ مثال دیتا ہے۔ پودے کے ہرا بھرا ہونے کے لیے' پروان چڑھنے کے لیے' اور ثمر بار ہونے کے لیے' مناسب پانی کی بڑی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حرارت بھی کچھ زیادہ نہ ہو جائے' لو بھی اس کو مار دیتی ہے' جن پودوں کو پورا پانی نہ ملے وہ سبز ہونے کی

---

❶ (زندگی کی حقیقی خوشگواریوں کے اہل اور لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی) وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 783)۔

❷ یہ وہ سعادت مند لوگ ہیں جو اپنے نشو ونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کی راہ نمائی میں سفر زندگی طے کرتے جاتے ہیں' اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں آخر الامر پروان چڑھتی ہیں (5-31:2 ;11-23:1) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 3)۔

بجائے زرد ہوجاتے ہیں اور جو پودے زرد ہوجاتے ہیں، ظاہر ہے کہ مرجھا جاتے ہیں "کلیاں چھیتی مرجاندیاں نیں۔"[1] خشیت کے معنی ہوتے ہیں "پورا پانی نہ ملنے سے پودوں کا زرد ہوجانا۔" یہاں کہا ہے کہ مِنۡ خَشۡيَةِ رَبِّهِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ (23:57) یہ اس کی ربوبیت ہے جس سے انسانیت اور کائنات کی یہ ساری چیزیں نشوونما پاتی ہیں، ربوبیت نشوونما دینا ہے۔ اس کو نشوونما دینے کے لیے ضروری چیز ہے کہ یہ کھیتیاں جو ہم بو رہے ہیں سرسبز ہوں، صحیح پانی ملے لیکن اگر کوئی اس ربوبیت سے محروم رہ جاتا ہے، اگر وہ اپنی کھیتی کو پانی نہیں دیتا اور وہ زرد پڑ جاتی ہے، تو ہمیں اور آپ کو تو اس کا احساس نہیں ہوگا کہ کیا ہوتا ہے۔ "سانوں تے ایناں ای پتہ اے کہ کھیتی زرد پڑ گئی ہے۔"[2] پوچھیے اس کسان سے کہ جس کی کھیتی، جس کے پودے زرد پڑ رہے ہوں، وہ بے قرار ہوتا ہے کہ اب کیا بنے گا۔ دیکھا آپ نے، کہ اس میں جسے آپ خوف کہتے ہیں، وہ پہلو کہاں آ رہا ہے: یہ کھیتیوں کا زرد پڑ جانا، پژمردہ ہوجانا ہے۔ اس سے کہا کہ یہ چیز قانونِ خداوندی کے اتباع نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے ورنہ وہ تو رب ہے، اس کی ربوبیت کے خزانے تو عام ہیں۔ کہیں تمہاری کوشش میں کوئی فرق آیا ہے، کوئی نقص پیدا ہوا ہے جس کی وجہ سے تمہاری کھیتی کو پورا پانی نہیں ملا، اس لیے زرد ہوگیا۔ اگر قانون کے سامنے تم جھکتے، اس کا اتباع کرتے، تو پھر یہ ہو نہیں سکتا تھا، وہ تو رب ہے۔

شفق کا قرآنی مفہوم

دیکھیے یہاں (23:57) میں "ربہم" کا لفظ آیا ہے۔ وہ تو رب ہے اس نے تمہاری کھیتیوں کو پژمردہ کیوں کرنا ہے۔ پھر یہ کیا ہوا ہے؟ تم نے سرکشی برتی ہے۔ اب یہاں مشفقون آیا ہے۔ اس کا مادہ شفق (ش ف ق) ہے۔ ہمارا ذہن اس طرف نہیں جا رہا کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ جب سورج نصف النہار[3] پہ ہو، مئی جون کی گرمی ہو، اور سر کے اوپر سورج ہو، اس وقت سورج کی تپش، حرارت ملاحظہ فرمائیے۔ صاحب! اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انتہا ہے، حرارت کی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ جھکنا شروع ہوتا ہے۔ شفق کے زمانے میں، جب وہ غروب ہو رہا ہوتا ہے، اس کی ساری تندی اور تیزی ماند پڑ جاتی ہے، رنگ بھی زرد ہوتا ہے، جھکا ہوا بھی اتنا ہوتا ہے۔ یہ جو اس طرح سے انسان کے اندر جھکاؤ پیدا ہوتا ہے اس کو عرب شفق سے تعبیر کرتے تھے۔ "مشفقون"، وہ لوگ ہوتے تھے جو اپنی تندی اور تیزی کو چھوڑ کر جھکاؤ پیدا کر لیتے تھے۔ اب قرآنِ کریم میں اس سلسلے کی پہلی ہی آیت (2:5) آ گئی کہ آؤ بتائیں تمہیں کون ہے جن کی کھیتیاں پروان

---

1. کلیاں جلد ہی سوکھ جاتی ہیں۔
2. ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ فصل زرد پڑ گئی ہے۔
3. دوپہر کا وقت۔

چڑھتی ہیں' وہ تو قانون کے مطابق ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ کہیں کوئی نقص رہ جاتا ہے اور وہ نقص بھی کچھ ایسا رہ جاتا ہے جس میں یہ ہوتا ہے کہ کہیں حرارت زیادہ ہوگئی' تندی زیادہ ہے' سرکشی زیادہ ہے' تکبر زیادہ ہے۔ تمہارے اندر رعونت پیدا ہوگئی' اس کے قانون کی پرواہ نہیں کی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ کھیتی کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ زرد ہورہی ہے' پتے خشک ہورہے ہیں' مرجھا رہی ہے۔ اس احساس سے کہ اب کیا ہوگا' فوراً قانون کی طرف نگاہ گئی ہے اور اس کے سامنے یوں جھکے جیسے یہ اس قدر سرکش سورج غروب ہوتے وقت جھکتا ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مِّنۡ خَشۡیَۃِ رَبِّہِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ [1] (23:57)۔ اس میں ڈر کا پہلو نہیں ہے اس جھکاؤ کے بعد پھر ان کی کیا کیفیت پیدا ہوئی اس کے لیے کہا کہ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ [2] (23:58)۔ انہوں نے دیکھا کہ اوہو؟ خدا کے قانونِ ربوبیت سے کہیں سرکشی برتی' کہیں انکار ہوگیا' کہیں اس کی خلاف ورزی ہوگئی' تو فوراً وہ سامنے لاتے ہیں کہ اس معاملے کے اندر قانون کیا تھا؟ یہ تھا قانون۔ فوراً وہ جا کے دیکھتے ہیں کہ ''موگے کا منہ بند ہوگیا سی' ایس واسطے پانی نہیں گیا۔'' [3] وہ رجوع کرتے ہیں' پھر انہی قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ اب یہاں آیا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِرَبِّہِمۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ (23:59) یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اطاعت صرف احکام وقوانین خداوندی کی کرتے ہیں' اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتے۔

شرک کی ایک واضح تر مثال

عزیزانِ من! یہاں پھر ایک بڑی چیز ہے جو ہمیشہ قرآن نے بتائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک ہی کا قانون اپنے سامنے رکھو۔ جب اس پہ آؤ تو یہ نہ کرو کہ ایلوپیتھک والے ڈاکٹر کے ہاں سے نسخہ لیا اور اس کے ساتھ ہومیوپیتھک کی گولیاں بھی ملا کے پھانکتے جاؤ اور پیچھے سے معجون ومرکب بھی کھاؤ۔ آپ پاکستان کے پرامن شہری رہنا چاہتے ہیں' قانون کا اتباع کرنا چاہتے ہیں' تو ٹھیک ہے جی' موٹر کا لائسنس تو لے لیا' پاکستان کے قانون کے مطابق سڑک پہ نہیں چلے' صحرائے عرب کے قانون کے مطابق' Keep to the right (دائیں طرف چلو) چلے۔ اسے کہتے ہیں شرک۔ یہاں پہ پورے کا پورا وہ نظام اور وہ قانون لانا پڑے گا' قانون کی ہر شق ماننی پڑے گی جو پاکستان میں ہے۔ اگر یہاں Keep to the left (بائیں طرف چلو) نہیں رکھنا تو امریکہ چلے جایئے۔ ٹھیک ہے' جب تک آپ نے یہاں رہنا ہے تو پھر یہاں کے قوانین ہی کو ماننا ہوگا' ان میں دوسرے قانون کو شریک نہیں کرسکتے' یہ بجائے خویش ایک بغاوت ہوتی ہے۔ یعنی یہ تو آپ

---

[1] (زندگی کی حقیقی خوشگواریوں کے اہل) وہ لوگ ہوتے ہیں جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 783)۔

[2] یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی کی صداقت اور محکمیت پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 783)۔

[3] واٹر کورس کا منہ بند ہوگیا تھا اس لیے پانی نہیں پہنچا۔

کہیں گے کہ ہم نے قانون کا اتباع کیا۔ سوال یہ ہے کہ کس کے قانون کا اتباع کیا اور ایک مملکت میں تو اسی ایک مملکت کا جو قانون ہے اسی کا اتباع کرنا ہوگا۔ جب آپ خدا کی مملکت میں رہتے ہیں تو پھر تو صرف خدا کے قوانین کو ماننا ہوگا۔ یہاں جو آمیزش ہے وہ یہی نہیں کہ وہ صحیح نتیجہ نہیں پیدا کرتی۔ بڑی نقصان دہ چیز ہوتی ہے کہ کسی عدالت میں جا کر آپ کہہ دیجیے کہ صاحب! میں نے جو یہ بات کی تھی میں نے وہ امریکہ کے قانون کے مطابق کی تھی' یہاں کا قانون میں نہیں مانتا' میں امریکہ کے قانون کے مطابق چلتا ہوں۔ یہ بھی بغاوت ہے۔ اسے شرک کہتے ہیں۔ یہاں (23:59) میں لَا يُشْرِكُوْنَ (23:59) کہا ہے یعنی وہ یہ نہیں کرتے۔

دو لفظوں میں قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت

یہاں تو یہ بتایا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (23:60) نظامِ خداوندی کی تشکیل' اور نوعِ انسان کی نشوونما کے لیے وہ جتنا کچھ دے سکتے ہیں' دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اُن کے دل اس خیال سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ ان کا کوئی قدم اس راستے سے ہٹ نہ جائے جو خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ کہا کہ پھر عملاً کیفیت یہ ہے۔ یہ جو قرآن کا نظام ہے اس کے متعلق پوچھا کرتے ہیں کہ جی! قرآن کا وہ نظامِ معیشت (Economic system) کیا ہے؟ [1] اس میں لمبی چوڑی بحثوں کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن تو دو فقروں میں ساری بات کر جاتا ہے کہ انسان کے جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جس کو وہ خود لیتا ہے' خود رکھتا ہے' خود کھاتا ہے' اور اُس کی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو وہ دوسرے کو دیتا ہے۔ جسم کی نشوونما بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے کھانا پینا ضروری ہے لیکن یہاں زندگی کا' قرآن کا' ایمان کا' پہلا Concept (تصور) خدا پر ایمان لانے کا ہے۔ یہ پہلی بات ہے۔ یہ Concept (تصور) مانے گا تو یہی بات آگے چلے گی۔ اگر یہی نہیں مانتا تو آگے کچھ نہیں چل سکتا۔ زندگی صرف یہ طبعی زندگی' انسان کے جسم کی ہی زندگی ہے' تو اس میں پھر خدا' رسول' وحی' رسالت کچھ آتی نہیں ہے۔ پھر طبعی قوانین ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین' مملکت کے قوانین ہوتے ہیں' اس میں یہی سیکولر نظام (Secular System) زندگی کے اس Concept (تصور) کا پیدا کردہ ہے یا زندگی کا یہ Concept (تصور) ہی سیکولر نظام ہے۔

---

[1] اس نظام کے مالہ وما علیہ کے لیے دیکھیے ڈاکٹر میر مصطفیٰ حسین (مرحوم) کا پرویزؒ کا ترجمہ شدہ پمفلٹ Economic System of the Holy Quran۔ یہ پمفلٹ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور سے چھپا ہے اور اردو میں بھی دستیاب ہے۔

انسانی ذات کی نشو ونما کے قوانین صرف وحی کے ذریعے ہی ملتے ہیں

دوسرا Concept of life (تصورِ حیات) یہ ہے کہ جسم (Body) تو ہے ہی' لیکن اس کے سوا ایک اور شے بھی ہے' جسے انسان کی ذات کہتے ہیں اور یہ وہ ہے جس پر انسانی اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور یہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ یہ لائف (زندگی) کا دوسرا Concept (تصور) ہوگیا۔ جب یہ Concept (تصور) ساتھ آئے گا تو آپ کو ان قوانین کی ضرورت پڑے گی جن سے انسان کی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں' جسم کی پرورش کے قوانین وحی کے ذریعے نہیں ملتے۔ انسانی ذات (Human Personality) کے قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں۔ اب وحی یعنی خدا کے قوانین تو خدا کے دیئے ہوئے ہیں۔ اب خدا پہ ایمان کی ضرورت پڑی۔ وحی رسولوں پہ آتی تھی' رسولوں کے ماننے کی ضرورت پڑی۔ وحی اس کتاب میں ہے' اس کتاب کے ماننے کی ضرورت پڑی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ جو زندگی کی جوئے رواں ہے یہ اپنے نتائج کو لے کر آگے چلے گی۔ اسے مکافاتِ عمل (Law of Requital) یا حیاتِ آخرت (Life after life) کہتے ہیں' اس سے آخرت پر ایمان کی ضرورت پڑی۔ اگر زندگی کا یہ تصور چھوڑ دیا جائے تو پھر کہیے کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے جس میں کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ جو ذاتِ انسانی کا Concept (تصور) ہے کہ انسانی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں' اس کی نشو ونما مقصود ہے۔ وہ نشو ونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو آپ دوسروں کی نشو ونما کے لیے دیتے ہیں **الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی** [1] (92:18) یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو اپنی ذات کی نشو ونما کے لیے اپنا مال دیتے ہیں۔

زکوٰۃ کا ادا کرنا حکومت کا فریضہ ہے

عزیزانِ من! میں آپ کو کیا کیا تصور بتاؤں' ہم کہاں سے کہاں چلے گئے۔ ان میں ایک زکوٰۃ کا غلط تصور بھی ہے۔ زکوٰۃ کے لفظ سے ہی یہاں یَتَزَکّٰی کا لفظ آیا ہے۔ یہ قرآنِ کریم میں نشو ونما کے معنوں سے ہی تو ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ زکوٰۃ آیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہے کہ اگر سال بھر اتنا پیسہ جمع ہو جائے تو اس کے اوپر اتنا نصاب ہے۔ آپ اس میں سے اتنا نکال کے دے دیجیے۔ یہ آپ کے ہاں کی فقہ کی زکوٰۃ ہے۔ قرآن میں زکوٰۃ کے معنی ہی سامانِ نشو ونما کے ہیں اور قرآنِ کریم تو اسے اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیتا ہے مگر ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو اسلامی بنالو یعنی انفرادی طور پر بانٹنے کی بجائے حکومت لوگوں سے وصول کرے' قرآن کہتا ہے کہ

---

[1] یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عندالضرورت اپنا سب کچھ (مالہ) نوعِ انسانی کی نشو ونما (Nourishment) کے لیے دے دیتے ہیں' اور اس طرح ان کی اپنی ذات (Personality) کی بھی نشو ونما ہو جاتی ہے (9:111)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1458)۔

حکومت یا مملکت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہے کہ وہ زکوٰۃ دے۔

مملکت اسلامیہ اور دوسری مملکتوں میں ایک بنیادی فرق ہے

کوئی اس آیت (92:18) کو نہیں دیکھتا کہ صاحب! وہ تو قرآنِ کریم میں یہ لکھا ہوا ہے کہ زکوٰۃ حکومت دے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے؟ یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ بڑی بلند چیز ہے۔ دنیا کی مملکتیں حکومتیں اس لیے وجود میں آتی ہیں کہ دوسروں سے لیتی چلی جائیں مگر یہ اسلامی مملکت اس لیے وجود میں آتی ہے کہ وہ سامانِ نشوونما دیتی چلی جائے تاکہ اس کے افراد کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ دنیا کے مملکتوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ فلاں نے انکم ٹیکس نہیں دیا' فلاں ٹیکس نہیں دیا اور انکوائریاں کرواور یہ کچھ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے وہ انکم ٹیکس نہیں دیتا۔ اور اس کے برعکس قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ یہ عام دنیوی مملکتوں کے افراد کی طرح کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں دینے سے ان کے دل کی کشادگی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟

ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے دو مختلف میدانوں کی نوعیت

یہ سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لیے دینا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ **اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ** (23:60) ان کا ہر قدم اس راستے کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے جو خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ **اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ** [1] (23:61)۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ انسانوں کے اندر ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہونا چاہیے لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایک تو میدان وہ ہے جس میں انسان کی کیفیت یہ ہے کہ **اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ** [2] (102:1-2)۔ ایک مکان بنالیا ہے تو اس کے بعد یہ ہے کہ اچھا' اس نے ایک اور مکان بنایا' اور میں دو اور مکان بناؤں گا۔ اس کی چار

---

[1] یہ ہیں وہ لوگ جو زندگی کی خوشگواریوں کے حصول کے لیے تیز گام رہتے ہیں' اور یہی ہیں جو شاہراہِ حیات پر سب سے آگے نکل جانے والے ہیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 783)۔

[2] تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں انسانیت کی صحیح منزلِ مقصود کی طرف سے یکسر غافل کر دیتی ہے؟ وہ چیز ہے مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس (57:20; 83:26)۔ اگر تم اپنی طلب کو' اپنی ضروریات پورا کرنے تک محدود رکھو تو اس کی ایک حد (Limit) ہو گی لیکن جب جذبہ محرکہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا ہو' تو اس کی کوئی حد (Limit) ہی نہیں ہو سکتی۔ اس جذبہ کے ماتحت کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ' اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1478)۔ ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006' سورۃ التکاثر۔

کوٹھیاں ہیں اور کتنا بڑا بینک بیلنس ہے۔ اس میں اتنا اور آ جائے گا۔ ایک موٹر آئی ہے' دو اور آ جائیں گی۔ دیکھتا ہے کہ اس نے وہ ماڈل (Model) منگوایا ہے' اس سے بھی جو Latest (جدید ترین) ہے وہ آ جائے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے' یہ ہونا چاہیے۔ انسان کی سعی و کاوش یہی ہے۔ قرآن اِسے Competition (مقابلہ) کہتا ہے لیکن کہتا یہ ہے کہ ہم تمہیں ایک دوسرا میدان بتا دیتے ہیں' تمہارا جذبہ وہاں Satisfy (پورا) ہو جائے گا۔ یہ لوگ یہ سارا کچھ لینے کے اندر ایک دوسرے سے مسابقت ❶ رکھتے ہیں کہ اِس سے زیادہ لے لوں' اس سے زیادہ لے لوں۔ سنو! تم دینے کے اندر ایک دوسرے سے مسابقت کیوں نہیں کرتے۔ بڑھنا ہی تو ہے اس میدان میں ایک دوسرے سے' بڑھو اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ** (23:61) دوسروں پہ سبقت لے جانا چاہتے ہو تو یہ جو دوسروں کو دینے کا کام ہے ان کے اندر سبقت لے کر جاؤ۔ قرآنِ کریم نے یہاں یسارعون کہا ہے۔ اس کے معنی ہی دوڑ کے ہوتے ہیں' اس کے اندر' جسے آج ہم Race کہتے ہیں' وہ ہوا کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تیزی سے بھاگنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ہم تم کو ایک دوسرا میدان دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں لفظ ''وسعت'' کی حدود کا تعین

دوسروں کو دینے کے لیے' مسابقت کا میدان دینے کے بعد کہا کہ ایک اگلی چیز یہ ہے کہ **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** ❷ (6:153)۔ ان الفاظ میں یہ جملہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات ❸ پر آتا ہے۔ اس کا عام ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلّف نہیں ٹھہراتا۔ یعنی خدا کسی پہ کوئی ذمہ داری اس کی وسعت سے زیادہ نہیں ڈالتا۔ یہ جو اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ او بھئی! کچھ اور بھی نہیں ''میں تے ایناں ای جوگا ہیگا۔'' ❹ اپنی وسعت کو خود طے کر لیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ صاحب! اس سے زیادہ اور کیا دوں' خدا نے خود کہا ہے کہ **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (23:62) اس کی وسعت سے زیادہ ہم اس کے اوپر بار ہی نہیں ڈالتے' تو ذمہ داری نہیں آتی۔ میں جو کہتا ہوں کہ میری اتنی وسعت ہے' اس سے زیادہ کیسے دوں۔ اس سے زیادہ وہ مانتا نہیں۔ یعنی وسعت ہم اپنی آپ متعین کر لیتے ہیں۔ تو پھر سیدھی سی بات ہے کہ ٹھیک ہے جی! ''اینی وسعت انی ای ہیگی اے۔'' ❺

---

❶ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا' سبقت لے جانا۔

❷ ہمارے احکام اور قوانین کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 331)۔

❸ یہ ان تین مقامات پر آیا ہے: (6:153; 7:42; 23:62)

❹ میں تو اسی لائق ہوں۔

❺ اتنی وسعت بس اتنی سی ہی ہے۔

اتنی استطاعت ہے اس سے زیادہ کوئی ہے نہیں اور یہ آیت آ گئی۔ یہ دیئے جانے کی بات تو کچھ اور ہی ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تو واقعی بہت بڑی ذمہ داری' فریضہ عائد کر رہا ہے' خدا پابندیاں عائد کر رہا ہے کہ اس قسم کا مال اور یہ رزقِ حلال لو رزقِ حرام نہ لو' حلال میں سے طیب لو' طیب میں سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ دو' پابندی پہ پابندی پہ پابندی ہے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر یہ پابندیاں گراں نہیں گزرتیں۔ یہ جانتے ہیں اور اس کی وہ مثال ہے کہ جب کبھی ہمیں کسی نہر کی رفتار سست لگتی ہے تو اس کے آگے ایک ٹھوکر (Fall) بنا دیتے ہیں۔ جس زمانے میں نہر ذرا خشک ہوا اور وہ وہاں پتھر رکھ کے بنا رہے ہوں تو آپ سب یہ کہیں گے کہ شاید یہ تو نہر بند کرنے لگے ہیں۔ نہر کے آگے بند بنا دینا ہے قرآن کہتا ہے کہ جن پابندیوں کو تم سمجھتے ہو کہ یہ نہر میں بند لگا دیا ہے' یہ تو تمہاری روانی میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ہم یہ بند لگاتے ہیں: **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (23:62) جو پابندی بھی کسی کے اوپر عائد کی جاتی ہے وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی رفتار میں وسعت پیدا ہو جائے اس لیے یہاں **يُسَارِعُوْنَ** (23:61) کہا تھا کہ یہ ایک ریس (Race) ہے۔ تم خیرات کے کاموں میں' یعنی اچھے کاموں میں' تعمیری امور میں' ایک دوسرے کے بالمقابل بھاگ رہے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کہیں کہیں دیکھتے ہیں کہ کچھ پابندی بھی ہے' ٹھوکر بھی ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ اسے پابندی نہ سمجھو' یہ تو رفتار میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ایک بند لگایا ہے' ٹھوکر لگائی ہے۔ اب جتنے احکاماتِ خداوندی ہوئے' یا پابندیاں یا فرائض یا واجبات ہوئے جب ان کے متعلق یہ تصور ہوا کہ یہ چیز تو میری رفتار کو تیز کرنے کے لیے ہے' نہ کہ میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے' تو آپ دیکھیے کہ آپ کس تیزی سے اس کی طرف جاتے ہیں اور آپ اِسے کیسے حسن کارانہ انداز سے پھاند جاتے ہیں' رفتار میں تیزی ہو جاتی ہے کیونکہ انسان جانتا ہے کہ **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (23:62) یہ پابندیاں میری وسعتوں میں اور زیادہ تیزی پیدا کرنے کے لیے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ باتیں وہ نہیں ہیں جو بظاہر نظر آتی ہیں۔ یہ تو وسعت پیدا کر کے عمل میں اور زیادہ تیزی کا باعث بنتی ہیں۔

عزیزانِ من! میں نے یہی عرض کیا ہے کہ **لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** [1] (6:153) میں دیکھیے لفظ نکلف آیا ہے' ہمارے ہاں اس نُكَلِّفُ سے یہ لفظ تکلیف نکلا ہوا ہے یعنی کسی کو تکلیف دینا۔ آپ جانتے ہیں کہ خواہ یہ خدا ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو یہ کسی کو تکلیف دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر خدا کا یہ ڈر اور خوف کا تصور نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ خوف اور ڈر کے اس تصور کے مارے آپ

---

[1] امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا' انسان پر جو پابندیاں عاید کرتا ہے تو وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشاد پیدا ہو یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں ہوتیں' بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہیں' جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ (حوالہ: لغات القرآن جلد سوم 1966ء ص۔ 1451)

یہ کچھ کرتے ہیں کہ صبح ہی اس نے تہجد کے لیے بھی کہا ہے' پھر اس کے بعد یعنی تہجد میں تو بہر حال چار بجے ہی آپ کے ہاں فجر کی اذان ہو رہی ہے۔ سردیوں کا موسم ہے۔ ٹھنڈا پانی ہے۔ اس سے وضو کر رہے ہیں۔ نہانا بھی ہوتا ہے۔ ابھی سوئے تھے' پھر اس کے بعد رات کو عشاء بھی ہے۔ تراویح ہیں۔ سارا دن کا روزہ ہے۔ پھر یہ دینا بھی ہے۔ یعنی آپ دیکھتے ہیں کہ اگر یہ خوف اور ڈر سے ہو' تو یہ تو ہر چیز دیکھتے ہیں کہ آپ کو کس قدر تکلیف دینے والی ہے۔ یہ مشقتیں ہیں۔ اس کا ترجمہ ہی مشقت کیا جاتا ہے۔ وہ مشقتوں میں ڈال رہا ہے۔ یہ ہے تو شعر' ذرا فراز کے شعر میں شوخی ہوا کرتی ہے۔ یہ ہے تو چھوٹی سی بات مگر بات بڑی پتے کی کہہ گیا ہے۔ انہی میں سے اس نے کسی کو دیکھا تو بے ساختہ زبان سے یہ نکلا:

مر رہے ہیں نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں
(فراز)

ان کو مشقت سمجھنا اور مشقت سمجھ کر یہ کچھ کرنا' اور ڈر کے مارے یہ کچھ کہنا' تو ٹھیک کہا اس نے کہ ''ایسی جنت گئی جہنم میں۔''

عزیزانِ من! اس آیت میں کہا کہ یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے' اسے ذہن نشین کر لو۔ اس سے کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں' اس سے تمہارے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اب مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو ان الفاظ کے وہ معنی بھی نہیں رہے۔ اب یہاں عربی زبان میں خیرات کا لفظ آیا ہے۔ آپ کے ہاں خیرات کے معنی کا تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ بخشش ہے اور سب سے زیادہ ذلیل کرنے والی چیز ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ عربی زبان کی رو سے خیر کی جمع خیرات بھی آئی ہے۔ خیر اور اختیار کا تو ایک ہی مادہ ہے۔ ''وسعہا'' ہر وہ عمل ہے جس سے تمہارے اختیارات میں وسعت پیدا ہو۔ اسے نیکی کہتے ہیں۔ ہم نے نیکی ترجمہ کیا اور اپنے ذہن میں ہی پھر سمجھ لیا کہ نیک کام کیا ہے۔ آپ نے اپنے ذہن میں سمجھ لیا' ہندو نے اپنے ذہن میں سمجھ لیا' صبح سویرے اٹھ کر چلے آ رہے ہیں۔ اب تو یہاں ہندو ہوتا نہیں۔ ہم نے ان کے ہاں وہ دیکھے تھے جو پن ❶ کرنے والے ہیں' آٹا لیا ہوا ہے چلے جا رہے ہیں' چیونٹے نکل آتے ہیں۔ برسات میں زیادہ نکلتے ہیں' بہت زیادہ ہوتے ہیں' تو وہ ایک چٹکی آٹے کی لی اور اُن کے آگے ڈال دی' کچھ آٹے کی چٹکی تو روز چڑیاں دے چوگے واسطے رکھ دیندے نیں۔ ❷ گھوڑوں کی پانی پلانے کی سبیلیں تو یہاں ان کے زمانے کی آپ نے ابھی تک دیکھی ہوں گی اگرچہ اب وہ کھنڈرات ہو گئے۔ ''بندیاں نوں پانی لبدا نہیں' گھوڑیاں نوں کتھوں لبھے گا۔'' ❸

---

❶ خیرات' صدقہ۔ نیک کام۔
❷ آٹے کی مٹھی تو روزانہ چڑیوں کے چوگے کے لیے رکھ دیتے ہیں۔
❸ اب تو انسانوں کو پانی نصیب نہیں ہوتا گھوڑوں کو کہاں ملے گا!

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

وہ گائے بھینسوں کے لیے اتنے اتنے بڑے نمک کے ڈلے رکھ دیتے تھے۔ اپنے ہاں یہ صبح ہی صبح سارا پن کا کام کرکے' خیرات کرکے بیٹھ جاتے تھے اور پھر کاروبار کے لحاظ سے جو بھی ان کے پاس آتا تھا اس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے تھے۔ اے کاروباری گل ہوئی ناجی! پن دی گل تے ہوگئی۔ [1] جب سویرے سویرے آپ کہیں گے کہ پن کا' نیکی کا کام کرو۔ یہ پن کا کام کچھ نیکی نہیں ہے۔ یہ تو الفاظ ہی عجیب ہیں۔ قرآنِ کریم میں تو نیکی کے لیے لفظ ''خیر'' آیا ہوا ہے اور خیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ جہاں تمہارے اختیارات میں وسعتوں کا اظہار ہو اس لیے **لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا** (23:62)۔ اب اس کے معنی سمجھ میں آئے جب خیرات (23:61) کا لفظ پہلے آیا۔ کہا کہ یہ چیزیں جو ہم کہہ رہے ہیں' تم انہیں اب یونہی نہ سمجھ لینا کہ خیر یہ کچھ ایسا ڈر کے مارے کرارہے ہیں۔ یہ وہ بات نہیں' بالکل نہیں ہے۔ یہ وہ یقین محکم ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ' نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے میں بھی' اپنے دل میں گرانی محسوس نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور وہ بالکل صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ **وَ لَدَیۡنَا کِتٰبٌ** (23:62)۔ ہم نے تو تمہارا اکاؤنٹ کھول رکھا ہے' ہمارے پاس قانونِ مکافات کا رجسٹر ہے جس میں ہر ایک کے اعمال کا ریکارڈ رہتا ہے اور **یَنۡطِقُ بِالۡحَقِّ** (23:62) اس کی کوئی انٹری غلط نہیں ہوتی اور ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ **وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ** (23:62) کسی میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی' کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی ہو۔ ظلم کے معنی کمی کے ہوتے ہیں' اسے ہی ہم زیادتی کرنا' کسی کے حق میں کمی کردینا کہتے ہیں' جیسا یہ کہا جائے کہ اس پر بڑی زیادتی ہوئی' ان کے ہاں کا یہ عجیب لفظ ہے۔ میں نے جیسے بتایا ہوا ہے کہ ظلم کے معنی ہوتا ہے جس شے کو جہاں اور جیسے ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو اور ویسے نہ ہو' وہ ظلم ہوتا ہے۔ کوئی نااہل ہو' کسی کو اس کے اوپر آپ لگا دیں' یہ بھی ظلم ہے۔ اہل کو وہاں نہ لگائیں کسی دوسری جگہ لگا دیں' وہ بھی ظلم ہے۔ ان کے ہاں کے یہ عجیب لفظ تھے۔ کہا کہ **وَ لَدَیۡنَا کِتٰبٌ یَّنۡطِقُ بِالۡحَقِّ** (23:62) ہمارے پاس رجسٹر ہے' آپ کے پاس بھی رجسٹر ہے۔ [2] وہ سمجھانے کے انداز میں یہ کہتا ہے کہ

---

[1] جیٔ یہ تو کاروباری بات ہوئی۔ نیکی کی بات تو (صبح) ہوگئی تھی۔
[2] یعنی مرزا اسد اللہ خان غالب (1869-1797ء)

پکڑتے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یعنی اوجیہڑے لکھن والے نے اسی اوناں نوں دیکھدے وی نئیں ہیگے۔ اوآپے ای کچھ لکھ لیندے نیں، آپے تیرے کول اوناں نے پیش کر دتا، آپے ای فردِ جرم لا دتی تو یہ تو ساڈا بندا نئیں سی"❶۔ اس نے کہا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی **وَ لَدَیۡنَا کِتٰبٌ یَّنۡطِقُ بِالۡحَقِّ** (23:62) تہاڈے کسے بندے دے او تھے نال لاگے ہون دی ضرورت نہیں سی۔ جیہڑی اے کتاب ہیگی۔ اے یہ یہ نہیں ہے کہ یہ بینک والے مینجر نے اپنے ہاں تمہارے اکاؤنٹ کا رجسٹر کہیں بند کر کے رکھا ہوا ہے تمہیں پتہ ہی نہیں چلے کہ اس میں یہ کیا ہے اکاؤنٹ کا رجسٹر (17:13)۔ اے نامہ اعمال آ❷۔

ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہوگا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **وَ کُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیۡ عُنُقِهٖ** (17:13) یہ دستاویز، اس کا یہ اعمالنامہ، ہر انسان کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ پہلے زمانے میں جو دستاویز ہوتی تھی۔ اس کو یوں لپیٹ لیتے تھے اور وہ لپیٹ کی نالیاں تو ہمارے ہاں ٹین کی بنائی ہوئی تھیں، ان میں محفوظ رکھنے کے لیے ڈال دیتے تھے، یوں نہیں رکھ دیتے تھے، وہ لپٹی ہوئی ہوتی تھی۔ ہر انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہے۔ اب جسے آپ حساب کتاب کا دن، قیامت کا دن، کہتے ہیں، اس دن بات اتنی ہی ہوگی کہ **وَ نُخۡرِجُ لَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلۡقٰهُ مَنۡشُوۡرًا** (17:13) یہاں وہ دستاویز لپٹی ہوئی ہے وہاں کھول دی جائے گی۔ بس، اب کھولنے کے بعد کیا کہا جائے گا کہ یہ کھل گئی، تو دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں ہے **اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ** (17:13) آپ ہی اپنا اعمالنامہ پڑھ، اچھا جی! پڑھ دیا۔ میں نے یہ سرا کچھ دیکھ لیا، اِدھر اور اُدھر Debit (ادا کردہ رقم) اور Credit (جمع کرائی گئی رقم) میں کیا چیزیں ہیں دیکھ لیں پھر اس کے بعد کیا کوئی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ آئے گا جو آگے بتائے گا کہ صاحب! اس میں کتنا نفع یا نقصان ہوا۔ کہنے لگے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اب **کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا** (17:14) آپ ہی حساب کر لو۔ اپنا لکھا ہوا، جو گردن میں لپٹائے ہوئے پھر رہا تھا، اس کو ہم نے کھول کے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ بس اتنا ہی کیا ہے۔ پھر تم سے خود کہا ہے کہ پڑھ لو اور تم ہی سے کہا ہے کہ اپنا حساب تم ہی کر لو۔

---

❶ وہ جو (نامہ اعمال) لکھنے والے ہیں ہم تو انہیں دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ وہ خود ہی لکھ لیتے ہیں، خود ہی تمہارے سامنے پیش کر دیا، خود ہی فردِ جرم عائد کر دی، یہ تو ہمارا بندا نہیں تھا۔

❷ تمہارے کسی بندے کے وہاں ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جو کتاب ہے یہ وہ عام کتاب نہیں ہے جیسے کہ تمہارے ہاں بنک منیجر نے تمہارے اکاؤنٹ کا رجسٹر کہیں بند کر کے رکھا ہوا تھا اور تمہیں اس کا علم ہی نہیں کہ یہ اکاؤنٹ کا رجسٹر کیا ہے (17:13)۔ یہ تو نامہ اعمال ہے۔

واہ! اب یہاں کہا ہے کہ وَ لَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (23:62) یہ ہے وہ حساب کا رجسٹر جسے ہم نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ سچی بات کہتا ہے' غلط بات نہیں کہتا۔ اب حساب میں کسی سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ آپ اپنا حساب لکھا ہوا خود ہی پڑھیں' خود ہی حساب کریں پھر کہا: بات تو ایسی نہیں جو سمجھ میں نہ آئے بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَ لَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ❶ (23:63) لیکن تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ یہ خود ہی ان تاریکیوں کے اندر ڈوبے ہوئے رہنا چاہتے ہیں اور اسی لیے یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں' اس کے خلاف کرتے ہیں جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پوچھنے والا نہیں۔

معاشرے کے مترفین کا انجام

آگے بڑی عجیب آیت آ رہی ہے' عزیزانِ من! سمجھتے ہیں کہ پوچھنے والا کوئی نہیں اور وہ اسی قسم کا کام کرتے رہیں گے حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ ❷ (23:64)۔ آپ کو یاد ہے کہ انبیائے سابقہ میں کے سلسلے میں اَلْمَلَؤُا الَّذِيْنَ (23:24) آیا تھا۔ اس میں لفظ ''اَلْمَلَؤُا'' ❸ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوتے ہیں انہیں ''اَلْمَلَؤُا'' کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے مترف کا لفظ بھی ان کے لیے استعمال کیا ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب قوم پہ عذاب یعنی تباہی آتی ہے تو سب سے پہلے یہ جو مترفین تھے ان کو پکڑا جاتا ہے اور کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ (23:64) وہ بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ جب ان کی گرفت ہوتی ہے تو چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں' رونے پیٹنے لگ جاتے ہیں۔ صاحب! ان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ قف اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ (23:65) آج اس گڑگڑانے اور رونے اور چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس سے بہت پہلے تمہیں کہتے رہے کہ یہ جو کچھ کر رہے ہو اس کے متعلق سوچو کہ یہ تمہیں کہاں لے جا رہا ہے' تم سرکشی کرتے چلے گئے۔ اب جو وہ نتائج برآمد ہونے کا وقت آ گیا ہے' اس وقت تمہارے لیے کون کچھ کر سکتا ہے؟ اب تو ہم بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ تمہیں اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔

---

❶ لیکن ان مخالفین کے دل اس حقیقت کی طرف سے یکسر غافل ہیں۔ یہ اپنی مفاد پرستیوں کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایسے کام کرتے ہیں جو صحیح روشِ زندگی سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ اور یہ اسی قسم کے کام کرتے رہیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 184)۔

❷ تا آنکہ ہم ان کے مرفہ الحال' سہولت پسند' سرمایہ دار طبقہ کو عذاب میں گرفتار کر لیں گے (23:33)۔ اُس وقت تم دیکھو گے کہ ان کا تکبر کس طرح ٹوٹتا ہے اور وہ کیسے چیختے چلاتے' اور آہ و زاری کرتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 784)۔

❸ وہ جن کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں بھری ہوئی ہوں' جن کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں' مالدار لوگ (تاج العروس) مِلْءٌ وہ مقدار جس سے کوئی چیز بھر جائے (تاج العروس) (پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔ 1554)۔

انجامِ کار کے سلسلہ میں قرآن کا محاکاتی[1] انداز

قرآن کہتا ہے کہ یہ جو اس قبیل کے لوگ ہیں وہ پھر اس ظہورِ نتائج کے وقت چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں۔ قرآن میں بڑے محاکاتی انداز میں اس چیز کو بیان کیا ہے۔ دوسری طرف ڈرامائی انداز ہوتا ہے۔ قرآن کا محاکاتی انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک منظر سامنے لاتا ہے مثلاً وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (21:11) آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ بستیاں جن کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں کے اوپر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں' کیسے تباہ ہوئیں۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ اپنے ان خلافِ قانونِ خداوندی کاموں کے اندر پڑتے چلے جاتے تھے۔ ہم انہیں کہتے تھے' ان کی طرف انبیاء بھیجتے تھے' قانون بتانے والے ان کی طرف آتے تھے' بتاتے تھے کہ اس کا نتیجہ یہ کچھ ہوگا' انہیں اس کا احساس تک نہیں تھا۔ کہا کہ یہ نہیں ہے کہ اس دوران ہمارا قانونِ مکافات غافل بیٹھا ہوا تھا' وہ کچھ نہیں کر رہا تھا۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ نتائج مرتب کیے چلا جا رہا تھا اور وہ Slow Poisoning (سست روز ہر) والی بات تھی کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں بھی جا کے کہیے کہ ڈاکٹر صاحب! رات اچھا بھلا سویا تھا صبح اٹھا تو یہ حالت ہے کہ یہاں اتنا سخت درد بتا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ رات ہی رات میں کچھ ہو گیا۔ کل تک اچھا بھلا تھا' لیکن ڈاکٹر یہ بتاتے ہیں کہ یہ رات ہی رات میں کچھ نہیں ہو گیا۔ یہ تو اس سے بہت پہلے کی بات ہے جب اس کو درد کا Attack (حملہ) ہوا تھا۔ اس کے لیے تم لوگ پہلے کیوں نہ آ گئے۔ کہا کہ جی' کچھ محسوس ہی نہیں کیا۔ انسان محسوس اس وقت کرتا ہے جب وہ آخری وقت آنے لگتا ہے۔ اس وقت پھر جب وہ درد اٹھتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے۔

ظہورِ نتائج کے موقع پر انسان کی نفسیاتی کیفیت

عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں یہ تھا کہ نہیں' کوئی خرابی کی بات نہیں۔ مگر اُن کی غلط روش کے نتائج' غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ[2] (21:12)۔ وہ تباہی جو تھی' جب ان کو اس کا احساس ہوا کہ آ رہی ہے' اور معلوم ہوا کہ باہر سپاہی بھی پھر رہے ہیں' مخبر نے انہیں بتایا کہ تمہارے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں' تو اس چیز کا احساس ہوا پھر اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12)

---

[1] باہمی بات چیت کا۔ باہمی داستان گوئی کا۔

[2] جب ان کے غلط اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آ گئے۔

اس وقت وہ بھاگ اٹھے۔ ان کا پہلا Reaction (ردِّ عمل) بھاگ اٹھنے کا تھا گویا وہ اس سے بچ جائیں گے۔ وہ بھاگ اٹھے۔ یہاں کہا کہ وہ بھاگے جا رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ کوئی پیچھا کرنے والا نہیں ہے۔ کیا بات ہے! کہا کہ لَا تَرۡكُضُوۡا (21:13) وہ بھاگے جا رہے تھے تو پیچھے سے ہمارے قانونِ مکافات کے سپاہیوں نے آواز دی کہ کھڑے ہو جاؤ مت بھاگو۔ وَ ارۡجِعُوۡۤا اِلٰی مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ وَ مَسٰكِنِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ (21:13) [1]۔ دیکھیے عزیزانِ من! کیا محاکاتی انداز ہے! کہا کہ وَ ارۡجِعُوۡۤا (21:13) واپس آؤ اِلٰی مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِيۡهِ (21:13) آؤ واپس۔ وہ سارا کچھ جو تم نے لوگوں کی محنتوں کی کمائی کا استحصال کر کے اپنے لیے الگ رکھا ہے، آؤ اس کی طرف، ان چیزوں کو دیکھو وَ مَسٰكِنِكُمۡ (21:13) اور بڑے بڑے محلات جو اس دوران تعمیر کر لیے تھے آؤ ان کی طرف، چلو واپس۔ کا ہے کے لیے واپس آؤ؟ لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ (21:13) تا کہ تم سے کچھ پوچھا جائے کہ یہ کہاں سے دولت لی ہے، یہ اتنے ہی دنوں کے اندر کیسے حاصل کی، یہ ماربل (سنگِ مرمر) کا اتنا بڑا گھر کیسے بن گیا، تمہارے پاس تو مکان کا کرایہ دینے کے لیے بھی نہیں ہوتا تھا اور سارا راز اس لَعَلَّكُمۡ میں ہے۔ عزیزانِ من! کہ اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ نشۂ اقتدار میں یہ جس قدر ذہن میں بدمستیاں ہوتی ہیں کہ ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا ورنہ اگر پوچھنے والے کا یہ احساس ہو تو پھر وہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ اسے آج کی اصطلاح میں Accountability (جوابدہی) کہتے ہیں۔ یہ جو آپ کے ہاں کے ماتحت (Sub-ordinates) ہوتے ہیں ان کے متعلق تو یہ ہوتا ہے کہ ہاں صاحب! انہوں نے اپنا اکاؤنٹ Render (چلانا) کرنا ہے۔

اسلامی مملکت اور ملوکیت میں ایک بنیادی فرق

اس وقت ساری دنیا میں جو نظام رائج ہے اس میں یہ ایک ایسا مقام Accountable to none (کسی کے آگے جوابدہ نہیں) رکھ لیتے ہیں کہ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ اسے Sovereign authority یا Sovereignty کہتے ہیں۔ اس کی Definition [2] (تعریف) یہ ہے کہ وہ Accountable to none (کسی کے آگے جوابدہ نہیں) ہے۔ دیکھیے قرآنِ کریم اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے ابھی کہا کہ لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ (21:13) تا کہ تم سے پوچھا جائے۔ عزیزانِ من! یہ جسے آپ نظامِ اسلامی کہتے ہیں یا

---

1. مت بھاگو۔ اب الٹے پاؤں انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کیے تھیں) اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنایا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (102:8) (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 729)۔
2. Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ) کی Definition (تعریف) یوں کی گئی ہے:

The power to do all things without accountability, (Robert Lansing: Notes on sovereignty, p.3, Quoted by Jacques, in "Man and the State"P.51).

جسے اسلامی مملکت کا نظام کہتے ہیں اور جس کے لیے کہتے ہیں کہ پتہ نہیں اس کے لیے کتنی کتابیں لکھنی پڑیں گی اور اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں قرآنِ حکیم نے تو اسے ایک آیت کے چار الفاظ میں بتا دیا کہ جسے آپ نظامِ اسلامی کہتے ہیں' حکومت کا نظام کہتے ہیں' وہ ہوتا کیا ہے؟ یہاں کہا تھا کہ آؤ تاکہ تم سے پوچھا جائے۔ یہ Accountability (جوابدہی) ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر قرآن کہتا ہے کہ یاد رکھو! **لَا يُسْـئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ** ❶ (21:23) دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے' کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو Accountability (جوابدہی) سے Above (ماورا) ہو جائے صرف خدا کی ذات ہے کہ جس سے پوچھا نہیں جا سکتا۔ یہ نظامِ خداوندی یعنی اسلامی مملکت کی چار لفظوں میں ساری بات ہو گئی۔ اگر آپ کسی نظام میں بھی کہیں رک کر یہ کہہ دیں کہ یہ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) ہو گئی تو اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ جو فیصلے کرتا ہے' جو قانون بناتا ہے' جو حکم دیتا ہے اس سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ یہ چیز غیر اسلامی ہو گئی خلافِ اسلام ہو گئی۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **لَا يُسْـئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ** (21:23)۔ انسانوں میں کوئی ایسا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا قرآنِ حکیم کا کہنا یہ ہے کہ Accountable (جواب دہ) نہ ہونا تو صرف خدا کے لیے ہے: **لَا يُسْـئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ** (21:23) وہ Accountable (جواب دہ) نہیں ہے۔ یہ جملہ آپ کے ہاں آئین پاکستان میں آیا ہوا تھا کہ Sovereignty belongs to Allah (اقتدارِ مطلق خدا کو حاصل ہے) لیکن خدا کا وہ اقتدارِ مطلق In the Universe (کائنات میں) ہے۔ یہ وہ ہے جو بقول سعدیؒ مکان کی تقسیم میں چھوٹے بھائی کو دے رہا تھا کہ تمہارا حصہ خدا کی دنیا کے اندر' چھت سے لے کر آسمان تک' ہے۔ کائنات کے اندر جو Sovereignty ہے وہ خدا کی ہے اور ہماری دنیا میں ہماری ہے۔ وہ تو آپ جانتے ہیں کہ صاحب مملکت کو Sovereign (صاحب اقتدارِ اعلیٰ) ہونا چاہیے **لَا يُسْـئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ** (21:23) اور **وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ** (21:23) کے متعلق کہا ہے کہ تم جو کچھ کرتے تھے' اس وقت ذہن میں یہ تھا کہ ہم اس مقام پر ہیں جو Accountable to none (کسی کے آگے جوابدہ نہیں) ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے قانون بھی ایسا بنا دیا تھا لیکن خود قانون بنا دینے سے تو ایسی بات نہیں ہو جاتی۔ اگر یہ کچھ کرنا ہے تو دنیا میں سیکولر نظام ہی ایسا ہوتا ہے۔ سیکولر نظام کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی ایسا مقام ہوتا ہے جو Accountable to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہیں) ہوتا ہے یہ Final authority ہے۔ یہاں اسلامی نظام میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں فائنل اتھارٹی ہے یعنی وہ اتھارٹی جو آگے Accountable (جواب دہ) نہیں ہے۔ وہ صرف خدا ہے۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ یہ محض ایک ذہنی یا اعتقادی

---

❶ اُس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اُس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں ایسا بنایا ہے اور اس کے لیے اس قسم کے قوانین کیوں نافذ کیے ہیں۔ اس کے برعکس' اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جداگانہ نظامِ زندگی کیوں وضع کر رکھا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔731-732)۔

بات ہے کہ ہاں صاحب! ہم نے یہ کہہ دیا کہ وہ خدا ہے بس مان لیا ہم نے کہ جی خدا ہے بس اب اس کے بعد Sovereign state تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہاں تو قرآن نے کہا ہے کہ **وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** ❶ (5:44)۔ ہماری Sovereignty (اقتدارِ مطلق) وہ ہے جو ہم نے تم کو قانون دیا ہے آئین دیا ہے جس کو اب کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہے ہماری Sovereignty (اقتدارِ مطلق)۔

Accountability (جواب دہی) کا ذریعہ صرف قرآنِ حکیم ہے

ہمارا وہ آئین جس کے بنانے میں کسی کے آگے Accountable (جواب دہ) نہیں ہیں اب جو اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا **اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) ان کو کافر کہتے ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ وہ ہے جہاں کوئی انسان بھی ایسے مقام پہ رکھ دیا جائے کہ وہ Accountable to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو) ہو جائے اور ایک Accountability (جواب دہی) وہ ہے جو اللہ کی طرف ہے وہ ذہنی اور اعتقادی نہیں ہے وہ عملاً ہے اس کتاب کے مطابق پوچھا جا سکتا ہے اور یہی چیز تھی جو واقعی قائم کی۔ یہ وہ نظام ہے جو ایک ایک فقرے میں بات بتا دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ (581-44/45AD) سے پوچھا گیا کہ صاحب! یہ جسے آپ استخلاف یا خلافت کہتے ہیں حکومت کہتے ہیں نظامِ اسلامی کہتے ہیں خدا کی حکومت کہتے ہیں اسلام کہتے ہیں یہ کیا ہے؟ جواب یہ تھا کہ ''کہاں سے لیا تھا اور کہاں دیا تھا۔''

ہر کسی کو خدا کے ہاں یہ جواب دینا ہوگا کہ کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا

عزیزانِ من! حضرت عمرؓ (581-44/45AD) کا کہنا یہ تھا کہ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں جا کر اس کا جواب دینا ہے کہ ''کہاں سے لیا تھا اور کہاں دیا تھا'' تو میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اتنا سمجھتا ہے وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ دنیاوی حکومت میں اور اس حکومت میں فرق اتنا ہی ہے کہ جہاں صاحب اقتدار کو اس کے ہاں جا کے یہ بتانا پڑے کہ کہاں سے لیا تھا اور کہاں دیا تھا۔ کہا کہ آؤ تم سے پوچھیں کہ تم نے یہ سب کہاں سے حاصل کیا؟ **قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ** (21:14)۔ یہ اس وقت اقرار کریں گے کہ ہاں صاحب! زیادتی ہوئی ہے دھاندلی ہوئی ہے واقعی ہم نے یہ کچھ کیا تھا۔ وہ یہ اس وقت پکارتے چلے جائیں گے لیکن اس وقت اس پکار کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا تا آنکہ وہ قوم واقعی ان چیزوں سے باز نہ آ جائے۔ اس انجام کے لیے دو الفاظ ہیں اور وہ یہ کہ اس قوم کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح بجھے ہوئے شعلے کی طرح ہو جاتی ہے۔ وہ

---

❶ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے وہ کافر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 255)۔

دو الفاظ ہیں: حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) ہائے! اس کسان کی محنت کہ وہ فصل پکنے سے پہلے ہی کوئی کاٹ کے لے جائے' وہ شعلہ کہ جو راکھ بن کے بجھ جائے اور ہوا اُسے اڑائے اڑائے پھرے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر وہ قوم اس طرح سے ہو جاتی ہے۔

ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 65 تک آ گئے۔ عزیزانِ من! 66 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

بارھواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 66 تا 75)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ
تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ
جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ
مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ
كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ
فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ
خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ
رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1977ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 66 سے ہوتا ہے: (23:66)۔

دھاندلی اور اس کی نوعیت کا انجام

سابقہ آیات میں آپ کو یاد ہوگا' بات یہاں تک چلی آ رہی تھی کہ یہ جو لوگ دھاندلی' ظلم' غصب' نہب وسلب' استحصال اور مظالم کی بنا پر بڑی ہی عیش فراوانیوں کی زندگی بسر کرتے تھے' ان سے بار بار کہا جاتا تھا کہ اس روش کا آخری نتیجہ بڑا تباہ کن ہوتا ہے لیکن یہ بات

جیسے کہا جاتا ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کے بعد قرآن نے کہا کہ پھر جب وہ نتیجہ پکے ہوئے پھل کی طرح ٹپکنے پہ آ گیا یعنی ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو پھر وہ چلانے' بھاگنے' دوڑنے لگے۔ ان کو پیچھے سے آواز دی کہ اب تم ہمارے قانونِ مکافات سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے' واپس آ ؤ اور ان محلات کی طرف چلو' ان ایوانات کی طرف' جہاں تم نے اپنے لیے یہ سارا سامان اکٹھا کیا تھا' اور چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ کہاں سے لیا تھا۔ اب تمہیں اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔

اب' عزیزانِ من! وہاں ان سے یہ کہا جائے گا کہ **قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ** (23:66) یہ بات کوئی پہلی دفعہ تم سے نہیں کہی جا رہی جو آج تم کہو کہ پہلے ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ یہ تو بار بار تم سے کہا جاتا تھا اور تم اسے سننا تک گوارا نہیں کرتے تھے کہ غلط تدبیریں کرنے والوں کی یہ تدبیریں' آخرالامر انہی پر پلٹ کر آیا کرتی ہیں' تم کسی اور کے ہاتھوں سے محکوم نہیں ہو رہے' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے بنے ہوئے جال ہیں لیکن تمہاری کیفیت یہ تھی کہ **فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ o مُسْتَكْبِرِيْنَ** (23:66-67) تم انتہائی سرکشی اور تکبر سے الٹے پاؤں چل دیتے تھے۔ تمسخر کی ہنسی' ہنس کر چل دیتے تھے: **مُسْتَكْبِرِيْنَ** (23:67) نہایت تکبر سے' رعونت سے' انانیت سے' چل دیتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے' یہ تو **بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ** (23:67) پرانے زمانے کی باتیں سنا رہا ہے۔ اس طرح سے تم پلٹ جایا کرتے تھے اور پھر **بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ** (23:67) اپنی مجلسوں میں جا کے انہیں خوش گپیوں اور داستاں سرائیوں کا موضوع بنایا کرتے تھے اور ان کے متعلق ایسا ہذیان بکتے تھے جسے کوئی شریف آدمی تک سننا گوارا نہ کرے۔ کیا بات ہے ان دو لفظوں کی!

میں نے آپ کو عرض کیا تھا کہ سامری کہتے ہیں افسانہ گو کو' داستان گو کو' باتیں بنانے والے کو' قصے گھڑنے والے اور خوش گپیاں کرنے والے کو۔ یہ ہے ''سمراً''۔ یہ لوگ اپنی مجلس میں بیٹھ کر اس کے متعلق عجیب عجیب قسم کے افسانے گھڑا کرتے تھے' خوش گپیاں اڑایا کرتے تھے' مذاق اڑایا کرتے تھے اور کیفیت یہ تھی کہ شرافت اور نجابت [1] کو بھی بالائے طاق رکھ کر وہ ایسی باتیں کرتے تھے کہ شریف آدمی تمہارے پاس بیٹھنا تک پسند نہ کرے۔ یہ کیفیت تھی تمہاری۔ اور آج تمہاری بزدلی کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس غلط روش کے نتائج' عواقب اور تباہیاں سامنے آ رہی ہیں تو تمہاری حالت یہ ہے کہ **تَهْجُرُوْنَ** [2] (23:67) چلا رہے ہو' چیخ رہے ہو' بھاگ رہے ہو۔ اگر اتنا ہی بڑا دم خم تھا تو پھر ان مصائب کا' ان مشکلات کا' سامنا کرو۔

---

[1] شرافت' اصالت

[2] ابن قتیبہ نے القرطین جلد 2' ص 49 پر هُجرٌ کے معنی ''ہذیان بکنا'' بھی لکھے ہیں۔ پرویزؒ نے صاحب تاج العروس کے حوالے سے تَهْجُرُوْنَ کے معنی ''بکواس کرنا'' لکھے ہیں۔ (لغات القرآن جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1961' ص۔ 1753)۔

اب آگے قرآن یہ بتا رہا ہے، عجیب چیزیں سامنے آ رہی ہیں، عزیزانِ من! کہ یہ کیا بات ہے کہ ان سے اتنی کھلی ہوئی چیز کہی جا رہی ہے کہ

گندم از گندم بروید جو ز جو

جس قسم کا بوؤ گے اس کا پھل کاٹنا پڑے گا، تو کیوں بات سمجھ میں نہیں آتی: اَفَلَمۡ یَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ (23:68) کیا یہ بات ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، کبھی اس پہ کھڑے ہو کر، غور و فکر ہی کرنے اور سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ اس پہ غور و فکر نہیں کرتے، تدبر نہیں کرتے، اسے Lightly (ہلکے پھلکے انداز میں) لیتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ اسے Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے۔ اس وقت جو سامنے تھے وہ زیادہ تر اہل کتاب تھے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ یَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ (23:68) اے رسول! کیا تو ان سے کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جو بالکل نئی ہے کہ انہوں نے ابھی سنی یا ان کے آباؤ اجداد نے کبھی پہلے یہ سنا ہی نہیں تھا کہ ظلم کا نتیجہ تباہی ہوا کرتا ہے؟ یہ کون سی نئی بات ہے جو تم ان سے کہہ رہے ہو؟ یہ یوں کہا گیا ہے جیسے کوئی شخص حیرت میں ہو کہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کیفیت ہے! کیا یہ اس چیز پہ کبھی غور نہیں کرتے؟ کیا یہ بالکل نئی چیزیں ہیں جو کہی جا رہی ہیں کہ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے؟ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ (6:21) ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھتی۔ کیا یہ باتیں پہلی دفعہ ان کے سامنے آئی ہیں؟ پہلی اقوام میں، خود ان کے اسلاف نے، ان کے بڑے بوڑھوں نے، یہ بات کسی نے نہیں کہی تھی!!!

حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی بطورِ شہادت سچائی کا ثبوت تھی

اَمۡ لَمۡ یَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ فَهُمۡ لَهٗ مُنۡکِرُوۡنَ (23:69) یا کیا یہ رسول، ان میں کہیں باہر سے آ گیا ہے اور اس کے متعلق انہیں کچھ پتہ نہیں، اس لیے یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید یہ کوئی فریب کار ہو؟ مگر تمہارے متعلق تو یہ بات نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے انہی میں اپنی پوری زندگی بسر کی، زمانہ قبل از نبوت انہی میں بڑھے، پھلے پھولے، پروان چڑھے، نبوت کا دعویٰ کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ اس شہادت میں، جیسا کہ کئی دفعہ یہ بات سامنے آ چکی ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک ہی چیز پیش کی اور وہ یہ کہ فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16) میں نے تو تمہارے اندر اپنی پوری عمر بسر کی ہے، میں اپنے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہنا ہی نہیں چاہتا، تم بتاؤ کہ میری پہلی چالیس سالہ زندگی تمہیں کس نتیجے پہ پہنچاتی ہے۔ اور اس کے بعد نہ تو قرآن میں اور نہ ہی تاریخ میں یہ بات ہے کہ انہوں نے کہیں بھی انگشت نمائی کی ہو، حضور ﷺ کے کسی کیریکٹر پر، سیرت پر، کچھ کہا ہو۔ جس رسول کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے اپنی عمر ان میں بسر کی ہے، وہ اپنی پہلی زندگی کو بطورِ شہادت پیش کر رہا ہے، اس کے خلاف

ایک لفظ یہ نہیں کہہ سکتے' نہ کہے ہیں۔ان کی کیفیت یہ ہے۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا؟ عزیزانِ من! یہ بڑی غور سے سننے کی بات ہے۔وہ کہتے تھے کہ یہ تو ٹھیک ہے' یہ اچھا بھلا تھا مگر اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِہٖ جِنَّۃٌ (23:70)۔کیا کیا جائے' پاگل ہو گیا ہے' اسے جنون ہو گیا ہے' پگلا پن تو ایک رات میں آ جاتا ہے' دورہ پڑ جاتا ہے' پہلے بالکل ٹھیک تھا' اب ہی کچھ پاگل سا ہو گیا ہے۔کہا کہ یہ کہہ رہے ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔کئی دفعہ یہ چیز آئی ہے: وہ کہتے تھے کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے' پاگل ہو گیا ہے۔

خودساختہ روایات پر مبنی ہماری سوچ کا معیار

ہمیں افسوس ہے کہ جو ہماری روایات ہیں' وہ ہر قسم کے امکانات کو دوسروں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے خلاف مستشرقین عام طور پہ کہا کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کو......معاذ اللہ......مرگی کے دورے پڑتے تھے اور یہ چیز آپ کی روایات پر مبنی ہے' ان میں کیفیت یہ ہے۔یہ اسے مرگی تو نہیں کہتے' البتہ کہتے یہ ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی آتی تھی تو آپ کی کچھ کیفیت ایسی ہو جایا کرتی تھی......معاذ اللہ......اب وہاں سے تو یہ چیز سامنے آ گئی' وہاں سے تو یہ سند مل جاتی ہے۔

طبعی طور پر آپ ﷺ کی یہ کیفیت کبھی نہیں تھی

عزیزانِ من! یہ کسی نے نہیں سوچا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔وہ طبعی قانون نہیں ہے کہ جسے وہ دماغ کا پاگل پن کہہ رہے ہیں۔یہ وہ پاگل پن نہیں ہے۔پھر سوال یہ ہے کہ پاگل کسے کہتے ہیں؟ آج بھی ہمارے ہاں یہ چیز ہے کہ ''او پاگل ہو گیا ایں' تینوں اپنے نقصان دا وی پتہ نہیں ہیگا۔'' ❶ یہ تھی وہ بات کہ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں رہا۔جس قومِ قریش کا یہ اتنا بڑا عظیم فرد ہے' یہ اس کے نفع نقصان کا ہی کچھ خیال نہیں کر رہا' بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے' پاگلوں جیسی باتیں کر رہا ہے' پاگل ہو گیا ہے' دیوانہ ہو گیا ہے۔یہ نئی بات نہیں ہے' ہر نبی کے ساتھ یہ ہوتا تھا اور ہر نبی سے یہ کہا جاتا تھا۔جب حضرتِ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ کہا تھا کہ یہ جو تم خدا کی زمین پہ اس طرح سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہو اور ان غریبوں کی بھیڑوں کو پانی تک نہیں پینے دیتے' یہ کیا انسانیت ہے اور کیا شرافت ہے' زمین تو کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی' اس کو کھلا چھوڑ دو۔وہ کہنے لگے کہ اے صالح علیہ السلام! تمہارے ساتھ تو قوم کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ اگر اس گاؤں میں اب پانچ سو ایکڑ زمین ہے تو تم اس کا رقبہ ہزار ایکڑ بنا دو گے۔آپ تو بڑے سمجھ دار تھے اور تم سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' کیا کہہ رہے ہو' کہ کسی کی ملکیت ہی نہیں ہو سکتی' پاگل ہو گئے ہو۔اب سوال یہ ہے کہ اس ''پاگل ہو گئے ہو'' کا مطلب کیا ہے؟

---

❶ ارے! تو عقل و ہوش کھو بیٹھا' تجھے اپنے نقصان کا بھی علم نہیں۔

قرآن فہمی کے لیے محاورۂ عرب کا سمجھنا ایک لازمی امر ہے

عزیزانِ من! ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے محاورۂ عرب کی ضرورت ہے۔ ہر زبان کا محاورہ سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک ہم بیسیوں دفعہ کہتے ہیں ''پاگل ہوگیا ہے۔'' کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے پاگل خانے (Mental Hospital) میں جا کر داخل کرا آؤ' یا اسے ڈاکٹر صاحب کو دکھاؤ کہ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ دراصل وہ یہ لفظ تو کہتے تھے اور یہ ان کا اپنا پگلا پن تھا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ جن گھرانوں سے متعلق ہوتے تھے' وہ اپنی قوم میں بڑے ممتاز گھرانے ہوتے تھے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' ان کے گھرانے کا ہی آدمی یہ کہتا ہے کہ یہ جنہیں تم کمینے اور رذیل سمجھتے ہو' یہ تمہارے جیسے انسان ہیں۔ اگر وہ ان میں سے ہوتا اور یہ بات کہتا تو وہ کہتے کہ ٹھیک ہے' اپنے مفاد کی بات کہہ رہا ہے۔

وحی کے نزدیک نوعِ انسانی میں مراتب کا معیار

اگر مانگنے والا فقیر' غریب' بھکاری' تمہارے دروازے پہ آ کر تمہیں سلام کہتا ہے اور جھک کر بھی سلام کہتا ہے تو وہ ٹھیک ہے' لیکن حقیقی طور پر سلام تو اس کا ہے جو سواری پہ چڑھا ہوا ہے اور پیدل چلنے والے کو سلام کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا تھا کہ یوں کیا کرو۔ یہ انبیائے کرام بڑے اونچے گھرانے کے لوگ ہوتے تھے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام سے بات شروع ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جنہیں تم اپنے معاشرے میں کمین یا کمی کہتے ہو' ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں اور اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ یہ جو کمی ہیں اگر ان کی سیرت و کردار اونچی ہے تو وہ تم سے بلند مرتبے کے انسان ہیں۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ تم پاگل ہوگئے ہو' کیا بات کہہ رہے ہو۔ یعنی وہ بات تمہارے اور تمہارے خاندان کے' تمہارے اپنے قبیلے کے خلاف جاتی ہے' پاگل ہوگئے ہو۔ حضرتِ شعیب علیہ السلام نے جب ان سے یہ بات کہی تھی کہ جو اس قسم کی تجارت تم کر رہے ہو' یہ ڈکیتی ہے' یہ Robery ہے' یہ تجارت نہیں ہے' وہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ یار! کیا کر رہے ہو' اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مار رہے ہو' اگر ہمیں تمہارے خاندان کا ڈر نہ ہوتا تو ہم تمہیں ختم کر دیتے' تم نے ہماری تجارت کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ ''اگر تمہارے اہل خاندان کا ڈر نہ ہوتا تو ہم تمہیں ختم کر دیتے''۔ دیکھا کہ اس بات کا انہیں ڈر تھا۔

دنیائے عرب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی اور معاشرتی حیثیت

عزیزانِ من! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو قریش اور قریش کے بھی ممتاز ترین گھرانے کے فرد تھے۔ محض قریش ہونے کی نسبت سے پہلی چیز کعبے کے متولی ہونا تھا۔ اور ''سائیں گھوڑے شاہ مزار دا متولی مان نہیں ہوندا' جناب اپنے پنڈ وچ۔'' [1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کعبے کے متولی تھے۔

---

[1] جناب! اپنے گاؤں میں تو حضرت گھوڑے شاہ صاحب کے مزار کا متولی بھی کسی سے کم نہیں ہوتا۔

ان لوگوں نے کعبے کو پورے عرب کے اندر' بلکہ عرب سے باہر کے علاقے کے لوگوں کے لیے بھی مرکز بنا رکھا تھا۔ وہ تجارت کا مرکز تھا۔ حسب ونسب کے اعتبار سے خود عرب کے قبائل میں سے قریش ممتاز ترین گھرانہ تھا اور ان میں سے یہ بنو ہاشم تو بہت ہی اونچے تھے اور پھر ان میں بھی نبی اکرم ﷺ کے گھرانہ کا تو پوچھیے نہیں کہ کیا کیفیت تھی۔ ان کی تجارت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ ساری دنیا کے قافلے لوٹے جاتے تھے مگر ان کے نہیں۔ یہ محض اس لیے تھا کہ یہ کعبے کے مجاوروں کے' متولیوں کے قافلے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ (106:2) سردی گرمی سارا سال ان کے قافلے چلتے رہتے ہیں' کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا' بس ایک نشانی کے طور پہ کوئی چیز باندھ دینی پڑتی تھی۔ یہ کیفیت تھی اس قریش کی' اس گھرانے کی' جس کے یہ ممتاز فرد تھے اور پھر یہ فرد بھی ایک گوہرِ یک دانہ تھا۔ چالیس سال تک آپ کی زندگی یہ تھی۔ یہ بڑے بوڑھے اپنے تمام الجھے ہوئے معاملات کے لیے حضور ﷺ سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ یہ مشورہ ہی نہیں تھا بلکہ آپ کو ثالث مقرر کیا کرتے تھے' اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھا کرتے تھے۔ یعنی یہ سمجھ دار بھی اتنے تھے اور آپ کے کیریکٹر کی بھی یہ کیفیت تھی۔ گھرانہ بھی یہ تھا۔ جس کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' جسے اپنے زمانے کے' اس وقت کے' آج کی اصطلاح میں' وزیراعظم کہہ لیجیے' اس باپ کے بیٹے اور یہ وزارتِ عظمیٰ وراثت میں آیا کرتی تھی اور وزارت بھی وہ جو مذہب کی حیثیت سے ملی ہوئی ہو' وہ تو بادشاہ سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ اس کے بیٹے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھ کر اپنے ہی باپ سے کہے کہ تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ باقی لوگوں سے سلام لیتے پھرو' اور ان سے خراج لیتے پھرو' تم دوسرے انسانوں جیسے انسان ہو' بادشاہ سے جا کر یہ کہہ دو کہ تمہیں کیا اقتدارات واختیارات حاصل ہیں' تم باقی انسانوں جیسے ہی ایک انسان ہو' نیچے اتر و آؤ۔ عزیزانِ من! کہیے کہ یہ لوگ اس بیٹے کو' بھائی کو' پاگل نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے!

نبی اکرم ﷺ کا پیغام اہلِ عرب کے نام

عزیزانِ من! اب آپ ﷺ کھڑے ہو کر ان قریش سے کہہ رہے ہیں کہ حسب ونسب کوئی شے نہیں ہے۔ سب انسان ایک جیسے ہیں اور پھر یہ کعبہ اور اس کی تولیت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ قرآن نے اسے وضع للناس کہا ہے۔ تم اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جانے والے اور اس کو ایک کمائی کا ذریعہ بنا لینے والے کون ہوتے ہو۔ یہ ایسا کچھ قطعاً غلط ہے۔ تجارت کے قافلے تمہارے ہی کیوں محفوظ ہوں' ساری دنیا کے محفوظ ہونے چاہئیں۔ آپ سوچیے کہ جو شخص انہی میں سے اٹھ کر یہ کچھ کہے وہ بڑی چیز

ہے۔اقبالؒ (1877-1938) نے جونوحہ ❶ ابوجہل کہا ہے وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ جا کر کعبے کا غلاف پکڑ کر بتوں کو مخاطب کر کے کہتا تھا کہ تم میں سے کسی نے اس شخص کو بددعا دے دی ہے' جو اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ اس کو سنبھالیے' یہ کیا کر رہا ہے۔ اب جس کی یہ کیفیت تھی اس نے یہ کہا تھا کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے۔ بتاؤ' یہ اس قسم کی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ اب اس کا جواب تو کوئی نہیں تھا کہ تمہاری پہلی زندگی میں یہ بات ہے۔ جواب یہ تھا کہ وہ تو ٹھیک تھا لیکن اب تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو' بالکل پاگل ہو گئے ہو۔ یہ باتیں تو پگلے پن کی ہیں۔ ٹھیک ہے پہلی زندگی میں وحی نہیں آئی ہے' پہلی زندگی میں خدا کی بات ابھی نہیں آئی' اس لیے اس زندگی میں وہ پگلا پن نظر نہیں آتا۔ کیا کہا ہے اس نے:

---

❶ ابوجہل غلافِ کعبہ تھام تھام کر فریاد کرتا تھا:

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ   از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
ساحرو اندر کلامش ساحری است   ایں دو حرف لا الہ خود کافری است
تابساطِ دین آبا در نورد   باخدا وندانِ ما کرد آنچہ کرد

وہ چلاتا تھا کہ

مذہب او قاطع ملک و نسب   از قریش و منکر از فضل عرب
درنگاہ اویکے بالا و پست   باغلام خویش بریک خواں نشست

اس کے نزدیک یہ سانحہ قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔

قدر احرارِ عرب نشناختہ   باکلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند   آبروئے دودمانے ریختند

اس لیے وہ حجرِ اسود کو پکار کر کہتا تھا:

باز گو اے سنگ ِ اسود باز گو   آنچہ دیدم از محمدؐ باز گو

اور کبھی کعبہ کے سب سے بڑے ''خدا'' سے فریاد کرتا تھا:

اے ہُبل اے بندہ را پوزش پذیر   خانۂ خود راز بے کیشاں بگیر
گلۂ شاں راہگراں کن سبیل   تلخ کن خرمائے ساں رابر نخیل

اور اس نالہ وفریاد اور سب وشتم سے اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتا تھا۔

خموشی میں ہر بات بن جائے ہے
جو بولے تو دیوانہ کہلائے ہے

''جو بولے تو دیوانہ کہلائے ہے''، تو کیا یہ واقعی اپنے نفع نقصان کا خیال نہیں رکھتے' ان کو خیال ہی نہیں ہوتا' سمجھ ہی نہیں تھی' سوچ ہی نہیں تھی کہ نفع کیا ہے یا نقصان کیا ہے؟ وہ یہی کہہ رہے تھے۔ اس قسم کے فرزانے کے متعلق یہ کہنا کہ اسے نفع نقصان کا خیال نہیں ہے بڑی زیادتی ہے۔ بات کیا تھی؟ نفع اور نقصان کے پیمانے بدل گئے' ان کی Values (اقدار) بدل گئیں۔ ان کا پیمانہ' صرف اسی طبعی دنیا کا نفع اور نقصان تھا۔ یہ شخص نفع اور نقصان کو اقدارِ خداوندی کے ترازو میں رکھ کر ناپتا تھا۔ اب ان کے پیمانے کی رو سے' ذرا سا فریب دینے سے یونہی ایک لاکھ روپیہ آ جاتا ہے مگر اس کے پیمانے کی رو سے وہ قطعاً حرام ہے۔ اب اسے تو نقصان ہو گیا جسے یہ کہا کہ یہ کچھ قطعاً حرام ہے' یہ جائز نہیں ہے۔ اس کا تو لاکھ روپیہ گیا' نقصان ہوا۔ اس کے نزدیک دنیا کی ہر متاع' قرآن کہتا ہے' ثَمن قلیل ہوتی ہے۔ یہ جو اقدارِ خداوندی ہیں' یہ جو خداوندی Values ہیں' یہ پیمانے ہیں۔ اقدار کے معنی ہی پیمانے ہیں۔ ان کو محفوظ رکھنے کے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی متاع کو بھی قربان کر دینا پڑے' تو یہ نفع کا سودا ہوتا ہے۔ یہ بات تھی جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پیمانہ دوسرا آ گیا تھا Exchange Values بدل گئی تھیں' جسے آج کی اصطلاح میں آپ کہتے ہیں۔ ان پیمانوں کی رو سے یہ مال و دولت تو ایک طرف رہی' طبعی زندگی جسے آپ حیات کا سیکولر تصور کہتے ہیں' کی رو سے جان سب سے زیادہ قیمتی تھی' اس سے زیادہ تو کوئی قیمتی چیز ہوتی نہیں۔ جان کو بچانے کے لیے تو وہ بہرحال مال کو بھی لٹا دیتے ہیں۔ یہ بڑی عزیز ترین چیز ہوتی ہے اور یہ جو نئے پیمانے آتے ہیں' ان پیمانوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایسا وقت آ جاتا ہے جہاں اقدارِ خداوندی یا حق کی حفاظت کے لیے جان جیسی چیز بطیبِ خاطر دے دی جاتی ہے۔ سچ کہا تھا اس مرد درویش' مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1938-1877) نے کہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

سود و زیاں کے سلسلہ میں انبیائے کرام کی سوچ کے پیمانے اور ہمارے ہاں کی روایات

دنیا کے اپنے پیمانے ہیں۔ ان پیمانوں کی رو سے جب جان دے دی جائے تو پھر زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر خدا کے پیمانے کی رو سے زندگی' اس وقت حاصل ہوتی ہے جب جان دے دی جاتی ہے اور پھر جان دے کر زندگی حاصل کرنے کا سودا ان کے نزدیک ایسا ہے کہ اس جیسا منفعت بخش سودا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ کیا کہہ دیا ہے!

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے' سو ایسا زیاں نہیں

جہاں کہیں بھی دنیا کے ترازو اور پیمانے آجائیں' وہاں یہ جو طبعی زندگی کے پیمانے ہیں' ان کے لحاظ سے' اس طبعی زندگی کے سود و زیاں میں سود تو ہوتا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک زیاں ہی ہوتا ہے۔ وہ تو اگر کبھی زندگی دے دینے کا اس قسم کا تصور بھی آجاتا ہے تو اسے روکتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کے پیمانوں کی رو سے تو یہ ہے کہ بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے۔ ''بھٹک بھٹک'' ان کے خوب انداز ہوتے ہیں!

بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے
مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

عزیزانِ من! یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزاروں فرزانگیاں قربان کی جاسکتی ہیں اور یہ ہوتی ہے انبیائے کرام علیہم السلام کی صداقت کو بلند کرنے والوں کی وہ دیوانگی' جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو ہر چیز نفع کی کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار

یہ بڑے ''بکارِ خویش'' ہوشیار دیوانے ہوتے ہیں۔ صاحب! یہ تھی وہ دیوانگی......معاذ اللہ...... یہ وہ نہیں جو آپ کی روایتوں نے کہا کہ وحی کے وقت آپ کی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی تھی جیسے مرگی والے کی...... معاذ اللہ...... ہوتی ہے اور روایات کے اندر یہاں تک بھی ہے کہ مدینے میں وہ ایک یہودیوں کا لڑکا تھا۔ اس پر بھی اس قسم کے دورے پڑا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اسے ہی دیکھنے کے لیے گئے تھے کہ وہ بھی کچھ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک حضور ﷺ پہ یہ بھی یہی ایک تائیداً کیفیت تھی۔ کیا بتائیں کیا کچھ ہے ان کتابوں کے اندر!!! وہ اعلم الناس ہستی کہ جس پہ علم کی بلندیاں ختم ہو جائیں' اس کی کیفیت یہ ہے!! یا للعجب!!!

بہر حال بات ہو رہی تھی کہ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِہٖ جِنَّۃٌ (23:70) کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسے جنون ہو گیا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ کہا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ بَلۡ جَآءَھُمۡ بِالۡحَقِّ (23:70) یہ نبی ان کے پاس افسانے لے کر نہیں آیا' حقیقتیں لے کر آیا ہے' Reality (حقیقت) کا Face (سامنا) کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے' عزیزانِ من! انسان خود فریبی میں رہنا چاہتا ہے۔ اس میں بڑا لطف ہوتا ہے۔ حق یا Reality (حقیقت) کا سامنا کرنا واقعی مشکل ہے۔ کہا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ رسول ان کے سامنے حق لے کر آیا ہے' وَ اَکۡثَرُھُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِھُوۡنَ (23:70) اور یہ بات ان کے اوپر بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ یعنی اس حقیقت کو اس زمانے میں سامنے رکھنا کہ تمام انسان یکساں واجب الاحترام ہیں' بڑی مشکل ہے۔ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور

چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کے جذبات ومفاد کی رعایت سے اس میں کچھ تبدیلی کر دیں اور پھر ان سے مفاہمت کر لیں۔

ہم نے آج بھی سیّد اور جولا ہے میں امتیاز روا رکھے ہوئے ہیں

میں نے ''قریش'' اور ''ہاشمی'' کہا ہے' اسے تو چھوڑ دیجیے۔ آج کے اس دور میں بھی آپ کسی سیّد سے کہہ کر دیکھیے کہ تو اور جولاہا ایک جیسے ہیں' تو وہ کس بری طرح آپ کے گلے پڑتا ہے' حالانکہ آج یہ تصورات بہت کچھ بدل گئے ہیں' لیکن اس دور میں بھی یہ کیفیت ہے۔ میرے پاس استفسارات آتے ہیں کہ کیا ایک سیّد زادی لڑکی کی شادی غیر سیدزادے سے جائز ہے۔ یعنی غیر سیّد زادہ' وہ کوئی موچی ہو' جولاہا ہو...... معاذ اللہ...... میں ان کی زبان میں کہہ رہا ہوں' خواہ وہ پٹھان راجپوت ہی کیوں نہ ہو' سیّد زادی سے شادی نہیں کر سکتا۔ غیر سیدزادے سے سیّد زادی کی شادی آج بھی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہاں اس دور میں آج بھی یہ تصور ہے۔ آپ پوچھیے نہیں کہ اس حق کو تسلیم کرنا کتنا مشکل ہے کہ ہر شخص یکساں واجب الاحترام ہے۔ یہ سیرت و کردار کے اعتبار سے اس سیدزادی سے کتنا زیادہ اچھا بھی کیوں نہ ہو اس کی شادی آج بھی کسی سیّد زادی سے محال ہے۔ برادرانِ عزیز! یہ ہے وہ حق' جس کا ہم سامنا (Face) نہیں کرنا چاہتے اور اپنے آپ کو فریب میں رکھے ہوئے ہیں۔ قرآن نے اس سلسلہ میں ایک ہی بات کہہ دی ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جائے اور یہ بھی کہے کہ نہیں صاحب! سید سید ہوتا ہے' جولاہا جولاہا ہوتا ہے' دونوں برابر نہیں ہوتے۔ قرآن نے انہیں ایک لفظ کہہ دیا کہ سید اور جولاہا ہونا تو صرف پیشہ ہے۔ وَ لَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِيۡهِنَّ (23:71) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع چلنے لگ جائے تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہے' ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے اور نظام کائنات تہ و بالا ہو جائے۔ اگر سورج کسی گراں خواب کے تابع ہو جائے' جو صبح اٹھنا نہیں چاہتا' تو سوچیے تو سہی کہ اس سحر خیز کا کیا ہوگا اور پھر اگر سورج نے گراں خواب کی بات ماننی ہو جو اکثریت (Majority) میں ہوں تو پھر تو وہ جمہوریت کے تابع ہی چلے گا۔ یہاں قرآن نے اس چیز کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ کہا کہ وَ اَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ كٰرِهُوۡنَ (23:70) یہ رسول ان کے سامنے حق پیش کرتا ہے اس لیے یہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں اگر اکثریت (Majority) ان کے خیالات کا اتباع کرنے لگ جائے تو پھر بات جمہوریت میں سیکولر نظام کی آ گئی' جہاں انسانوں کے فیصلے حق بن جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ بہترین نظام تو یہی آپ نے کہا ہے کہ جہاں اکیاون (51) فی صد کا کوئی فیصلہ ہو جائے' وہ الحق ہو جاتا ہے تو اس طرح حق اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ ہم سے نہیں' آج پوری دنیا سے پوچھیے۔ وہ یہی ہے کہ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِيۡهِنَّ (23:71) پھر کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہے۔ ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے اور نظامِ

کائنات تہہ وبالا ہوجائے۔

خارجی کائنات میں قانون سازی کی اہمیت کا ماحصل

عزیزانِ من! کائنات کے متعلق اب مغرب کے یہ سارے سائنٹسٹ، علیٰ وجہ البصیرت، اپنی تحقیقات کی رو سے، اس نتیجے پہ پہنچ گئے ہیں کہ اس کائنات کی متناہیت ذہن انسانی کے اندر آ ہی نہیں سکتی۔ اس کا عالم یہ ہے کہ وہ جو حق پر مبنی قانونِ خداوندی ہے اگر اس میں ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کے برابر بھی ذرا سی بغاوت ہوجائے تو اس کے متعلق جیمز جینز [1] سے پوچھیے، وہ کہتا ہے کہ اس اتنے سے تفاوت سے اس قدر ٹکراؤ ہوجائے کہ ایک ثانیے میں ان تمام کرّوں کے اندر کائنات ختم ہوجائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ کائنات کے متعلق قوانین تک تو پہنچ گئے انسانی دنیا میں دیئے گئے قوانین تک نہ پہنچ سکے۔

انسانی سوچ کی متضاد کیفیات کا نتیجہ

مغرب کے سائنسدانوں کے نزدیک کائنات کے متعلق قوانین اور انسانیت کے متعلق قوانین میں بس فرق صرف اتنا ہی ہے کہ دنیائے انسانیت کے متعلق بھی یہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہاں بھی حق پر مبنی کوئی قانون کارفرما ہونا چاہیے اور اگر حق پہ مبنی قانون نہیں ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے قانون کی اطاعت ہوتی ہے تو یہاں بھی فساد برپا ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ سارا فرق اتنا ہی کیا جاتا ہے کہ جسے آپ سیکولر نظام کہتے ہیں اس میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین چلتے ہیں اور خارجی کائنات میں خدا کے۔ انہوں نے یہ ثنویت (Dualism) قائم کر رکھی ہے۔ دین خداوندی یا نظامِ خداوندی، اس کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے، اور سیکولر نظام میں فرق اتنا ہی ہے کہ یہ جتنے بھی مغرب کے سائنٹسٹ نہیں بلکہ سیکولر نظام والے بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ جو آپ کے ہاں پہلی شق آئی تھی کہ Sovereignty in the entire Universe belongs to God (خارجی کائنات میں جو اقتداراتِ مطلق ہے، وہ خدا کا ہے) تو وہ خارجی کائنات میں اس کے قائل ہیں البتہ دنیا میں ان تھوڑے سے دہریوں کو چھوڑ دیجیے جو آج نمایاں طور پہ کہتے ہیں کہ خدا کی ہستی نہیں ہے، باقی سب مانتے ہیں کہ خارجی کائنات کے اندر قوانین خداوندی جاری وساری ہیں۔ یہ انہیں قوانین فطرت کہہ دیتے ہیں۔ یہ سائنسدان اور دہریئے دونوں اس پہ متفق ہیں کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نہیں ہیں۔ اس پہ دنیا کا ہر شخص متفق ہے کہ خارجی کائنات میں ایسے قوانین ہیں جو کسی دوسرے کی خواہشات کا اتباع تو ایک طرف، اپنی بھی کسی خواہش یا خیال کا اتباع نہیں کرتے، وہ ان قوانین کے تابع چلنے پر مجبور ہیں لیکن وہی جب انسانی دنیا کی طرف آتے ہیں تو وہاں ان کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔

---

[1] Sir James Jeans کی کتاب The Mysterious Universe بڑی ہی پر از مفید معلومات پر مبنی ہے۔

ہم ذرا آگے بڑھ آئے تھے' پھر میں دوبارہ ان آیات پہ آ تا ہوں بلکہ اسی سورۃ المؤمنون میں ذرا آگے چلیے۔ کہا کہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهَآ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (23:84) کہو کہ تمہارا علم تمہیں کیا بات کہتا ہے کہ اِس کائنات کے اندر کس کا قانون چل رہا ہے' کس کا اقتدار ہے؟ کہا کہ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:85) یہ تسلیم کریں گے کہ یہ خدا کا ہے۔ یہ انہیں مخاطب کیے جا رہا ہے جو اسلام سے' حضور ﷺ کے پیش کردہ دین سے' قرآن سے' وحی سے' انکار کر رہے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (23:86) تو پوچھو ان سے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں' انتہا درجے تک' ان کی ربوبیت کس کے قانون کی رو سے ہوتی ہے؟ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:87) یہ اعتراف کریں گے کہ یہ بھی اللہ کے قانون سے ہوتی ہے۔ قُلْ مَنْۢ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُوَ یُجِیْرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (23:88) کہا کہ بتاؤ علم کی بارگاہ سے پوچھ کے کہ کائنات کا اقتدارِ مطلق کس کے ہاتھ میں ہے' کون ہے کہ جس کے قانون کی رو سے ہر ایک کو پناہ ملتی ہے' حفاظت ملتی ہے اور اس کے خلاف چلنے سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی؟ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:89) یہ کہیں گے کہ یہاں خدا کا قانون ہے۔ کہا کہ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (23:89) اب ان سے پوچھو کہ جب ہم تمہیں پھر انسانی دنیا کی طرف لاتے ہیں تو یہاں آ کر تمہیں کیوں موت پڑ جاتی ہے' کیا چیز ہے جو تمہیں دھوکا دے دیتی ہے کہ یہاں تم نے یہ تقسیم کی ہوئی ہے کہ کائنات تک تو اس کا اقتدار چلتا ہے اور اس سے ذرا نیچے' تم اپنی دنیا کی طرف آتے ہو' تو یہاں انسانوں کو صاحب اقتدار مانتے ہو۔ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (23:89) وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق نہیں ہے' خدا کے جو قوانین میں تمہیں دیتا ہوں وہ تم انسانی دنیا میں نہیں مانتے۔ انسانی دنیا میں اپنے قوانین بناتے ہو۔

دنیائے مذاہب سراپا توہم پرستیوں کا کھیل ہے

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ بات بڑی صاف سی ہے۔ تم اس کائنات کو دو ٹکڑوں میں بانٹ رہے ہو؟ عزیزانِ من! یاد رکھو' یہ ایک ایسا نکتہ تھا جو اہل مذاہب کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ مذہب والوں کے نزدیک نہ باہر کی کائنات میں خدا ہوتا ہے' نہ ان کی یعنی انسانوں کی زندگی میں خدا ہوتا ہے۔ وہاں' باہر کی کائنات میں' توہم پرستیاں ہوتی ہیں اور یہاں انسانوں کی زندگی میں انسان پرستیاں ہوتی ہیں۔ آپ غور کیجیے گا کہ قرآن کو یہ کہنے کی کیوں ضرورت پڑی کہ وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ [1] (43:84)۔ غور

---

[1] خدا کا قانون خارجی کائنات (السمآء) میں بھی کارفرما ہے اور خود انسانی دنیا (الارض) میں بھی۔ ساری کائنات کی زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1155)۔

کیجیے گا کہ اس قدر نکھار کر کہنے کی ضرورت کیوں پڑی کہ یاد رکھو! خارجی کائنات میں بھی وہی اللہ ہے اور تمہاری اپنی انسانی زندگی کے اندر بھی وہی اللہ ہے۔ گویا انہوں نے دو زندگیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ پہلی زندگی جو خارجی کائنات کی ہے اس میں تو خدا خود کہہ رہا ہے کہ یہ اللہ کو مانتے ہیں' اللہ کا تصور تھا' ان کے ہاں نام بھی اللہ ہی تھا' خود نبی اکرم ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ تھا۔ وہ کیا بات تھی کہ اس کے باوجود ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ یعنی وہ جو اللہ کو مانتے ہیں' ان سے یہ کہنا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تو اس کے کیا معنی ہیں؟ کہا یہ کہ تم ''الٰہ فی السمآء'' کو تو مانتے ہو یعنی خدا کو تو مانتے ہو جس کا خارجی کائنات میں اقتدار ہے اور وہ اس کے قوانین کے تابع چلتی ہے مگر ''الٰہ فی الارض'' کو نہیں مانتے۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہوئے کہ انسانوں کی زندگی کے اندر' انسانوں کی دنیا کے اندر' قوانین خداوندی کی حکمرانی ہو جیسی خارجی کائنات میں ہے۔

سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے اقرار اور انکار میں آخر فرق کیا ہے؟

میں نے پچھلے جمعہ ❶ درس میں کہا تھا کہ یہ جملہ جو ہمارے ہاں ہے کہ ''جی' میں خدا کو مانتا ہوں'' اس پر نہ کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا ہے' نہ پوچھا ہے کہ ''مانتا ہوں'' کے معنی کیا ہوئے؟ یعنی یہ مانتے ہو کہ خدا ہے۔ بالفرض اگر تم کہتے ہو کہ خدا نہیں ہے اور اس کے برعکس ساری کائنات' ساری دنیا' یہ کہہ دے کہ خدا نہیں ہے تو اس سے بگڑتا کیا ہے؟ اور اگر تم نے کہہ دیا کہ خدا ہے اور ساری دنیا کہہ دے کہ خدا ہے تو پھر بنتا کیا ہے؟ اس کو ماننے کے معنی کیا ہیں؟ خدا کی ذات کے اقرار اور انکار سے آخر زندگی میں فرق کیا پڑتا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم نکتہ ہے کہ ایمان باللہ کا حقیقی تصور کیا ہے اور اس کے مضمرات (Implications) کیا ہیں؟

ایمان باللہ کا حقیقی تصور اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! صرف یہ کہنا کہ ''میں خدا کو مانتا ہوں'' اور جو اپنے بچوں کے نام عبداللہ رکھتے تھے تو کیا وہ خدا کو نہیں مانتے تھے؟ اہل کتاب کے متعلق تو پوچھیے ہی نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ تو خدا کو' رسولوں کو' وحی کو' آخرت کو' سب کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن کہتا تھا کہ نہیں' تم ایمان لاؤ جیسے اے جماعت مومنین! تم ایمان لائے ہو۔ لہٰذا اگر یہ اس طرح ایمان لائیں تو پھر یہ ہدایت پہ ہوں گے۔ یہ ایمان باللہ کیا تھا؟ یہ اسے الٰہ فی الارض ماننا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے۔ انہیں تو آپ چھوڑ دیجیے جنہیں آپ غیر مسلم کہتے ہیں' کافر کہتے ہیں' مشرک کہتے ہیں۔ مومن تو خیر آج ایک فرقے کا نام ہو گیا۔ جسے مسلمان کہتے ہیں' مسلم کہتے ہیں' جس کا ایمان الٰہ فی الارض ہے' وہ ایمان کہاں ہے؟ آج آپ کے ہاں کی ساری مسلم ورلڈ (دنیا) انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہی کے تابع زندگی بسر کر رہی ہے۔

---

❶ یعنی جولائی 1977ء کی 15 تاریخ۔

دراصل یہ سماء میں الگ خدا اور ارض میں الگ خدا والی چیز تھی جس سے خدا نے انہیں منع کیا تھا۔ برادرانِ عزیز! اب اس سے یہ واضح ہوگیا کہ جب ہم کہیں گے کہ میں خدا کو مانتا ہوں تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَنۡ عِنۡدَهٗ (21:19) سماوات والارض اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، سب کے سب اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سراپا سرگرمِ عمل ہیں۔ یہاں براہِ راست اس کا قانون چلتا ہے اور یہ مَنۡ عِنۡدَهٗ (21:19) بڑی عجیب ترکیب (Phrase) ہے۔ یعنی وہ جو السماء اور الارض کے درمیان ہے۔ وہاں کیفیت یہ ہے کہ لَا یَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِهٖ (21:19) وہ اس کے قوانین کی اطاعت اور محکومیت سے کبھی سرکشی نہیں برتتے بلکہ یوں کہیے کہ سرکشی برتنا تو ایک طرف، ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں۔ ❶ اور پھر قرآن کہتا ہے کہ وَ لَا یَسۡتَحۡسِرُوۡنَ (21:19) وہ کبھی تھکتے نہیں ہیں۔ کبھی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ ''دو گھڑیاں آرام وی کر لین دیو۔'' ❷ وہ تو اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے تھکتے ہی نہیں ہیں۔ یُسَبِّحُوۡنَ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفۡتُرُوۡنَ (21:20) وہ سب دن اور رات اس کے قوانین کی اطاعت کے لیے مصروف رہتے ہیں۔ کہا کہ اب انسانوں سے پوچھو کہ اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِهَةً مِّنَ الۡاَرۡضِ هُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ (21:21) انہوں نے اپنی زمینی دنیا کے اندر اور خدا بنا رکھے ہیں، اور کہتے یہ ہیں کہ یہ ہیں وہ خدا جو ہمارے لیے سامانِ زیست یعنی ہمارے بڑھنے، پھولنے کا سامان رکھتے ہیں۔ انہوں نے ارض میں اپنے لیے اور خدا بنا رکھے ہیں۔

عزیزانِ من! مسلمان قرآن کی ان آیات کے ان الفاظ پہ کبھی غور ہی نہیں کرتا کہ وہ کائنات کے اندر خدا کو تو مانتے ہیں لیکن ارض کے اندر انہوں نے اپنے لیے اور خدا بنا رکھے ہیں اور بناوہ رکھے ہیں جو هُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ (21:21) ہیں۔ یعنی جن کے سہارے ہم بڑھتے، پھولتے پھلتے پھیلتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ارض کی دنیا میں، یعنی اپنی انسانی زندگی کے اندر اور خدا بنا رکھا ہے بالفاظِ دیگر آسمانوں کا خدا اور ہے اور زمین کا خدا اور۔ آسمانوں میں خدا کی بادشاہت اور زمین پر انسانوں کی۔ یہ ان کی بڑی بھول ہے۔ کہا کہ لَوۡ كَانَ فِیۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21:22) ❸ یاد رکھو! جب اس طرح تم نے دو خدا بنا لیے کہ کائنات کا خدا اور ہے اور تمہاری تمدنی

---

❶ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا (غالبؒ)

❷ پل بھر آرام بھی کر لینے دیں۔

❸ اگر کائنات میں خدا کے علاوہ اور الٰہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے (Aspect) میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے، تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 731)۔

زندگی کا خدا دوسرا' یعنی ارض کا خدا اور ہے تو اس تصور سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں کچھ بگڑے گا نہیں کیونکہ وہاں خارجی کائنات میں تو کوئی ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا اس لیے کہا کہ یہاں اپنی انسانی دنیا میں جب تم نے دوسروں کو معبود بنا لیا تو اس کے بعد پھر تمہاری زندگی کے اندر اتنا فساد برپا ہوگا کہ تم سنبھال نہ سکو گے۔

قرآنِ حکیم کا قابلِ غور و فکر پیغام

عزیزانِ من! سوچیے کہ قرآن کا پیغام کیا تھا' اسلام کسے کہتے ہیں' دین الحق کیا ہوتا ہے' نظام خداوندی کسے کہتے ہیں؟ قرآنی تعلیمات کی رو سے انسانی دنیا کے اندر خدا کے قوانین کی حکمرانی کا نام ''اللہ پر ایمان لانا ہے'' اسی کا نام اسلام ہے' یہی دین اللہ ہے۔ اب پھر ہم درس کی اس آیت پہ آ جاتے ہیں جس میں کہا ہے کہ **بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ o وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ** (23:70-71) حق آ گیا ہے اور یہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع چلنے لگ جائے تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہے' ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ اس طرح سیدھی سی بات ہے کہ اگر حق لوگوں کی خواہشات' مفادات' آرزوؤں اور خیالات کے تابع ہو جائے تو پھر یقینی طور پر کائنات کے اندر فساد ہی فساد برپا ہو جائے اور نظامِ کائنات تہ و بالا ہو جائے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک پاگل کون ہے؟

بات شروع سے یہ چلی آ رہی تھی کہ کیا یہ تمہیں پہنچانتے نہیں ہیں' کیا تو ان سے کچھ انوکھی باتیں کر رہا ہے جو یہ تمہیں پاگل کہہ رہے ہیں۔ کہا کہ آ ؤ ہم تمہیں بتائیں کہ پاگل کون ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ کہا کہ **بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (23:71)۔ انہیں کون بتائے کہ ہم انہیں وہ کچھ کہہ رہے جو انہیں ان ذلتوں سے اور خواریوں سے نکال کر شرفِ انسانیت [1] کی بلندیوں پر لے جائے گا اور یہ ہیں کہ اس سے اعراض برت رہے ہیں' اس سے منہ موڑ کر جا رہے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ کیا پاگل میں ہوں؟ یہاں کہا ہے کہ **بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ** (23:71)۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کو محاورۂ عرب سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ذکر کے معنی شرف اور بلندی ہوتا ہے۔ یہاں **ذِكْرِهِمْ** (23:71) کے معنی ان کا شرف اور ان کی بلندی ہے۔ قرآنِ کریم ان کے شرف اور بلندیوں کی باتیں کر رہا ہے۔

---

[1] ''ذکر'' شرف و عزت' موعظت بڑائی اور عظمت' شرف و مجد اور سرفرازی و سربلندی کو بھی کہتے ہیں (تاج العروس)۔

عزیزانِ من! انسان کوانسان کی محکومیت سے بچانا اس کے لیے سب سے بڑا شرف اورسب سے بڑی تکریم کا باعث ہے جب کہ انسان کے سامنے جھک جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ من تیرا' نہ تن ❶ ۔کہا کہ میں تو تمہیں یہ پیغام دے رہا ہوں کہ کسی انسان کے سامنے نہ جھکو اور تم ہو کہ یہی بات مجھے کہہ رہے ہو کہ یہ پاگل پن کی بات ہے۔تمہی بتاؤ کہ یہ پاگل پن کی بات ہے یا تمہارے نفع کی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔یہ تو قرآن نے کئی بار دہرایا ہے کہ قرآن کے اندر خود تمہارا اپنا ذکر ہے۔❷ ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ ''ذکر'' کے معنی شرف اور بلندی کے ہیں اور میں پھر یہ عرض کردوں کہ انسان کے لیے اس سے بڑا شرف' عزت اور بلندی کا مقام اور کیا ہوگا کہ قرآن نے کہا ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:79) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا' خواہ خدا اس کو ضابطۂ قوانین حکومت اور نبوت بھی عطا کرے کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ خدا سے ورے تم میرے سامنے جھکو۔کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔اگر انسانوں کی دنیا میں یہ قانونِ خداوندی نافذ ہو جائے تو سوچیے' عزیزانِ من! شرف اور مجد کی کن بلندیوں پہ انسان پہنچ جائے۔

انسانیت کی دنیا میں سب سے بڑا ظلم تکریمِ انسانیت کا نہ ہونا ہے

مجھ سے پوچھیے کہ جسے آپ ظلم اور استبداد کہتے ہیں وہ کیا ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ یہ Physical (طبعی) طور پر بھی ظلم اور استبداد ہے لیکن سب سے بڑا ظلم اور استبداد یہ ہے کہ کسی کی بھی تکریم انسانیت باقی نہ رہے' انسان ہونے کی حیثیت سے جو واجب العزت ہے وہ تکریم چھین لی جائے' کسی فرد کو ذلیل کر دیا جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ہی ہے جب انسانی دنیا کے اندر خدا کا یہ قانون کارفرما ہو کہ **وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی وجہ سے یکساں واجب التکریم ہے۔یہ اتنا اہم قانون ہے کہ کسی جہت سے بھی اگر کسی فردِ انسانیہ کی دوسرے کے ہاتھوں سے تذلیل ہو جائے تو عزیزانِ من! اس سے بڑا جرم بارگاہِ خداوندی میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔

---

❶ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن (اقبالؒ: بالِ جبریل)

❷ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔729)۔

قوانینِ خداوندی سے بے اعتنائی کا نتیجہ

قرآن تو آیا ہی تکریم انسانیت کو قائم (Establish) کرنے کے لیے تھا۔ اس کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے' کہا کہ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا (7:175) ❶ انہیں اس شخص کی بات سناؤ' اور بات' عزیزانِ من! اس شخص کی نہیں ہے' بات ہماری ہے جو سنائی جا رہی ہے۔ قرآن کا انداز بھی عجیب ہے' نام لے کر ہم سے بھی نہیں کہتا کہ اس سے بھی کچھ ان کے جذبات کو ٹھیس لگ جائے گی۔ کیسا عجیب پیارا انداز ہے! لہٰذا کہا کہ انہیں اس شخص کی بات سناؤ جسے ہم نے اپنے قوانین دیئے۔ پھر کیا ہوا؟ اس کے لیے کیا لفظ ہے: فَانْسَلَخَ مِنْهَا (7:175) وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر کچھ یوں نکل گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے کہ اس کے اوپر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ کیا تشبیہ ہے قرآن کی! جب وہ کینچلی تھی تو وہ محیط تھی کیونکہ وہ سانپ کے اوپر پوری طرح اسے Cover (ڈھانپے) کیے ہوئی ہوتی ہے اور جب سانپ اس میں سے نکلتا ہے تو اس کے اوپر اس کا کسی قسم کا کوئی نقش تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انہیں اس قوم کی کہانی سناؤ کہ جسے ہم نے اپنے قوانین دیئے تو وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر یوں نکل گئی جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ اس کینچلی کے اندر یہ قوم بہت محفوظ تھی۔ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ (7:175) تو ان کے پست جذبات ان کے پیچھے لگ گئے' انہوں نے اس کو بہکانا شروع کر دیا اور اگلی بات یہ کہی کہ انہیں بتاؤ کہ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (7:176) ہم تو چاہتے تھے کہ اس کتاب کے ذریعے اسے آسمان کی بلندیوں تک لے جائیں وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (7:176) لیکن یہ کم بخت زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ کہا کہ اتنی کھلی ہوئی بات تھی اور ہے لیکن پھر بھی یہ ایسی بلندیوں سے اتنی پستیوں کے اوپر کیوں آیا؟ کیا ہوا؟ اس کے لیے جواب دیا کہ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (7:176) اس نے اپنی مفاد پرستیوں کو خدا بنا لیا۔ ❷ سارا مسئلہ یہ تھا۔ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا (7:176)۔ کتنی بری مثال ہے اس قوم کی کہ جس نے یوں ہمارے قوانین کی تکذیب کی! ہمارا کیا بگڑا! کسی کا

---

❶ ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اے رسول! تم اپنی جماعت (مومنین) کے سامنے پیش کرو اور اُن سے کہو کہ اسے دل کے کانوں سے سن لیں۔ ایک شخص کو خدا نے اپنے احکام وقوانین دیئے (وہ ان پر کاربند ہوا تو اُسے خوش حالی اور عروج نصیب ہو گیا۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔384)۔

❷ اس کی زندگی کا سارا مقصد دنیاوی مفاد کا حصول رہ گیا۔ قرآنِ کریم نے اس کی یہ مثال دی ہے کہ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ (7:176) اب اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اُسے دوڑاؤ اور اکساؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے' اور اگر ویسے چھوڑ دو' تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ (یعنی پھر انسان کی ہوس کی تسکین ہی نہیں ہوتی خواہ وہ کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو' اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔) ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ (7:176) یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا (7:176) جو ہمارے قانونِ ربوبیت کو جھٹلاتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔384)۔

کیا بگڑا! **اَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ** (7:177) انہوں نے اپنے آپ پہ ظلم کیا' نہ کہ ہم پہ ظلم۔ وہ جو پہلے کہا تھا کہ انہیں اس قوم کی بات سناؤ' تو کہا کہ ان کو کہو کہ **لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ** (7:176) ذرا غور وفکر سے کام لو اور دیکھو کہ شاید یہ بات یوں سمجھ جائیں۔ ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ ❶ ان کو کہو بات ہم نے سنائی ہے' غور وفکر تم کرو۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا عطا کردہ مقامِ بلند

قرآن انسان کو بڑی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے لیکن یہ خود ہی زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ یہیں سے ہم پھر زیر درس آیت کی طرف آتے ہیں جہاں کہا گیا کہ **بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِذِكۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَنۡ ذِكۡرِهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ** (23:71) ہم انہیں ان کے شرف اور بلندیوں کی طرف بلا رہے ہیں اور یہ دیکھو تو سہی' یہ اس سے بھاگ کر پستیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ پاگل کون ہے۔ اے رسول! کیا یہ بات ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ **اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ خَرۡجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ** (23:72) تو ان سے کچھ مال ودولت چاہتا ہے؟ یا کوئی ایسی چیز ہے کہ تم ان سے کوئی ٹیکس مانگتے ہو' کوئی بیگار کے پیسے اکٹھے کرنا چاہتے ہو؟ عجیب بات ہے!!

نبی کے مدعا میں "خَرۡجٌ" کی کیفیت نہیں ہوتی

عربی زبان میں "خَرۡجٌ" وہ ہے جو دوسروں سے ٹیکس وصول کیا جائے اور خراج وہ ہوتا ہے جو دوسرا از خود کسی کو دے۔ یہاں کہا ہے کہ ان سے کہو کہ میں تم سے "خَرۡجٌ" نہیں مانگ رہا' کوئی ٹیکس نہیں مانگ رہا' زبردستی تم سے کچھ رقوم نہیں مانگ رہا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ یہ دلِ بے مدعا ہے۔ یہ چیز تو ناممکنات میں سے ہے کیونکہ یہ تو ایک شاعری ہوگی جو تصوف نے گھڑ لی ہے۔ اگر یہ دل ہی بے مدعا ہو جائے تو وہ تو موت ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ میرا مدعا اس میں نہیں ہے: **فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ** (23:72) مجھے خدا دیتا ہے میں ان سے زبردستی نہیں لیتا' مجھے دینے والا دیتا ہے اور بہت دیتا ہے۔ "خیر" کے سلسلہ میں' میں نے کہا تھا کہ اختیار اور خیر کا ایک ہی مادہ (خ ی ر) ہے۔ پوچھو نہیں ان سے لو تو خیرات ہو جائے۔ یہ خیر تو ہمارے ہاں آ کر خیرات ہو گئی۔ برادرانِ عزیز! خیرات سے زیادہ تذلیل انسانیت کسی کی نہیں ہو سکتی۔

خیرات کے سلسلہ میں ایک حدیثِ مبارک

وہ بڑی صحیح بات کہی ہے۔ یہ بات کسی Psychologist (ماہر نفسیات) نے نہیں کی بلکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ

---

❶ یہ خود ہماری یعنی مسلمانوں کی داستان ہے جسے قرآنِ کریم فرقان حمید نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔

خیرات سے لوگوں کے دل شاید پتھر یا مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے دینے والے کے دل کے اندر تکبر پیدا ہو جاتا ہے' لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے۔'' خدا نے ''خیر'' کہا تھا' خیرات نہیں کہا۔ وہ تو ہم ہیں جو اس خیر کو خیرات میں لے آئے۔ وہ تو کہتا ہے کہ جو کسی انسان سے کچھ لیتے ہو تو تمہارے اختیارات سمٹ کے' سکڑ جاتے ہیں' ہم سے لیتے ہو تو ان میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ پھر تم کسی انسان کے دروازے کے محتاج نہیں رہتے: وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (23:72) اس آیت میں رازقین کہا ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی صفات ایسی ہیں جن میں کہا ہے کہ خدا ان میں سب سے بہتر ہے مثلاً خدا احسن الخالقین ہے' خیر الرازقین ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ واقعی رزق دوسرے لوگ بھی دیتے ہیں' دوسروں کو کھانا کھانے کے لیے دیتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خیر الرازقین کون ہے؟ کس کے دینے سے تمہاری اپنی ذات کی وسعتیں' تمہاری ذات کے اختیارات کی وسعتیں بڑھتی ہیں؟ اس کے علاوہ کسی کے ہاں سے بھی تم اگر لوگے تو وہ اس کی ایسی قیمت لے گا جس کے لیے مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے کہا کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

رزقِ حلال کے اثرات کی کیفیت صراطِ مستقیم کی شکل میں ہوتی ہے

یہ ❶ عجیب شخص تھا۔ آپ نے یہ دیکھا کہ وہ قرآنی حقائق کو کیسے مؤثر انداز میں بیان کر جاتا ہے۔ وہ جو خیر ہے' اختیارات سمیٹے ہوئے ہے۔ جس رزق سے اختیارات میں خامی آتی ہے اس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے۔ حلال کے تو معنی یہ ہیں کہ رسیاں کھول دی جائیں۔ رزقِ حلال وہ ہے جس سے انسان کے ہر قسم کے بندھ کھل جاتے ہیں۔ یہ اسکے لفظی معنی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (23:72) وہ ایسا رزق دینے والا ہے کہ جس کے رزق دینے سے انسان کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے بہتر روزی دینے والا اور کوئی نہیں۔ وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (23:73) تو انہیں ایک ایسے راستے کی طرف دعوت دے رہا ہے جو سیدھا ہے' جس میں پیچ وخم نہیں ہے' واضح ہے' نمایاں ہے' اس میں Confusion (الجھاؤ) نہیں ہوتی۔ اس راستے کے متعلق کہا کہ اس کی مثال سیڑھیوں کی سی ہے۔ اسے ذی المعارج (70:3) کہا ہے یعنی اس سیڑھی کا سیدھا ہونا بھی ہے' اس کا مستقیم ہونا بھی ہے' اور پھر یہ بھی کہ وہ سیڑھی اپنے پاؤں پہ کھڑی بھی ہوتی ہے' قائم بھی ہوتی ہے اور عجیب چیز یہ ہے کہ اس پر چلنے سے بلندیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اسے قرآن نے کہا ہے کہ اس راستے پہ چلنے سے طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) تم بلندیوں کی طرف بڑھتے چلے جاؤ' ہر قدم جو تم

---

❶ یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-187ء) کی طرف ہے۔

اس سیڑھی کے اوپر رکھتے ہوئے ایک قدم تمہیں پہلے قدم کے مقابلے میں زیادہ بلندی پر لے جاتا ہے۔ کیا عجیب راستہ ہے' یہ برادرانِ عزیز! قرآن کی مثالیں اور قرآن کی تمثیلات بڑی ہی جامع ہوتی ہیں۔

خدا نے تو اپنے آپ کو سیڑھیوں والا خدا بھی کہا ہے

یہ صراطِ مستقیم سیدھا بھی ہے اور قائم بھی ایسا ہے کہ اس سے ہر قدم پہ بلندی حاصل ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق ذی المعارج کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ آؤ! ہم اوپر کھڑے ہیں' تمہیں آواز دے رہے ہیں چلے آؤ' تم اس راستے سے آ سکتے ہو اور پھر' عزیزانِ من! کیا بات ہے اس زبان کی! سیڑھی وہی ہوتی ہے اس سیڑھی کے وہ جنہیں ہمارے ہاں ڈنڈے کہتے ہیں جب کوئی شخص اس سیڑھی کے ان ڈنڈوں پر چڑھتا ہے تو عرب ان ڈنڈوں کو درجات کہتے ہیں۔ یہ جو مدارج ہیں اور جسے آپ درجہ کہتے ہیں' یہ سیڑھی کا وہی ڈنڈا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیڑھی وہی ہوتی ہے مگر جب کوئی نیچے اتر رہا ہو تو انہی ڈنڈوں کو درکات (پستی) کہتے ہیں کہ آخری ڈنڈے پہ پہنچے ہو تو جہنم کی پستیوں میں جا گرتے ہو یعنی اس سے منہ موڑ کے اگر تم سفر حیات طے کرو گے تو ہر قدم تمہیں نیچے کی طرف لے آئے گا حتی کہ تم نار' کا جو درکِ اسفل ہے اس میں جا پہنچو گے۔ اللہ کا یہ رسول تو تمہیں بلا مزد و معاوضہ لَتَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (23:73) زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

آخر انسان اس صراطِ مستقیم کو قبول کیوں نہیں کرتے؟

آگے ایک ہی بات کہی ہے۔ کہا کہ یہ سارا قصہ جو ہم نے تمہیں بتایا ہے' یہ اس کی مخالف کیوں کرتے ہیں اور پاگل کیوں کہتے ہیں' یہ ادھر کیوں نہیں آتے' اپنے شرف سے کیوں اعراض برتتے ہیں' آخر ایسا کیوں ہے؟ کہا کہ بات صاف ہے اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُـؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوۡنَ (23:74)۔ بات صرف یہ ہے کہ اگر کوئی اس زندگی کو' یہی طبعی زندگی ہی سمجھے' تو پھر یہ سب کچھ ہوگا جو ہم نے بتایا ہے۔ انفرادی طور پر ذلت اور رسوائیاں بھی ہوں گی' اجتماعی طور پر فسادات بھی برپا ہوں گے لیکن ان کے نزدیک قانونِ مکافاتِ عمل کا کوئی تصور نہیں کہ غلط کام کا نتیجہ ہمیشہ غلط نکلے گا۔ آخرت کے یہ معنی بھی ٹھیک ہیں کہ مرنے کے بعد بھی آخرت ہے لیکن عربوں کے ہاں تو ہر بعد کا آنے والا سانس' پہلے کے مقابلے میں آخرت کہلاتا ہے' ہر بعد میں آنے والی نسل پہلے کے مقابلے میں آخرت کہلاتی ہے' ایک ہی فرد کی زندگی کے اندر جو دور آتے ہیں وہ جسے آپ مستقبل (Futurity) کہہ لیجئے' وہ جو مستقبل ہے' وہ آخرت ہے۔ یہاں ہر سانس میں آخرت ہے' زندگی کے ہر دور میں آخرت ہے' ہر نسل میں آخرت ہے' ہر قوم کے بعد دوسری قوم آتی ہے تو آخرت ہے' مرنے کے بعد کی زندگی اس زندگی کے مقابلے میں آخرت ہے۔ یہاں بات یہ ہے کہ جو سیکولر (Seculatr) نظام یا طبعی (Physical)

نظام کے ماننے والے ہیں' ان کی منزل ہمیشہ حال (Present) تک محدود ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ حال (Present) کی خوشحالیوں کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں ان کا مطمح نگاہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت مل جائے' آخرت کی خبر خدا جانے۔ لہٰذا لو! یہ بھی لو' وہ بھی لو' ارے بھئی! انجام اس کا؟ دیکھا جائے گا۔

نبی کے زیرِ تربیت تیار ہونے والی قوم کی خصوصیت

سیکولر (Secular) نظامِ حیات کے برعکس نبی ایک قوم تیار کرتا ہے' جسے وہ ضابطہ ہدایت دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کا پہلا ورق الٹیے اور اس میں دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے: **وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ** (2:4) وہ مستقبل پہ نگاہ رکھتے ہیں کہ اس ضابطہ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال (Present) کی جدوجہد سے انسان کا مستقبل (Future) روشن ہو جاتا ہے۔ وہ مستقبل (Future) جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ غالباً یہ وہ قصہ ہے جس کے لیے کہا ہے کہ Future is purchased by the Present یعنی مستقبل کو حال کی زندگی سے خریدا جاتا ہے۔ آج آپ جو کچھ کرتے ہیں وہی آپ کا آنے والا کل جو مستقبل ہے' بن رہا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ پہلی آواز تھی جس میں کہا گیا تھا کہ **وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ** (2:4) یہ قوم مستقبل پہ نگاہ رکھتی ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ وہ اب یعنی اپنا حال ترک کر دیتی ہے۔ وہ اپنا حال اس قسم کا بناتی ہے کہ اس سے جو مستقبل بنتا ہے وہ خود خوشگوار ہوتا ہے:

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے![1]

آخرت کے لمحات دراصل حال کا ہی پرتو ہوتے ہیں

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **اِنَّ الَّذِیْنَ** (23:74) یہ وہ لوگ ہیں جو **لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ** (23:74) مستقبل پہ یقین نہیں رکھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ **عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ**[2] (23:74)۔ سیڑھی کے اوپر ہم لے جا رہے ہیں'

---

[1] اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 163

[2] وہ اس راستے سے دور ہٹتے رہتے ہیں (اور ادھر آنا نہیں چاہتے)۔

یہ الٹے پاؤں نیچے اترتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پہ ایمان نہیں رکھ رہے۔ ایمان اسی کے اوپر رکھ رہے ہیں جس زمین سے گئے تھے۔ ہم اوپر کھینچ رہے ہیں' یہ پیچھے کی طرف' نیچے کی طرف' گر رہے ہیں۔ یہاں عَنِ الصِّرَاطِ (23:74) آیا ہے۔ یہ وہی صراط ہے۔ خدا جسے عذاب کہتا ہے' وہ درحقیقت انسانی اعمال کے فطری تخریبی نتائج ہوتے ہیں۔ جب ان کے ظہور کا وقت آتا ہے یا جب وہ محسوس طور پر سامنے آتے ہیں تو پھر اس وقت اس کو عذاب کہا جاتا ہے۔ کہا کہ اس کا انداز یہ ہوتا ہے۔ ہمارے مکافاتِ عمل کا پروگرام یہ ہے کہ ہم انہیں فوراً نہیں پکڑیں گے' بلکہ اس سے پیشتر انہیں وارننگ دیتے رہتے ہیں' قوموں کو تنبیہ کرتے رہتے ہیں' ہلکی ہلکی سی کچھ تباہیاں پہلے آتی ہیں لیکن انسان اس سے بھی ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (23:75) یہ چیز آتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ سمجھ لے کہ یہ غلط چیز تھی' اس کو چھوڑ دینا چاہیے' صحیح راستہ اختیار کرنا چاہیے' وہ سمجھتا یہ ہے کہ اب یہ جانے والی چیز ہے اس لیے اور زیادہ ہاتھ مار و وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہاں الفاظ یہ ہیں کہ من ضر۔ وہ جو آنے والی تباہی ہے' اس سے چھوٹا سا جھٹکا آتا ہے مگر یہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور آگے الفاظ آئے ہیں کہ فِیْ طُغْیَانِهِمْ (23:75) اپنی طغیانی میں ہوتے ہیں۔ یہ طغیانی وہی ہے جسے سیلاب کہتے ہیں تو یہاں کہا کہ پہلے ذرا ہلکی سی وارننگ آتی ہے اور پھر' اور زیادہ تیزی سے طغیان یعنی سیلاب آ رہا ہوتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کے روکنے کے لیے بند باندھ لیں' وہ اس سیلاب کے اندر اور زیادہ تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جتنا کچھ ہاتھ میں آئے' لے جاؤ' اُسے لے لو۔ اب اگلا لفظ ہے یَعْمَهُوْنَ (23:75)۔ کیا بات ہے عربی زبان کی! عربی کا ایک مادہ (Root) ہے: ع م ی۔ یہ جو ''ع م ی'' ہوتا ہے اسی سے عمی کا لفظ ہوتا ہے یعنی آنکھوں سے نابینا ہونا' اندھا ہونا اور اس کے علاوہ ایک دوسرا مادہ (Root) ہے: ع م ھ۔ اسی مادہ (Root) سے یَعْمَهُوْنَ کا لفظ ہے۔ یہ جو ''ع م ھ'' ہے یہ وہ ہوتا ہے جو بصیرت سے نابینا ہو۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ آنکھوں سے اندھے ہو جاتے ہیں نظر تو آ رہا ہوتا ہے' وہ بصیرت سے اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ لَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ [1] (23:76)۔ یعنی اس کے بعد وہ وقت آ جاتا ہے جس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 75 تک پہنچ گئے۔ 76 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀……❀……❀

---

[2] اور ہم انہیں عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

تیرھواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 76 تا 90)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰٓى اِذَا
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ
اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٨﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ
اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ
الْاَوَّلُوْنَ ﴿٨١﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٨٢﴾ لَقَدْ وُ
عِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ لِّمَنِ
الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا
تَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيْمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ
فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿٨٩﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٩٠﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1977ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 76 سے ہو رہا ہے:(23:76)۔

مادی تصورِ حیات کا دوسرا نام سیکولر نظام بھی ہے

سابقہ آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ لوگ جو غلط روش اختیار کرتے ہیں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ جو زندگی کا سیکولر Concept (تصور) ہے اور میں بار بار اس کا ذکر کرتا ہوں کیونکہ اس دور میں بات اسی سے سمجھ میں آتی ہے' اسے Materialistic Concept (مادی تصورِ حیات) بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصورِ حیات میں بات ساری اتنی ہے کہ انسانی زندگی اسی طبعی جسم کی زندگی ہے اور یہ طبعی قوانین کے تابع چلتا ہے۔ جب طبعی جسم کی یہ مشین ختم ہو جائے گی' انسان مر جائے گا تو قصہ ختم ہو جائے گا لہٰذا جو کچھ انسان کرتا ہے اس میں تمدنی قوانین اس کے اپنے بنائے ہوئے ہوتے ہیں یعنی یہ حکومت کے بنائے ہوئے انسانوں کے قوانین ہیں جو کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر کسی طرح سے ایسا کوئی انتظام کر لے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے اور سزا نہ پائے تو اس کے بعد پھر کوئی پوچھنے والا ہوتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ زندگی اسی طبعی زندگی کا نام نہیں ہے' اور آپ احباب کے سامنے اب اس چیز کو بار بار Repeat (دہرانے) کی ضرورت نہیں ہے کہ زندگی اس جسم کے مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ آگے چلتی ہے اور اس زندگی میں جو کچھ کیا ہوتا ہے حتیٰ کہ دل میں گزرنے والے غلط خیالات اور نگاہ کی خیانت تک' وہ جو کچھ آگے جانے والی چیز ہے جسے نفس یا ذات کہہ کر پکارا جاتا ہے' وہ ان تمام اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لے کر جاتی ہے اور ان کے نتائج اس کے سامنے آتے ہیں اور وہ نتائج بھگتتے ہیں۔

سیکولر نظام کا قوموں کی موت و حیات پر اثر

قرآنِ حکیم کا کہنا یہ ہے کہ یہ نظام جو ہم تمہیں دیتے ہیں' اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج اس دنیا میں بھی نہایت خوشگوار سرفرازیاں' شادابیاں اور خوشحالیاں لیے ہوئے مرتب ہوتے ہیں اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو اس زندگی میں بھی تباہیاں آتی ہیں۔ قوموں سے متعلق بھی یہی وہ قوانین ہیں جو قرآن نے دیئے ہیں۔ بالفاظ دیگر قوموں کی زندگی اور موت کے متعلق بھی قرآن نے قوانین دیئے ہیں یعنی افراد ہی کے متعلق نہیں بلکہ اقوام کے متعلق بھی۔ غلط نظام کے مطابق اپنا معاشرہ قائم کرنے والی قوم کچھ وقت کے لیے غلط تدابیر سے' جسے قرآن مکر و سعی کہتا ہے' استحصال Exploit کر سکتی ہے' دولت سمیٹ سکتی ہے' استبداد سے لوگوں کو مغلوب کر سکتی ہے اور بظاہر بہت خوشحال ہو سکتی ہے لیکن انجام کار اس سے تباہی آتی ہے۔ یہ چیزیں ہیں جنہیں قرآنِ کریم بڑی ہی شرح

وبسط سے، اسی زندگی کے تعلق سے بیان کرتا ہے لیکن جب یہ دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو اس میں دو تین بنیادی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ پھر انسان اپنے اعمال کے نتائج ہمیشہ اگلی زندگی پر، قیامت پر، اٹھا رکھتا ہے۔ یہاں کی زندگی کے ساتھ ان اعمال کے اثرات کا کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔ بہرحال یہ تو وہی سیکولر نظام ہے جس کے تابع یہاں کی زندگی رہ جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ پھر کچھ اعتقادات، کچھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مناسک، شعائر اور رسومات کو مکینیکلی ادا کیا اور کہہ دیا کہ ہم ان سے الگ ہو گئے حالانکہ یہ چیزیں مکینیکلی کر لینے سے انسان الگ نہیں ہوتا۔ الگ تو آپ اس وقت ہوں گے جب یہ مانیں گے کہ یہاں کے قوانین صرف آپ کے بنائے ہوئے یا انسانوں کے بنائے ہوئے یا اپنی حکومت کے بنائے ہوئے ہی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ قوانین ہیں جو خدا نے یہاں کی زندگی کے متعلق بھی دیئے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا ان قوانین کو یہاں بھی تسلیم کیا جاتا ہے؟ تیسری بات یہ ہے کہ مذہب میں قرآنِ کریم کی اصطلاحات کے معنی بدل جاتے ہیں۔

غلط اور متضاد تصورات کی مثال

عزیزانِ من! جب یہ تصورات مذہب میں آجاتے ہیں، تو ان کی رو سے قرآن کی جو اصطلاحات ہیں، ان کے معنی ہی بدل جاتے ہیں مثلاً جب آپ کہیں کہ مجرم کو سزا ملی تو آپ کے ذہن میں یہ بات آجاتی ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو گناہ ہوگا اور خدا کا عذاب مسلط ہو جائے گا، خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ عذاب کے اس تصور سے کچھ متعین بات ذہن میں آتی نہیں ہے۔ اب یہ جملے عام بولے جاتے ہیں کہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہے، اللہ کا عذاب آجاتا ہے، لیکن اگر ہم اس کی بجائے یہ کہیں کہ تباہی آجاتی ہے تو پھر بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ دراصل مذہب کرتا یہ ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات تو وہ وہیں سے لیتا ہے لیکن ان کا مفہوم متعین نہیں کرتا۔ جب یہ کہا جائے کہ صاحب! یہ دیکھیے، زندگی میں غریبی ہے، مفلسی ہے، ذلت ہے، رسوائی ہے، یہ سارا کچھ ہے تو کہہ دیا جائے گا کہ نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو آزمایا کرتا ہے۔ چل بھئی! قصہ ختم ہوا۔ اس کے برعکس دوسری قوم کے افراد میں جو خدا کو نہیں مانتے۔ جب ان کے اوپر یہ چیز آتی ہے تو کہتے ہیں کہ دیکھا، ان پر خدا کا عذاب آ گیا اور اگر اپنے ہاں وہی کچھ ہو تو یہ تقربِ بارگاہِ الٰہی ہو گیا، اگر ان کے ہاں عذاب آ گیا تو یہ پھر سزا نہیں کہی جاتی۔

دیکھیے یہ کتنے غلط اور متضاد تصورات ہیں جنہیں ہم سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آیت یہ آئی تھی کہ یہ لوگ جو اس طرح خدا کے قوانین مکافاتِ عمل کو نہیں مانتے، ان کی صورت یہ ہو جاتی ہے کہ وَ لَقَدْ اَخَذْنٰـهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَ مَا

يَتَضَرَّعُوْنَ ❶ (23:76)۔اب یہاں عذاب کا لفظ آیا ہے۔آپ تراجم میں بھی‘ تفاسیر میں بھی‘ دیکھ لیجیے وہ کہیں گے کہ صاحب! پہلے تو اللہ تعالیٰ تھوڑے چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیتا ہے۔کاہے کے لیے جھٹکے دیتا ہے؟ کہ پھر وہ ہماری طرف آتے ہیں یا نہیں؟ نمازیں پڑھتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے ہاں جھکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ جھکانے کے لیے‘ نمازیں پڑھوانے کے لیے آتے ہیں‘ وہ اپنا کوئی کام کرانے کے لیے ہے۔جب یہ سیدھے طور پہ نہیں مانتے تو ٹیڑھی انگلیوں سے وہ گھی نکالتا ہے اور وہ کچھ جھٹکے دیتا ہے کہ آتے ہیں یا نہیں آتے؟ اور اس کے بعد ہے کہ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (23:77) اور جب پھر اس پہ بھی وہ نہیں مانتے تو پھر وہ جناب! روڈ رولر پھیر دیتا ہے‘ پھر وہ تباہی کے دروازے‘ عذاب کے دروازے کھول دیتا ہے۔عزیزانِ من! یہ Concept (تصور) ہی غلط ہے۔اصل تو یہ ہے کہ اگر تم اپنے ہاں زندگی کا غلط نظام قائم کرو گے جس میں تکریم انسانیت نہیں رہتی تو پھر اس نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ ایک ایسی آنے والی تباہی بن جائے گا جو سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ❷ (7:182) کی شکل اختیار کر لے گا۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کا اور عذاب کا قرآنی مفہوم

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے اس لفظ کو پڑھتے ہوئے بھی کیسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پڑھنا پڑتا ہے۔یہ لفظ تدریج سے ہے یعنی یہ چیز Gradually (تدریجاً) ہوتی ہے۔پہلے یہ چیزیں ہلکی سی شکل میں آتی ہیں مثلاً مہنگائیاں ہو گئیں‘ بھوک آ گئی‘ خطرے پیدا ہوئے۔مختلف قسم کے نظام تھوڑا تھوڑا کر کے بگڑتے ہیں تاکہ وہ دیکھ لیں کہ اس غلط نظام کے یہ اس قسم کے نتائج نکل رہے ہیں اور وہ انہیں سنوار لیں یعنی اپنے نظام (Systems) صحیح کر لیں لیکن جب وہ اس طرف توجہ نہیں دیتے اور اپنی روش میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو پھر قرآن کے الفاظ میں یوں ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہیں کہ اب شدید عذاب کے پھاٹک کھل گئے ہیں۔اسے تباہی کیوں نہ کہیے۔قرآن نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ استبدالِ قومی ہے۔کہا ہے کہ اگر تم یہ نہ کرو گے تو تمہاری یہ کیفیت ہو جائے گی۔هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (47:38) تم سے کہا جاتا ہے کہ اس صحیح نظام کے استحکام کے لیے تمہیں اپنی محنت کی کمائی کو خود بطیبِ خاطر کھلا رکھنا ہو گا‘ اس سے یہ معاشرہ استوار رہے گا‘ اس سے تمہاری بقا ہو گی لیکن تمہاری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ (47:38) تم اس روپے کو سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہو۔تو یہ کہا ہے کہ جب بھی کسی نظام میں کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کے بقا اور استحکام کے لیے اس

---

❶ ہم نے انہیں عذاب میں مبتلا کیا تھا‘ تو اس پر بھی یہ اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کے سامنے نہ جھکے‘ اور نہ ہی ان کے دل میں ذرا سا بھی گداز پیدا ہوا (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص ص۔786-785)۔

❷ ہم انہیں آہستہ آہستہ‘ بتدریج‘ تباہی و بربادی کے اُس مقام تک لے آتے ہیں جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن‘ ص۔386)۔

طرح بطیبِ خاطر یہ Wealth (دولت) Open (کھلی) نہ رکھی جائے تو اس کا نتیجہ عذاب ہوتا ہے۔ اسے ہی تباہی کہتے ہیں۔ یہ تباہی آہستہ آہستہ، بتدریج آتی ہے اور اس انداز سے آتی ہے کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔

غلط نظام کا تباہ کن نتیجہ

سوال یہ ہے کہ عذاب ہوتا کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (47:38) اگر تم اسی طرح سے اس صحیح روش سے اعراض برتتے رہے اور تم میں سے ہر شخص ساری دولت سمیٹ کر اپنی ذات کے لیے بنک بھرتا رہا، تو یاد رکھو! اس کے بعد یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عذاب کی کیا تشریح ہو رہی ہے۔ یہ ہے انتہائی شکل۔ ابتدائی شکلیں تو یہ ہیں کہ تمہارے اپنے اندر ہی یہ چیزیں آئیں گی تاکہ تمہیں فطرت کی طرف سے وارننگ ہوتی رہے کہ بھئی! یہ نظام غلط ہے۔ پہلے ہلکا ہلکا سر درد شروع ہوتا ہے، اس کے بعد وہ زیادہ Painful (تکلیف دہ) ہو جاتا ہے۔ یہ چیز فطرت کے اندر ہے۔

اس کا قانون یہ ہے کہ وہ یہ چیزیں Gradually (بتدریج) کرتا ہے۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (47:38) تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی۔ ذہن میں یہ آتا ہوگا کہ وہ بہر حال جیسے ہم ہیں ویسے ہی وہ قوم آ جائے گی تو یہ تبدیلی کیا ہوئی؟ کہا کہ یہ غلط ہے۔ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) پھر وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یہ بات یوں نہیں ہے کہ ہم ایک قوم کی جگہ اسی قسم کی دوسری قوم لے آتے ہیں۔ اے کوئی چوٹھے دین والی گل تھوڑی ہیگی اے کہ اتر بابا میں چڑھاں۔ ❶ اللہ میاں کہتا ہے کہ صاحب! اتنے سال تم نے حکومت کر لی ہے۔ او ٹھیک، اتر تھلے، پنج سال پورے ہوگئے۔ ہن نویں الیکشن، سانوں آن دیو۔ ❷ یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) پھر اس قوم کی جگہ وہ قوم لیتی ہے جو اس کی مثل نہیں ہوتی۔ ❸ پھر دوسری جگہ کہا ہے کہ وَ لَقَدۡ اَهۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا (10:13) ہم نے قانونِ مہلت اور مکافات کے مطابق، اس سے پہلے، بہت سی قوموں کو تباہ کر دیا جب انہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کر کے لوگوں پر ظلم اور زیادتی شروع کر دی۔ وَ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ (10:13) ان کی طرف ہمارے پیغمبر واضح قوانین اور کھلے کھلے دلائل لے کر آئے۔ وَ مَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا (10:13)

---

❶ یہ کوئی جھولا جھلانے والی بات نہیں ہے کہ ارے بھئی! اتر، اب میری باری ہے۔

❷ نیچے آؤ، تمہارے پانچ سال پورے ہوئے۔ اب نئے انتخابات (Election) میں ہمیں آنے دو۔

❸ یہ اس لیے کہ قوموں کی موت و حیات، اور استخلاف و استبدال کا قانون (Law of Substitution and Succession) یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظامِ زندگی کی حامل ہو، وہ باقی رہتی ہے، جو غلط نظام رائج کرے، وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو۔ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے زندگی کے متعلق ان کے نظریات، اور عملی نظام کی رو سے ہوتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1193)۔

لیکن انہوں نے ان کی صداقت کو تسلیم نہیں کیا اور وہ تباہ ہو گئے۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (10:13) اسی طرح ہم سر درد کے مجرمین کو ان کے کیے کا بدلہ دیتے ہیں اور ایسی قوم لاتے ہیں جو تم سے بہتر ہوتی ہے۔ اس کے لیے استبدال و استخلافِ قومی کا قانون (Law of Succession and Substitution) یہ ہے کہ جو قوم غلط نظام قائم کرے' اس کی تباہی جاتی ہے۔ تباہی کی ایک شکل یہ ہے کہ دوسری قوم آ جاتی ہے اور وہ قوم اس سے بہتر ہوتی ہے' جبھی تو وہ اس کی جگہ لیتی ہے۔ اس جگہ لینے والی قوم کے متعلق کہا ہے کہ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (10:14) پھر ہم نے تمہیں تمکن عطا کیا لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14) تا کہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔

یہ جو قرآن نے ایسا صاف غیر متبدل قانون دیا ہوا ہے کہ ساری تاریخ ہمارے سامنے اس کی شہادت دیتی ہے لیکن جونہی ہم نے عذاب کا یہ تصور مبہم رکھا اور اس کے بعد اس کو ہم نے آخرت پر اٹھا رکھا تو اس زندگی کے ساتھ تو تعلق ہی نہ رہا' نہ ہی خدا کی ان ہدایات کا رہا حالانکہ یہ ہدایت خداوندی اس لیے آتی تھی کہ اس دنیا کی زندگی میں تم کیسے عمل کرتے ہو۔ کس قدر جامع الفاظ میں یہ شخص کہہ جاتا[1] ہے کہ اس سارے سلسلہ رشد و ہدایت کا' رسالت کا' بعثتِ انبیا کا' خدا کی طرف سے یہ قانون آنے کا' مقصد یہ تھا کہ

از کلید دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا جائے۔ بات عذاب کے لفظ سے ہوتی ہے۔ یہ تو انتہائی شکل ہے اور قرآن نے جو ابتدائی شکل بتائی ہے میں اس کی تفصیل میں اس مقام پہ آؤں گا جب قرآن میں عذاب کا لفظ آئے گا۔ قرآن کے اندر درمیان میں یہ ضمنی بات آ جاتی ہے تو ضمناً ہی کچھ کہنا ہوتا ہے۔

ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آنے کی صورت کیا ہوتی ہے؟

سنیے' عزیزانِ من! وہ جو کہا تھا کہ ابتداً معاشرے کے اندر اس تباہی سے پہلے کہ' استبدال قومی ہو' تمہیں ہلکے ہلکے سے جھٹکے لگتے ہیں' تم خفا ہو جاتے ہو مگر صحیح نظام نہیں لاتے تو تمہاری جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے' اس جگہ لینے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ انہیں اٹھا کے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ جگہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسری قوم والے غالب آ جاتے ہیں' تم پہ مسلط ہو جاتے ہیں' وہ حکمران ہو جاتے ہیں' تم محکوم ہو جاتے ہو۔۔ اس سے پہلے کی جو کیفیت بیان کی ہے اس میں پہلے ہلکے ہلکے جھٹکے آتے ہیں۔ یہ بھی وہی ہے جسے عذاب کہا ہے۔ دیکھیے' عزیزانِ من! کن الفاظ میں قرآن کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ پھر ایسے غلط معاشرے میں ہوتا ہے' جہاں عدل نہیں ہوتا' تکریم انسانیت نہیں

---

[1] یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ہوتی' انسانوں کی Exploitation (سلب ونہب) ہوتی ہے۔ الغرض غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔

قوم وملک کی تباہی کی شکلیں

استبدالِ قومی کے اس سلسلے میں (6:65) بڑی اہم آیت ہے۔ اس میں کہا کہ **قُلْ** (6:65) اے رسول! ان کو Warn (تنبیہ) کردو' ان کے لیے یہ اعلان کردو کہ **هُوَ الْقَادِرُ** (6:65) اس کے قانون کے اندر پاور ہے' طاقت ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے ''القادر'' کہا ہے۔ آگے کہا کہ وہ **اَلْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ** [1] (6:65)۔ اس آیت میں عذاب کا لفظ آ گیا' اگر حکمران عدل وانصاف اور تکریم انسانیت سے کام نہیں لیتے تو قوم کے عذاب کی ایک شکل یہ ہے کہ تمہارے اوپر اس قسم کے حاکم مسلط ہو جائیں جو تمہارا کچومر نکال دیں۔ یعنی حاکم کی ایک شکل یہ ہوتی ہے یا پھر یہ شکل ہوتی ہے کہ **اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ** (6:65) یا پھر ان کے حاکموں کے ہاتھوں تنگ آنے کے بعد' ان کے پاؤں تلے روندے ہوئے عوام' ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قوم کے لیے یہ بھی تباہی ہوتی ہے۔ یہ اس عذاب کی دوسری شکل ہوتی ہے کہ یہ جو **تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ** (6:65) ہیں یعنی پاؤں تلے روندے ہوئے ہیں' یہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے قوم کی تباہی ہوتی ہے' ملک کی تباہی آتی ہے۔ یہاں بات تو عذاب کی ہے جس کے معنی تباہی ہیں۔ یاد رکھیے! کسی قوم یا ملک یا مملکت کی تباہی کے لیے یہ دو شکلیں ہمارے سامنے آ گئیں۔ ابھی تیسری شکل بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ **اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا** (6:65) یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ یہ جو اوپر کا لیڈروں کا طبقہ ہے' اس کا ہر لیڈر اپنے ساتھ نیچے کے طبقے کے کچھ لوگ ملا لیتا ہے' ان کی پارٹیاں بن جاتی ہیں' اور پھر **وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ** (6:65)۔ ایسی صورت میں پھر کوئی دوسری قوم آ جاتی ہے اور اسے اچک کر لے جاتی ہے۔ یہ استبدالِ قومی تو پہلے بتا دیا ہے کہ پھر ملک کے اندر یہ کچھ ہوتا ہے۔ اس عذاب کی تیسری شکل یہ ہے کہ **وَ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ** (6:65) آپس میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ پارٹیاں بنتی کیسے ہیں؟ قرآنِ کریم نے کیا عجیب چیز کہی ہے! پہلے تو کہا: اوپر کا طبقہ' پھر کہا: نیچے کا طبقہ۔ وہ تو دونوں الگ الگ رہتے ہیں اور تیسری شکل یہ ہے کہ اوپر والوں میں سے کوئی ان نیچے والوں کو اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ یہ يَلْبِسَكُمْ ہے۔ اس طرح وہ ایک مخلوط شکل ہو جاتی ہے۔ اب یہ ان کے Followers (متبعین) ہیں اور یہ ان کا لیڈر ہے۔ یہ عوام ہیں اور اس طرح یہ ان کا رہنما ہے۔ یہ رہنما اپنی اپنی الگ الگ پارٹیاں بنا کے ایک دوسرے کے ساتھ الجھ پڑتے ہیں کہ خانہ جنگی کی نوبت آ جاتی ہے۔ یہ تباہی کی آخری انتہائی شکل ہوتی ہے۔

---

[1] معاشرے کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اس کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

کہا کہ یہ ابتدائی شکلیں ہوتی ہیں اور خانہ جنگی ان کی انتہائی شکل اور پھر آگے وہ استبدالِ قومی ہوتا ہے۔ پھر کوئی دوسری قوم جو ان جیسی نہیں ہوتی 'اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اگر وہ بھی ایسی ہوتی یعنی ان کے ہاں بھی اسی طرح خوں ریزیاں اور ظلم و بربریت' خانہ جنگی اور سلب ونہب ہورہی ہوتی تو اس نے آ کے کیا حصہ لینا ہے۔ جو قوم تمہارے جیسی نہیں ہوتی وہ قوم آ جاتی ہے۔

تباہ حال قوم کے خلاف ظالم قوموں کا اتحاد اور ان کا طریقِ کار

قرآن نے ایک جگہ اور بھی بڑی گہری بات کہی ہے۔ سورۃ الانعام یعنی (6:130) میں کہا ہے کہ آخر ہوتا تو یہی ہے جو ہم نے کہا ہے کہ کوئی دوسری قوم جو تمہارے جیسی نہیں ہوتی' آ جاتی ہے۔ وہ تمہیں اچک کر لے جاتی ہے۔ کہا کہ اگر کوئی ایک قوم ایسی نہ ہو جس میں اتنی ہمت نہ ہو تو بعض مختلف قومیں' جن میں سے ہر ایک ظالم قوم ہوتی ہے وہ آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں۔ اب دیکھیے کہ یہ کیفیت ہے کہ وہ ظالم قومیں' جب کسی ایک قوم کو اس طرح سے دیکھتی ہیں کہ وہ ہمت نہ ہونے کے باعث یوں الجھی ہوئی ہے تو **وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ** (6:129) یہ جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں اس کی بنا پہ یہ مختلف ظالم قومیں آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں اور مل کر ان کے متحدہ محاذ بنا کر انہیں اچک کر لے جاتی ہیں یعنی ملاحظہ کیجیے کہ آپس میں تو ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن اس مقصد کے لیے کہ اس قوم کو اچک کے لے جانا ہے' وہ ایک متحدہ محاذ بنا لیتی ہیں حالانکہ ایک قوم جو آنی تھی اس کے لیے کہا تھا کہ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی' بہتر ہوگی لیکن کیا کیا انداز ہیں صاحب! اگر وقت ہو تو میں آپ کے سامنے تاریخ بیان کروں' بتاؤں کہ کس طرح سے تاریخی واقعات وشواہد اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ عزیزانِ من! کہیں تو کوئی ایک ہی قوم ہوتی ہے جو جھپٹ لیتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں جتنی قومیں ہیں جنہیں آج کل ترقی پذیر قومیں (Developing Countries) کہا جاتا ہے' یہ جن کو نئی نئی آزادیاں دی جاتی ہیں' پھر ان آزادیوں کے بعد جو کچھ ان کا حشر کیا جاتا ہے وہ یہی قومیں ہوتی ہیں' کبھی تو الگ الگ ہوتی ہیں اور کبھی یہ آپس میں متحدہ محاذ بنا کے اتحاد کر لیتی ہیں۔ یہ جتنی نئی نئی قومیں دنیا میں آزاد ہوئی ہیں آپ دیکھیے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔ بات تو اس کی سی نہیں ہے لیکن ہے بڑی دلچسپ۔ یہ جنہیں نئی آزادیاں دیتے ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ پکار اٹھتی ہیں کہ

مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے!

دنیائے انسانیت میں سب سے بڑا ظلم انسان کی تذلیل کرنا ہے

اس Colonization (کالونیاں بنانے) کے بعد یہ جو آزادیاں دے رہے ہیں وہ یہی ہے کہ مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا۔ اف!

عزیزانِ من! یہ بات سوچ کر میری چیخ نکل جاتی ہے: مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے! کس قدر سچ کہا ہے قرآنِ کریم نے کہ کَـذٰلِکَ نُـوَلِّـیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا (6:129)۔ تو اس وقت یہ جو ظالم قومیں ہیں یہ کم بخت ان کو لوٹنے کے لیے آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں۔ کہا کہ یہ ہیں عذاب کی شکلیں، جو آیا کرتی ہیں۔ یہ تو ساری باتیں یہیں کی، کی جا رہی ہیں۔ یہ ہوتا ہے قوموں میں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے سب سے بڑا جرم یہ ہے، عزیزانِ من! کہ تکریمِ انسانیت نہیں ہوتی۔ یہاں انسان کی عزت، انسان ہونے کی جہت سے نہیں کی جاتی۔ جونہی کسی ابن آدم کی تذلیل ہوتی ہے، خدا کا عرش ہل جاتا ہے۔

عزیزانِ من! دنیا میں کوئی ظلم اس سے زیادہ ظلم نہیں ہے کہ کسی انسان کی تذلیل کی جائے وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (17:70)۔ بڑا اہم انعام ہے کہ ہر ''ابن آدم، ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہے۔'' قرآنِ کریم نے عذاب کی یہ شکلیں بتائی ہیں۔

انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوت کا تذکرہ

کہا ہے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ ایسے ہی نہیں ہے کہ ہم نے کچھ کہہ دیا اور ہمارا کچھ جی چاہتا تھا کہ عذاب میں مبتلا کریں تو وہ آ گیا اور یہ کہ یہ سمجھ میں بھی نہ آئے۔ کہنے لگے کہ یہ بات ہی نہیں ہے کہ یہ چیز سمجھ میں نہ آئے۔ کہا کہ هُـوَ الَّـذِیْٓ اَنْشَاَ لَـکُـمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (23:78) ان قوموں میں سننے، دیکھنے، بھالنے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ان کے اندر سماعت، بصارت کی صلاحیتیں موجود تھیں تو اس سے مراد یہ جتنے بھی ذرائع ہوتے ہیں جن سے انسان کو انفرمیشن ملتی ہے وہ سب آ جاتے ہیں اور اس سے مقصود ہوتا ہے کہ انسان تک انفرمیشن پہنچنی چاہیے، اس کے سامنے معلومات آنی چاہئیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے، باہر آپ کے دوست کے ساتھ کچھ ہو رہا ہو، آپ کو علم ہی نہیں ہے، اس پہ اگر کوئی چیختی آواز آئے گی تو اس سے آپ سمجھیں گے کہ کچھ ہوا ہے۔ یہ انفرمیشن ہے۔

سب سے پہلے تو انفرمیشن (معلومات) کا آنا ضروری ہے۔ یہ جو سمع بصر قرآن کہتا ہے، یہ اطلاعات اور معلومات کے ذرائع ہوتے ہیں۔ اس سے آگے پھر آپ کے اندر فیصلے کرنے والی ایک چیز اور ہے مثلاً چیخ کی آواز آئی اور آپ نے یہ پہچانا کہ وہ آپ کے دوست کی آواز ہے۔ فیصلہ کیا کہ فوراً مدد کے لیے جانا چاہیے۔ یہ آپ کے کان اور آنکھ کا فریضہ نہیں تھا۔ اندر ایک اور چیز ہے۔ اسے قرآن ''افـئـدة'' کہتا ہے۔ اس کا کچھ نام رکھ لیجیے۔ یہ تو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ صاحب! ایک Term (اصطلاح) ہے جو اس نے رکھی۔ آج بیسویں صدی میں علم اتنی ترقی کر گیا ہے اور پھر سائیکولوجی (علم نفسیات) وغیرہ اتنی آگے بڑھ گئی ہیں۔ اس چیز کا نام ابھی تک متعین

نہیں ہو سکا کہ وہ ہے کیا جو اندر فیصلہ کرتی ہے۔ پہلے انہوں نے اس کے لیے مائنڈ (Mind) کا لفظ قائم کیا تھا۔ آہستہ آہستہ، گھس گھسا کے پھر اس کے معنی ہی کچھ اور ہو گئے۔ آپ دیکھیے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟ اس سے کچھ پوچھا ہے۔ اور پھر اس Mind کے لفظ سے انہوں نے Adjective (اسم صفت) بنایا۔ وہ مینٹل ہوا اور پھر وہ مینٹل ہاسپٹل ہوا تو پاگل پن کی بات ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لیے آج کوئی اور لفظ ڈھونڈ لیجیے۔ سائیکولوجی والوں نے Psyche کا ایک لفظ تو ڈھونڈا ہے۔ امریکہ میں سائیکولوجی والوں نے کمرشل سائیکولوجی کی اصطلاح وضع کر لی۔ آج وہاں تو خدا بھی کمرشل ہوتا ہے مگر بات وہاں بھی نہیں بنی۔

قرآنی لفظ افئدہ کا اور شکر کا مفہوم

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے بھی ''قلب'' اور ''افئدہ'' کے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عربی زبان وسعت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں قلب عام طور پہ اس چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کا تعلق Intellect یعنی ادراک سے، عقل اور فہم سے اور شعور سے ہو۔ افئدہ کا لفظ وہاں استعمال ہوتا تھا جہاں جذبات کا تعلق ہو۔ اس کے معنی سوز و گداز ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دو باتیں تھیں لیکن بہر حال قرآن سمع اور بصر اور افئدہ کہتا ہے۔ یہ قوموں کو معلوم تھا، یہ سارا کچھ ان کے سامنے ہو رہا ہے۔ تاریخی شواہد ان کے پاس تھے لیکن اس کے بعد قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ (23:78) بہت تھوڑے ہوتے ہیں، جو ان کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ شکر کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ یہ یا اللہ! شکر تیرا والی زبانی بات نہیں ہے۔ یہ ان کے صحیح استعمال کی بات ہے۔ کہا کہ بہت تھوڑے ہیں جو ان کا صحیح استعمال جانتے ہیں بلکہ استعمال صحیح جاننا تو رہا ایک طرف، آپ کو معلوم ہے کہ یہ سمع اور بصر اور افئدہ کا صحیح استعمال ہی نہیں کرتے یا یوں کہیے کہ یہ انہیں استعمال ہی نہیں کرتے۔

تقلید پرست قوموں کی زبوں حالی

عزیز برادران! اب میں نے یہاں دو الفاظ ''قلب'' اور ''افئدہ'' استعمال کیے ہیں۔ اب ایک تو وہ لوگ ہیں جو سمع اور بصر کا استعمال تو کرتے ہیں لیکن ان کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ چلیے اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہی سہی ان کے ہاں عقل خود بیں تو ہوتی ہے۔ عقل جہاں بیں تو بڑی چیز ہے۔ وہ کچھ اپنا فائدہ تو کرتے ہیں۔ ایک وہ قوم ہوتی ہے جو ان سے کام ہی نہیں لیتی۔ یہ وہ قوم ہے جن کے ہاں تقلید ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ یہ قوم انسانیت کی سطح پہ نہیں پہنچتی۔ یہ بھیڑیں ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ مقلد بھیڑ ہوتی ہے۔ کسی پچھلی بھیڑ سے پوچھو کہ آگے کیوں جا رہی ہو، وہ کہتی ہے اگلی جو جا رہی ہے اس لیے میں بھی جا رہی ہوں اور جو سب سے آگے ہے اس سے پوچھو تو وہ ''اوہوں'' کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ جواب تو اس کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ بس وہ چلی جا رہی ہیں۔

قرآنِ حکیم کے غلط تراجم کی ایک واضح تر مثال

کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن ان کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179)۔ اس آیت کا عام ترجمہ یہ کرلیا جاتا ہے کہ ''ہم نے پیدا کیا ہے، بہت سے لوگوں کو، جہنم کے لیے۔'' چلو، بھئی! قصہ ہی ختم۔ پیدا ہی تم نے انہیں جہنم کے لیے کیا تو وہ بیچارے کیا کریں گے، تمہارے علی الرغم وہ کیسے جنت میں جاسکتے ہیں؟ اس کے باوجود وہ ساری عمر جنت میں جانے کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دیکھو تو سہی تو کہتا ہے کہ یہ ''پیدا کیے ہیں'' ''نمازاں پڑھنے آں، روزے رکھنے آں، اسی جنت اچ ضرور جاکے رہنا اے۔''[1] بس ایک لفظ کا ترجمہ کر دینے سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''تم ایسے لوگ دیکھو گے جن کی زندگی بتا دیتی ہے کہ یہ تو ہیں ہی جہنم والے۔'' صاف نظر آتا ہے بھئی! کہ یہ کون ہیں۔ پھر کہوں کہ یہاں صاف دکھائی دتیا ہے کہ یہ تو ہیں ہی جہنم والے شخص۔ یہ وہ ہیں کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) ہم نے انہیں دل دیا ہے، سمجھنے کی صلاحیت دی۔ یہ اس صلاحیت کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ یہ تھا وہ جو (23:78) میں کہا تھا کہ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (23:78) تم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ صحیح تو یوں ہے کہ وہ اس کا صحیح استعمال ہی نہیں کرتے۔

انسان اور حیوان میں صرف بصیرت کا فرق ہے

ان کے لیے پھر بھی توقع تھی کہ اگر صحیح اور غلط میں کبھی بھی ان کے سامنے امتیاز آ گیا تو وہ ظالم کی کلائی مروڑ دیں گے کیونکہ وہ اس کا استعمال تو کرتے ہیں، تلوار چلانا تو جانتے ہیں، آج وہ تلوار مظلوم کے سینے میں گھونپتے ہیں، جب بھی کبھی بات سمجھ میں آ گئی تو پھر وہ اس سے ظالم کی کلائی مروڑیں گے اور جسے یہ تلوار چلانا آتا ہی نہیں، اس کو استعمال ہی نہیں کرنا آتا، تو وہ کیا کرے گا۔ یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے سمجھنے کی صلاحیت تو دی۔ وہ اس سے کام ہی نہیں لیتے، اچھا جی وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) ہم نے آنکھیں دی تھیں کہ دیکھ کے چلا کرو، وہ آنکھیں کھولتے ہی نہیں، ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے بصارت اور بصیرت میں کتنا فرق کر دیا ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ فزیکلی وہ آنکھ نہیں کھولتے اور فزیکلی چیزوں کو نہیں دیکھتے۔ وہ آنکھیں تو کھلی رکھتے ہیں، پھر وہ کیا ہے جس کو کہا ہے کہ استعمال نہیں کرتے۔ بصیرت ہے جس کو کہتے ہیں کہ آنکھیں نہیں کھولتے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7:179) ہم نے کان دیئے تھے کہ سنا کرو، وہ اس سے سننے کا کام ہی نہیں لیتے۔ کہا کہ یہ تمہیں چلتے پھرتے نظر آئیں گے کہ انسان ہیں۔ مگر اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (7:179) انسان نہیں، یہ تو بالکل حیوان ہیں۔ عزیزانِ من! ''انعام'' کہہ کر اگلی بات یہ کہہ

---

[1] (ہم) نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، ہم جنت میں ضرور جا کر رہیں گے۔

دی کہ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) یہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ حیوان اپنی جبلت (Instinct) کے تقاضوں کے مطابق تو چلتا ہے' فطرت (Nature) نے اس کے اندر جو Instinct (جبلت) دی ہوئی ہے وہ کبھی اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ جیسا میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ شیر اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود جنگل میں اگر اس کے آس پاس انگوروں کی بیلیں ہوں اور اُن کے خوشے بھی لٹک رہے ہوں' تو بھی وہ بھوکا مرجاتا ہے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھتا' اس لیے کہ یہ چیز اس پہ حرام ہے۔ وہ رزقِ حرام نہیں کھا سکتا۔ وہ گوشت کی تلاش کرے گا۔ بکری کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی خواہ کتنے ہی دنوں کی بھوکی کیوں نہ ہو۔ وہ حرام اور حلال میں تمیز کرتی ہے۔ یہ ہیں بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ عقل وفکر سے کام نہ لینے کے اعتبار سے تو کہا کہ حیوان کی مانند ہے بلکہ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) اس سے بھی زیادہ گیا گزرا' اس لیے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں۔ اور اس قسم کے انسان' ان حدود سے بھی اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) بے خبر رہتے ہیں۔ اس سے بھی اضل' اس لیے کہ ان کے پاس یہ صلاحیت تھی نہیں کہ وہ اس میں امتیاز کر سکتے۔

اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے پاس یہ صلاحیت ہے مگر وہ اس صلاحیت سے کام نہیں لے رہا۔ یہ ہے وہ کہ جو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں کہ جہنم میں جانے والے ہیں اور یہاں تو (7:179) میں لمبی بات کی ہے۔ ایک اور مقام ہے جہاں قرآن اس سے بھی مختصر تر الفاظ میں بات کہہ گیا ہے۔ سورۃ الملک میں کہا کہ جب یہ لوگ گروہ در گروہ تباہیوں کے جہنم میں ڈالے جائیں گے تو اس سے چیخ وپکار کی کرب انگیز آوازیں سنائی دیں گی اور وہ جہنم بڑا پر جوش اور طوفان انگیز ہوگا (67:7)۔ ایسا طوفان انگیز کہ یوں دکھائی دے گا گویا وہ جوشِ غضب سے پھٹ جائے گا۔ جب کوئی قوم اس میں ڈالی جاتی ہے تو اُس سے جہنم کے چوکیدار پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آیا تھا جو تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا (67:8)؟ عزیزانِ من! قرآن کا بات سمجھانے کا محاکاتی انداز ہے۔ وہاں ان سے جہنم کے داروغے پوچھیں گے کہ کیا کوئی ایسا تمہارے پاس نہیں آیا تھا جو بتاتا کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور غلط راستہ کون سا ہے' انسان جہنم میں کیوں چلا جاتا ہے اور جنت میں جانے کا کون سا راستہ ہے؟ کیا کوئی بتانے والا نہیں آیا تھا؟ ایسی صوت بھی تو ہو سکتی ہے کہ کوئی بتانے والا آئے ہی نہیں۔ کہا کہ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ (67:9) وہ کہتے ہیں کہ ہاں! ہمارے پاس ایسا آگاہ کرنے والا آیا تھا لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے اس کی بات کو سچ نہ مانا۔ اس سے کہا کہ فَکَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ (67:9) تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خود اپنی طرف سے ہی یہ باتیں بنا کے کر رہے ہو۔ یہ کوئی خدا کا حکم نہیں ہے' اس قسم کے احکام وہ بھی نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اسے یونہی جھٹلا دیا۔ ہم نے کہا کہ تم نے سوچا ہی نہیں' ہم تمہیں کیا کہیں! قالوا وہ کہیں گے کہ لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (67:10)۔ یہاں ''نسمع'' اور ''نعقل'' کے دو الفاظ آئے ہیں جن سے ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ انہوں نے

کہا کہ اگر ہم ان کی بات دل کے کانوں سے سن لیتے "نسمع" اور پھر اس پہ غور کر لیتے "نعقل" تو آج کبھی جہنم میں نہ آتے۔ بات تو ساری سن لینے اور غور کرنے کی ہے۔ اور اُدھر وہ جو جنت میں جانے والے ہیں ان کے لیے قرآن میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ **سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا** [1] (24:51) یہ "سمعنا" کاہے کے لیے ہے؟ اس سننے میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک تو یہ سننا ہے جسے آپ Hearing کہتے ہیں۔ یعنی میں نے آواز نکالی آپ کے کان میں پہنچ گئی۔ یہ تو آپ کو کوئی Effort (کوشش) ہی نہیں کرنا پڑی۔ وہ تو اس کا قانون ہے جس میں وہ آواز آپ کے کان کے اندر خود چلی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے دو الفاظ ہیں۔ ایک Hearing ہے اور دوسرا Listening ہے۔ Listening میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اللہ کہہ رہا ہے اسے توجہ سے سنا جائے' اس پہ غور کیا جائے۔ پھر یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ سمعنا کے معنی یہ ہوتا ہے۔ یہاں (67:10) میں کہا ہے کہ ہم اگر توجہ سے سنتے جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اور اس کے اوپر پھر غور و فکر کرتے' ہم عقل سے کام لیتے تو اس کے بعد ہے کہ **مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ** (67:10) آج اس جہنم میں کیوں ہوتے؟ کس قدر Definite (متعین) بات ہے کہ آج ہم جہنم والوں کے اندر ہوتے ہی نہیں۔ کہا یہی ہے کہ اگر عذاب آیا تو یہ بات نہیں ہے کہ یہ سمجھ سوچ نہیں رکھتے' سب جانتے ہیں' سمجھ سوچ رکھتے ہیں مگر مفاد پرستیوں کے جذبات اس قدر طوفان کی طرح امڈے چلے آتے تھے کہ وہ دوسری طرف دیکھنے یا سننے کی فرصت ہی نہیں دیتے تھے اگر کسی کی بات سنتے بھی تو اس پہ غور و فکر نہیں کرتے تھے' کرتے بھی تھے تو تکذیب کرتے تھے کہ نہیں صاحب! کہاں ہوتا ہے' جانے دو۔

سامانِ زیست کی اس قدر فراوانی اور انسان کی غلط جذباتی کیفیت کا نتیجہ

قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ** (23:79) تمہیں پیدا کیا تو ہم نے زمین پر اتنا سامانِ زیست پھیلا دیا۔ بس یہی چیز تمہارے لیے عذاب کا موجب بن گئی۔ یہ جو کچھ پھیلایا تھا' اگر تم اسے پوری نوعِ انسانی کے لیے کھلا رہنے دیتے تو کبھی یہ تباہی نہیں آتی۔ وہاں تم نے جا کر جتنا جتنا کسی سے بن پڑا اس نے سمیٹنے کی فکر کی' یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس پہ کوئی مواخذہ نہیں کرے گا' کوئی گرفت نہیں کرے گا۔ تم بھول گئے کہ **وَ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ** (23:79)۔ تمہارا ہر قدم تو ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے' مگر یہ تم ہو کہ اس کے متعلق سوچتے ہو کہ کوئی پوچھنے والا' مواخذہ کرنے والا ہی نہیں ہے حالانکہ یہ کہا گیا ہے کہ **اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:156);(2:46) یہ اپنے قدم سے کشاں کشاں اس کی طرف چلے آ رہے ہیں' خود بخود اس طرف چلے آ رہا ہے۔

---

[1] ہم نے اس بلاوے کو سن لیا' اور ہم اس کی فرمانبرداری کے لیے تیار ہیں۔ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24:51) یہ ہیں وہ لوگ جن کی کھیتیاں بار آور ہوں گی اور وہ کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 809)۔

قوموں کی موت وحیات خدا کے عطا کردہ پیمانوں کے مطابق ہوتی ہے

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ اس کی بارگاہ کی طرف چلے آ رہے ہیں هُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ (23:80) جس کے قانون کے تابع قوموں کی موت وحیات چلتی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم پہ سورج طلوع ہوا ہے اور روشنی آ گئی ہے تو ہم پہ رات نہیں آئے گی اور یہ جن کو ہم نے تاریکیوں میں رکھا ہوا ہے' ان پہ کہیں سحر طلوع ہی نہیں ہوگی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تاریکی اور روشنی' یہ دن اور رات ان کے قوانین کے تابع چلتے ہیں۔ یہ تو استبدال ہے کہ لَـهُ اخۡتِلَافُ الَّیۡـلِ وَ النَّهَارِ (23:80) یہ دن ہے اور اس کے بعد رات بھی ہے' اور جن پہ رات ہے اس کے بعد دن بھی ہے۔ یہ ان کے قوانین کے تابع نہیں ہوتا۔ یہ جسے استبدالِ قومی کہا گیا ہے' یہ قوموں کے اندر تبدیلیاں ہیں' جو ہمارے قوانین کے تابع واقع ہوتی ہیں اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (23:80) یہ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

جب ہم لیل ونہار کا تغیر کہتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چوبیس گھنٹے کے دن اور رات ہیں۔ اس میں تو عقل سے کام لینے کا کچھ سوال ہی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کہتا یہ ہے کہ یہ جو تغیرات ہیں' یہ ہمارے قوانین کے تابع واقع ہوتے ہیں۔ ان سے یہ کچھ کہو اور انہیں کھل کر بتا دو کہ عقل وفکر سے کام لو مگر یہ ہیں کہ بَـلۡ قَـالُـوۡا مِثۡـلَ مَا قَالَ الۡاَوَّلُوۡنَ (23:81) کسی دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب! دیکھنا ذرا کتاب میں کہ ہمارے اسلاف نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔ قرآنِ کریم ان سے کہتا ہے کہ عقل وفکر سے کام لو مگر وہ ہیں کہ بھیڑ کی طرح کرتے ہیں مثلاً اگلی بھیڑ جدھر چلی جا رہی ہے' وہ بھی اسی سمت چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ اس قسم کی باتیں کرنے والے ہنستے ہی رہتے ہیں' اس قسم کے ڈراوے دیتے ہی رہتے ہیں۔ قَـالُوۡۤا ءَاِذَا مِتۡـنَـا وَ كُـنَّا تُـرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ (23:82) یہ کہہ رہا ہے کہ مر جاؤ گے' مٹی اور ہڈیوں کا ڈھیر ہو جاؤ گے تو پھر بھی اٹھائے جاؤ گے' زندگی ہوگی' تم سے پوچھا جائے گا' تمہارا مواخذہ کیا جائے گا' حساب کتاب ہوگا' Accountability (جوابدہی) ہوگی۔ لَـقَـدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنۡ قَبۡلُ (23:83) اس سے پہلے ہمارے ہاں کے اسلاف کو بھی یہ کچھ کہنے والے آئے تھے۔ کہتے چلے گئے' یہ شخص بھی یہی دہرا رہا ہے جو ہم سے یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ کہا کہ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡـرُ الۡاَوَّلِیۡنَ (23:83) یہ وہ کہانیاں ہیں جو شروع سے اسی طرح سے چلی آ رہی ہیں' بس کہانیاں ہیں جو کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! گھڑی پرانی ہو جائے تو اس کا ایک فائدہ تو ہوتا ہے کہ چلنی بند ہو جاتی ہے۔ جہاں سے ہم نے شروع کیا تھا' میری گھڑی اب بھی وہیں کھڑی ہے' تو اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ میں ابھی سمجھتا ہوں کہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ [1]

---

[1] یاد رہے اس زمانے میں درس ڈیڑھ گھنٹے کا ہوا کرتا تھا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک خدا تعالیٰ کو ماننے کا ایک الگ تصور ہے

عزیزانِ من! کہا کہ بات یہ نہیں ہے کہ وہ کمیونسٹ ہیں' یہ ملحد ہیں' اور خدا کو نہیں مانتے۔ یہ بات پہلے بھی آ گئی ہوئی ہے مگر وہ آیات آج آئی ہیں۔ اس لیے اسے میں دہرادوں کیونکہ وہ بات کہ میں خدا کو مانتا ہوں بڑی بنیادی ہے' عزیزانِ من! ہم سب یہ بات کہتے ہیں کہ ''میں خدا کو مانتا ہوں'' کیا کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ خدا کو مانتا ہوں کے معنی کیا ہے؟ اسے دہرادوں جو میں نے اس دن نزولِ قرآن کے جشن کے وقت کہا تھا۔ نزولِ قرآنِ کریم کے وقت رسول اللہ ﷺ کے سامنے اہل کتاب تھے' یہودی تھے' نصاریٰ تھے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ وہ خدا کو مانتے تھے' وحی کو مانتے تھے' رسولوں کو مانتے تھے' کتابوں کو مانتے تھے' آخرت پہ بھی ایمان رکھتے تھے پھر بھی انہیں دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ' خدا پر ایمان لاؤ اور میں نے کہا کہ جنہیں ہم آج قریش کہتے ہیں یا جنہیں مشرکین کہا جاتا ہے وہ اہل کتاب سے الگ کہا جاتا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ وہ بھی خدا کو مانتے تھے۔ لمبی چوڑی تاریخ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے والد ماجد کا نام تو عبداللہ تھا' اللہ کو وہ بھی مانتے تھے یعنی ان کے ہاں نام بھی اللہ ہی تھا۔ وہ اس عربی زبان میں اللہ کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود ساری عمر حضور ﷺ ان کو دعوت دیتے رہے کہ آؤ' اللہ کو مانو۔ یہ کیا بات ہے؟ یورپ کے سارے سائنٹسٹ خدا کو مانتے ہیں۔ اس میں چند ایک مستثنیات نکلیں گی کہ جو یوں نہیں مانتے لیکن ان کے ہاں بھی لفظ کا فرق ہے۔ وہ خدا نہیں کہتے وہ اس کو قانونِ فطرت کہہ دیتے ہیں۔ چلیے' باقی تو سارے خدا کو مانتے ہیں تو پھر آپ بھی کہتے ہیں ہم خدا کو مانتے ہیں' وہ بھی کہتے ہیں خدا کو مانتے ہیں۔ انہیں آپ کافر کہتے ہیں' تو وہ کیا بات ہے' وہ تو انکار نہیں کرتے۔ یہ جو ایک لفظ ماننا ہے' اس کے لیے سن رکھیے کہ یہ الفاظ' بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں کیونکہ ان سے Self deception (خود فریبی' فریبِ نفس) ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ بات کہ انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا ہے' وہی ہے جس کا ہم سے پہلے' ہمارے آباؤ اجداد سے' اسی طرح وعدہ ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن آج تک کسی نے مردے کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا اس لیے جو کچھ ہم سے کہا جا رہا ہے بجز ایں نیست کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں دہرایا جا رہا ہے۔ تم ان سے اس باب میں زیادہ بحث نہ کرو۔ ان کے نظامِ زندگی کے متعلق بات کرو۔ ان سے پوچھو کہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهَآ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (23:84) اگر تم جانتے ہو تو یہ بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:85) یہ تسلیم کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ تو پھر ان سے کہو کہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ قُلْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (23:85) کیا اس کے بعد حقیقت کو بھی سامنے رکھتے ہو یا بس اتنی سی بات ہی کہہ دیتے ہو کہ ہاں ہاں خدا نے وہ بنایا ہے؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (23:86) ان سے پوچھو کہ کائنات کی بلندیوں میں

یہ جو اتنے عظیم فضائی کرّے ہیں، ان کے اوپر کس کا کنٹرول ہے؟ سَيَقُولُوْنَ لِلّٰهِ (23:87) کہیں گے کہ اللہ کا کنٹرول ہے۔ وہ تمام یہ کہتے ہیں کہ

Sovereignty in the outer Universe belongs to Allah ❶

دیکھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ ہو رہا ہے کہ خارجی کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (23:87) آخر کیا تم اس کی نگہداشت بھی کرتے ہو، جو کچھ تم کہتے ہو؟ تم جو اشیائے کائنات پر اُس کے کنٹرول کے بجائے اپنا کنٹرول رکھنا چاہتے ہو، تو تم اس طرح خدا کا مقابلہ کرنے کے انجام سے ڈرتے ہو؟ کیا تم اس تباہی سے بچنا نہیں چاہتے جو تمہاری اس غلط روش کا لازمی نتیجہ ہے؟ آگے بات آئے گی کہ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (23:88) کہتا ہے کہ علم کی بارگاہ سے پوچھ کر بتاؤ کہ یہ قوانین کس کے اقتدار میں، کس کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ یہ قوانین جس کے اقتدار میں ہیں اس کے ماتحت یہ کارگہ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہی ہے۔ یہ ایسا اقتدار ہے کہ جو اس کی پناہ میں آ جائے اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا، لیکن جو اس کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے، اسے کائنات میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ کون ہے کہ جب خطرات کا سامنا ہوتا ہے، سیلاب آتا ہے تو اس سے بچ کے بھاگ کے جاتے ہو؟ کہاں جاتے ہو؟ اس کے بتائے ہوئے قانون کے تابع تم پناہ لیتے ہو اور جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے کہیں پناہ نہیں ملتی۔ کہو کہ وہ کون ہے؟ اس پر کہا کہ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:89) کہیں گے یہ بھی خدا ہے۔ کہا کہ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (23:89) پھر ان سے پوچھو کہ یہاں تک تو سارا خدا کو مانتے ہو، جب اپنی دنیا میں آتے ہو تو وہاں کیا تمہیں موت پڑ جاتی ہے، تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ حق نہیں۔ یہاں تسحرون کا لفظ آیا ہے۔ یعنی وہاں کون سی چیز ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، تمہیں دھوکا لگ جاتا ہے، سحر ہو جاتا ہے، تمہاری مت ماری جاتی ہے؟ کیا بات ہے جو آگے ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے؟ اپنی دنیا کی طرف بھی تو آؤ، الٰہ السماء کو تو مانتے ہو، تم خارجی کائنات میں خدا کو تسلیم کرتے ہو، خدا خدا کہتے ہو، کیا اسے الٰہ الارض مانتے ہوئے تمہیں موت پڑ جاتی ہے؟ اسے الٰہ الارض بھی تو مانو۔

ہمیں بھی قرآنِ کریم میں دیئے گئے خدا کے تصور پر عملاً ایمان لانا ہوگا

عزیزانِ من! خدا نے الٰہ السماء اور الٰہ الارض کی دو باتیں خود کہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا بات تھی جو قرآن ان اہل کتاب سے بھی کہتا تھا کہ ایمان لاؤ، ان مشرکین سے بھی کہتا تھا کہ ایمان لاؤ اور اگر میں ایک قدم آگے بڑھوں تو وہ کہتا ہے کہ یایھا الذین امنوا

---

❶ خارجی کائنات میں اقتدارِ مطلق اللہ کو حاصل ہے۔

امنوا باللہ (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! ایمان لاؤ خدا پہ۔ چل بھئی! وہ قریش اور اہل کتاب کی باتیں تو پرانی ہو گئی تھیں، وہ تو ہمیں بھی کہہ رہا ہے کہ خدا پر ایمان لاؤ۔ میں خدا کو مانتا ہوں کہنے سے بات پوری نہیں ہوتی۔ اس باب میں سنیے، قرآن کیا کہتا ہے؟ آپ اس میں ایمان کے ایک لفظ کا اضافہ کر لیں گے یعنی آپ مانتا ہوں سے پہلے ایمان کے لفظ کا اضافہ کر لیں تو پھر وہ بات صاف ہو جائے گی۔ وہ ہو گا قرآن کا مطالبہ: ایمان اور خدا کو مانتا ہوں۔ اے گل جیہڑی اسی سندے ترے اونے آں، اسی طرح سے کہہ دیتے ہیں۔ ❶ ہم کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں۔ ''ایمان سے کہو، کبھی کھڑے ہو کر سوچا کہ جیسا کہتا ہوں میں خدا کو مانتا ہوں تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ بس اسے دہرا دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! میں اس قسم کی بیسیوں آیات پیش کر سکتا ہوں۔ اس وقت ایک ہی آیت پیش کروں گا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ **اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا** (6:114) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو فیصلہ دینے والا، حکومت کرنے والا، حکم چلانے والا، ماننے لگ جاؤں؟ نہیں، اب حکم آ گیا۔ میں خدا کو حاکم مانتا ہوں۔ یہ ہو گیا جی ایمان! کہ اسے حکم مانتا ہوں، اُسے فیصلہ دینے والا مانتا ہوں، مانتا ہوں کہ حکومت اُسی کی ہے، مانتا یہ ہوں کہ تمام معاملات کے فیصلے اسی کی رو سے کرانے ہوں گے۔ خدا کو میں حاکم مانتا ہوں: **اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا** (6:114) کیا تم مجھے یہ کہتے ہو، یہ جو کائنات خدا کو ماننے والے تھے، کیا تم اپنی طرح مجھے بھی یہ کہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم تسلیم کر لوں؟ اب یہ بات بھی Abstract (غیر محسوس) رہ جاتی ہے کہ ٹھیک ہے جی ہم تو خدا کو احکم الحاکمین مانتے ہیں کہ تیرے اوپر کوئی حاکم نہیں ہے جو تیرے فیصلوں کو بدل دے۔ احکم الحاکمین (11:45;95:8) قرآن میں آیا ہے۔ ہم تو یہ مانتے ہیں کہ **وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا** (6:114) اس نے اپنا ضابطہ قوانین تمہاری طرف بھیج دیا ہے جو بڑا ہی نکھیڑ ❷ کر بات بیان کرتا ہے۔ اس کا جو حکم ماننا ہے وہ خدا کو حکم ماننا ہے۔ اس کا نام ہے خدا پر ایمان، خدا کی کتاب کو ضابطہ حکومت ماننا۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔

دوٹوک بات ہے، عزیزانِ من! اگر اس خدا کے سوا آپ نے کسی اور کو بھی حکم مان لیا تو خدا پر ایمان نہیں رہا، خدا کو مانتا نہیں رہا۔ یہ بالکل کفر ہی ہو گیا، انکار ہی ہو گیا۔ اگر کچھ اس سے بھی لے لیا اور کچھ اپنے بنائے ہوائے قوانین لے لیے تو یہ شرک ہو گیا۔ دونوں ہی خدا سے انکار ہیں تو خدا کا ماننا یہ ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا وَّ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ**

---

❶ یہ بات جو ہم سنتے چلے آ رہے ہیں اسی طرح کہہ دیتے ہیں۔

❷ واضح اور نکھار کر۔

مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ [1] (6:114)۔جنہیں یہ کتاب دی گئی ہے'وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب کسی انسانی حکومت کا ضابطہ قوانین نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ وہ اسے مانتے ہیں۔عزیزانِ من! یہ ہے خدا کا ماننا۔ کہا کہ یہ سارا کچھ خدا کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بھی خدا کرتا ہے'وہ بھی خدا کرتا ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ انہیں اس بات میں کہیں دھوکا لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ رسول ان کے سامنے حق پیش کرتا ہے اور چونکہ حق ان کی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے اس لیے یہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں حالانکہ بَلۡ اَتَیۡنٰہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ (23:90) اس نے جو یہ کتاب بالحق نازل کی ہے وہ اسے حکم نہیں مانتے۔ بات ختم ہوگئی۔

روس میں مسلمانوں کے لیے مذہبی آزادی کی کیفیت

یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ قُلۡ فَاَنّٰی تُسۡحَرُوۡنَ (23:89) ان سے پوچھو کہ تمہیں کہاں دھوکا لگتا ہے یا کہاں دھوکا دیا جاتا ہے یا کہاں فریب دیتے ہو؟ یہ جو آج کا نظام ہے'جسے سیکولر نظام (Secular system) کہتے ہیں'اس میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ یہ ابھی دو چار دن [2] ہی ہوئے ہیں کہ Russia (USSR) کی طرف سے کچھ سیکولر اسٹائل چیزیں آنی شروع ہوئی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ رشیا (روس) تو بہرحال وہ ملک ہے جو خدا کو اتنا بھی نہیں مانتا۔ آپ کے ہاں سب سے بڑا ملحد'بے دین' کافر'خدا کا نہ ماننے والا'وہ کمیونسٹ ہے۔ انہوں نے اس سیکولر اسٹائل چیزوں میں لکھا ہے کہ ''سوویت یونین (USSR) میں مسلمانوں کی انجمنوں کی بڑی تعداد کا تعلق سنی فرقے سے ہے۔ یہاں ہمارے ہاں' مساجد میں روزانہ نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے' مسلمان اپنی عیدین بڑے ہی اہتمام سے مناتے ہیں' ماسکو کی مسجد میں عید کے موقع پر عموماً پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ سوویت یونین (USSR) کے مسلمان اپنے عقائد کے مطابق ساری مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں' نمازِ جنازہ وغیرہ اور مسلمان خاندانوں میں شادیاں اسلامی عقائد کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ سوویت یونین کے مسلمان فریضہ حج ادا کرتے ہیں۔ مساجد میں لائبریریاں ہیں'ان کتابوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمان جنتریاں فتوے وغیرہ بھی شائع کرتے ہیں۔ آپ کے قرآنِ شریف کے اور ایڈیشن کی اشاعت

---

[1] ان سے پوچھو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر' کسی اور کے قانون کے مطابق تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطہ قوانین بھیج دیا ہے۔ جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے (یعنی جماعت مومنین کے اربابِ علم وبصیرت: 74:31)' وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ یہ فی الواقعہ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔317)۔

[2] یاد رہے یہ بات جولائی 1977ء کی 29 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مذہبی آزادی کی باتیں کی جارہی ہیں۔ آخر میں جا کر لکھا ہے کہ سوویت یونین نے ریاست کو مذہب سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ بس اینی جی' گل سی۔ ❶ پہلا خدا کو ماننے کا سارا حصہ ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کا ہے۔ انہیں تو اتنا ہی پتہ ہے کہ یہ لوگ مذہب کے نام پر خواہ مخواہ دخل نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں بھی پتہ نہیں ہے کہ بات کیا ہے۔

تحریکِ پاکستان کی جنگ اور علامہ اقبالؒ کا ''خواب''

''مذہب اور ریاست ایک ہوتا ہے'' کے معنی کیا ہوتے ہیں' ہمیں بھی اس کا پتہ نہیں ہے۔ اب بات یاد آ گئی' عزیزانِ من! تحریکِ پاکستان کی تاریخیں تو بہت لکھی گئیں مگر آپ کو کوئی ایک تاریخ بھی ایسی نہیں ملے گی جو یہ بتائے کہ اصل جھگڑا کیا تھا۔ سارا جھگڑا ہی یہ تھا کہ مذہب اور ریاست کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ وہاں ہندو مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا تھا اور ہمارے ہاں کے نیشنلسٹ علمائے کرام اس معاملے میں مسلم لیگ یا محمد علی جناحؒ (948-1876) سے جھگڑتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں کا اکثریت میں رہنے والا ہندو ہمیں ضمانت دیتا ہے۔ انہوں نے لکھ کے دے دیا تھا کہ آپ کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ وہ بحث جو ''معرکۂ دین و وطن'' ❷ کے نام سے علامہ اقبالؒ (1877-1938) اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) (1879-1957) میں جاری ہوئی تھی اس کی تفصیل پڑھ کے دیکھیے۔ مولانا مدنی ❸ بار بار یہی کہتے تھے کہ آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھیے' کانگریس کی طرف سے چارٹر پاس ہوا ہے' وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور مناسک عیدین وغیرہ کی اجازت ہے' وہ اس کی گارنٹی دے رہے ہیں' اسلام کی اجازت مل رہی ہے' باقی یہاں جو حکومت ہے وہ جمہوری طریقے پر ہوگی' آپ کو اس پر کیا اعتراض؟ ادھر سے اس کا جواب یہ تھا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

[اقبالؒ]

---

❶ بس بات اتنی سی ہی تھی۔

❷ علامہ محمد اقبالؒ نے ارمغان حجاز (اردو) میں حسین احمدؒ کے زیر عنوان یہ اشعار کہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ' ورنہ — ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبرکہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی ' تمام بولہبی است

❸ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1957-1879ء)

قرآنی ضوابط کو عملی شکل دیئے بغیر خدا پر ایمان قابلِ قبول ہی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' مناسکِ حج اور شادی' طلاق وغیرہ کی یہ ساری اجازتیں ہوں اور خدا کی کتاب کو فیصلہ کرنے والا قانون' نہ تسلیم کیا جائے تو قرآن اسے خدا پہ ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ نماز روزہ تو بعد کی بات آتی ہے۔ اوخدا ہی کو نہیں مانتے تو نماز کس کی پڑھتے ہو۔ ماننے کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ اس کی کتاب کو حکم مانا جائے۔ تحریک پاکستان میں جھگڑا ہی یہ تھا لیکن ہمارے ہاں تو عجیب تماشہ ہوتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بیچارہ وہی بھولا بھالا ❶ سا' کیا کہہ گیا؟ کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس ❶ نے تو اس کا ترجمہ کیا تھا کہ اگر آپ کے ہاں مملکت کا مدار قانونِ خداوندی پہ نہیں ہے' خدا کی کتاب آپ کی مملکت کا ضابطہ آئین و قانون نہیں ہے' تو پھر آپ جس طرز کی بھی حکومت قائم کریں گے چنگیزیت ہی ہوگی۔ انہوں نے بڑی صحیح بات کی۔ میں تو کسی خاص ضابطہ پہ تبصرہ نہیں کیا کرتا۔ پچھلے دنوں یہاں جو کچھ ہنگامے ہوئے ان سے کہا گیا کہ اے مسیت اچ اینے روڑے جمع کردے ہوا ینیا اِٹاں جمع کردے پئے ہیگے او' اے سارا کچھ جیہڑا ہیگا اے' اے جھگڑا ہون واسطے فساد دنگا خوں ریزی واسطے! ❷ کہا کہ مسجد کا احترام تو کرو۔ تم لوگ ہم سے یہ کیا کہتے ہو! کہا گیا کہ صاحب! جدا ہو دیں سیاست سے' تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔ اسلام تو دین ہے' اسلام میں تو دین اور سیاست الگ الگ ہوتے ہی نہیں۔ اب آ کے کہنے لگے کہ آپ تو چالیس برس سے ہمیں یہ وعظ کہتے ہوئے تھکتے نہیں تھے کہ اسلام میں سیاست اور دین کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ عزیزانِ من! یہ تھی وہاں مذہبی آزادی کی بات۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ رشیا کو تو یہ سارے ملحد و بے دین کہیں گے' سب سے زیادہ کمیونسٹ ہے۔ اس کمیونسٹ نے یہ اعلان کردیا کہ ہمارے ہاں بھی اس کی آزادی ہے اور تم تو اسی کا نام اسلام رکھ رہے ہو۔ یہ کل کی بات ہے اور آج آپ کے ہاں بھی' عزیزانِ من! کون سی خدا کی کتاب حکم ہے؟ وہی آزادیاں ہیں' دو چار شقیں اور اس میں اضافہ کردیجیے۔ بات تو یہ ہے جو قرآن خدا پہ ایمان کی کہہ گیا ہے۔

اب میں یہ دہرادوں کہ خدا پہ ایمان کے معنی ہیں کہ خدا کی کتاب کو حکم' ضابطہ قانون' فیصلہ کن حقیقت' Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ) تسلیم کرلیا جائے گا۔ عملاً یہ خدا پر ایمان ہوگا اور اگر اسے حکم تسلیم نہیں کیا جائے گا تو میں خدا کو مانتا ہوں' خدا کے میزان میں کوئی وزن

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

❷ یہ جو مسجد میں اتنے اینٹوں کے ٹکڑے جمع کررہے ہو' اتنی اینٹیں جمع کررہے' یہ سارا کچھ مسجد میں دنگا فساد اور خون ریزی کے لیے ہے۔

نہیں رکھتا۔ یہودی مانتے تھے، عیسائی بھی مانتے تھے، مشرکین بھی مانتے تھے، آج آپ کے ہاں کمیونسٹ رشیا میں رہنے والا مسلمان بھی مانتا ہے مگر یاد رکھیے! جہاں بھی خدا کی کتاب حکم نہیں، ایمان نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ تم خدا پر ایمان کے مدعی ہو اور اپنے معاملات کو غیر خداوندی قوتوں اور قوانین سے طے کراتے ہو اور اس کا نام ایمان رکھتے ہو۔ تو اسلام میں یہ ایمان نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دین اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ المومنون کی آیت 90 تک ہم آ گئے، 91ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

چودھواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 91 تا 98)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ
وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ
وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ﴿۹۳﴾ رَبِّ
فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ
لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا
يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ
اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1977ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 91 سے ہوتا ہے:(23:91)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں بات یہ چلی آ رہی تھی کہ جس سے بھی پوچھیے وہ کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں لیکن ذرا کھڑے ہوکر اس سے پوچھیے کہ یہ آپ مانتے کیا ہیں؟ خدا کو مانتا ہوں کے معنی کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ صرف اسی ایک بات پہ ہی نہیں، یہ جو روزمرہ اس قسم کی اصطلاحات اور الفاظ استعمال کرتے ہیں، کبھی کسی سے پوچھیے گا کہ صاحب! اس کا ذرا مفہوم تو بتا دیجیے۔ خدا کو مانتا ہوں مسلمانوں ہونے کی دلیل ہوگئی اور میں نے کہا تھا کہ نزولِ قرآن کے وقت سے ہی اگر اسے لے لیجیے تو یہ اہلِ کتاب، عیسائی، یہودی وغیرہ خدا کو تو ایک طرف رہا، یہ تو خدا کو، رسولوں کو، ملائکہ کو، آخرت کو، کتابوں کو، جو آپ پانچ اجزائے ایمان کہتے ہیں، وہ تو سب انہیں مانتے

تھے۔ مشرکین کے متعلق آپ کہیں گے کہ وہ دوسرے تھے' ان سے الگ تھے۔ میں نے کہا تھا کہ مشرکین کے متعلق خدا خود کہہ رہا ہے کہ ان سے بھی پوچھو کہ بارش کون برساتا ہے؟ وہ کہیں گے کہ خدا برساتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ یہ کائنات کس نے تخلیق کی؟ یہ کہیں گے کہ کائنات خدا نے تخلیق کی حتیٰ کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ مشرکین عرب' جنہیں آپ حجاز کے یا قریش کے یا جتنے بھی یہ قبائل تھے' ان میں خود رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ تھا۔ یہ تو حضور ﷺ کی پیدائش سے بھی پہلے کا نام رکھا ہوا ہے۔ نبوت اور رسالت تو ایک طرف رہی یہ عبداللہ تو وہ نام رکھتے تھے۔ وہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن شہادت دیتا ہے کہ مانتے تھے تو پھر یہ کیا بات ہوئی؟

آپ بھی کہتے ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور قرآن انہیں دعوت دیتا ہے کہ یہ مانتا ہوں والی بات' میں نہیں مانتا۔ پھر میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے خود ہی بتایا کہ خدا کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کو زندگی کے ہر معاملے میں قولِ فیصل' حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیے۔ یہ اگر مانتے ہو تو یہ خدا کا ماننا ہے۔ اگر وہ یہ نہیں ہے تو پھر وہ یہود و نصاریٰ' مجوس' بت پرست' مشرک اور کافر سب خدا کو مانتے ہیں تم بھی مانتے ہو اور اسی لیے جب اس نے اہل کتاب سے کہا تھا کہ ایمان لاؤ' قریش سے کہا تھا اور مشرکین سے کہا تھا کہ ایمان لاؤ تو کہا تھا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! تم بھی خدا پہ ایمان لاؤ۔ خدا تو ہم سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے لیکن جس سے پوچھیے وہ کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ عزیزانِ من! جو کچھ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے' جو کچھ آپ کہتے چلے جا رہے ہیں' جو کچھ سنتے چلے جا رہے ہیں' جب تک کھڑے ہو کر آپ اس پہ غور نہیں کریں گے آپ دین تک نہیں آ سکتے۔ آنکھیں بند کیے مذہب کی روش پہ تو چلتے جائیے۔ اب وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا تکرار اور تضاد اس بات پہ تھا' مطالبہ یہ تھا' تقاضا یہ تھا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا [1] (2:137) یہ جو ہم نے بات کہی ہے کہ یہ ہے خدا کا ماننا' اس طرح سے اگر خدا کو مانیں تو پھر سمجھا جائے گا کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ اسے ہی حق پہنچتا ہے یہ کہنے کا کہ میں خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں ورنہ نہیں۔ خدا کہتا ہے ہم تو مانتے ہی نہیں کہ تم خدا کو مانتے ہو۔

خدا تعالیٰ کے متعلق انجیل کا بیان

قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب کی بات لے لیجیے مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا

---

[1] ان سے کہو کہ یہ ہے ہماری دعوت۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح اس ضابطہ حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو' تو اس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستہ پر ہوں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 49)۔

خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ❶ (23:91)۔ یہ کہتا ہے کہ ان عیسائیوں کو لے لیجیے: صاحب! خدا کو مانتا ہوں سب سے پہلے۔ آگے بڑھتے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ کہیں وہ اپنے نبی کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں' کہیں اسے خود خدا ہی بنا لیتے ہیں' کہیں اس کی ہمسر صاحب اقتدار ہستی بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں تیسرا حصہ خدا ہی کا ہے' اس کی الوہیت کا ہے۔ یہ تینوں چیزیں ان کے ہاں انجیل میں موجود ہیں۔ خدا کا بیٹا تو وہ خود کہتے چلے آ رہے ہیں۔ میں اور میرا خدا ایک ہیں۔ یہ ان کی انجیل میں ہے کہ

I and my father are one ❷

یعنی میں اور میرا باپ' ہم دونوں ایک ہی ہیں' خدا کو وہ باپ کہتے تھے' گویا یہ ان کے عقائد تھے۔ انہیں قرآن مسترد قرار دیتا ہے اور کہتا ہے او یہ خدا کو ماننا نہیں ہے' غضب خدا کا' یہ کیا کیا عقائد تم لیے بیٹھے ہو۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ (23:91) اس کے ساتھ کوئی الٰہ نہیں ہے۔

عیسائیت کی پیروی میں مسلمانوں کے وضع کردہ عقائد

یہاں تک کے بعد تو آپ کہیں گے کہ یہ بات آگے چلی۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ سمجھ میں آئی ہوئی ہے اور پھر سمجھ میں نہ آنے والی بات کون سی ہے۔ ہمارے ہاں تو عیسائیوں کے ساتھ بہت سے مناظرے ❸ ہوتے ہیں۔ اب تو وہ روش کم ہوگئی ہے اور ان مناظروں کے موضوع بھی بدل گئے ہیں۔ وہ تو گزشتہ تین چار مہینے میں آپ نے ہوتے دیکھے ہیں۔ مناظروں کے موضوع جب مذہب کے ہوتے تھے تو عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ ابن اللہ پہ' تصلیب پہ' الوہیت مسیح پہ ہوتا تھا اور مسلمان مناظر اس جرأت اور بیباکی سے ان کی تردید کرتے تھے۔ حق بھی یہی تھا اور پھر بڑے فاتحانہ انداز سے وہاں آتے تھے۔ ٹھیک ہے کہ کدی اپنی منجی تے بہہ کے نہیں سوچیا۔ ❹ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔

---

❶ (ان سے پوچھو کہ خدا کے علاوہ وہ کون ہے جس کے اقتدار و اختیار کے ماتحت تم رہنا چاہتے ہو؟) اُس کا کوئی بیٹا نہیں (کہ تم بادشاہ کو چھوڑ کر دوسرے کی حکمرانی تسلیم کر لو اور اس کی مملکت میں چلے جاؤ۔) ان سے کہو کہ اگر ایسا ہوتا کہ یہاں ایک سے زیادہ صاحب اقتدار ہستیاں ہوتیں تو ہر ''خدا'' اپنی اپنی مخلوق کو اپنے ساتھ لے لیتا' اور اس طرح یہ سب ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں میں ہوتا ہے۔) بہر حال' یہ لوگ خدا کے متعلق جس قسم کا تصور رکھتے ہیں' وہ اس سے بہت بلند اور منزہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔788)۔

❷ میں اور میرا خدا ایک ہی ہیں۔

❸ یاد رہے کہ یہ بات اگست 1977ء کی 5 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

❹ کبھی فارغ ہو کر خود نہیں سوچا (کہ یہ ہے کیا؟)

عقیدہ حلول کے متعلق پائے جانے والے تصورات

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اعتقادات وعقائد کیا ہیں۔قرآن نے کہا تھا کہ مسیح ❶ خدا کا عبد اور اس کا رسول ہے۔آپ کے ہاں بھی خدا کا ایک عبد اور رسول ہے۔ہم عبدہ ورسولہ کہتے ہیں۔آپ نبی اکرم ﷺ کو عبد اور رسول کہتے ہیں وہ جو عیسائی ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدس اور بزرگ رسول کو Apostles کہہ کر پکارتے ہیں۔وہ انہیں اپنے رسول بنائے ہوئے تھے۔وہ درحقیقت ہیکل کے اعلیٰ منصب دار تھے جو پیشین گوئیاں کرتے اور قسمت کا حال بتاتے تھے۔ان کے ہاں نبی غیب کی خبریں دینے والا تھا۔قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی ہے۔عبد اور رسول آپ کے ہاں اسلام میں ہیں۔نبی اکرم ﷺ آخری عبد اور رسول ہیں' یہ قرآن کہتا ہے۔عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جو خدا ہے' وہی مسیح کی شکل میں دنیا میں آ گیا ہے۔یہ بات نظری سی ہو جائے گی۔میں عرض کروں کہ ایک چیز تھی' وہ تھا کوئی پرانا عقیدہ جاہلیت کا' جو چلا آ رہا تھا اور اب بھی چلا آ رہا ہے۔وہ اسے حلول کہتے تھے کہ خدا نے اپنے آپ کو اس میں حل کر دیا ہے اور اُدھر اوتار ❷ کا ایک عقیدہ ہوتا تھا کہ وہ خود خدا ہی ہے جو اس طرح سے آ گیا ہے۔عیسائی تو پھر بھی حلول تک ہی مانتے تھے۔یہ جو عقیدہ ہے کہ خود خدا ہی اس رسول اللہ نبی اکرم ﷺ کی شکل میں آ گیا ہے یہ عیسائی نہیں مانتے تھے۔خیر سے مسلمان کا ایک

---

❶ نزولِ قرآن کے وقت' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی افراط وتفریط انتہائی گوشوں تک پہنچ چکی تھی۔عقائد کے لحاظ سے عیسائی: (1) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے تھے۔
(2) ابن اللہ ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی۔ (3) تثلیث کے اقانیم ثلاثہ (باپ' بیٹا' روح القدس) پر عقیدہ رکھتے تھے۔
(4) آپؑ کے اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش ہوتی تھی۔ (5) آپ کی تصلیب کو نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ تصور کرتے تھے۔
(6) آپؑ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ (7) اور آپؑ کی واپسی کے منتظر تھے۔
(پرویزؒ: شعلہ مستور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994' ص۔27)

❷ ہندوؤں کے اس عقیدہ اوتار کے معنی یہ ہیں کہ خود ایشور (خدا) مادی مخلوق کے پیکروں میں نمودار ہوتا رہتا تھا۔چنانچہ ان کے ہاں پرہلاد (بھگت کے واقعہ سے متعلق) چیونٹی سے لے کر رام اور کرشن تک اوتار مانے جاتے ہیں۔یہی عقیدہ مسلمانوں کے ہاں' اہل تشیع کے غالی فرقوں میں در آیا۔چنانچہ سب سے پہلے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں اور ان کی اولاد میں حلول کر آیا تھا۔اس کے بعد نصیریہ' کیسانیہ' قرامطہ اور باطنیہ فرقوں میں یہ عقیدہ اور بھی متشدد ہوتا چلا گیا۔وہیں سے یہ عقیدہ صوفیا کے عقائد میں داخل ہو گیا۔ان میں حسین بن حلاج اس کا پہلا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔اس کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی ذات اس میں حلول کر گئی ہے۔اسی وجہ سے وہ انا الحق کا نعرہ بلند کرتا تھا۔اس کی کتاب کا نام ''کتاب الطّواسین'' ہے۔

چھوٹا سا فرقہ [1] اسے مانتا ہے۔ انہی میں ان سے مناظرے کرنے والے میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کس تعجب اور حیرت سے میری طرف تک رہے ہیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے! جی' آپ کے ہاں یہ بڑے دھڑلے سے مانا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر

اس میں قرآنِ کریم کے الفاظ میں مستوی کے معنی **استوا علی العرش** (7:54;13:2;25:59;32:4;57:4) کے ہیں یعنی وہ عرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ پورا شعر یوں ہے:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفٰی ہو کر

(معاذ اللہ)

اندازہ لگائیے' عزیزانِ من! عیسائیوں کے خلاف' الوہیت مسیح کے خلاف' مناظرے کرنے والے ہمارے ہاں یہ اتنی کھلی ہوئی شکل میں غلو کو کس حد تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوؤں کا اوتار ہونے کا عقیدہ تو عیسائیت میں بھی نہیں ہے مگر ہمارے ہاں کے وہ مناظر اس کو بڑے فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں وہ زیادہ سے زیادہ حلول [2] تک پہنچتے ہیں لیکن بہرحال یہاں سوچیے تو سہی

---

[1] یہ ہے برصغیر ہندو پاک میں' مولانا احمد رضا خاں مرحوم کا فرقہ' جو اپنے آپ کو سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت سے تعبیر کرتا ہے' لیکن عام طور پر رضائیہ یا بریلوی فرقہ کے نام سے متعارف ہے۔ یہ اس باب میں متشدد عقائد رکھتا ہے۔ رسول اللہ کے ''عین حق'' کے متعلق ان کے اکثر اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ان کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خاں حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

ھو الاول ھو الاخر ھو الظاھر ھو الباطل	**بکل شیء علیم** لوح محفوظِ خدا تم ہو
نہ ہو سکتے ہیں دو اول' نہ ہو سکتے ہیں دو آخر	تم اول اور آخر ابتدا تم انتہا تم ہو
خدا کہتے نہیں بنتی' جدا کہتے نہیں بنتی	خدا پر ہی یہ چھوڑا ہے' خدا جانے کہ کیا تم ہو

(حدائق بخشش' حصہ دوم' ص۔104)

[2] اصولی طور پر ان عقائد کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (ا) حلول: مسلمان صوفیائے کرام میں حسین بن منصور حلاّج اس کا پہلا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ (۲) وحدت الوجود: عام الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے' سب خدا ہی ہے۔ یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔ اسے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے ایک بڑی مغالطہ آفریں شکل میں پیش کیا ہے۔ (۳) وحدت الشہود: اس عقیدے کی رو سے (ا) کائنات خود خدا تو نہیں لیکن اس کا ظل یا سایہ ہے۔ (ب) جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کی روح' روح خداوندی کا جزو تو نہیں لیکن انسانی کشف ووجدان کے ذریعے ایسی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی ذات' ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اسے ''فانی فی اللہ۔ باقی اللہ'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالب کے الفاظ میں ...... عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
اسی لیے اولیاء اللہ یا صوفیائے کرام کی وفات کو وصال کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس کے معنی واصل بالحق ہو جانے کے ہیں۔ اور اُن کے یوم وفات کی تقریب کو عرس کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از پرویز: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ' (رجسٹرڈ) لاہور' 1992' ص ص۔ 77,78,97)

کہ وہی جو ''مستوی عرش تھا خدا ہو کر' اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر'' جھوم جھوم کر قوالوں کی زبان سے سنتے ہیں اور ''بزرگانِ دین سر دھنتے اور وجد میں آتے ہیں۔ اب اور ذرا آگے بڑھے۔ بات شاعروں کے ہتھے چڑھ گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ خدا کی ایک صفت احد ہے۔ اسی لیے خدا کو احد کہتے ہیں یعنی واحد' یگانہ' Unique۔ نبی اکرم ﷺ کا ایک اسم گرامی احمد بھی ہے۔ دونوں میں حرف ''م'' کا فرق ہے۔ ❶ اب آئی شاعری۔ بات وہی ہے کہ یہ جو مستوی عرش ہے' اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر۔ اب انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! احمد میں ''م'' کا وہ حصہ درمیان میں سے کاٹ دو تو احد رہ جاتا ہے۔ خدا مادی پیکر میں دنیا میں نہیں آتا۔ جب وہ مادی پیکر اختیار کرتا ہے تو یوں یہ مادی پیکر ہے جو ''م'' ہے اور یوں بنایا ہے۔ اصل میں یہ وہی احد ہے بس اس نے درمیان میں ''م'' کا پردہ تھوڑا سا رکھ لیا ہے۔ اور اس کو تو پوچھیے نہیں کہ کون کون کس کس انداز میں کیا کیا کہتا ہے کہ

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ م کو اٹھا کر
وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ چھپا چھپا کر

آپ اپنے ہاں عقائد دیکھ رہے ہیں۔ وہ صرف پردہ ہے جو پیکر ہے۔ یہ مادی پردہ ہے اور یہ ''م'' کا پردہ ہے جو مادی پیکر آیا تو پھر پوچھیے نہیں کہ اس عقیدے نے کیا کچھ کیا۔ عیسائیت پہ پہنچ کر تصوف نے ایک منظّم مسلک (Organised system) کی شکل اختیار کر لی۔ اُدھر ہندوؤں کے ہاں عقیدہ اوتار آیا۔ عقیدہ حلولیت نے جڑیں پکڑیں۔ یہ تمام اوتار یا حلولیت شرک تھے' کفر تھے لہٰذا مسترد کرنے کے قابل۔ یہ آپ کے ہاں کی ساری چیزیں تھیں جنہیں کہتے ہیں کہ جھوم جھوم کے پڑھنے والی ہیں کیونکہ یہ پردہ م کو دیکھ لیتی ہیں' یہ عرب نبی اکرم ﷺ بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں ''ع رب'' مادی ہے' جی! اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ یہ جھومتے ہیں' پڑھتے ہیں۔ میں فرقہ وارانہ الجھنوں میں نہیں جایا کرتا کیونکہ وہ مرحلہ بڑا نازک سا ہوتا ہے ورنہ میں آپ حضرات کو بتاؤں کہ یہ عقائد کہاں سے آئے۔ شیعہ حضرات کے ہاں کے کچھ غالی فرقے جو ہیں ان کی تفصیل میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں آپ دیکھ لیجیے گا کہ یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں۔ حضرتِ علیؓ (600-662ء) کے متعلق تو ان کے ہاں وہ عقائد موجود ہیں جن کی رو سے

---

❶ ان حضرات نے اس م (میم) کے گرد وہ تانا تنا ہے کہ ''احد'' اور ''احمد'' کو ایک بنا کر چھوڑا ہے۔ مثلاً:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں' ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

جب میم کا پردہ پنجابی صوفیا کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اسے نوچ کر الگ پھینک دیا۔ بابا بلھے شاہ کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

احد' احمد وچہ فرق نہ بلّھیا ۔۔۔ اک رتی بھر مروڑی دا۔

(احد اور احمد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ جو تم فرق دیکھتے ہو' وہ ایک ذرا ''مروڑی'' (پیچ) کا ہے اور بس)۔

وہ بالکل خدا کے اوتار ہیں۔ آپ یہ سب کچھ دیکھیے اور غور کیجیے۔

سنی حضرات کے عقائد

عزیزانِ من! امام شافعیؒ نے وحی خفی کا عقیدہ وضع کیا۔ ❶ جنھوں نے شیعیت کی فضا میں پروان پائی۔ ان پر شیعیت کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ سنیوں کے چار جید امام (امام ابوحنیفہؒ ' (80-1500) امام مالکؒ ' (93-179ھ) امام حنبلؒ ' (164-341ھ) امام شافعیؒ (150-204ھ)) ہیں۔ ان کے ہاں بھی شاہِ ولایت حضرت علیؓ کا متصوفانہ لقب مانا جاتا ہے۔ انہیں سنی بھی جو مقام دیتے ہیں اس پہ غور کیجیے گا۔ یہ کہنے والا سنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "نجد میرا مدینہ ہے" تو وہ حضرت علیؓ تو مدینے والے رسالت میں آ گئے۔

نجد میرا مدینہ ہے' مدینہ میرا کعبہ ہے۔

یہاں سے انہیں منتقل کیا ہے تو وہاں مدینے میں بھیجا اور وہاں سے بھیجا تو پھر ان کو کہاں Accomodate کیا جائے گا۔

نجد میرا مدینہ ہے' مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں' امت شاہِ ولایت ❷ ہوں

شاہِ ولایت حضرت علیؓ (600-662ء) ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسالت تو یہاں آ گئی۔ کہا ہے کہ امتِ شاہِ ولایت ہوں' میں بندہ اور کا ہوں۔

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو
مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

آپ اپنے ہاں کے اوتار دیکھ رہے ہیں! وہ رسول اللہ کو خدا اور حضرت علی ﷺ کو رسول قرار دیتے ہیں۔ اگر میں یہ پردہ اٹھاؤں تو آپ دیکھیں کہ آپ کے ہاں کے کتنے بڑے امام' محدث' مفسر' اہل طریقت' اہل تصوف' قطب اور ابدال ہیں کہ "وہ ہیں کون کون؟ فیر تے پوچھو ای ناں۔ اوتھے تے گل ای اگاں ہورآ ❸"۔ وہاں تو احد اور احمد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ ذات اور صفات دونوں کے لحاظ سے وہ ایک ہی ہیں۔ حضور کے معراج کے سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ

---

❶ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص ص۔ 70-51

❷ شاہ ولایت حضرت علی کا متصوفانہ لقب ہے۔

❸ پھر تو پوچھو ہی نہیں۔ وہاں تو پھر بات ہی کچھ اور ہے۔

اوہو شہر مکے وچہ رہندا ' تے آپے عرشِ بریں تے بہندا

آپے آپ نوں ویکھن چلیا ' ویکھ وکھا کے گل مک گئی ❶

جی! یہ روحانیت کی محفلیں ہیں، جس کا قرآنِ کریم میں کہیں ذکر تک نہیں آیا مگر یہ سارے وہ ہیں جو بانگ دہل کہتے ہیں، محاورے میں نہیں بلکہ بانگ دہل یہ سب کچھ پکارا جاتا ہے۔ کیا آپ نے یہ اشعار قوالوں کی زبان سے نہیں سنے اور ان پر ''بزرگانِ دین'' کو سر دھنتے اور وجد میں آتے نہیں دیکھا؟ بس یہ سب کچھ چلا آ رہا ہے۔ کہیں کفر کا فتویٰ لگتا ہے تو اس بات کے لیے وہ ایک پرویز رکھا ہوا ہے کہ یہ کچھ کہتا کیوں ہے۔ یہاں تک تو معاملہ صرف نبی اکرم ﷺ تک ہی ہے۔

وہ عیسائیت کی بات کچھ یوں ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے مختلف انداز سے حضرت مسیحؑ میں صفاتِ الوہیت کے قائل ہیں۔ ان میں اسکندریہ کے عیسائی آپ کو لوگاس کہتے تھے۔ عیسائیوں نے اس نظریہ پر اپنے فلسفہ الٰہیات کی عظیم عمارت قائم کی ہے، جس کی رو سے لوگاس تثلیث کے اقانیم ثلاثہ کا اقنوم ❷ ثانی ہے۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا دیا ❸۔ یہ عیسائیت ہے۔ اسلام تو بہت آگے جاتا ہے۔ اس میں تو خدا کے ساتھ ہم کلامی کی سند لائی جاتی ہے اور اسی قسم کی سندوں کے سہارے ہمارے صوفیائے کرام نے اپنے الہامات اور مکالماتِ خداوندی کے دعاوی پیش کیے ہیں۔ مثلاً سرخیل صوفیا محی الدین ابن عربی (1240-1165ء) جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے، سب سے بڑا سرچشمہ تصوف ❹ ہیں۔ خانقاہیں تو اس سے پہلے آپ کے ہاں اس زمانے میں وجود میں آ گئی تھیں جب شام کے عیسائی راہب مسلمان ہوئے ہیں۔ ایران کے مجوسی تو آپ کو اپنے ہاں سیاست میں لے گئے تو یہ شام کے عیسائی مسلمان ہونے والے راہب

---

❶ یہ خواجہ غلام فرید کا فرمان ہے۔ اس کا رواں مفہوم یہ ہے کہ وہی مکہ میں رہتا تھا، وہی عرش پہ بیٹھا تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو دیکھنے گیا۔ اپنے آپ کو دیکھ لیا تو قصہ ختم ہو گیا۔

❷ دینِ مسیحی خدا کا ہر جز (باپ، بیٹے اور روح القدس میں سے ہر ایک) کو اقنوم کہتے ہیں۔ جمع: اقانیم۔

❸ عیسائیوں نے ابتداً افراطِ عقیدت سے حضرت عیسیٰ کی شان میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا۔ یہی مبالغہ سینٹ پال کے وقت حقیقت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ نیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے اسے عقائد کا رنگ دیا اور ٹرنٹ کی کونسل میں اس نے اس ایمان کی صورت اختیار کر لی کہ ''ہم ایمان لائے (۱) خدا، قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور (۲) رب یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے، الٰہ اللہ ہے اور نور، نور ہے، عین خدا ہے۔ مولود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے...... ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا۔ (پرویزؒ: شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1994، ص۔138)۔

❹ ابن عربی کو سلسلہ تصوف میں سند کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ اپنی مشہور کتاب ''فصوص الحکم'' میں لکھتے ہیں کہ ''جس مقام سے نبی لیتے تھے اُسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزماں، غوث، قطب لیتے ہیں۔'' ''صاحب کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہیں...... ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔''

آپ کو تصوف میں لے گئے۔ سب سے پہلی خانقاہ ❶ قائم ہی اس زمانے میں ہوئی تھی لیکن تصوف تو باقاعدہ ایک فلسفے کی حیثیت سے ایک School of Thought کی حیثیت سے آیا۔ یہ جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے یہ محی الدین ابن عربی (1165-1240ء) ہیں۔ انہوں نے اس چیز کو لیا۔ فتوحات مکیہ ان کی بڑی الجھی ہوئی بڑی مشکل تریں کتاب ہے۔ یہ تصوف کی وہ کتاب ہے جسے بائبل کہتے ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مفتی محمد شفیع مرحوم کا فتویٰ

اس بات پہ آپ ہنس پڑے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ ایک عرصے تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے جب یہ نئے نئے لاؤڈ اسپیکر آئے تھے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حرام ہے یا حلال ہے؟ اس بارے میں شریعت حقہ کیا فیصلہ دیتی ہے؟ آپ نے پڑھا ہوگا۔ یہ مفتی محمد شفیع مرحوم جن کا ابھی انتقال ہوا ہے' دیوبند کے ہیں۔ یہ سب سے بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان سے یہ سوال فتویٰ پوچھا گیا تھا۔ انہوں نے فتویٰ دیا تھا۔ ان کے یہ فتوے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ فتویٰ ان کے اندر درج ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کیا ہوتا ہے اور کیسے یہ کچھ ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے پھر Jubilee High School بنارس کے پنڈت ❷ ...... (یا کیا نام تھا) ان سے پوچھا۔ وہ وہاں سائنس ماسٹر تھے۔ یعنی ہائی اسکول کے سائنس ماسٹر ایک ہندو ہیں' ان سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ جو اس میں آواز ہوتی ہے' یہ بولنے والے کی آواز ہوتی ہے یا وہ کچھ اور بن گئی ہوئی ہوتی' میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہیں انہیں خود پتہ نہیں' وہ ہندو سائنس ماسٹر سے پوچھتے ہیں۔ وہ بھی یہ کہتا ہے کہ پتہ تو مجھے بھی نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ بہرحال یہ بات مشتبہ ہے اس لیے اس کا استعمال حرام ہے اور پھر ساری عمر اسی لاؤڈ اسپیکر کے اوپر وہ فتوے بھی دیتے رہے' وعظ بھی کہتے رہے۔

---

❶ قرآن اور حدیث میں تصوف اور حدیث کے الفاظ تک نہیں ملتے۔ اس لیے اس دور میں مسلمان صوفیاء کے وجود کا بھی پتہ ونشان نہیں ملتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے لفظ سے مشہور ہوا (وہ) ابوہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ 140ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابوہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آ گیا جہاں 160ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تاریخ میں بہت سے اشخاص کے ساتھ یہ لقب (صوفی) دیکھنے میں آتا ہے۔ ان میں بعض زیادہ مشہور ہیں مثلاً جابر ابن حیان اور اس کا شاگرد صالح ابن علوی' ابراہیم ابن بشار خراسانی' ابوجعفر جو عبدالصمد کے مرید تھے۔ اکثر مغربی محققین حارث بن اسد المحاسبی (ھ 225-160) کو متقدمین صوفیاء کے گروہ کا سرخیل قرار دیتے ہیں۔ (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1992' ص ص۔ 73-72)۔

❷ پرویزؒ نے دسمبر 1939 کو سلیم کے نام لکھے گئے دوسرے خط بعنوان ''ہمارے مذہبی اجتماعات'' میں یوں لکھا ہے کہ ''دارالعلوم دیوبند کے ایک مفتی صاحب نے فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع فرمایا ہے جن میں ''عباداتِ مقصودہ'' کے لیے اس آلہ (لاؤڈ اسپیکر) کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس رسالہ (البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ) کے صفحہ 20 پر درج ہے کہ الگزنڈر ہائی اسکول' بھوپال کے سائنس ماسٹر جناب برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔'' (پرویزؒ: سلیم کے نام' ادارۂ طلوع اسلام' لاہور' 1981' ص۔ 16)

محی الدین ابن عربی کا نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کے متعلق تصور اور ان کی تعلیم کا ماخذ

محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1165-1240ء) کی فتوحات مکیہ ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! یہ سوال ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ خدا ہیں یا خدا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب خدا ہی ہے۔ سیاپا مکا دتا ❶۔ اسے کہتے ہیں ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا نظریہ۔ آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے۔ پہلے ہندوؤں کے ویدانت کی بات شروع ہوئی۔ یہودیوں نے اس کو اپنایا تھا۔ سپین میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا گروہ رہتا تھا۔ ابن عربی سپین میں انہی سے متاثر ہوئے۔ انہی کا فلسفہ وحدت الوجود اور اندازِ بیان اپنایا۔ یہودیوں کی ایک کتاب تصوف زہار ❷ ہے۔ وہاں سے انہوں نے اس تصوف کو مستعار لیا۔ یاد رکھیے! جو شخص بھی زیادہ Intelligent (ذہین) ہو، زیادہ Genius (فطین) ہو، جب وہ گمراہ ہوتا ہے تو پوچھو نہیں اس کی گمراہی کتنوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اِس زمانے میں ہسپانیہ میں متصوفین فلاسفر کا ایک گروہ تھا جو وحدت الوجود کا قائل تھا وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کرتے اور

---

❶ الجھن ہی ختم کر دی۔

❷ اس تمام تر تفصیل کا پس منظر یہ ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودی مذہب میں کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا تو وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (Philo) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوف کا ابوالاباء افلاطون (Plato) ہے۔ یہ عجیب حقیقت ہے کہ فلسفہ (عقلیت پسندی) اور اس کی ضد باطنیت دونوں کی ابتدا یونان سے ہوئی اور قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئی۔ عقلیت پسندی کی ابتدا دیماقریطس (C460-370BC) اور ابیقورس (C341-270BC) جیسے فلاسفرز سے ہوئی اور باطنیت کا آغاز فیثاغورث سے۔ اس کے بعد افلاطون (Plato: C.427-347 BC) کے ہاں عقلیت اور باطنیت دونوں جمع ہو گئے لیکن اس کی اہمیت عقلیت سے زیادہ باطنیت کی وجہ سے ہوئی۔ باطنیت نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالمِ امثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم محض اس کا پرتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب (Mirage) سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُس حقیقی عالم کے متعلق علم حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ باطنی طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ افلاطون (Plato) کے اس فلسفہ (یا بالفاظِ صحیح 'تصوف') کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلاطینس (Plotinus: 204-296AD) تھا۔ ان فلاسفرز میں ایک Apollonious of Tyana نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے برہمنوں سے ہندی تصوف (ویدانت) سیکھا۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینس کی زیر سرکردگی، افلاطون (Plato) کے فلسفہ قدیم کو، ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نوفلاطینی فلسفہ (Neo Platinism) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو (Philo) کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، معرفت اور حقیقت میں بدل گئی۔ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب ''زہار'' ہے۔ تورات کی شریعت ہر بنی اسرائیل کے لیے کھلی تھی لیکن اس کے ذریعے تورات کے باطنی معنی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1992ء، ص ص۔ 26-27)

اپنے عشق حقیقی کو عشق مجازی کے جاذبِ نگاہ لباس میں پیش کرتے تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی (1240-1165ء) انہی سے متاثر ہوئے۔

محی الدین ابن عربی کے عشق کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی

وہاں سے وحدت الوجود کا نظریہ ❶ یعنی اس تصوف کا فلسفہ آیا کہ سب خدا ہی ہے' میں بھی خدا تو بھی خدا' یہ بھی خدا وہ بھی خدا۔اور آپ کے ہاں یہ وحدت الوجود اب مسلمہ چلا آ رہا ہے۔میں نے تین دفعہ سوچا ہے کہ یہ بات زبان پہ لاؤں یا نہ لاؤں لیکن لانی پڑتی ہے کہ یہ کیوں کہا گیا۔یہ سارا کچھ ذہن میں رکھیے گا۔ابن عربی (1240-1165ء) کا مقام تصوف کی دنیا کے اندر پوچھو نہیں کہ کتنا بلند مقام ہے۔میری بیٹیاں مجھے معاف رکھیں' بات کہنی پڑتی ہے۔''فتوحاتِ مکیہ'' میں نے کہا کہ ان کی تصوف میں بلند تریں کتاب ہے۔اس میں وہ خود لکھتے ہیں کہ وہ وہاں سے مکے گئے تھے۔مکے میں بیٹھ کے یہ کتاب لکھی۔لکھا ہے کہ وہاں ایک دوشیزہ تھی۔وہ اس کے دامِ عشق میں گرفتار ہو گئے اور یہ کہا کہ اس کے عشق نے مجھے یہ مقام عطا کیا کہ اب یہ سب چیز جو میں لکھ رہا ہوں وہ مکاشفات کا روحانی جذبہ ہیں۔ وہاں ان پر اعتراض آ سکتا تھا کہ صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔اتنا بڑا یہ مقام مکہ ہے۔مکے میں بیٹھے ہوئے ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور ایک دوشیزہ ہے اس کے اوپر آپ فریفتہ ہو رہے ہیں' ایک خوبصورت لڑکی کے پیچھے یہ کیا ہے؟ اب دیکھیں کہ اس کا جواب کیسے ملتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ سن لو کہ جو محسوسات کی دنیا میں پھر رہے ہو تمہارے نزدیک یہ ایک خوبصورت لڑکی ہے۔یہ وہی ہے جو وہ وہاں ہے' جو وہاں ہے وہ کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔صاحب! یہ ہوا عشقِ مجازی' جو عشقِ حقیقی تک پہنچنے کی سیڑھی ہوتی ہے اور سارا تصوف اسی سیڑھی سے آگے پہنچتا ہے۔فارسی کی ساری شاعری تصوف ❷ کی ہے۔آپ کے ہاں کی شاعری میں خط و خال' گیسو اور پیکر' میکدے اور سارا قصہ جو ہے وہ عشق مجازی ہے جو عشق حقیقی تک پہنچنے کی سیڑھی ہے۔اس نے کہا کہ شراب پی رہے ہو' وہ کہتا ہے کہ مت ماری ہوئی ہے یہ تو اس کے اندر وہی ہے۔کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔وجود صرف خدا کا ہے اس لیے ہر شے خدا ہی ہے۔❸ آپ دیکھ رہے ہیں آپ کے ہاں کے عقائد کیا ہیں؟ سوچ رہے ہیں کہ قرآن نے کیوں تیرہ سو سال پہلے تمہیں کہہ دیا تھا کہ یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

---

❶ عام الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔جو کچھ نظر آتا ہے' سب خدا ہی ہے یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔

❷ اسی لیے علی حزیں نے کہا ہے کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' چنانچہ وحدت الوجود جیسا رنگین عقیدہ جب شاعروں کے ہتھے چڑھا تو انہوں نے وہ گل کھلائے کہ توبہ بھلی۔ہماری فارسی اور اردو شاعری کی لطافت نگاری اسی عقیدہ کی رہین منت ہے۔مثلاً حافظ شیرازی کہتا ہے کہ

خیال آب و گل در رہ بہانہ
ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست

(حوالہ پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور' 1992' ص۔81)

❸ اسے ''ہمہ اوست'' بھی کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ جب سب خدا ہی ہے تو پھر مختلف اشیاء' مختلف افراد' حتیٰ کہ مختلف عقائد میں تفریق و تمیز کا تصور ہی غلط ہے۔رام بھی وہی ہے' رحیم بھی وہی۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ (4:136) اے اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے! ایمان لاؤ خدا کے اوپر یہ ایمان رکھو۔ یہاں کہا جائے گا کہ صاحب! پھر قرآن یہ کہاں سے لایا؟ کیا ان کے پاس قرآن نہیں تھا؟ قرآن تھا' میں نے پوری جلدیں تو نہیں دیکھیں' کہا جاتا ہے کہ محی الدین شیخ اکبرؒ (1165-1240ء) نے سو جلدوں میں قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ❶ جو کچھ آپ سے کہہ رہا ہے تو اس کی پہلی آدھی عمر اسی میں گزری ہے۔ یہ ساری چیزیں عقیدہ ہی نہیں' ایمان کے طور پہ مان لی ہوئی تھیں۔ صاحب! پوچھو نہیں کہ وہ دور کیا تھا' الحمد للہ کہ وہ دور گزر گیا۔

اہل تصوف کے ہاں لکھی گئی تفاسیر کی بنیاد

عزیزانِ من! ان تفاسیر کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ یہ جو آپ کے ہاں قرآن کے الفاظ ہیں' ان کی رو سے قرآن کے معنی سمجھ میں نہیں آتے' نہ ہی الفاظ مخصوص ہیں۔ قرآن کے ان الفاظ کے اندر باطن میں معنی ہیں۔ اصل میں ہر لفظ کے معنی باطن میں ہوتے ہیں اور وہ باطنی معنی ہیں جو صحیح معنی ہیں' جو منشائے خداوندی ہے' وہ کسی ظاہری دنیاوی علم سے حاصل نہیں ہوتے۔ وہ جو خدا کے ہاں سے براہِ راست علم لدنی ملتا ہے بغیر کسی وسیلے کے براہِ راست ملتا ہے' اس سے وہ معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ ختم نبوت بھی ہے اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ براہِ راست بھی اس کے ساتھ خدا سے علم ملتا چلا ہے۔ اس کی روسے' یہ جو باطنی معنی ہیں' قرآن کی تفسیر پھر ان باطنی معنوں کی رو سے ہوئی۔ ذرا سی مثال لیجیے۔ بات نظری سی ہو جائے گی لیکن بہر حال کچھ تو آپ کو بھی معلوم ہو کہ یہ جن کے سامنے پتھر کے مزار ہیں جن کو جو آپ جا کے سجدے کرتے ہیں' آپ کو عقائد کیا دے رہے ہیں' کیا کیا عقائد آج بھی آپ کے ہاں یہ سب موجود ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے' اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے ہوئی: یہی مٹی اور جہاں تک اس کے جسم کا تعلق ہے' مرنے کے بعد وہ یہی بے جان مادہ ہو جاتا ہے۔ تم اگر انسان کے متعلق یہی Concept (تصور) رکھتے تو یہ تو بڑا گھٹیا قسم کا Concept (تصور) ہے۔ قرآن کی آیت ہے کہ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (20:55) ''اسی زمین سے ہم نے تمہیں نکال رکھا ہے اور اسی میں تم پلٹ جاؤ گے اور اسی سے بارِ دیگر نکالیں گے۔'' باطنی معنی کی رو سے ابن عربیؒ (1165-1240ء) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب احدیت سے نکلے تھے اور اس کے بعد فنا ہو کر احدیت میں ہی جا کے مل جائیں گے پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے۔ ❷

---

❶ یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

❷ حوالہ فصوص الحکم

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یہ قرآن کی آیت کے باطنی معنی ہیں۔ سارے قرآن کے معنی اسی طرح سے باطن سے لیے ہوئے ہیں۔ اس عقیدے کی رو سے وہ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں' وہ لکھتے ہیں کہ انا ربکم الاعلیٰ قرآن میں فرعون کے متعلق ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں تمہارا ربِ اعلیٰ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ صاحب! فرعون کو ایک طرح حق حاصل تھا کہ وہ کہے کہ انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی سی تھی۔ ابن عربیؒ [1] نے کہا تھا کہ وحدت الوجود کی رو سے حضرت موسیٰ اور فرعون میں کوئی فرق نہیں' دونوں ایک ہیں رومیؒ [2] کہتے ہیں:

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد
موسیٰ باموسیٰ درجنگ شد

آپ کو تو معلوم ہے یہ تو پھر ہر جگہ چلتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''می گفت در بیاباں رند دین در بدہ'' یعنی بیابان میں ایک رند پکار رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟ کہ صوفی خدا نہ دارد' او نیست آفریدہ۔ صوفی کسی کی مخلوق نہیں ہے' یہ بات ہی نہیں ہے' وہ تو جس طرح سے خدا موجود ہے وہ بھی موجود ہے۔ خدا اور بندہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ نہ عقل وقیاس اس کا احاطہ کر سکتی ہے' نہ کیف ونشاط کے ذریعے اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کی شاعری۔ یہ سارے جو شیخ اکبرؒ (1165-1240ء) اور مولانا رومیؒ (1207-1273ء) ہیں' سارے آپ کے ہاں کے جو بڑے بڑے شیخ طریقت اور اولیاء ہیں' ان سب کے یہ عقائد ہیں۔ ان سب کی کتابوں کے اندر یہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ اور پھر وہ رومیؒ (604-672ھ) کی شاعری کی مشہور غزل ہے:

ہر لحظہ بشکلِ بتِ عیّار برآمد' دل بردو نہاں شد
ہر دم بلباسِ دگر' آں یار بر آمد' گہ پیر و جواں شد
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ' خود رندو سبوکش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار برآمد' بشکست و رواں شد
خودگشت صراحی و مے و ساغر و ساقی' خود بزم نشیں شد
خورد آں مے و سرمست بیا زار بر آمد' شورِ دل و جاں شد

---

[1] یعنی محی الدین ابن عربیؒ (560-638ء بمطابق 1165-1240ء)

[2] محمد جلال الدین رومی (604-672ھ بمطابق 1207-1273ء)

پیالہ آپ ہی، پیالہ بنانے والا بھی آپ ہی، اس پیالے کی مٹی آپ ہی، اس پیالے سے شراب پینے والا خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد آپ ہی اس پیالے کا خریدار بن کے آیا۔ ہمہ اوست یعنی پیالہ اور وہ ایک ہی ہے۔ پھر بابا بلھے شاہ کا کلام دیکھیے۔ وحدت الوجود کو لیجیے۔ اس کا ترجمہ کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ وہ اکثر مبہم استعارات میں بات کہتے اور نادر اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں:

اربع عناصر محل بنائیو ' وچہ وڑ بیٹھا آپے
آپے کڑیاں ' آپے نینگر ' آپے بنیائیں ماپے
آپے مریں ' تے آپے جیویں ' آپے کریں سیاپے
بلھیا! جو کجھ قدرت رب دی ' آپے آپ نجاپے [1]

اہلِ تصوف کے نزدیک شرکِ خفی اور شرکِ جلی کی نوعیت

عزیزانِ من! ہنسیے نہیں، خون کے آنسو روئیے۔ ہزار سال سے آپ کا یہ اسلام چلا آ رہا ہے، اسلام ہی نہیں بلکہ یہ وہ عقائد ہیں جنہیں اسلام کا مغز قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ کس قسم کا اسلام ہے جس کے مغز کا نمونہ یہ ہے۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن سے مغز لے لیا ہے۔ یہ جتنے الفاظ کی رو سے قرآن لیے پھرتے ہو، یہ تو نچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جو کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔ صاحب! اب جو سب وہی ہوا تو پھر یہ کفر اور اسلام اور یہ اور وہ نہیں ہے۔ صاحب! یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہ محض محسوسات کے پردے ہیں:

کفر و دیں است در رہت پویاں

کفر ہو یا دین، یہ سارے اسی کے راستے کے اوپر ہیں۔

وحدہ لا شریک لہ گویاں

کافر بھی خدا کو لاشریک کہتا ہے، مسلمان بھی وحدہ لاشریک ہی کہتا ہے۔ اور آگے بڑھے۔ انہوں [2] نے کہا کہ

اے پسر لا الہ الا اللہ
ایں ز شرکِ خفی است آئینہ دار

---

[1] ان اشعار کا ٹھیٹھ ترجمہ نہیں تو کم از کم اردو مفہوم یہ ہے: ''اس نے خود ہی مادی کائنات کو پیدا کیا اور خود ہی اس کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ خود ہی لڑکا ہوتا ہے خود ہی لڑکی اور خود ہی ماں باپ۔ وہ خود ہی زندہ ہوتا ہے اور خود ہی مرتا ہے اور اپنے مرنے پر آپ ہی سیاپے کرتا ہے۔ یہ وہ بھید ہیں جو کسی کی سمجھ میں اپنے آپ آ نہیں سکتے''۔

[2] حافظ شیرازی

لا الٰہ الا اللہ کہنا شرک ہے، شرک خفی ہے، اس شعر میں یہ لفظ ہے کیونکہ اس میں لا الٰہ الا اللہ کے معنی مانتے ہیں کہ اللہ کے سوا یہ جو باقی الٰہ ہیں، یہ کوئی حقیقی نہیں ہیں لیکن ان کو مانتے تو ہو کہ یہ ہیں۔ وہ تو یہ شرک ہو گیا، ذرا سا شرک خفی کہا۔ آپ کہیں گے کہ شرکِ جلی کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ

ہست شرکِ جلی رسول اللہؐ

(معاذ اللہ) حضور ﷺ کو اللہ کا رسول کہنا یہ شرکِ جلی ہے۔ اگلے مصرعہ میں کہا کہ

خویشتن را ازیں دو شرک برار

(معاذ اللہ) بیباک شاعری کہاں تک جاتی ہے!! برہنہ الفاظ میں کیا کچھ کہتی ہے!! اپنے آپ کو ان دو شرکوں سے نکال کے لے جا۔ ان کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین جس جس چیز یا جس جس انسان کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں، وہ سب خدا ہی ہوتے ہیں کیونکہ خدا کے سوا کائنات میں کسی کا وجود ہی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی کیا ہے؟ ان کے ہاں قرآن کی رو سے، الفاظ کی رو سے تو معنی یہ ہیں کہ الٰہ وہی ہے، اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔ ان کے ہاں یہ اس کا عقیدہ اور یہ اس کے معنی کیے جاتے ہیں: لا الٰہ الا اللہ، یہ دنیا میں جتنے الٰہ کہے جاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اللہ ہی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کے یہ معنی کیے جاتے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ، یہ الٰہ، یہ الٰہ نہیں ہیں جن کو تم لوگ یہ الٰہ کہتے ہو، صاحب! الا اللہ یہ سب اللہ ہی ہیں، اللہ ہی نہیں، یونہی یہ محسوس کے پردے میں تم نے ان کو الگ الگ بنا رکھا ہے: گنگا ایک گھاٹ بہتیرے۔ [1] بس یہاں آ گئی وہ تشبیہ۔ تصوف کا سارا مدار تشبیہات پہ ہوتا ہے۔ چپک جانے والی تشبیہ ہے۔ نہ اس میں سمجھ، نہ دلیل ہے۔ بس گنگا ایک گھاٹ بہتیرے۔ کفر، دین، اسلام اور شرک سب ایک ہی ہیں۔ گنگا ایک ہے یہ سب گھاٹ ہیں۔ گنگا ایک گھاٹ بہتیرے، کہت کبیر عقل کے پھیرے۔ اسی لیے تو یہ عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ یہاں مغزِ اسلام تصوف ہے۔ اُدھر سے اسے رام اور کرشن کے بھگتوں نے عام لیا اور اِدھر صوفی شاعروں نے شطاریہ، قادریہ کا گٹھ جوڑ ہوا، چشتیہ خانوادہ نے سمند ناز پر ایک اور تازیانے کا کام کیا۔ اس طرح وحدت الوجود ان شاعروں کی رگ رگ میں سمو گیا۔

ان تصورات کی سند کے لیے خود ساختہ روایات کا سہارا

اب آپ کہیں گے کہ صاحب! اس کی آخر کوئی سند تو ہو۔ کسی بھی قسم کی سند بنا لینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ عربی کا ایک فقرہ بنایا اور اس

---

[1] یہ بھگت کبیر (1518-1440ء) کے الفاظ ہیں: گنگا ایک گھاٹ بہتیرے کہت کبیر عقل کے پھیرے
رام بھی وہی، رحیم بھی وہی اس لیے کفر اور اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ (معاذ اللہ)

کے ساتھ قائل رسولؐ اللہ لگا دیا بس سند ہوگئی' اب جو اس سے انکار کرے' منکر حدیث ہو۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرتِ ابو ہریرہؓ نے فرمایا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دو برتن عطا فرمائے۔ بند تھے' ایک کو تو میں نے کھول کے عام کر دیا۔ یہ ہے جو لوگوں میں ظاہر ہے اور دوسرا وہ ہے کہ اگر میں اس کو عوام میں عام کروں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے [1]۔ یہ بند کا بند سینہ بہ سینہ آگے چلے گا۔ یہ ہے وہ علم لدنی' اور باطنی علم جس کی رو سے یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کا ''جنوں دین کا تت کڈیا ہویا کیندے نیں''۔ [2] یعنی مغز دین جسے مولانا رومیؒ کہتے ہیں۔ یہ چیز کہنے والے تو کہیں گے کہ صاحب! اہل طریقت الگ ہوتے ہیں' اہلِ شریعت نہیں۔

تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہابی اور گلابی وہابی ایک ہی ہیں

یہ جو آپ کے ہاں اہلِ شریعت ہے' ان کے ہاں بھی تو کچھ کم نہیں یعنی ان کے ہاں اگر مناظرہ چلتا ہے تو اتنا ہی ہے کہ وہاں جا کے یا عبدالقادر کہنا چاہیے یا ساتھ ہی جیلانی معروف بہ حضرت غوث الاعظم کہنا چاہیے یا نہیں؟ وہ ان کے ہاں بھی وہی ہے' اُن کے ہاں بھی وہی ہوتا ہے۔ اس پہ بحثیں چلتی ہیں۔ ان کے ہاں یہ جو سارا کچھ ہے ان کے ہاں کی کتابوں کے اندر انبار لگے ہوئے ہیں' پڑھائی جاتی ہیں' درس دیئے جاتے ہیں' ان کے ورد کیے جاتے ہیں۔ ان کے اہلِ شریعت میں' آپ کے ہاں جو دیوبندی حضرات ہیں' ہمارے ہاں تو ان کو گلابی وہابی کہتے تھے یعنی جو اہلِ حدیث تھے' ان کو پکا وہابی کہتے تھے اور یہ ذرا سے جو ان سے ہٹے ہوئے تھے ان کو گلابی وہابی کہتے تھے۔ وہ اتنا ہی فرق تھا کہ یہ مزاروں پہ جا کے یہ کہنا یا نیاز دینا یا ختم درود دینا منع تھا یعنی یہ صرف اتنا ہی نہیں مانتے تھے' باقی جو کچھ بھی ہے وہ یہ سب کچھ مانتے ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خودنوشت سوانح حیات کی ایک جھلک

آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو آپ کے ہاں کے گلابی وہابی ہیں یہ بیعت لیتے تھے' ان کے مرید تھے' یہ مراقبے کرتے تھے' یہ ورد وظیفے کرتے تھے' ان کی کرامات ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ (1957-1879ء) کی اپنی لکھی ہوئی خودنوشت' سوانح حیات کے اندر' ان کی اپنی کرامات لکھی ہوئی ہیں کہ کتنی زور کی بارش ہو' حضرت چلے جایا کرتے تھے تو بارش کا ایک قطرہ بھی ان پہ نہیں پڑتا تھا' دائیں بائیں چلا جاتا تھا' کتنی ہی دھوپ میں چلے جایا کرتے تھے' دھوپ ان پہ نہیں پڑا کرتی تھی' دائیں بائیں پڑا کرتی تھی۔ یہ مولانا حسین احمد مدنی (1957-1879ء) تھے۔ [3]

---

[1] ان تمام نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص' 137 تا 165 (مع انہی صفحات کے فٹ نوٹ)

[2] جسے دین کا مغز کہتے ہیں۔

[3] مولانا حسین احمد مدنیؒ (1957-1879) کی کرامات کے لیے دیکھیے: دیوبند' شیخ الاسلام نمبر

میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ یہ بات نہ کہہ دیجیے کہ صاحب! یہ بھنگڑ خانے کے بھنگی ہیں جن کے متعلق یہ باتیں (معاذ اللہ) ہیں۔نہیں' قطعاً نہیں۔آپ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ ہیں۔اور آپ نظام الدین اولیاءؒ ہیں۔ان کے ملفوظات ہیں جنہیں امیر خسرو نے مرتب کیا تھا۔اور یہ وہ آپ کے ہاں کے جلیل القدر ہیں جن کے نام کے ساتھ احترام میں بے ساختہ نظریں جھک جاتی ہیں۔یہ سارے اوران سب کے ماننے والے یہ اربابِ شریعت تھے۔بات یہ چلی تھی کہ یہ انسانوں کا عقیدہ ہے۔قرآن یہ نہیں کہتا ہے کہ خدا کسی کو بیٹا بھی بنا دیتا ہے یا ان کا عقیدہ الوہیت مسیح کا ہے کہ یہ تین میں ایک اور ایک میں تین مانتے ہیں یا ان کے ہاں ایسے فرقے بھی ہیں جو خود اس کو ہی خدا مانتے ہیں۔اس پہ ہمارے ہاں ہزار برس سے ان کی تردید میں ان کے ساتھ مناظرے چلے آ رہے ہیں اور یہ آپ کے ہاں کے عقائد ہیں۔ان کا ماننے والا مشرک ہے مگر ان کو ماننے والے کہتے ہیں کہ اصل دین' مغز دین یہی ہے۔

عزیزانِ من! کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا سوچ ہی کے دیئے ہوئے یہ چراغ جلتے ہیں؟ یہاں جب آیت آئی' کہا کہ یہ انسانوں کے متعلق ہے۔انہوں نے کہہ دیا کہ صاحب! حضرتِ مسیح کے متعلق یہ عقیدہ بڑا باطل ہے' مشرکانہ ہے' ملحدانہ ہے۔صاحب! اس کے خلاف مناظرے کرو مگر یہ سب کچھ اپنے ہاں ہے اس کے خلاف ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔کوئی سوچتا ہی نہیں ہے کہ ہمارے ہاں یہ کیا عقیدہ ہے [1]۔کہو تو کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ روحانیت کی باتیں ہیں۔مجھے معاف رکھیں قرآن تو یہ کہتا ہے کہ **مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ** (23:91) اللہ کا کوئی بیٹا نہیں اور **وَ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ** (23:91) نہ ہی اس کی ہمسر کوئی صاحب اقتدار ہستی ہے کہ تم ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی حکمرانی تسلیم کر لو اور اس کی مملکت میں چلے جاؤ مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ سب کچھ قطعاً اور تماماً غلط ہے۔

خدا کی پرستش کا تصور ایک باطل تصور ہے

میں نے کہا ہے کہ جب الٰہ کا ترجمہ ہمارے ہاں معبود کیا تو سارے مسئلے خود ہی یوں ہوئے کہ پرستش کے قابل کوئی نہیں ہے' پرستش کے قابل صرف خدا ہے اور بس یعنی اب خدا کا اور آپ کا اتنا ہی تعلق ہے کہ آپ اس کی پرستش کر لیتے ہیں کسی اور کی پرستش نہیں کی جاتی۔پرستش کا تو لفظ ہی فارسی ہے' آپ پرستش کہتے ہیں۔نماز کا لفظ فارسی ہے' درود کا لفظ فارسی ہے۔دیکھیے قرآن کیسے الٰہ کو واضح کرتا ہے۔الٰہ کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں۔اقتدار' اختیار' قانون' ضابطہ' احکام صرف ایک خدا کے ہیں' کسی اور کے نہیں' پھر کہا کہ **مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ** (23:91) کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہے اور یہ بھی کہ **لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا** (18:26) وہ اپنے اس حقِ حکومت

---

[1] یہاں اس عقیدہ سے مراد عقیدہ حلول' عقیدہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ہے۔ ان وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ النور (2007ء)' ص ص 137 تا 165 (مع فٹ نوٹ)۔

میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ تو حقِ حکومت کی بات ہے۔ اب اقتدار کے بعد دیکھیے کہ قرآن وحی نازل کرنے کا کہتا ہے کہ سوچو تو سہی کہ اگر ایسی بات ہوتی' کہ کوئی اور بھی الٰہ ہوتا تو پھر اس کائنات کی حالت کیا ہوتی۔ یہ جو الٰہ کا ترجمہ معبود کیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ پرستش کرلو' کہا کہ سوچو تو سہی' اگر کہہ دیا جائے کہ صاحب! یہ اور بھی معبود ہیں تو اس کائنات کا حلیہ بگڑ جاتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آپ کہیں گے کہ یہ ان لوگوں کی جہالت ہے بس وہ اتنا ہی ہے کچھ اور تو اثر نہیں پڑتا مگر قرآن کہتا ہے کہ اگر کوئی اور الٰہ بھی ہوتا **اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** [1] (23:91)۔ تو الٰہ کے تو معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا صاحب اقتدار ہو کہ اگر اور بھی کوئی الٰہ ہوتا تو یہ صاحب اقتدار دونوں آپس کے اندر اس طرح سے لڑتے جھگڑتے' ایک دوسرے کے اوپر چڑھ دوڑتے' اپنی اپنی مخلوق کو ساتھ لے کر۔ یہ ہے الٰہ۔ کہا کہ سوچو کہ پھر کائنات کا حشر کیا ہوتا؟ اب الٰہ کے معنی سمجھ لیجیے کہ اس کے ساتھ اس کی مخلوق ہے اور وہ اقتدار رکھتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (23:91) ایک دوسرے کے اوپر اپنی اپنی فوج لے کر چڑھ دوڑتے ہیں تو الٰہ تو وہ ہے کہ جو چڑھ دوڑنے کے قابل ہوتا ہے۔ کہا کہ اس کائنات کا یہ ہو جاتا حشر اگر یہاں الٰہ کوئی اور بھی ہوتے۔ کہا کہ یہ مانو گے تو پھر خدا پر ایمان ہوگا کہ الٰہ تو وہ ایک ہی ہے' قانون تو صرف اسی کا ہی ہے' حکومت صرف اس کی ہے' اقتدار صرف اس کا ہے۔ اگر انسانوں کی دنیا کے اندر کسی اور کا اقتدار آپ نے شریک کرلیا تو یہ شرک ہی نہیں ہوگا کفر ہوگا' انکار ہوگا' بغاوت ہوگی۔

انسانی دنیا میں تصورِ خدا کا تجزیہ

عزیزانِ من! قرآن اس قسم کے ایمان والوں کی نفی کرتا چلا جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ **سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ** (23:91) یہ تسلیم کرنے والے جو تصورات (Concepts) بھی یہ خدا کے متعلق قائم کیے ہوئے ہیں' وہ ان سے بہت اونچا ہے' بہت دور ہے' بہت پاکیزہ ہے' بہت منزہ ہے۔ خدا کے متعلق جتنے تصورات بھی انسان نے قائم کیے ہیں وہ ان سے پاکیزہ ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں خدا کے متعلق جو تصورات ہیں وہ قرآن کے سوا خدا کے متعلق کوئی اور تصور آ گیا تو شرک ہو گیا' کفر ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے متعلق جو ہر انسانی تصور (Concept) ہے' وہ اس سے بلند اور بالا پاکیزہ اور منزہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک خدا کا کوئی نہ کوئی تصور رکھتا ہے۔ ذہن میں تصور کے بغیر تو اس چیز کے ماننے یا نہ ماننے کا یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ چیز محسوسات میں سے ہے تو اس کو یوں محسوس طور کے اوپر دیکھنے بھالنے سے نظریات میں سے ہے۔ کوئی تصور ہی سہی لیکن تصور تو ہوتا ہے۔ اگر تصور ایسا ہے کہ جس میں انسانوں کے متعین کیے

---

[1] ان سے کہو کہ اگر ایسا ہوتا کہ یہاں ایک سے زیادہ صاحب اقتدار ہستیاں ہوتیں تو ہر ''خدا'' اپنی اپنی مخلوق کو اپنے ساتھ لے لیتا اور اس طرح یہ سب ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (جیسا کہ دنیا کے عام بادشاہوں میں ہوتا ہے۔) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 788)۔

ہوئے، تصور کی آلائش بھی ہو جاتی ہے تو شرک ہے، عزیزانِ من! کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلماں ہونا آسان ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ تو خیالات اور تصورات کی دنیا کو بھی پکڑتا ہے۔

خدا کے صحیح تصور کو سمجھے بغیر قرآنِ حکیم سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا

عزیزانِ من! خدا کا تصور وہ ہے جو قرآن نے دیا ہے۔ اس میں کسی انسان کے وضع کردہ تصور کی کوئی آلائش نہیں۔ اگر یہ تصور قائم ہو جائے تو خدا کے دیئے ہوئے اس تصور کے مطابق سارا ہی قرآن سمجھ میں آ جاتا ہے۔ وہ تو اس کی بنیاد ہی خدا کے تصور پہ ہے۔ خدا پہ ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں بلکہ یہ ہیں کہ وہ **عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ** (23:92) تمہارے ظواہر پہ بھی نگاہ رکھنے والا ہے، تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک کے دیکھنے والا ہے، تمہارے تصورات تک پہ نگاہ رکھنے والا ہے۔ سوچتے ہو کہ وہ کیا ہے؟ اس لیے تصورات میں بھی اگر تم نے کسی قسم کا شرک کر لیا تو وہ اس سے بہت اونچا ہے۔ وہ صحیح کہا تھا سعدیؒ نے کہ

ہے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم

یہ وہی Concept of God ہے، یعنی خدا کا تصور ہے، معاف رکھیے گا، میں نے God کہہ دیا، اللہ کے لفظ کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے، اللہ کا جو تصور ہے، اس کے مختلف گوشے (Facets) ایسے ہیں کہ ان سے وہ تصور متعین ہوتا ہے جس میں ذہن انسانی کے کسی قسم کے خیال و قیاس و گمان و وہم کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ہے توحید۔

نبی اکرم ﷺ کی 23 سال تک کی داستانِ کشمکش حیات

اب کشمکش کی، ٹکراؤ کی، ساری دنیا کے خلاف ٹکراؤ کی بات پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ یہ تو ہے ہی ساری دنیا کے خلاف ٹکراؤ۔ ایک کافر، مشرک، ملحد تو ایک طرف رہے یہ تو خدا کو ماننے والوں کے خلاف بھی ٹکراؤ ہے، یہ تو اس ستر کروڑ مسلمانوں [1] کی آبادی کے خلاف بھی ٹکراؤ ہے، یہ ٹکراؤ چلا آ رہا تھا اور وہ آپ کو یاد ہو گا، جو ایک بات آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مکے کی تیرہ سالہ زندگی کی ابتدا اس ٹکراؤ سے ہوئی۔ اس دور میں ہر قسم کی مسلسل تکالیف، مصائب، صعوبتیں، پریشانیاں، آتی رہیں گی۔ خدا کا یہ وعدہ آ رہا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے، انجامِ کار تم دیکھو گے کہ یہ کیسے تباہ ہوں گے۔ اس تباہی کے متعلق پہلی چیز تو یہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی یہ بات پہلے (13:40) میں بھی آ چکی

---

[1] یاد رہے یہ بات اگست 1977ء کی پانچ تاریخ کو لکھی گئی تھی۔

ہے کیونکہ قرآن کی آیات بار بار آتی رہتی ہیں کہ نبوت کی زندگی کا قریباً 60% مصائب وتکالیف برداشت کرتے ہوئے گزر گیا۔ ایک وعدہ ہی تھا جو ادھر سے آیا ہوا تھا کہ یہ تباہ ہوں گے اور انجام تیرے حق میں ہوگا' کامیابی آخرالامر یہ ہوگی۔ یہاں ہی نہیں' مدینے کی زندگی میں بھی جا کر یہ ٹکراؤ تو پھر عمل میں آ گیا تھا۔ یہاں تو صرف مار ہی پڑتی تھی وہاں میدانِ جنگ میں آ گئے۔ فتح مکہ تک تو سات سال اور گزر گئے تھے۔ تیرہ سال وہ' اور سات سال وہ' کل بیس سال ہو گئے۔ تیئس سالوں میں یہ بیس سال تو مسلسل جہاد' مسلسل لڑائی رہی۔ مدنی زندگی تو اس سے بھی زیادہ اس قسم کے تصادمات سے بھری ہوئی تھی۔

حضور ﷺ کی ایک حسین آرزو

وعدے پہ بڑا یقین تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا مگر ایک معصوم سی آرزو قلبِ مطہر میں ابھری۔ عزیزانِ من! ابھرنی بھی چاہیے تھی: دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت۔ اس قسم کے جہادِ مسلسل کرنے والوں کے دل میں بھی آرزو ابھرتی ہے کہ یا اللہ! میری ساری عمر اس طرح سے پٹتے پٹاتے گزر جائے گی یا جو کچھ مجھ سے کہا جا رہا ہے میں اس کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکوں گا۔ بڑی فطری آرزو ہے' بڑی معصوم سی آرزو ہے کہ کیا میں اپنی بات کی عملی تکمیل دیکھ بھی سکوں گا؟ مجھے شروع میں قرآنِ کریم سے محبت تھی اور آج بھی اسی طرح زندہ وتابندہ ہے۔ بے ساختہ دل کے اندر یہ جذبہ آیا کہ اللہ تعالیٰ! کیا اس کی تکمیل وتشکیل میری اس حیاتِ طبیعہ (Physical Life) میں ہو سکے گی؟ جواب تھا کہ فکر نہ کر یہ ضرور ہوگا' یہ ہمارا وعدہ ہے۔ لیکن یہ تو ایک انسان کی آرزو کے مقابلے میں کوئی انسان کا ہی دوسرا جذبہ تھا اور خدا تو اسے کہتے ہیں جو جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ تمہاری یہ آرزو ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ **وَ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا**(13:40) تیری زندگی میں ہی یہ سب ہو جائے۔ وعدہ تو تو کہتا ہے' تیرا سچا ہے' اس پہ تو مجھے یقین ہے' اس پہ مجھے شک نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات تو اتنی ہے مگر یہ بتا کہ میری زندگی میں یہ آئے گا یا میرے بعد؟ اور از اں کہ من نہ مانم۔ حضور ﷺ تو یہ نہیں کہہ سکتے تھے' میں بھی یہ جرأت نہیں کرتا لیکن یہ آرزو ضرور تھی۔ خدا کی طرف سے جواب آیا کہ اے رسول ﷺ! جو وعدہ ہم کر رہے ہیں' وہ تیری زندگی میں پورا ہو یا تیرے مرنے کے بعد پورا ہو' یہ دیکھنا تیرا کام نہیں ہے کہ تو اس کو متعین کرے لہٰذا اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں' تیرا کام **فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ**(13:40) اس کو پہنچائے چلے جانا ہے اور ہوگا۔ کب نتائج نکلیں گے ہمارے قانون کے مطابق اس کا حساب ہوگا تو کرتا جا یہ کام۔ میرے اللہ! جی چاہندا سی کہ تھوڑی جی وی تے رعایت دے دے۔ جے اور رعایت دیدوے تے اور رب بنن دے قابل ای نئیں رہندا[1]۔

---

[1] میرے اللہ! جی چاہتا تھا کہ تھوڑی سی ہی رعایت (Favour) دے جا۔ اگر وہ رعایت (Favour) مرحمت فرما دے تو وہ رب بننے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

عزیزانِ من! یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ رسول کی آرزو کا بھی یہ جواب ملا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ کچھ کرنے والے چار قدم چلنے کے بعد ہی مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ صاحب! وہ خدا کس قسم کا ہے' یہ سب کچھ ہو رہا ہے' ہم مر رہے ہیں' روز مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں' تکلیفیں ہی تکلیفیں ہیں' اور یہ ہے کہ کہتا ہے کہ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:40) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچائے جا۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق' نتائج کب ظہور میں آتے ہیں' کوئی بات نہیں۔ فَاِمَّا نَذۡهَبَنَّ بِکَ فَاِنَّا مِنۡهُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ o اَوۡ نُرِیَنَّکَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَیۡهِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ (43:41-42) یہ سمجھ رکھ کہ تیرے جانے کے بعد یہ ہو' یا تیرے سامنے یہ بات ہو' ہم ان دونوں چیزوں پر

قادر ہیں لیکن یہ تیرا کام نہیں ہے کہ تو ان کے لیے بیٹھ کے حساب کرے۔ وہ جو خدا نے کہا ہوا ہے کہ وہ بغیر حساب رزق دیتا ہے ہم اس بغیر حساب کو یہ سمجھتے ہیں کہ اے اللہ دی ونڈ اے۔ اللہ دی ونڈ سارے کہندے نیں' تے جی جنوں چاہے لکھوں لکھ کر دے جنوں چاہے ککھوں لکھ کردے۔ [1] بغیر حساب کے معنی یہ نہیں ہوتے' وہ معنی یہ ہوتے ہیں کہ تمہارے حساب کے مطابق نہیں ہوگا وہ ہمارے حساب کے مطابق ہوگا۔ رسول کے لیے کہا کہ ہم اس چیز کے اوپر قادر ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ فَاسۡتَمۡسِکۡ بِالَّذِیۡۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (43:43) تو اُس وحی کے مطابق لازمی طور پر کرتا رہ۔ اس کے مطابق اپنا جو پروگرام ہے' جاری رکھ۔ یہ یقین رکھو کہ تیرا جو راستہ ہے یہ سیدھا ہے' منزل تک پہنچا کر رہے گا۔ تھک کر نہ بیٹھ جاؤ' راستہ سیدھا ہے۔

عزیزانِ من! ایک آرزو اور ابھری کہ یا اللہ! مجھے اس کا یقین تو ہے کہ ضرور ان کی تباہی آئے گی۔ نظر آئے گا کہ یہ مکے کی زندگی ہے۔ بہرحال فرمایا کہ قُلۡ رَّبِّ اِمَّا تُرِیَنِّیۡ مَا یُوۡعَدُوۡنَ o رَبِّ فَلَا تَجۡعَلۡنِیۡ فِی الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ (23:93-94) بارِ الٰہی! اگر ان پہ تباہی آنی ہے تو ایسا کیجیے کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے' مجھے یہاں سے پہلے نکال کر لے جا۔ نبی کا لطیف اور شفیق قلب ہوتا ہے۔ یا اللہ! تباہی آنی ہے اف' اگر یہ تباہی آنی ہے تو میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ انتقام کا جذبہ نہیں تھا۔ جذبہ تو سارا ہی اصلاح کا تھا' شفقت کا تھا' محبت کا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نہ ہو لیکن یہاں پہنچ کر یہ بات کہی کہ وَ اِنَّا عَلٰۤی اَنۡ نُّرِیَکَ مَا نَعِدُهُمۡ لَقٰدِرُوۡنَ (23:95) ہم اس پہ قادر ہیں کہ تیری زندگی میں یہ کچھ ہو جائے' اس پہ بھی قادر ہیں کہ تو یہاں نہ ہو' اور تیری بات بھی پوری کر دیتے ہیں تیری آنکھوں کے سامنے۔ یہ بات ہماری بھی پوری ہو جائے گی کہ یہ کر سکتا ہے۔

---

[1] یہ اللہ کی تقسیم ہے اور اللہ کی اس تقسیم کو سبھی یہ کہتے ہیں کہ وہ چاہے تو ساہوکار کو کنگال کر دے اور کنگال کو ساہوکار۔

دین خداوندی مدافعت کا سبق دیتا ہے طمانچہ کھانے کا نہیں

لیکن تیرے ذمے ایک پروگرام ہے۔ سنیئے عزیزانِ من! یہ پروگرام کیا ہے؟ کہا کہ یہ ساری ناہمواریاں' یہ ظلم' یہ استبداد' یہ زیادتیاں' یہ دھاندلیاں' یہ ناانصافیاں' سب کچھ ان کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان کے جواب میں کہیں تم بھی ان ہتھیاروں پہ نہ اتر آنا۔ اسلام کا پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے' طریق کار کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (23:96) مدافعت کر۔ طمانچہ کھا کر دوسری گال سامنے کرنے والی بات نہیں ہے' مدافعت کر۔ یہ ہے فرق' عزیزانِ من! محرف شدہ دین میں اور خدا کے منزہ دین میں۔ وہاں عیسائیت میں بھی یہ چیز ہے کہ یہ محرف ہے۔ کہا کہ مدافعت کر' اس کی مدافعت کا طریق اور ہے کہ یہ جتنی ناہمواریاں پیدا کرتے جاتے ہیں' یہ گڑھے کھودتے ہیں' تو ان گڑھوں کو بھرتا چلا جا' تو اپنے حسنِ عمل سے ہمواریاں پیدا کرتا چلا جا' حسن کارانہ انداز سے مدافعت کر۔ اس کا یہ جواب دے۔

انسانیت کے لیے سیاست کا واحد علاج حسنات سے ہی ممکن ہے

قرآن کا وہ اصول میں بار بار دہرایا کرتا ہوں' ہر شخص یہ پوچھتا ہے کہ صاحب! یہ بڑے مظالم ہو رہے ہیں' بڑی ناانصافیاں ہیں' معاشرہ دیکھو کس طرح تباہی اور بربادی پہ اتر آیا ہے' کیا کیا جائے؟ ارے مجھ سے کیوں پوچھتے ہو' اس سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114)۔ میں نے کہا ہوا ہے کہ یہ چار الفاظ تو آپ کے ہاں حکومت کے ہر دفتر میں' ہر جگہ' جلی حروف میں لکھنے چاہئیں۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ (11:114) اس بات پہ یقین رکھو کہ برائیاں اور ناہمواریاں دور ہوتی ہیں حسنات کے ذریعے سے۔ حسن کہتے ہیں کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا۔ تو کہا کہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ وہ کرسی پہ بیٹھا ہے اور وہ اب گرا' یا اب گرا' تو کرسی کا' اس کا' توازن ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ کرسی کے پائے تلے ایک ٹکڑا دیدیو یعنی جو اس کا بگڑا ہوا توازن ہے اس توازن کو ٹھیک کر دیں' کرسی کو متوازن بنا دیں' علاج ہو گیا۔ قرآن سیأت کا علاج حسنات سے کرتا ہے۔ جتنی زیادہ کسی معاشرے میں سیأت عام ہو رہی ہیں اس معاشرے کے اندر اس سے زیادہ حسنات پیدا کرتے چلے جاؤ' سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں ایک سیأت کے مقابلے میں کہتے ہیں کہ دس سجدہ کر و یا' اینٹ مارو یا پتھر مارو۔ اس سے تو صرف وہ پوری کی پوری عمارت گرا دو گے۔ یہاں مرض کا یہ علاج ہوتا ہے۔ برائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اگر ہلکی قسم کی برائی تھی' یہ اس سے زیادہ قسم کی برائی ہے۔ ہوتی یہ بھی برائی ہے۔ برائی کا علاج برائی نہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ برائی اور نیکی' بدی اور نیکی تو الفاظ ہی فارسی کے ہیں۔ قرآن تو ایک طرف' یہ عربی کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ یہ الفاظ ہی تو ہیں جنہوں نے ان کو جھوٹا اطمینان بھی دلا دیا' تباہیاں بھی لے آ رہے ہیں۔

ہمارے ہاں نیکی لفظ ہے۔ اس سے زیادہ تو لفظ ہی ہماری زبان میں نہیں ہیں اور نیکی کا اپنا اپنا Concept (تصور) اپنے ذہن کے اندر ہے۔ سیٔات اور حسنات آپ لے آیئے اور ان کے معنی قرآن سے پوچھیے' بات کہیں کی کہیں چلی جاتی ہے۔ جہاں ناہمواری پیدا ہوگی وہاں وہ ہزار نمازیں پڑھو' لاکھ حج کیجیے' وہ سیٔات میں داخل ہوگی' اس کا علاج؟ حسنات کی طرف آپ کی توجہ ہونی چاہیے' یہ اس کا علاج ہے۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجیے' عزیزانِ من! معاشرے میں' میں اپنے معاشرے میں نہیں کہہ رہا' ساری دنیا میں سیٔات پھیلی ہوئی ہیں۔ دنیا سیٔات کا مقابلہ یا اس کی مدافعت' سیٔات سے کر رہی ہے۔ سیٔات بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ میرے سامنے تو آج سے بیس تیس سال پہلے کے بھی یورپ کا جو واویلا ہے' وہ بھی موجود ہے۔ اس کو اقبالؒ (1938-1877ء) یورپ کا واویلا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابھی نچلے سر میں ہے۔ وہ کب آئے گا؟ میں نے اس زمانے میں بھی ان کے ہاں کی تحقیقات کی کتابیں پڑھی ہیں' کچھ کم تھیں۔ جوں جوں یہ ان کی مدافعت کی تدبیریں کرتے جا رہے ہیں اپنے ذہن میں برائی کا مقابلہ اس سے زیادہ بڑھ کر برائی میں اور زیادہ برائیاں پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ ان معاشروں کے اندر یہ علاج ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) اجتماعی طور پہ' تو عزیزانِ من! بہر حال معاشرہ یہ کرے گا' انفرادی طور پہ' آپ یہ کچھ حسن کارانہ انداز میں کر کے دیکھیے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کر کے دیکھو بدترین دشمن' عزیز ترین دوست ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا یہ ارشاد ہے کہ تم سیٔات کی مدافعت حسنات کے ذریعے سے کرتے رہو' اجتماعی طور پر اپنی جماعت کو بھی تیار کرو۔ یہ سب من مارنے کی بات ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے آخر الامر جب مکے میں داخل ہوئے ہیں تو جنہوں نے اس سارے بیس سال میں کہہ لیجیے' ہر قسم کی اذیت پہنچائی' مقابلہ کیا' تصادم کیا' جنگ تک میں اتر آئے' سب کچھ کیا' یہ سارے کے سارے قریش مکہ اس طرح پابجولاں سامنے کھڑے تھے اور دوسری طرف پوری مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ گئے۔ فاتح مکہ کی حیثیت سے حضور ﷺ تھے۔ وہاں دشمن اس طرح سے سامنے آ کر پابہ زنجیر کھڑے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ کہو' کیا سزا ہے تمہاری؟ حضور ﷺ بھی تو بہر حال حضور تھے مکہ والوں کے غیر نہیں تھے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے جو فریقِ دشمن کی سزا ہوتی ہے وہ سزا دو۔ انہوں نے دشمن کا لفظ استعمال کیا۔ کہا کہ میں تو انسانیت کا دوست ہوں' دشمن نہیں ہوں: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) کوئی سزا نہیں' یہ تھوڑی سزا تھی جو تمہیں مل گئی ہے' اس کے بعد کوئی اور سزا باقی نہیں رہ جاتی' میرا کام زنجیروں کو توڑنا ہے' میرا کام زنجیریں پہنانا نہیں ہے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ [1] (23:96)۔ یہ سارے کے سارے اس قدر وفادار اور ہمدرد اور ایثار شعار ہوئے کہ اس کے ساتھ کی صفوں کے اندر

---

[1] ان کی پیدہ کردہ ناہمواریاں اپنے حسن عمل سے دور کرتے رہا کرو۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ (23:96) ہم ان کی سب باتوں کو جانتے ہیں۔

سب سے آگے یہ لوگ تھے۔ لیکن اپنی جماعت کے متعلق ایک بات کی کہ اتنا بڑا فریضہ میرے ذمہ ہے۔ **وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ** (23:97)۔ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ کیا بات ہے۔ یا اللہ! میں صرف تجھ سے ایک چیز مانگتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میری مدافعت تو کر، مجھے حفاظت دے، مجھے پناہ میں رکھ۔ کس چیز سے؟ اس چیز سے کہ میری جماعت کے اندر آ کر کچھو کے لگا کر، جو اس قسم کی بدلیاں اور منافرتیں اور سرکشیوں کے جذبات پھیلانے والے ہیں، ان سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں، باقی میں سب سنبھال لوں گا۔ یہ ہے جن سے پناہ مانگتے ہیں کہ یہ جو اس قسم کی سازشیں کرنے والے ہیں، جب مستحکم جماعت ہوتی ہے، نہایت متحمل ہوتی ہے، وہ آتے ہیں اور ان کے نہایت ہمدرد اور شفیق اور بہی خواہ بن کر جماعت کے اندر سازشیں پیدا کرتے ہیں۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ ''کیوں تینوں کی لب جانا اے، ساری عمر تیری مار کھاندے آں، گزر گئی''❶؟ یہ جو کچھ بھی ہے، باپ بچے اور وہاں عزیز اور اقارب وہ سارے گرفتارِ بلا ہیں، تم یہاں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہو، مل کیا رہا ہے، ساری عمر گزر گئی، باقی بھی گزر جائے گی، بڑے ہمدرد بنے پھرتے ہو۔ یہ جو ہمدرد ہیں، یہ ہیں جماعت کے اندر سازشیں پیدا کرنے والے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ جواب کیا تھا اور اب آپ نے دیکھا کہ یہ جو ہمیں کہا گیا ہے کہ **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ** اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ کس چیز سے Protection (حفاظت، پناہ) مانگی جا رہی ہے؟ **وَ اَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ** (23:98) اور میں اس چیز سے تمہاری پناہ مانگتا ہوں کہ یہ وہ جو یحضرون کہہ کر کہا ہے کہ جو کچھ بھی تیرے قانون کے مطابق ان کو سزا ملنے والی ہے، وہ میرے سامنے نہ ہو اور میری جماعت کی Protection (حفاظت) اس سے ہو جائے، یہ تو بس میری دعا ہے۔ باقی جو کہا گیا ہے کہ جو میرا کام ہے، میں وہ کرتا چلا جاؤں گا تو پھر وہ اس کے بعد نتائج تاریخ کے اوراق سے پوچھیے، عزیزانِ من! پھر کیا برآمد ہوئے آج کا وقت پورا ہو گیا۔ انہیں ہم آئندہ لیں گے۔

سورۃ المؤمنون کی آیت 98 تک ہم آ گئے 99 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

❶ کیوں آخر تجھے کیا ملے گا؟ کیا تیری ساری عمر مار ہی کھاتے گزر جائے گی؟

پندرھواں باب: **سورۃ المؤمنون** (آیات 99 تا 107)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا
تَرَکۡتُ کَلَّا ؕ اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا ؕ وَمِنۡ وَّرَآئِھِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ
یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَھُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّلَا
یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنۡ
خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ فِیۡ جَھَنَّمَ
خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلۡفَحُ وُجُوۡھَھُمُ النَّارُ وَھُمۡ فِیۡھَا کٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمۡ تَکُنۡ اٰیٰتِیۡ
تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَکُنۡتُمۡ بِھَا تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوۡا رَبَّنَا غَلَبَتۡ عَلَیۡنَا شِقۡوَتُنَا
وَکُنَّا قَوۡمًا ضَآلِّیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡھَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1977ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 99 سے ہو رہا ہے: (23:99)۔

مہلت کے وقت کی اہمیت

پیچھے سے ذکر یہ چلا آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو وارننگ دی جاتی رہی کہ جس روش پہ تم چل رہے ہو' اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ یہ بڑا سائنٹفک طریق جاری وساری ہے۔ ایک ایسا مرض جس کے متعلق آپ کو خیال تک نہ ہو کہ یہ مرض بھی آپ کو ہو سکتا ہے لیکن کچھ ایسی علامات ہوں کہ جنہیں دیکھ کر وہ یہ کہہ دے گا کہ دیکھو بھئی! تمہیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے' ان ان چیزوں سے احتیاط برتو' ان ان قسم کی چیزیں کرو' اگر ایسا نہیں ہوگا تو ایک دن یہ مرض بڑھ جائے گا اور اس کے بعد پھر شاید یہ لا علاج ہو جائے۔ عام طور پہ اس قسم کی وارننگ پہ کان نہیں دھرا جاتا اور وہ مرض بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اس نکتے پہ پہنچ جاتا ہے' جہاں وہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ مریض تو چیختا روتا ہوا پھر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہاں یہ کہتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میں نے تو تمہیں اتنا عرصہ پہلے اس کے متعلق وارننگ دیدی تھی لیکن تم نے اس پہ دھیان ہی نہیں دیا' کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ اب یہ بڑھتا گیا اور اس مقام تک آ گیا ہے۔ پھر یہ مریض بے ساختہ ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! اس دفعہ تو کسی طرح اس کا علاج کر دیجئے' آئندہ کے لیے آپ دیکھیے گا کہ میں کس طرح اس کی احتیاط برتتا ہوں' میری توبہ' میرے بڑوں کی بھی توبہ' اگر میں یہ کچھ کروں۔ وہ جو اس تکلیف کی شدت ہوتی ہے اور اس درد کے جو نتائج سامنے آتے ہیں تو اس وقت یہ چیز بے ساختہ آتی ہے۔ یہ اندر کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی حفاظت چاہتا ہے اور فرق تو اتنا ہی ہے کہ پہلے سے جب یہ کہا جائے تو دھیان نہیں دھرتا اور جب وہ بالکل تباہی کے منہ پہ آ جاتا ہے تو اس وقت وہ چیختا ہے۔

پیچھے سے یہی بات چلی آ رہی تھی کہ ان کو وارننگ پہ وارننگ دی جاتی رہی کہ یہ غلط نظام ہے اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا لیکن وہ اس پر کان نہیں دھرتے' انہوں نے اس پر توجہ نہیں کی حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ (23:99) جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے یا وہ مر جاتے ہیں تو قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ o لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ (23:99-100) تو اس وقت یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں مہلت دے' ہمیں اس زندگی میں اس دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ جو کچھ ہم نے پہلے نہیں کیا تھا' وہ کریں' اس کمی اور نقصان کو پورا کریں' ہمیں کسی طرح واپس بھیج دے۔ آپ دیکھیے بات تو بڑی آسانی سے سمجھ آ جانے والی ہے اور بالکل سیدھی سادی سی ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ روزمرہ کے دیکھنے کی چیزیں ہیں۔

موت کے بعد مختلف چکروں کا تصور یونان کا پیدا کردہ ہے

قرآنِ کریم تو سیدھی سادی بات کرتا ہے اور پھر بڑی گہرائی میں جا کر اہم قسم کے نظریات اور غلط معتقدات کی تردید بھی ساتھ کرتا چلا جاتا ہے۔اس کا انداز ہی یہ ہے۔زندگی کے متعلق یہ واپس آنے کا ایک عقیدہ Iransmigration of Soul (تناسخِ روح) ہے۔ یونان سے اس کی ابتدا ہوئی۔بات ذرا لمبی چلی جائے گی' میں بالکل مختصر الفاظ میں یہ عرض کرونگا۔یونان کے فلاسفرز نے دیکھا کہ یہ بڑے بڑے کرے' جتنے بھی ہیں' یہ سب گول ہیں' چاند سورج گول ہیں۔یہ ان کو زمین سے چلتے نظر آتے تھے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ جو سائیکل (دائرہ) ہے' یہ اصل میں کائنات کی بنیاد ہے لہٰذا اِس چکر اور گول دائرے کے ساتھ انہوں نے زندگی کے متعلق بھی یہی تصور قائم کیا کہ یہ سائیکل آرڈر (Cyclic Order) میں چلتی ہے یعنی یہ زندگی دائرے کے اندر چلتی ہے۔اب دائرے میں چلنے کے معنی یہ ہیں کہ جب دائرہ ختم کر کے' پھر اس مقام پہ آئے تو پھر وہ چکر شروع ہو جائے یعنی وہ آگے نہیں بڑھتی بلکہ اسی چکر کے اندر رہتی ہے۔انہوں نے یہ تصور کیا تو اس تصور کا پہلا ہی نتیجہ یہ تھا کہ پرستش کا کوئی راستہ ہی ان کے سامنے نہ رہا۔جب کولہو کے بیل کی طرح آپ سارا دن ایک چکر میں چلتے رہیں' وہ بیل شاید تیس چالیس پچاس ساٹھ میل کا سفر طے کرتا ہے لیکن صبح جہاں سے چلا تھا شام کو وہیں سے اس کی رسی کھول دی جاتی ہے اور ساری عمر وہ اسی طرح سے چلتا رہتا ہے لہٰذا اب ان کے سامنے اگلی چیز یہ آئی کہ موت کے بعد زندگی مختلف چکروں میں رہتی ہے۔

زندگی کے سلسلہ میں انسانی سوچ آج بھی افلاطون' ارسطو اور فیثا غورث کے پیدا کردہ اسی چکر میں گرفتار ہے

ضمناً میں یہ عرض کر دوں کہ وجہ یہ ہے کہ یونان نظری طور پر (Theoretically) دنیا کے اندر تو فلسفے میں اُس دور میں ہی نہیں' بلکہ آج تک اس دور سے بھی بہت بلندیوں کے اوپر ہے۔افلاطون (347-428 ق م)' ارسطو (322-348 ق م) وغیرہ کے مقابلہ کے فلسفہ دان آج تک پیدا نہیں ہوئے۔یہ آپ کے ہاں کی جو Logic (منطق) ہے اس کی بنیاد آج بھی ارسطو کے کلیات پر ہے' وہ نظری طور پر بہت اونچے ہیں لیکن وہ اہل یونان سوئی تک نہیں بنانا جانتے تھے۔وہ اس لیے کہ ان کے ہاں زندگی کا جو آگے بڑھنا تھا' اس کا یہ تصور ہی نہیں تھا۔وہ زندگی کو دائری حرکت کے اندر لیتے تھے اور اب جب موت ان کے سامنے آئی تو انہوں نے کہا کہ اب کیا کیا جائے' دائرہ ختم ہوا۔انہوں نے کہا کہ نہیں' مرنے کے بعد پھر انسان اس دنیا میں آتا ہے۔انہوں نے مرنے کے بعد سائیکل آرڈر'

(Cyclic Order) 'مسئلہ آواگون رکھنا تھا' پھر گردشِ دورلابی شروع ہوجاتی ہے۔ یہ تھا ان کے ہاں وہ تصور جسے آپ Transmigration of Soul (تناسخ روح) کہتے ہیں۔فیثاغورث (500-580ق م)❶ نے اس چیز کی بنیاد کی رکھی جس کا نام ہندوؤں کے ہاں آواگون ہے۔

ہندودھرم کی ساری بنیاد آج بھی اسی چکر کے عقیدہ پر ہے

آواگون کا یہ لفظ ہندی ہے۔یہ ہندوؤں کے ہاں چکر ہے۔ان کے ہاں تو کوئی چیز اپنی ہے ہی نہیں:

آنکھ نرگس کی ' دہن غنچے کا ' حیرت میری
ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

ان کے ہاں کوئی چیز اپنی نہیں ہے۔ذرا ٹریس (Trace) کیجیے تو نظر آجاتا ہے کہ وہ جتنے لوگ ان کے ہاں حملہ آور آتے رہے' وہ تو تباہ و برباد کر کے چلے جاتے رہے۔ان کے نظریات اور کلیات جو کچھ تھے وہ یہ اپنے پاس رکھتے تھے۔یہ جسے آپ ہندودھرم کہتے ہیں' انہوں نے یہ جو آواگون یا تناسخ کا چکر لیا ہے' اس نے ہندوؤں کے ہاں دھرم کی شکل اختیار کی اور وہ آج تک یہ مانتے ہیں۔وہ یونان والے تو مر مرا گئے' کہیں مٹ مٹا گئے یہ جو جون پلٹ پلٹ کے آتی ہے' پھر واپس آنا' پھر واپس آنا' یہ تصور ان کے ہاں ابھی تک چلا آرہا ہے۔

تصورِ آواگون کے برعکس' قرآن حکیم کا پیش کردہ ایک عظیم تصورحیات 'صراط مستقیم' ہے

قرآنِ کریم نے آکر زندگی کے متعلق ایک لفظ دیا کہ زندگی صراطِ مستقیم پر چلتی ہے' سیدھی لائن کے اوپر چلتی ہے' چکر میں نہیں چلتی۔ چکر میں چلنے سے تو کوئی پروگریس (ترقی) نہیں ہوتی' انسان وہیں کا وہیں رہتا ہے' سیدھی لائن پہ چلنے سے آپ کا ہر قدم آگے کی طرف جاتا ہے سیدھی لائن بھی آگے کو جاتی ہے اور قرآن نے خدا کو ذی المعارج بھی کہا ہے۔سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اس میں ہر قدم ہر ڈنڈے پہ آگے بھی جاتا ہے' بلندیوں کی طرف بھی جاتا ہے۔

---

❶ Pythagoras (c.580-500 B.C). Greek philosopher, theologian, and mathematicia. The school he founded in southern Italy taught spiritual growth through asceticism and the study of musical harmony and geometry. Though his famous theorem was known previously, he was the first to prove its universal validity. His insight into the relationship between numbers and the perceived universe gives him claim to be the first true mathematician. (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited, P. 1253).

آپ دیکھیے کہ ایک لفظ سے قرآن کتنے بڑے فلسفے کی بنیادیں ہیں' جو رکھ رہا ہے لیکن رکھ کس طرح سے رہا ہے کہ چودہ سو سال پہلے کا ایک بدو' کھجور کی گٹھلیوں پہ گزارا کرنے والا' وہ بھی بات سمجھ لے اور آج کا آئن سٹائن بھی اس سے بات سمجھ لے کہ زندگی چکر میں نہیں چلتی' سیدھی جاتی ہے' بلندیوں کی طرف چلتی ہے' طبقاً عن طبقٍ درجہ بدرجہ بلند ہوتی ہوئی' آگے بڑھتی ہوئی' چلی جاتی ہے۔ لہٰذا زندگی کے پیچھے کی طرف لوٹنے کا تو سوال ہی نہیں بلکہ زندگی کے پانی کا جو دھارا آگے بڑھ جاتا ہے' واپس نہیں آسکتا۔ دو ہی شکلیں ہوتی ہیں: سیدھی لائن پہ چلنے والا یا تو رک جائے گا' ایک مقام پہ کھڑا ہو جائے گا یا آگے بڑھے گا' پیچھے آ ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کہنے کو تو یہ ایک لفظ کا تصور ہے اور دعا ہے **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5) یارب ذی المعارج! ہماری صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کردے یعنی قرآن اتنی بات میں یہ کچھ کہہ کیا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن سمجھ میں اس طرح سے آتا ہے' اس کے لیے ان چیزوں کی Comparative Study (تقابلی مطالعہ) ہونی چاہیے: Religion (مذہب) ہی کی نہیں' فلسفے کی' زندگی کے نظریات کی' کلیات کی' پھر بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک لفظ سے قرآن کہہ کیا گیا ہے۔ اب یہاں اس نے کہا کہ جب ان کے سامنے نتائج آئیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اے ہمارے رب! ایک دفعہ ہماری زندگی کے اس پانی کے دھارے کو پیچھے کی طرف لوٹا دے' ہمیں واپس بھیج دے تو پھر دیکھ کہ جو کچھ ہم نے نہیں کیا تھا' جو کچھ تم کہتے تھے اور ہم کان نہیں دھرتے تھے' ہم پھر وہ کیسے کرتے ہیں لیکن اس قسم کے سارے تصورات کے لیے قرآن کا ایک لفظ ہے: **كَلَّا** (23:100) زندگی کے تصور میں یہ ناممکن ہے' تم پیچھے نہیں جاسکتے' رک کے یہیں کھڑے رہ سکتے ہو' آگے بڑھ سکتے ہو' پھر پیچھے قدم نہیں پڑسکتا۔ کس قدر ایک نیا تصور دیا ہے قرآن نے۔ کہا کہ **كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا** (23:100) وہ یہ باتیں ہیں جو وہ کر رہے ہیں جبکہ یہ زندگی کی ممکنات میں سے ہے ہی نہیں۔

برزخی زندگی کا تصور اور عذابِ قبر کی حقیقت

برزخ کے عرصہ کی وضاحت میں کہا کہ **وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ** (23:100)۔ یہاں ایک اور لفظ آگیا ہے۔ ہمارے ہاں درمیان میں ایک تصور آتا ہے کہ اس موت میں اور قیامت کے دن زندگی کے درمیان ایک عرصہ ہے اور یہ تو عام طور پہ آپ نے سنا ہوگا یعنی درمیان میں حیاتِ برزخ' برزخی زندگی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ یہ ان کے ہاں کا تصور پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں موت ہے اور قیامت کو کہتے ہیں کہ زندگی ہوگی۔ یہ جو درمیانی عرصہ ہے یہ وہ ہے جسے آپ قبر کا عذاب کہتے ہیں یعنی حساب کتاب بھی ابھی نہیں ہوا ہے' جرم بھی کوئی ثابت نہیں ہوا' سزا بھی نہیں ہوئی' تو یہ جو درمیان میں' یہ قبر کا عذاب ہے وہ جو حوالات میں ملتا ہے عذاب یعنی ملزم ابھی

عدالت میں بھی نہیں پیش کیا جاتا' ان میں سے ستر' اسی' نوے فیصد تو ملزم بعد میں بالکل بری ہو جاتے ہیں لیکن وہ ایک رات کی حوالات چھ مہینے کی قید سے زیادہ شدید تریں ہوتی ہے۔ قبر کے عذاب کی آپ جب تفاصیل سنیں' تو پوچھو نہیں کہ انسان پہ پھر کیا گزرتی ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ اس کے اندر پھر پہلے دو گرزوں والے آتے ہیں یعنی یہ وہاں اکیلا ہی قبر کے اندر ہے۔ بالکل یہی نقشہ ہوتا ہے یہاں کا جو ایک ملزم اور اتنے سپاہی اتنے گرزوں والے آتے ہیں پھر وہ قبر کی جو دیواریں ہیں وہ پھٹتی ہیں' درمیان میں ٹکراتی ہیں اس کی جو ہڈیاں ہیں توڑی جاتی ہیں' گرزوں والے اس کو مار مار کے چور کر دیتے ہیں۔ یہ جو مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ حلوہ پکا کے ان کو تقسیم کرو' تو وہ کہندے یہ ہیگے نیں پئی اے اوناں دی زخم بندی سمجھی جائے گی تے اونوں سیک پہنچے گا تے ارمان آئے گا مردے نوں۔ [1]

عزیزانِ من! اس کا سوال ہی نہیں۔ زندگی تو جوئے رواں ہے۔ اس میں انقطاع ہوتا ہی نہیں ہے۔ ہر فرد جو مرتا ہے' اس کی قیامت آ جاتی ہے۔ زندگی اسی طرح آگے چلتی ہے۔ زندگی میں انقطاع کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تو ایک جوئے رواں ہے۔

برزخ ایک پردہ ہے' جہاں اہل قبور اہل دنیا کی نہ سن سکتے ہیں' نہ سنا سکتے ہیں

اب اگر میں زندگی میں انقطاع نہ ہونے کی یہاں بات کروں تو یہ بات کچھ اور ہو جائے گی۔ یہاں بھی موت نہیں ہے۔ شعور یا Consciousness کا جو Level (سطح) ہے اس میں ایک فرق آتا ہے اور وہ عجیب چیز ہے۔ بات یہ ہو گئی کہ یہ جو برزخ ہے' جسے درمیان میں پردہ کہا گیا ہے' کہا یہ گیا ہے کہ یہ پیچھے کی طرف آ نہیں سکتے' لوٹ نہیں سکتے' پیچھے والے جو ہیں وہ نہ ان کی سنتے ہیں' نہ یہ ان کو کچھ سنا سکتے ہیں۔ یہ سارا قصہ جو آپ کے ہاں درگاہوں پہ اور قبروں پہ جا کے اور حضرت صاحب کے نام پہ یہ کچھ کر کے فریادیں کرتے ہیں' یہ کچھ کرتے ہیں' قرآن کہتا ہے کہ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ مردے کا کوئی تعلق زندہ انسانوں سے رہ سکے۔ وہ تو ان کی سنتا ہی نہیں' ان کے پیچھے بس جو دنیا ہے اس میں ایک رکاوٹ ہو جاتی ہے' پردہ لٹک جاتا ہے' یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے یہ جو ورآئھم (23:100) ہے' اس کے معنی آگے نہیں ہوتا' عربی زبان میں پیچھے بھی ہوتا ہے کیونکہ اسی آیت میں آگے اس نے پھر الی یوم یبعثون کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے وہ ایک پیریڈ ایسا بھی ہے کہ جس میں یہ آمنے سامنے بھی ہونگے۔ اب جس کے سامنے ہونا ہے اگر وہ ابھی زندہ ہے اور یہ پہلے مر گیا تو یہ واپس نہیں آ سکتا' وہ اس کے ساتھ ابھی نہیں مل سکتا تو وہ ایک دَور ہے جس کے اندر پھر یہ صورت بھی ہے کہ "او آمنے سامنے وی ہونا اے۔" [2] یہ اس کے آگے ہے۔

---

[1] تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی زخم بندی سمجھی جائے گی' اسے گرمائش پہنچے گی تو مردے کو آرام آئے گا۔

[2] وہ آمنے سامنے بھی ہوں گے۔

روزِ قیامت صور پھونکے کا قرآنی مفہوم

وہ جونقشہ ہمارے سامنے قیامت کا لایا جاتا ہے' وہ بھی عجیب وغریب ہے۔'' پکی روٹی''❶ والی نقشہ ہیگا اے۔اب یہ کہتے ہیں کہ:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ (23:101)۔ وہ صور پھونکا جائے گا' جیسے وہ بگل بجتا ہے۔قرآن کے اندر عجیب الفاظ ہیں۔اس کے معنی ہوتا ہے توانائی پیدا کر لینا۔ یہ صور جو ہے' یہ ٹھیک ہے' یہ لفظ آتا ہے' جب جنگ کے لیے بگل بجتا ہے یعنی یہ جنگ کے اس بگل بجنے کے لیے آتا ہے لیکن یہاں بنیادی صورت تو کچھ اور ہے۔ وہ جسے آپ صورت کہتے ہیں' Form یا پیکر کہتے ہیں' اسکی جمع صور ہے' جسے یہ پھر صور پڑھا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ جب ان پیکروں کے اندر توانائی پھونکی جائے گی' اس کا نام ہے جس کو آپ حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔تو وہاں پھر یہ بتایا ہے کہ کیفیت کیا ہوگی۔اب واپس یہ آ نہیں سکتے کہ کسی کمی کو پورا کر لیں۔اب یہ دیکھیے کہ وہ جو قرآنِ کریم نے ایک چیز کہی ہے' وہ ہے ہر فرد کی Individuality (انفرادیت) ہر فرد' Individual اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔اسے ہی نتیجہ بھگتنا ہوگا' کوئی ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ قرآن بتاتا ہے کہ **لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی** (6:164) کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا' کوئی سفارش سے نہیں چھڑا سکتا' کوئی کچھ دے دلا کر نہیں چھوٹ سکتا۔

نجات کا یا عذاب کا تصور دوسروں سے مانگا ہوا ہے

یہ جو چھوٹ سکنا ہے' اصل میں یہ سارا تصور عذاب کا یا نجات کا ہے۔ یہ ہم نے دوسروں سے مانگ کر لیا ہوا ہے۔ہم نے تو یہ سمجھا ہوا ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا گڑھا ہے جسے جہنم کہتے ہیں۔اس میں سزا بھگتنے کے لیے گناہ گاروں کو ڈال دیا جائے گا' وہ چیخیں گے' چلائیں گے' وقت مقرر ہوگا' یہ چھ مہینے کی قید' دس مہینے کی قید' سال بھر کی' دو ہی مہینے کی' ایک دن کی' کچھ انکے ہاں کے تصور کے مطابق ڈال دیا جائے گا اور اس کے بعد پتہ چلے گا۔ یہ جو ان کے ہاں کے بڑے بڑے انبیاء اور اولیاء اور لیڈران ہیں' وہ وہاں جا کر پھر ان کو سفارش کر کے' چھڑا لائیں گے۔ یہ سارے قصے' جتنے بھی ہمارے ہاں ہیں' وہ بنیادی تصور نجات کے ہی ہیں جو کہ غلط ہے۔اصل میں سزا کا یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں یورپ سے پوچھیے' وہ اس کو آج Appreciate (پسند) کر رہا ہے۔قرآن نے جو تصور دیا ہے وہ بڑا سائنٹفک تصور ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' Evolutionary Stages (ارتقائی مراحل) طے کرتی ہوئی' انسانی شکل کے اندر آ گئی ہوئی ہے۔ وہ Scientifically (سائنسی لحاظ سے) اس کو Prove (ثابت) کرتے ہیں' بتاتے ہیں کہ زندگی کی شکل یہ ہے کہ اگر کوئی نوع (Species) اپنے اندر اس قسم کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اس سے اگلے درجے میں جانے کے قابل ہو جائے' تو

---

❶ یہ'' پکی روٹی'' میں جونقشہ دیا گیا ہے' وہی ہے۔

وہ اگلا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ایسی صورت نہیں ہوتی تو وہیں رک کر رہ جاتی ہے اور رکنے کے بعد اکثر و بیشتر وہ انواع (Species) ختم ہو جاتی ہیں۔ Species (انواع) میں جسے یہاں زندگی (لائف) کہتے ہیں، یہ لائف اپنی Stages (منازل) طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ جس Form (شکل، پیکر) میں بھی وہ ہوتی ہے اگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے تو اس سے بلند درجے کی شکل میں چلی جاتی ہے، اگر وہ ایسی صورت حاصل نہیں کرتی تو یا تو اسی شکل میں رک کر رہ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔

زندگی تو جوئے رواں است کے مصداق ہے

جب لائف (زندگی) آئی ہے تو اب یہاں دو تصور آئے۔ ایک مغرب کا تصور آیا۔ وہ سیکولر (Secular) تصور تھا کہ یہاں تک پہنچنے کے بعد ارتقا کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے یعنی ان کی Scientific Investigation (سائنسی تحقیق) کے اعتبار سے گروہ در گروہ قرن ہا قرن سے یہ سلسلہ مسلسل چلا آ رہا تھا اور یہاں تک پہنچنے کے بعد تو بس پھر یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہیں کے Evolutionary Scientists (ارتقا کے سائنسدان) ہیں، انہوں نے یہ کہا کہ یہ کہہ کر تو تم فطرت کے منہ پہ چابک مار رہے ہو۔ تم خدا کو نہیں بھی مانتے تو کم از کم فطرت کو تو مانتے ہو کہ وہ اتنا لمبا پروگرام، کس طرح سے، قرنہا قرن تک پہنچائے جس کا جو End (اختتام) ہے، وہ تو ختم ہو جاتا ہے، بس اس کے بعد اور کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم کیا کرتے ہو؟ جو تم کہتے ہو یہ جرم ہے، یہ فطرت کے خلاف گستاخی ہے، اس کی بارمیں اس کا پروگرام تو تم دیکھو کہ اس نے کہاں سے اسے شروع کیا، یہاں تک لے آیا۔ کیا اس لیے یہاں تک لایا کہ اس کے بعد بس اس پروگرام نے ختم ہو جانا ہے؟ سنو، یہ ختم نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے یہ ارتقائی منازل آگے بھی چلیں گے۔ یہ وہ تصور تھا، عزیزانِ من! جو قرآن نے دیا ہے کہ موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، زندگی آگے چلتی ہے۔ یہ جو جسمانی پیکر ہیں، وہ فزیکل باڈی ہیں، وہ Physical Law (طبعی قوانین) کے تابع ہوتی ہیں۔ وہ ٹھیک ہے کہ ان کی Disintegration (پژمردگی) ہو جاتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ جلا دیجیے، مچھلیاں کھا جائیں، اس کو ویسے تباہ کر دیجیے، دبا دیجیے، اس کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان جسمانی پیکروں کے برعکس لائف اور شے ہے، وہ آگے بڑھتی ہے اور یہ تصور قرآن کا ہے کہ اگر اس کے اندر وہ جو لائف ہے، جسے آپ انسانی ذات کہہ لیجیے، اقبالؒ (1877-1938ء) نے خودی کہہ کر اس کا تعارف کرایا ہے، اسے سیلف (Self) کہہ لیجیے، قرآن اسے نفس کہتا ہے، وہ شے جو جسم نہیں ہے، وہ شے جو جان بھی نہیں ہے، جان تو یہ جو فزیکل مشینری آپ کے ہاں ہے، اس کی حرکت کا نام ہے، جو وہ آگے بڑھتی ہے۔ جو جسمانی لائف ہے یہ وہ لائف نہیں ہے۔ لائف (زندگی) اور شے ہے اور وہ آگے بڑھتی ہے۔ قرآن نے یہی بتایا ہے۔

ہر دم جواں ہے زندگی

اب یہ دیکھیے کہ یہ جو آج Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) ہوئی ہیں، وہ بتاتی ہیں کہ زندگی آگے بڑھتی ہے ہر فرد، یہ Individual کا صحیح ترجمہ ہے، ترجمہ تو ہم یہی کرتے ہیں، لیکن اس سے Individuallity (انفرادیت) کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں آتا، ہاں تو یہ فرد کا اپنا اپنا تشخص ہے، اپنی اپنی ذات ہے، میں ''میں''، ہوں، آپ ''آپ''، ہیں اور ہر فرد جو کچھ اس زندگی میں کرتا ہے، اس کے مطابق اس کا Future (آخرت) مرتب ہوتا ہے۔ اس کی ذات اس کے مطابق بنتی چلی جاتی ہے۔ اگر اس زندگی سے جو اگلی اس سے بلند منزل ہے، وہ اس منزل کو طے کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے تو وہ ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے جنت کی زندگی کہا جاتا ہے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے، وہ رک جاتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کا لفظ جحیم ہے۔ اس کے عربی زبان میں معنی ہی رک جانا، کھڑے ہو جانا ہے۔ یہاں یہ مار پیٹ اور سزا وغیرہ کا تصور نہیں۔ قرآن نے بڑا نیچرل اور سائنٹفک تصور دیا ہے۔

انسان کا ایک ایک سانس اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے، خدا کی ذات سفارشوں سے ماورا ہے

اب قرآن کا یہ تصور ہے کہ ہر فرد کا اپنا جو کچھ عمل ہے، اس کے مطابق اسکی یہ ذات بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہاں قیامت میں جا کے ایک دن بن جاتی ہے۔ یہ بنتی چلی جاتی ہے، ہر سانس میں قیامت پنہاں ہوتی ہے اسی لیے تو وہ کہتا ہے کہ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

اے واعظ! بڑی بڑی لمبی چوڑی باتیں تم نے کیں، قیامت کے اندر میزان ہوگی اور اعمالنامہ ہوگا۔

مگر ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

یہ جو تیری ہر سانس میں قیامت ہے، اس پہ تیری نگاہ نہیں پڑ رہی، یہ تو ہر سانس میں قیامت ہے، ہر سانس میں انسان کی ذات بنتی اور بگڑتی چلی جاتی ہے اور اس کا جو Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اسکا Future (آخرت) بنتا ہے۔ پھر تو اب سیدھی سی بات ہے کہ اس میں وہ سارے تصورات غیر قرآنی ہیں کہ جب وہ شفاعت کریں گے تو بخشش کی یہ چیز ہوگی، وہ رحم کرے گا، خدا بخش دے گا پھر یہ کرا جائے گا، یہ سارا تصور ہی باطل پہ مبنی ہے۔ جسے اعمال کہا ہے، اس کے نتائج میں تو کوئی دخل ہی نہیں دے سکتا۔ یہی نہیں ہے کہ جو عمل باہر سرزد ہوتے ہیں، انہی کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے یہاں تو دل میں گزرنے والے خیالات کا اثر بھی ذات انسانی پر ہوتا ہے۔ یہ وہ جرائم ہیں جو سوسائٹی کی گرفت میں ہی نہیں آسکتے تو اس میں کسی کی سفارش کا، شفاعت کا، کسی کے کہنے سننے کا، معافی کا، سوال

ہی نہیں ہے' اس میں بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن سائنٹفک تصور دیتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ جب پھر جو اگلی زندگی ہے اس کے اندر یہ چیز سامنے آئے گی۔ پہلی چیز تو کہا کہ **فَلَآ اَنۡسَابَ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ** (23:101)۔ دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ وہاں ''انساب'' کسی کام نہیں آئیں گے۔ آپ کو پتہ ہے کہ انساب کا عام طور پہ ترجمہ کیا جاتا ہے جسے آپ نسبی رشتہ کہتے ہیں' یہ جو باپ بیٹے کا رشتہ ہوتا ہے' اس کو عام طور پہ انساب کہتے ہیں لیکن اس کو کیوں چھکایا جائے قرآن کی وسعت کو کیوں نہ لیا جائے۔ انساب تو نسبت کی جمع ہے۔ وہاں ہر قسم کی نسبتیں ٹوٹ جائیں گی' اور پھر نسبت تو ماں باپ ہی کے ساتھ نہیں ہوتی' یہاں تو عجیب عجیب قسم کی نسبتیں ہوتی ہیں' آپ کے ہاں سب سے بڑی نسبت تو ایک طریقت میں اور پیر و مرشد کی نسبتیں ہوتی ہیں جبکہ وہاں کوئی نسبت کام نہیں دے گی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک نسبتوں کی حیثیت اور کیفیت

جیسا میں نے عرض کیا ہے انساب کا مفہوم وسیع تر ہے۔ کسی قسم کی کوئی نسبت کام نہیں دے سکتی اور آپ دیکھیں گے کہ یہاں ہمارے ہاں نسبتوں کے عقیدے کتنے گہرے ہیں۔ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ قرآن ہاتھ میں لے کر تو فرقے کی بات کرنا شرک ہے' عزیزانِ من! میں کسی پہ تنقید نہیں کرتا' لیکن یہ چیز جو قرآن کا تصور ہے' جسے آپ نجات کہہ لیجیے' اسے فلاح کہہ لیجیے' Future کہہ لیجیے' مستقبل کہہ لیجیے' اس میں تو ذاتی اعمال کے سوا کسی قسم کی کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اب یہ جو انساب ہے' اس میں ہمارے ہاں حدیثیں ہیں اور وہ حدیث اہلِ سنت و جماعت کی کتابوں کے اندر کی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ چلا ہوں: ایک کتاب اللہ اور ایک میری یہ سنت' لہٰذا کہا گیا کہ اگر تم ان دونوں کے ساتھ تمسک رکھو گے تو پھر جنت میں جاسکو گے۔ یہ انہی کے ہاں کی اتنی بڑی نسبت حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت نہیں' ایمان اس دل میں نہیں آسکتا۔ آپ دیکھتے ہیں یہ عقائد لیکن ایک منٹ ٹھہریئے' رکیے یہ جو روایات تھیں یہ ان کے عقیدے کے مطابق اکٹھی ہوئیں' بلکہ عباسیوں کے دور (750-1258AD) میں بنیں۔ آپ سوچیے کہ عباسیوں کا زمانہ ہو' جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کرم اللہ وجہہ (600-66/AD) کی نسبت سے یہ جو سادات تھے' ان سے انہوں نے مملکت تو چھینی کیا' ان کو انہوں نے آلہ کار بنا کے مملکت حاصل کی تھی۔ یہ ساری حدیثیں دراصل عباسیوں (750-1258AD) کے دور میں آپ کے ہاں جمع ہوئیں یا بنی تھیں۔ سلطنت ان کی تھی جس میں یہ بن رہی تھیں۔ تو وہ اہلِ بیت کی محبت یا حضرت علیؓ کی محبت کی حدیث کو تو کسی طرح مٹا نہ سکے۔ آپ حیران ہونگے کہ جہاں یہ ہے اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس دل میں عباس کی محبت نہیں ہوگی' اس دل میں ایمان نہیں آسکتا۔ چلیے صاحب! سیدھی بات ہے اور یہ آج اس دورِ جمہوریت میں آپ کی کیفیت یہ ہے کہ آپ نسبتیں گھڑتے رہتے ہیں۔ وہ تو ملوکیت کا زمانہ تھا' عباسیوں کے دور

(750-1258AD) میں حدیثیں بنیں اور یہ ناممکن ہے کہ وہ "اسے برداشت کرلیں: اوشریکا اوناں دا"❶۔ وہ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ نہلے پہ دہلا ہیں، یہ تو سنیوں کے ہاں کی حدیثیں ہیں، شیعہ حضرات کو تو چھوڑ دیجیے۔ یہ حدیث آپ کے ہاں ہے، اس کے ساتھ ہی ہے سورۃ شوریٰ میں جو آیت آتی ہے اس کی تفسیر کے اندر آپ دیکھیے۔ پھر یہ جو حدیثیں آتی ہیں انہوں نے کہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اگر نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس دل میں حضرت عباس کی محبت نہیں، ہے اس دل میں ایمان نہیں آ سکتا۔ آپ اس سے اس شریکے کا اندازہ لگائیے۔

کسی انسان کا عمل دوسرے انسان کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا۔

قرآن کہتا ہے کہ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (23:101) کوئی نسبت کام نہیں دے سکے گی۔ وہ Scientific Base (سائنسی بنیاد) ہے کہ سنکھیا کھا لیجیے، دور کی نسبت تو ایک طرف، ڈاکٹر کا جو حقیقی بیٹا ہے، وہ بھی یہ کہہ کر کہ میں ڈاکٹر کا بیٹا ہوں، سنکھیے کے اثر سے نہیں بچ سکتا، ڈاکٹر خود نہیں بچ سکتا، بیٹے نے کیا بچنا ہے۔ بیٹے کے متعلق بھی تو انہی کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے حضرتِ فاطمہؓ سے بھی کہہ دیا کہ فاطمہ! یاد رکھو قیامت میں یہ کہہ کے تم نہیں چھوٹ سکتی کہ میں محمد ﷺ کی بیٹی ہوں۔ وہاں تو تمہارے اپنے ہی اعمال ہیں جن کی وجہ سے تم چھوٹ سکتی ہو۔ یہ تو اولاد کے متعلق ہے۔ حدیث کی ضرورت نہیں، یہ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی معصیت کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جس ذات کے متعلق، پھر یہ عقیدے وضع ہوگئے کہ ساری گنہگار امت کو وہ جہنم سے چھڑا کے لے جائے گی۔ وہؐ اپنے متعلق یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کے بعد Any more scientific (کسی مزید سائنسی بنیاد) کی ضرورت نہیں رہی۔ نسبت ان چیزوں سے کسی کو بچا ہی نہیں سکتی۔ قرآن کا مکافاتِ عمل کا بڑا عجیب تصور ہے۔

قرآنِ حکیم کے بیان کردہ مکافاتِ عمل کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا اعلان

عزیزانِ من! یہیں پہنچ کر یہ نظر آتا ہے کہ لاریب یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ دنیا کے کسی مذہب میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ کسی اور کا کوئی اثر یا بخشش یا سفارش نہ ہو۔ کسی مذہب کو لیجیے، وہاں یہی ہے کہ کسی نہ کسی نسبت سے، کسی نہ کسی کفارے سے، سفارش سے، مجرم چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں جو بلند ترین ہستی ہے، جن کی ذات کے ساتھ ہماری یہ عقیدت ہے کہ مجرموں کے آپ ﷺ شفیع ہیں، حالانکہ خدا

---

❶ وہ اسے برداشت کرلیں: وہ شریکا (قبیلہ) ان کا ہے۔

خود قرآن میں رسول سے یہ کہیجا رہا ہے' کہ اس چیز کا اعلان کر دواور رسول اعلان کر رہا ہے کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی معصیت کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا' کوئی ذات نہیں بچ سکتی۔ عزیزانِ من! یہ نسبتیں تو میں نے ابھی بہت دور کی کہی ہیں۔ ہمارے ہاں تو کیا بات ہے!

ایک روایت کی روشنی میں حضرت ابراہیم جنت کے دروازے پر

جب شاعری شروع ہوتی ہے اور تصوف تو شاعری ہی ہے' تو پھر پوچھو نہیں کہ کیا سے کیا ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ؒ' میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی روایت ہے یا ان کی طرف منسوب ہے' بہرحال ہم تک تو یوں پہنچتی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں یوں سمجھیے کہ محاکاتی انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے دروازے پہ ایک رضوان کھڑا کر رکھا ہے' وہ Ticket collector (ٹکٹ کلکٹر) ہے۔ وہ ہر ایک کی ٹکٹ دیکھ کر اندر جانے دیتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہو ہوا جائے گا اور پلیٹ فارم خالی ہو جائے گا تو وہ اندر جنت میں دیکھیں گے کہ لاکھوں کی تعداد میں مجرم جنت کے اندر پھر رہے ہیں تو اسے بلایا جائے گا کہ ''توں کی کر داسیں' دروازے تے کھلوتا ہویا؟ کہنے لگا: جی میں تے اک نئیں بغیر ٹکٹ والے نوں اندر جان دتا۔ کہنے لگے: او اندر و یکھ تے سہی جا کے' بعض بہنیں معاف رکھیں' وہ جو اتنی پنجابی نہیں سمجھتی' بعضی گل دا سواد اوندا ای پنجابی اچ ہے ❶ ۔کہا''۔ تو دیکھو تو سہی اور وہ بھی انگشت بدنداں ہے' اوپر سے ڈانٹ پڑ رہی ہے اور حالت یہ ہوئی تو اس پہ' وہ یہ جھگڑا دیکھ کے' وہ پیر صاحب مسکرائیں گے۔ اللہ میاں سمجھ جائے گا۔ حضرت صاحب جب اندر جا رہے تھے تو انہوں نے ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا (ان کے ہاں کملیاں ہوتی ہیں) اور یہ اپنی کملی کے لیے سند بھی لے آتے ہیں' پہلے حضور ﷺ کو کملی والا بنایا' تو پھر یہ ساری کملیاں جتنی تھی پھر وہ ان کے ہاں آئیں۔ بہرحال پتہ چلا کہ ان کے کمبل کے جو تانے بانے تھے' اس کے بانا کے ہر تاگے کے ساتھ' ان کی مریدوں کی روحیں چمٹی ہوئی تھیں' وہ گزرے تو انہوں نے اپنا ایک ٹکٹ دکھایا اور ٹھیک ہے کوئی لمبا چوڑا ساتھ سامان بھی نہیں کہ وہ تولنا ہو' کچھ بھی نہیں' خالی ہاتھ چلے جا رہے ہیں' ایک کمبل اوپر اوڑھا ہوا ہے' اندر جا کر جھاڑ دیا۔ اے جنوں تسی کیندے ہو نا حضرت صاحب دی کمبلی اچ جواں پے گیاں' اسے جواں نہیں ❷ ۔ اندازہ لگائیے۔ عزیزانِ من! میں تو یہ سوچ کر خون کے آنسو روتا ہوں کہ کیا یہ قوم قرآن پہ آ جائے گی؟

---

❶ تم دروازے پہ کھڑے ہوئے کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگا: جی' میں نے تو بغیر ٹکٹ ایک کو بھی اندر نہیں جانے دیا۔ کہنے لگے: ارے اندر جا کر دیکھو تو ذرا۔ بعض بہنیں مجھے معاف رکھیں جو اتنی سی پنجابی بھی نہیں سمجھتیں۔ کچھ باتوں کا مزہ آتا ہی پنجابی زبان میں ہے۔

❷ یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب کی کملی میں جوئیں پڑ گئیں یہ جوئیں نہیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک شفاعت کی نوعیت

شریعت میں آیئے تو نبی اکرم ﷺ کی شفاعت آ گئی۔ وہ اتنا گہرا عقیدہ ہے کہ ہمارے ہاں کسی کے لیے بدترین بددعا یہ ہوگئی کہ خدا کرے تمہیں رسول کی شفاعت نصیب نہ ہو یا مجھے یا کسی اور کو کوئی بہت بڑی قسم کھانی ہو تو ہمارے سامنے یہ شریعت یا یہ طریقت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ** (23:101) کوئی نسبت کام نہیں دے گی۔ عزیزانِ من! ایک لفظ انساب میں میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن نے کیا بات کہہ دی ہے! تفصیل میں جایئے تو ایک کتاب لکھی جائے۔ ایک لفظ انساب کہہ کے اس نے وہ رشتہ داری کی بنا پر جو محبت کے عقیدے تھے ان کو بھی کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ ساری طریقت وغیرہ کے یہ جتنے عقیدے، جتنی نسبتیں تھیں یا ہیں، وہ تمام ہمارے ہاں دوسروں کے ساتھ اس لفظ نسبت سے ہوتا ہے کہ ان کی نسبت حضرت صاحب کے ساتھ ہے اور قرآن نے کہہ دیا کہ **فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ** (23:101)۔ انساب کہتے ہو تو سن لو کہ نہ رشتے داریاں باقی رہیں گی اور نہ ہی کوئی ایک دوسرے کا پرسان حال ہوگا۔ کوئی شفاعت نہیں بلکہ **فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ** (23:101) وہاں تو ہر ایک کو اپنی اپنی ایسی پڑی ہوئی ہوگی کہ کوئی پہچاننے کے باوجود اس سے سلام علیکم نہیں کہے گا کہ کوئی بات نہ کر جائے، کسی دوسرے کو پوچھے گا نہیں۔ دوسرے مقام پہ اسی کی تشریح آئی ہے اور اس دن کا نقشہ جو کھینچا گیا ہے وہ ہے کہ **يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ** (80:34) بھائی بھائی کو دیکھے گا تو دور سے ہی بھاگ جائے گا اور اس کی اگلی ہی آیت کے عجیب لفظ ہیں کہ **وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ** (80:35) میاں اپنی بیوی کو اور ماں باپ اولاد کو چھوڑ جائیں گے **وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ** (80:36) اس لیے کہ **لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ** (80:37) اپنی اپنی ہر ایک کو ایسی پڑی ہوگی کہ سوال ہی نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے کو وہ پوچھ بھی لے کہ تیرا کیا حال ہے، جائیں گے کیسے![1]

دورِ حاضر کی سائیکلوجی (نفسیات) کے بالمقابل قرآنِ حکیم کی روشنی میں انسانی ذات کی وضاحت

سورۃ الانعام کی 95 ویں آیت میں ایک بڑا عجیب لفظ "فرادیٰ" ہے۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو "فرد" کا لفظ ہے، جہاں سے ہمارے ہاں انفرادیت بنا ہے، قرآن نے تو اس کو فرادیٰ کہا ہے یعنی Individuality (انفرادیت)۔ آج ہمارے ہاں کے یہ جو سائیکولوجسٹ (ماہر نفسیات) ہیں، ان سے پوچھیے۔ وہ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے تم لوگوں کو ایک ایسی اصطلاح دی ہے کیونکہ ان کے ہاں علم نفسیات میں لائف سے، Soul (روح) سے، Spirit سے کام نہیں چلتا تھا، اس کا مائنڈ (Mind) سے بھی کام نہیں

---

[1] ان نکات کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006، ص ص۔ 181 تا 197۔

چلا' انہوں نے Psyche کہا ہے۔ تو اس کا بھی اور انداز ہو گیا اور پھر انگریزی زبان میں Personality (شخصیت) کہا۔ کہتے ہیں کہ آپ کو پتہ ہے کہ وہ بہت اچھی Personality ہے اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پھر اس کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اس سے بھی کام نہیں چلا ہے۔ پھر انہوں نے ایک لفظ Individuality لے لیا ہے اور یہ جو لفظ تھا' انہوں نے قرآنِ کریم سے لے کے ترجمہ کیا ہوا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (6:95) تم Individuality (انفرادیت) لے کر ہمارے پاس آ ؤ گے اور یہاں سنیے کہ Individuality کے معنی کیا کیے ہیں؟ اور یہ بات یہاں ہر ایک بولتا ہے۔ ہر ایک تو ایک طرف رہا' بڑے بڑے دانش مند بھی کھڑے ہو کر نہیں سوچتے ہیں: میرا ہاتھ' میری آنکھ' میرا گھر' میرا بیٹا' میرا باپ' حتیٰ کہ میرا جسم' حتیٰ کہ میری جان۔ یہ جسے ''میری'' کہہ رہے ہیں' یہاں لفظ جو ''میں'' ہے تو یہ کون ہے جس کا یہ سب کچھ ہے؟ جان تک بھی آپ کہتے ہیں کہ یہ میری جان ہے' یہ میرا جسم ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے یہاں کوئی چیز نہیں رہی' البتہ میری زبان سے یہ نکل گیا کہ ''میں'' نے یہ کہا ہے ''میں'' نے یہ کیا ہے۔ یہ ''میں'' کون ہے جو یہ کچھ کہہ رہا ہے' کر رہا ہے یعنی یہ ''میں'' کون ہے؟ جسم نہیں' جان نہیں' ہاتھ نہیں' پاؤں نہیں' وہ تو سب تم کہتے ہو: میرا ہاتھ' میرا پاؤں' میرا جسم' میری جان۔ یہ ''میں'' کون ہے جو کہہ رہا ہے کہ ''میں'' نے یہ کیا۔ یہ ساری چیزیں ''میں'' کی نسبت سے ہیں۔ ''میں'' کسی کی نسبت سے نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں یہ بغیر کسی نسبت کے اپنے مقام پہ ہے اور باقی سب کچھ اس دنیا میں جو ہے اس ''میں'' کی نسبت سے ہے۔ قرآن نے یہاں یہ جو انساب کہا تھا یعنی نسبتیں' میں نے کہا تھا کہ آپ دیکھیے کیسے اس کی تشریح ہو رہی ہے۔

موت کے عمل سے انسان کا تو جسم مر جاتا ہے لیکن ''میں'' نہیں مرتی [1]

قرآن یہ کہتا ہے کہ جسے تم جزا کا دن کہہ رہے ہو' جسے ہمارے پاس آنا کہہ رہے ہو' جسے زندگی کا Future (آخرت) کہہ رہے ہو' وہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (6:94) جس کو تم میری یا میرا کہتے تھے' وہ موت کے ساتھ پیچھے [2] رہ گیا اور انسانی ''میں'' ہمارے سامنے آ گیا۔ عزیزانِ من! آج دنیا کے جو سائیکولوجسٹ (ماہرین علم نفسیات) ہیں' ان سے پوچھیں وہ بتائیں گے کہ قرآن یہ کیا فقرہ کہہ گیا ہے: جسے بھی تم ''میرا'' کہتے تھے یا ''میری'' کہتے تھے' اسے تم پیچھے چھوڑ آئے اور یہ جو ''میں'' تھا وہ ہمارے سامنے آ گیا۔ تو پوچھا جائے گا کہ یہ ساری زندگی کہتے رہے تھے کہ ''میں'' نے یہ کیا ''میں'' نے یہ خیال کیا ''میں'' نے یہ کہا۔ یہی تھی کسی

---

1. فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے۔ اقبالؔ
2. نکولس باردیو (Nicholas Bardyeau) اپنی کتاب Slavery and Freedom (غلامی اور آزادی) میں موت کے متعلق لکھتا ہے کہ ''موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی' وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔''

کے ساتھ نسبت۔ تو اب اس کی یہ ''میں'' نہیں رہی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ یہ بتا کہ تو نے یہ کیوں کیا تھا۔ کہا کہ وہاں یہ ''میں'' جواب دے گا کیونکہ یہ سوال ''میں'' سے ہوگا اور وہاں یہ قطعاً نہیں کہہ سکے گا کہ صاحب! میرے ہاتھ نے یہ چرایا تھا اور میری زبان نے یہ کہا تھا' وہ اس لیے کہ یہ تو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ لہٰذا اے ''میں''! بتا تو نے یہ کیا کیا؟ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! یہ کیا کتاب ہے!

میں کہہ رہا ہوں کہ یہ قرآن کیا کتاب ہے! یہ بات چودہ سو سال پیشتر کہی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ آج بیسویں صدی میں بھی اس انداز میں کوئی یہ بات نہیں کر سکتا' گو کہ آج یہ علم ان بلندیوں تک پہنچ چکا ہوا ہے۔ یہ بات چودہ سو سال پیشتر عرب جیسی سرزمین میں ایسا فرد جو چالیس سال تک لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا' وہ کہتا ہے۔ ان کو مسائل کہیے' ان کو نظریات کہیے' وہ ان کو کچھ کہیے' اس انداز میں بیان کر رہا ہے کہ کوئی نسبت وہاں نہیں رہے گی یعنی یہ نسبت میرا باپ' میری ماں' میرا دوست' میرا بھائی' میرا افسر' میرا شفاعت کرنے والا' یہ سب میری ہے۔ کہا کہ یہ جو میری اور میرا والا قصہ تھا' وہ تم پیچھے چھوڑ آئے' تو جسے تم میری جان کہتے تھے' وہ بھی پیچھے چھوڑ آئے ہوئے ہو۔ اے ''میں''! بتا جو تو کہتا تھا۔ وہاں تو اقرار کرتا ہے کہ ''میں'' نے کہا تھا۔ کیا بات ہے قرآن کے بات کرنے کی! جواب نہیں بن پڑیگا۔ ساری عمر کہا تھا کہ ''میں'' نے کیا ہے۔ اور یہاں کہا کہ ''اے میں''! بتا اور آگے کہا کہ **وَ مَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا** (6:94) وہاں تمہیں ان کا بہت بڑا بھروسہ تھا' جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ یہ ساتھ کھڑے ہو کے شفاعت کرلیں گے' سفارشیں کر دیں گے' بچا دیں گے' نجات دلا دیں گے۔ یہاں اس ''میں'' کیساتھ ایک بھی باقی نہیں رہا کیونکہ وہ جنہیں تم میرے شفیع اور میرے سفارشی کہتے تھے' وہ میرے تو سب پیچھے رہ گئے۔ اب اس ''میں'' کا فیصلہ وہاں ہوگا۔

مغرب کے مفکرین کے سامنے قرآنِ حکیم کو قرآن کی روشنی میں پیش کرنے کا طریق

اب سوال یہ ہے کہ اس ''میں'' کا یہ فیصلہ کس طرح سے ہوگا؟ عزیزانِ من! زندگی کے آخری دور میں پہنچ رہا ہوں پتہ نہیں کہ کتنے دن اور زندہ رہوں گا۔ کہتا یہ ہوں کہ مغرب کے مفکرین کے سامنے قرآنِ حکیم' قرآن کی روشنی میں پیش کرنا چاہیے کیونکہ مذہب کے عقائد میں جکڑے ہوئے انسان کا ذہن خالی نہیں ہو سکتا لہٰذا قرآن کا کہنا یہ ہے کہ یہ باتیں وہ سمجھ سکتے ہیں جو اپنے دل و دماغ کو پہلے سے قائم کردہ عقائد سے خالی کیے ہوئے ہوں۔ اس کے سمجھنے کے لیے یہ شرطِ اوّل ہے۔

جہانِ فردا کے متعلق ہمارے قائم کردہ تصورات

قرآن تو بات ہی سائنٹفک کرتا ہے۔ اب سنیئے' اگلا فقرہ آ گیا کہ یہ فیصلہ کس طرح سے ہوگا کہ یہ آگے جانے کے قابل ہے یا پیچھے رہ جانے کے قابل ہے؟ ہمارے ہاں تو تصور یہ ہے کہ انسان جائیں گے اور جتنے گنہگار ہونگے' جنہوں نے کچھ گناہ کیے ہوئے ہونگے' ان کی

سزا بھگتنے کے لیے انہیں جہنم میں بھیج دیا جائے گا' وہاں جب وہ اتنی سزا بھگت لیں گا تو پھر وہ وہاں سے پاک صاف ہو کر جنت میں جائیں گے یعنی جنت میں وہ جائیں گے جن کے ساتھ گناہ کی کسی قسم کی کوئی آلائش باقی نہیں رہی ہوگی یا تو وہ شفاعت کے ذریعے سے دھودی جائے گی اور اس طرح یہیں وہ کپڑے اتار لیں گے۔ یعنی مثالیں ہمارے ہاں یہ دی جاتی ہیں کہ جو جہنم ہے وہ دھوبی کی بھٹی ہوتی ہے۔ اصل میں وہ بھٹی میں گرا دیتے ہیں' جتنی وہاں وہ ادھر ادھر کی میل' کالک لگی ہوئی ہوتی ہے اگر اتر جاتی ہے' تو پھر کپڑا صاف ہو جاتا ہے' پھر اس کو جنت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ہر مذہب میں اس سزا کا اور جہنم کا تصور ہی یہی ہے کہ وہاں کچھ عرصے کے لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ یہ جو گناہوں کی آلائشیں ہیں' وہ وہاں صاف ہو جائیں اور جنت کے اندر بالکل پاک صاف ہو کر چلا جائے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک خدا کے حضور پیشی کا طریق: طریق موت وحیات

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری خود فریبی ہے جو یہ سمجھتے ہو کہ انسان اس زندگی میں' اس دنیا میں' رہتے ہوئے آلائشوں سے بالکل پاک اور صاف بھی رہ سکتا ہے اور عمل کی یہ آلائشیں ایسی نہیں ہیں کہ جنہیں اگر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے تو یہ اس سے الگ ہو جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ جس چیز کو تم تندرست انسان کہتے ہو کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھنا کہ اس کے اندر بھی کس کس قسم کی بیماریوں کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یہ تندرست کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ جو اس کی Power of Resistance (مدافعت کی قوت) ہوتی ہے' وہ ان تخریبی قوتوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ وہ ان کو غالب نہیں آنے دیتی۔ بیمار اس وقت ہوتا ہے جب بیماری کے وہ جو جراثیم ہوتے ہیں' وہ غالب آ جاتے ہیں۔ علاج کس کو کہتے ہیں؟ قوتِ مدافعت کا بڑھا دینا۔ یہ قوتِ مدافعت اگر غالب آ جائے تو وہ بیماری مغلوب رہتی ہے۔ یہ چیز تو آپ کے ہاں سارے طالبعلم جانتے ہیں کہ اگر 60% پاس مارکس ہیں تو اس اسٹوڈنٹ کی چالیس فیصد غلطیاں بھی تو پرچے میں ہیں' 40 مارکس کی غلطیاں بھی تو ہیں لیکن اسے اگلی کلاس میں بھیج دیا جاتا ہے اور آج تک کبھی یہ چیز نہیں ہوئی کہ 100% مارکس لینے والا جو ہے وہی اگلی کلاس میں جا سکے گا۔ صلاحیت کا ایک معیار مقرر کیا ہوا ہے کہ اتنی صلاحیت ہو جائے یعنی جو کمی کمزوری ہے اس سے زیادہ کی صلاحیت اگر پیدا ہوگئی ہے تو وہ آگے جانے کے قابل ہو جائے گا اور جس نے 40% مارکس حاصل کیے ہیں وہ اگر یہ کہہ دے کہ صاحب! زیادہ نہیں' تین مہینے کے لیے اگلی کلاس میں مجھے بھیج دیجیے کیونکہ 40% تو میں نے لیے ہی ہیں لیکن اس کو اسی کلاس میں روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ 40% مارکس کچھ کام نہیں دے سکتے۔ جس وقت موت آتی ہے تو اس وقت یہ نہیں ہوتا کہ اس کے اندر جو توانائی ہے وہ بالکل ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اندر وہ جو تخریبی عناصر ہیں' وہ اتنے زیادہ بڑھ گئے ہوئے ہوتے ہیں کہ یہ جو تھوڑی سی توانائی باقی ہوتی ہے' یہ کچھ کام نہیں دیتی اور پھر اس پہ موت طاری ہو جاتی ہے۔

دنیا کی ہر وہی نوع آگے بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو

عزیزانِ من! Evolution Theory (نظریہ ارتقا) پر جس قدر بھی تحقیقات ہوئی ہیں' انہوں نے بتایا ہی یہ ہے کہ ہر نوع جس کے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے' اس میں جو پیچھے رہنے کی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں' وہ اس بڑھی ہوئی صلاحیت سے Cover (پوری) ہو جاتی ہیں' دنیا بھر کے مذاہب کے ان تمام تصورات اور معیارات جو انہوں نے اپنے ہاں مقرر کیے ہوئے ہیں کے مطابق یہ ہے کہ انسان اپنے غلط اعمال کی سزا جہنم میں بھگت کر جنت میں جائے گا' قرآنِ کریم ایک یکدم ان کو مسترد کرتا ہے اور اسے No Scientific (غیر سائنسی) طریقہ کہتا ہے۔ وہاں اصول یہ ہے کہ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (23:102)۔ جو 60% مارکس حاصل کرلے گا' Promote (پاس) کر دیا جائے گا کیونکہ اس میں اگلی کلاس میں جانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کا پلڑا جھک جائے گا' اس کے لیے یہ نہیں کہا کہ اس کے دوسرے پلڑے میں کوئی نمبر ہی نہیں ہوگا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ صاحب! ہمارے ہاں God is mercy [1] کا تصور ہے' جبکہ اسلام کا خدا عادل ہے۔

عیسائیت کے ہاں حضرتِ مسیح کے کفارے کا عقیدہ قرآنِ حکیم کی تعلیم کے خلاف ہے

عیسائیت کے ہاں کی Mercy (رحم) کے معنی یہ ہیں کہ انسان جو جی میں آئے کرتا چلا جائے' وہ صرف حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لے آئے تو جنت میں چلا جائے اور اس کو [1] God is mercy بتایا ہے کہ عزیزانِ من! کیا بات ہے اس Mercy کی! نتیجہ اس Unscientific (غیر سائنسی) طریقے کا یہ ہے کہ آج یورپ کا جو Intellectual (دانشور) طبقہ ہے' وہ بھی کفارے کے اس مسئلے کے اوپر عیسائیت کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ میرے پاس وہ کتاب ابھی تک نہیں پہنچی۔ میں تو یہ چیزیں منگا تا رہتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ وہاں ایک Latest (جدید ترین) کتاب بھی شائع ہوئی ہے' اس میں یہ بتایا ہے کہ حضرتِ مسیحؑ کا خدا ہونے کا عقیدہ اور کفارے کے عقیدے' یہ تمام کے تمام کہیں اور سے آئے ہیں' یہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ عزیزانِ من! یہ بالکل صحیح بات ہے۔ وہ دانشور خود میں God is mercy (خدا رحیم ہے) کا انکار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں یہ توقع کسی فرد سے بھی نہیں کرتا کہ اس سے زندگی بھر کوئی ایک لغزش بھی نہ ہوئی ہو تو پھر وہ جنت میں جائے گا۔

---

[1] خدا رحم ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اہلِ جنت کا معیار

انسان سے لغزش ہو جاتی ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے سنگین جرائم ہیں، مومن ان سے بچا رہتا ہے، وہ اس سے سرزد نہیں ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی سی چیزیں قابلِ ملامت ہوتی ہیں، یہ ہر انسان سے ہو جاتی ہیں۔ یہ ہیں مثلاً وہ 40% جو میں نے ابھی کہا ہے، جو اس میں ہوتی ہیں۔ یہ اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ Compulsory Subjects (لازمی مضامین) کے اندر وہ پاس ہو گیا ہوا ہے Optional (اختیاری) کے اندر یہ جو غلطیاں ہیں، یہ رکاوٹ نہیں بنتیں۔ Optional (اختیاری) مضامین میں خواہ کتنے ہی زیادہ مارکس کیوں لے لیے نہ ہوں، اگر وہ Compulsory Subject (لازمی مضامین) میں پاس نہیں ہو رہا تو وہ اگلی کلاس میں نہیں جائے گا۔ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (23:102;7:8) یہ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں، جن کے پلڑے جھکتے ہیں۔ اس کے برعکس وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ (23:103) اور جن کا صلاحیتوں کا یہ جو پلڑا ہے، وہ اٹھا ہوا رہتا ہے، انہیں روک لیا جائے گا۔ دیکھیے، عزیزانِ من! الفاظ کہ یہ ہوتا کیا ہے۔

ابھی ابھی میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کا تصور یہ ہے کہ انسان کی جو ذات ہے، اس کا جو سیلف (Self) ہے، اس کی جو ''میں'' ہے اگر اس نے اس دنیا میں حسنِ عمل سے اتنی صلاحیت حاصل کر لی ہے کہ اس میں اگلے درجے تک پروموٹ (Promote) ہونے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کے برعکس جس کی ذات نے یہ بات نہیں حاصل کی، اس میں کمی رہ گئی ہوئی ہے، وہ آگے نہیں جا سکے گی۔ یہ سنیے الفاظ کہ مَنۡ خَفَّتۡ (7:9) جس میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تو فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡٓا اَنۡفُسَہُمۡ (23:103) یہ وہ ہیں جن کی ذات میں کمی رہ گئی تھی۔ میرے اللہ! جن کی ذات کی نشوونما میں کمی رہ گئی ہوئی تھی وہ یہ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ فِیۡ جَہَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ (23:103) وہ رک گئے، آگے نہیں بڑھ سکے، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

عدل میں معافی کا تصور غلط ہے

یورپ کا کوئی سائنٹسٹ (سائنسدان) اعمال کے پلڑے کے اس تصور سے انکار نہیں کر سکتا، عزیزانِ من! اور یہ بھی کہ وہ کسی مذہب کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی سائنس میں معافی کا سوال ہی نہیں ہے۔ عدل میں معافی نہیں ہوتی۔ کہا کہ کیا پوچھتے ہو ان کا! کیا پوچھتے ہو: ان کی ندامتوں کا تَلۡفَحُ وُجُوۡہَہُمُ النَّارُ وَ ہُمۡ فِیۡہَا کٰلِحُوۡنَ (23:104) وہ آئینے میں اپنے سیاہ چہرے کو دیکھیں گے اور اسی سے بری طرح منہ بگاڑ رہے ہوں گے۔ ان سے یہ کہا جائے گا کہ اَلَمۡ تَکُنۡ اٰیٰتِیۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَکُنۡتُمۡ بِہَا تُکَذِّبُوۡنَ (23:105) صرف اتنی بات کی جاتی ہے کہ کیا یہ بات تو نہیں تھی کہ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میرے قوانین کیا ہیں۔ اور اس طرح سے تمہیں یہ

کہا گیا تھا کہ اس کا نتیجہ غلط ہوگا۔ تمہیں کہا تھا' یہ بات تم تک پہنچی تھی؟ کہیں گے کہ جی ہاں' پہنچی تھی تو پھر اس کے بعد اب کس کا قصور ہے؟ اپنے آپ کو Blame (الزام) کرو۔

یہ بڑا عجیب نکتہ ہے کہ بات پہنچی تھی۔ جن تک یہ بات نہیں پہنچی ہے' تو وہ محفوظ ہی نہیں ہو سکتے۔ یہاں ہمارے ہاں دیکھیے کہ چھ چھ مہینے کے چھوٹے چھوٹے بچے مر جاتے ہیں۔ کیا ان کو بھی وہاں قیامت میں جہنم میں بھیجیں گے؟ اب ان بچوں کو کیا کریں صاحب! اگر جہنم میں بھیجتے ہیں' تو ان کی جو مائیں ہیں' وہ کہتی ہیں کہ ''تہاڈا ستیاناس ہووے۔ میرے منڈے نے کی کتا سی؟ او اینا ں معصوم بچہ سی۔''❶ یہ کہتے ہیں کہ پھر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ان کو ملیں گے۔ وہ ان بچوں کے چرواہے ہیں' ان کی ڈیوٹی یہ لگائی ہوئی ہے کہ وہ ان بچوں کو ساتھ لے کر جنت میں چلے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ پاگل دیوانے وحشی اقوام جن تک یہ چیز پہنچی نہیں ہے وہ کیسے قابلِ مواخذہ ہو سکتے ہیں؟

قصۂ آدم میں آدم کا اعتراف اور ابلیس کے انکار کی وضاحت

قرآن کہتا ہے کہ قَالُوْا رَبَّنَا (23:106)۔ بات سنیے جناب! کیا بات ہے! کہا کہ یہاں بھی ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ عزیزانِ من! سب سے بڑا جرم ہے۔ کیا عرض کروں' یہ باتیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور گھڑی ہے کہ چلے جا رہی ہے! قصۂ آدم میں قرآن نے ایک ہی بات کہی ہے: آدم نے بھی یہ ایک جرم کیا' اسے کہا تھا کہ یہ نہ کرنا لیکن اس نے وہ کیا۔ ابلیس نے بھی ایک جرم کیا' اسے کہا کہ یہ کرو لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ دونوں نے جرم کیا۔ ایک کے متعلق تو یہ کہا کہ ٹھیک ہے' تیرا اعتراف قبول ہے۔ دوسرے کے متعلق کہا کہ تو ابدی طور پر زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گیا۔ کیا بات ہوئی؟ دونوں نے ایک جیسا جرم کیا تھا۔ کہا ہوا یہ تھا کہ جب آدم سے ہم نے پوچھا کہ تم نے کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) بارِ الٰہا! میں اپنی غلطی کا ذمہ دار ہوں' مجھے احساس ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ کہا کہ جب تم نے اس کا اعتراف کر لیا' ذمہ داری کو قبول کر لیا' قطراتِ ندامت تیری پیشانی پہ آ گئے' تو تیری اصلاح کا امکان ہے۔ ابلیس سے کہا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ کہنے لگا: ارے خداوند! تو قادرِ مطلق' تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا' میں کون ہوں خود کرنے والا' تو نے کرایا ہے' میں نے کیا ہے۔ کہنے لگا کہ اگر یہ ذہنیت ہے تو قیامت تک کے لیے تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا' اس کی اصلاح ہی نہیں ہو سکتی۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں نے کیا ہی نہیں' اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور تقدیر کا سارا مسئلہ حل ہو گیا' عزیزانِ من! پھر آپ کے ہاں جب وہ مجوسی عقائد در آتے ہیں تو دین مذہب بنتا ہے یعنی قرآن نے آدم کا اور ابلیس کا پہلا ہی تعارف یہ کرایا ہے کہ ابلیس نے تقدیر کا بہانہ بنایا' آدم نے اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیا' اس میں اصلاح کا امکان ہے' ابدی طور پہ

---

❶ تمہارا ستیاناس ہو۔ میرے لاڈلے لختِ جگر نے کیا کیا تھا؟ وہ تو بہت ہی معصوم بچہ تھا۔

وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

مجوسیوں کے ہاں تقدیر کا بنیادی عقیدہ

آپ کے ہاں یہ ایرانی اسلام آیا ہے جسے اقبالؒ (1938-1877ء) مجوسی اسلام یا عجمی اسلام کہتا ہے۔ مجوسیوں کے ہاں تقدیر کا یہ بنیادی عقیدہ تھا۔ یہ تھا ان کے ہاں کا دین۔ اسلام اس عقیدے کی جڑ کاٹنے کے لیے آیا۔ وہ ہر فرد کو اس کے عمل کا ذمہ دار بنا رہا ہے۔ وہاں سے جب یہ دین مجوسیت کے اس کوچے سے ہو کر واپس آیا تو یہ سارا قسمت کا' تقدیر کا' نصیبے کا' بخت کا عقیدہ لایا۔ یہ جسے آپ بخت کا عقیدہ کہتے ہیں ان کے ہاں یہ بخت تو انسان پیدائش سے اپنے ساتھ لے کر آیا اور یہ آپ کے ہاں پورے کا پورا تقدیر کا عقیدہ آیا اور پھر دیکھیے کہ کس طرح سے وہ جزوِ ایمان بنا ہے۔

ہمارے ہاں ایمان کے سلسلہ میں تقدیر کا خودساختہ عقیدہ

قرآن نے تو پانچ ہی اجزائے ایمان کہے تھے: ❶ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ سارے قرآن میں یہ پانچ ہی اجزائے ایمان کہے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ آپ سے یہ جو ایمان کا اقرار لیا جاتا ہے' کیسے لیا جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ نے تو کبھی ساری عمر ایمان لایا ہی نہیں یعنی ''اسی تے جماندرو مسلمان ہیگے ہاں نا۔ ساری عمر اسی کدی ایمان لے آندا ای نہیں ہیگا۔ سوچ رہے ہیں جو میں کہہ رہیا ہیگاں؟ ایمان نال کہہ' سچ کیناں کے نہیں؟ ❷ آج اس دور میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں۔ پہلے دور میں دو چار سخت مقام آیا کرتے تھے۔ اس میں یہ کلمہ بھی پڑھنا پڑتا تھا۔ یہ ایمان مجمل اور ایمان مفصل' تو اب عہدِ کہن کی داستانیں ہیں۔ ہمارے جو بچے ہیں' یہ تو ایمان مجمل اور ایمان مفصل کے یہ لفظ بھی نہیں جانتے۔ نکاح کے وقت یہ پڑھا جاتا تھا۔ ''تے ہن جیہڑا تسی نکاح نامے تے دستخط کر کے ٹر جاندے' اوتسی ایتھوں وی گئے ❸۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آپ کے ہاں کا جو ایمان ہے' اب وہ کیا ایمان ہے۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ❹۔ یہ چار ہو گئے اور اگلا ہے کہ و بعث بعد الموت موت کے بعد اٹھنا' یہ پانچواں آ گیا ہے اور انکے درمیان یہ آتا ہے کہ والقدر خیرہٖ وَشرہٖ من اللہ تعالیٰ۔ خیر اور شر سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے' اس پر ایمان۔ یہ کہنا آپ

---

❶ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ (2:177) کشادگی کی راہ اس کی ہے جو اللہ پر' یومِ آخرت پر' ملائکہ پر' کتب پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

❷ ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہم نے ساری عمر ایمان لایا ہی نہیں ہے۔ کیا آپ سوچ رہے ہیں جو میں کہہ رہا ہوں؟ ایمان سے کہو کہ سچ کہتا ہوں یا نہیں؟

❸ اب جو آپ نکاح نامے پر دستخط کر چلے ہیں تو اب تو آپ اس سے بھی گئے۔

❹ میں اللہ پر' ملائکہ پر' (آسمانی) کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لایا۔

کے ہاں کا ایمان کا جزو ہے اور ان کے بعد ہے کہ و بعث بعد الموت یعنی مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان ۔ یہ چھ جزو ہیں ایمان کے ۔ اب پانچ خدا کے دیئے ہوئے ہیں' یہ چھٹا جزو آپ کے کلمے کے اندر تقدیر کا مسئلہ داخل ہوا ہے ۔ آپ اس کو کہاں کہاں سے نکالیں گے ۔

جہنم کے اندر بھی غلط روش کا عمل جاری ہے

عزیزانِ من! اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ آپ حسبنا کتاب اللہ [1] کو' یعنی خدا کی کتاب کو' اپنے ہر عقیدے کا' ہر نظریئے کا معیار بنائیں تو پھر آپ دینِ مصطفیٰ' پہ نظامِ مصطفیٰ پہ آ سکتے ہیں اور اگر آپ یہی کلمے پڑھاتے رہے تو یہ تو پھر مجوسیوں کا کلمہ ہے' یہ مصطفیٰ کا کلمہ تو نہیں ہے ۔ حضورؐ کے زمانے میں تو اس کلمے میں یہ چھٹا [2] جزو نہیں تھا' کوئی نہیں کرتا تھا ۔ سنیے: بات کہاں تک آئی! کہا کہ کیوں یہ لوگ اس طرح جہنم میں آئے؟ اب بھی ان کی کیا کیفیت ہے؟ ان سے پوچھا جائے گا کہ جہنم میں کیوں آئے تھے؟ حالانکہ کہنے والوں نے تمہارے پاس آ کر بتایا تھا کہ یہ کچھ چھوڑ دو' غلط روش ہے' تباہ ہو جاؤ گے ۔ انہوں نے کہا کہ ہاں بتایا تھا ۔ پوچھا تو پھر کیا ہوا؟ **قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا** [3] (23:106) کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ ہماری تقدیر نے مار دیا ۔ کہا کہ اسی لیے تو جہنم میں آ رہے ہو ۔ تم یہاں بھی یہ کہہ رہے ہو کہ **وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ** [4] (23:106) ایک ہم ہی نہیں تھے' پوری کی پوری امت ہی اس میں گڑی ہوئی تھی ۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا ۔ اب حقیقت ہم پر آشکارا ہو گئی ہے لہٰذا **رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ○ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ** (23:107-108) اے بارِ الٰہا! ہمیں ایک دفعہ پھر واپس بھیج دے' یا اللہ! میری توبہ' ایک دفعہ پھر واپس بھیج دے ۔ اس نے کہا کہ تمہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہاں دوبارہ چانس نہیں ملتا' ایک ہی دفعہ اس زندگی کے اندر ملتا ہے اس لیے اب یہ باتیں کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے ۔ ذلیل و خوار ہو کے پیچھے ہٹے رہو' تم آگے نہیں بڑھ سکتے اور اب باتیں بنانے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمنون کی آیت 107 تک ہم آ گئے' 108 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

1. ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے ۔
2. والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ
3. وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! (یہ سب درست ہے لیکن اب ہم اس کے سوا اور کیا کہیں) کہ ہماری بدبختی ہم پر مسلط ہو گئی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ۔ 790) ۔
4. اور ہماری پارٹی غلط راستے پہ چل نکلی تھی (ہم بھی اس کے ساتھ ہی تھے) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ۔ 790) ۔

سولھواں باب: **سورۃ المؤمنون** (آیات 108 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ
تَضْحَكُوْنَ ﴿١١٠﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ
الْفَآئِزُوْنَ ﴿١١١﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا
يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿١١٣﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ
اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١١٤﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا
لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿١١٥﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ
الْكَرِيْمِ ﴿١١٦﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا
حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ
وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١١٨﴾

عزیزانِ من ! آج ستمبر 1977ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 109 سے ہو رہا ہے:(23:109)۔

ظہورِ نتائج کے سلسلہ میں وقت کا دریا کبھی پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا

مسلسل درس کا سلسلہ ہمارے ہاں جاری ہے۔ اس میں آخری درس کافی عرصہ پہلے [1] ہوا تھا اور اگر شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب [2] میں، تو وہ تو ایک مہینے سے بھی زائد کا عرصہ ہو گیا ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ پچھلی آیات میں بات یہ آ رہی تھی کہ وہ لوگ جو قانون شکنی اور سرکشی کی بنا پر جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، انہیں مہلت کا وقفہ دیا جاتا ہے کہ شاید اب بھی یہ اپنی اصلاح کر لیں، اب بھی صحیح راستے پہ آ جائیں اور جب یہ عرصہ گزر جاتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی، مہلت کا وقفہ بھی باقی نہیں رہتا تو وہ آتا ہے جسے ظہورِ نتائج کا وقت کہتے ہیں۔ جب ظہورِ نتائج کا وہ وقت آ جاتا ہے تو ان کے ان جرائم کے نتائج محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اسے آپ سزا کہہ لیجیے، تباہی کہہ لیجیے، بربادی کہہ لیجیے، قوموں کے معاملے میں ان کی ہلاکت کہہ لیجیے۔ ان آخری لمحات میں وہ چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ **رَبَّنَآ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ** (23:107) اے ہمارے پروردگار! اگر ایک موقع اور ہمیں دے دیا جائے، جیسے کہتے ہیں وقت کے دریا کو پیچھے کی طرف لوٹا دیا جائے، تو پھر دیکھ، ہم کتنے اچھے کام کرتے ہیں۔ اس وقت تم سے یہ کہا جائے گا کہ **قَالَ اخۡسَـُٔوۡا فِيۡهَا وَلَا تُكَلِّمُوۡنِ** (23:108) تمہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہ وقت پیچھے کی طرف نہیں جایا کرتا، بار بار تمہیں وارننگ دی جاتی تھی، بار بار انتباہ کیا جاتا تھا، اور تم سنتے نہیں تھے۔ اب تو اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر کہا کہ تمہیں یاد نہیں کہ **اِنَّهٗ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡ عِبَادِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ** (23:109) وہی میرے بندوں میں سے ایک جماعت ایسے لوگوں کی تھی جو ہمارے قوانین پر یقین رکھتے تھے، تمہاری اس قسم کی تدابیر کے خلاف حفاظت چاہتے تھے، ہم سے دعائیں مانگتے تھے، یہ ان کی آرزوئیں تھیں کہ یا اللہ! اس قسم کے نامساعد حالات کے اندر بھی ہماری حفاظت کر، سامانِ نشوونما بھی عطا کر۔ یہ لوگ موجود تھے لیکن **فَاتَّخَذۡتُمُوۡهُمۡ سِخۡرِيًّا حَتّٰٓى اَنۡسَوۡكُمۡ ذِكۡرِىۡ وَكُنۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ تَضۡحَكُوۡنَ** (23:110) تم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ یہ باتیں بے وقوفوں کی ہیں۔ جو تم کہہ رہے ہو اس سے بہت نقصان ہوتا ہے حالانکہ وہ بار بار تمہیں کہتے تھے کہ نہیں، ہم بات بڑی Seriously (سنجیدگی) سے کر رہے ہیں، اس پہ

---

[1] یاد رہے اس سے پہلے کا درس اگست 1977ء کی 12 تاریخ کو ہوا تھا۔

[2] کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں (غالب)

غور وفکر تو کرو لیکن' جیسا نشے میں مدہوش آدمی کبھی کسی ہوش مند کی بات سنتا ہی نہیں ہے' تم سنتے ہی نہیں تھے تا آنکہ کہ تم نے ہمیں بھی یکسر فراموش کر دیا اور انہیں مرفوع القلم سمجھ لیا کہ ہم نے انہیں ختم کر دیا' ان کی آوازوں کو بھی دبا دیا ہے۔ اب ہمیں کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہوگا۔

قانون بنانے والوں کا فریضہ

ضمناً یہاں دو باتیں اہم ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ جو قرآن کی رو سے قانونِ مکافاتِ عمل ہے اس میں آپ دیکھیے کہ کس قدر عادلانہ اور Scientific Bases (سائنسی بنیادوں) پر قرآن میں یہ آیا ہے کہ وہ لوگ جن میں ان باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے' ان کے متعلق یہ بات نہیں ہے کہ وہ قانونِ مکافات کی گرفت میں آ جائیں۔ ان میں دوسری بات یہ ہے کہ جن تک یہ بات پہنچی ہی نہیں وہ بھی اس کے تحت گرفت میں نہیں آ سکتے۔ یہ کتنا بلند اصول ہے! حالانکہ ہمارے ہاں اب جو مہذب ترین زمانہ گنا جاتا ہے اس میں قانون میں تو کہتے ہیں کہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں بھی Ignorance of law is no cxcuse[1] تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو قانون بنانے والوں کا' یا گرفت کرنے والوں کا' یا احتساب کرنے والوں کا' فریضہ ہے کہ یہ اس قانون کو ان تک پہنچائیں۔ اس نے کہا ہے کہ سب سے پہلے تو ہم نے یہ فریضہ اپنے اوپر عائد کیا ہے۔ ہم جس کو رسول کہتے ہیں اس کے معنی ہی قانون کو پہنچانے والے کے ہیں۔ اب یہ فریضہ اسی صورت میں ادا ہوگا کہ ہماری جو رسالت ہے یہ وہ پیغام پہنچائے جہاں تک یہ پیغام پہنچے گا وہیں تک وہ لوگ اس کی گرفت میں آئیں گے۔ ختم نبوت کے بعد اس نے کہا ہے کہ کم از کم انسانوں کے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو ان قوانین کو انسانوں تک پہنچائے اور یہ دونوں چیزیں جمع ہوں یعنی ان تک یہ پہنچ چکا ہو اور ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو اور اس کے بعد پھر اگر وہ اپنی مفاد پرستی یا ضد' عناد یا سرکشی کی بنا پہ اس کی خلاف ورزی کریں تو پھر ان کے خلاف جرم ثابت ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم اواگون کے تصورات کی تردید کرتا ہے

کہا ہے کہ تمہارے اندر وہ لوگ تھے جو تمہیں بار بار اس کے متعلق انتباہ کرتے تھے' وارننگ دیتے تھے' تنبیہ کرتے تھے' لیکن تم ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ نظر آیا کہ پیغام پہنچا بھی دیا گیا تھا اور ان میں اس قسم کی صلاحیت تھی کہ وہ سمجھ سکتے ہوں' اس کے باوجود انہوں نے یہ Attitude (رویہ) اختیار کیا اور تیسری چیز یہ کہ جب وہ پہلی شکایتیں آہستہ آہستہ مرض بن جاتی ہیں' درد بن جاتا ہے' جب وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو پھر یہ جس کو چیخنا چلانا کہتے ہیں' وہ کسی کام نہیں آتا' اور اہم چیز یہ ہے کہ یہ پلٹ کے واپسی کی بات غلط ہے۔ اس سے وہ سارا جسے آپ Transmigration of Soul (تناسخ یا آواگون کا مسئلہ) کہتے ہیں' اُس سب کی تردید ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے

---

[1] قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے۔

کہ قرآن کی رو سے (مثلاً) یہاں دنیا سے جو مر جانے والا بھی ہے' اس کا کوئی تعلق اس دنیا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بار بار قرآن میں یہ بات آئی ہے اور یہ مر جانے کے بعد ہی کی بات نہیں ہے بلکہ یہاں بھی' اس دنیا کے اندر بھی' قرآن کی رو سے ہلاکت واحتساب اور گرفت اور عدل اور مکافاتِ عمل کی رو سے نتائج کا برآمد ہونا اس دنیا کے اندر بھی ہے۔ قرآن ان کے متعلق بار بار کہتا ہے کہ **خزی فی الحیوۃ الدنیا** (2:85) ان کے لیے اس دنیا کے اندر ذلت اور تباہی اور مواخذہ اور سزا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس کی شکلیں کیا ہوتی ہیں' کن کے ہاتھوں سے وہ آتا ہے لیکن اس دنیا میں بھی وہ آتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ یہاں جو معاملہ پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ اعمال اپنا نتیجہ دے کر رہتے ہیں۔ کہا کہ یہ لوگ موجود تھے جو یہ کچھ کہتے تھے' تمہارا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ **اِنِّیۡ جَزَیۡتُہُمُ الۡیَوۡمَ بِمَا صَبَرُوۡۤا ۙ اَنَّہُمۡ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ** (23:111)۔ ان لوگوں نے بڑی برداشت' بڑے صبر واستقامت سے کام لیا۔ تمہیں تو پتہ نہیں کہ کس کس قسم کی ان کو تکلیفیں پہنچاتے تھے' اذیتیں دیتے تھے۔ سچ بولنے والوں کو' تمہاری ان سرکشیوں پر آگاہ کرنے والوں کو' غلط اعمال کے نتائج سے متنبہ کرنے والوں کو' تم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور اسی بنا پر پتہ نہیں کیا کیا کچھ ان کے خلاف کرتے تھے اور یہ تھے کہ استقامت سے' ثبات سے' اپنے مسلک کے اوپر جمے رہتے تھے۔ آج ہم ان کو اس کا معاوضہ دیتے ہیں۔ یہ ہیں کامیاب' یہ ہیں فائزون جنہوں نے کچھ Achieve (حاصل) کیا ہے۔

حق بات کو سمجھنے والوں کا فریضہ اور اُن کے مصائب

عزیزانِ من! یہ چیز بھی ہے کہ رسول خدا کی طرف سے' اس پیغام کو پہنچانے کے لیے بھی' معمور ہوتا ہے لیکن میں اپنی بصیرت کے مطابق یہ عرض کروں گا کہ جسے بھی حق کی کوئی بات سمجھ میں آجائے' جسے بھی قرآن کی کوئی چیز سمجھ میں آجائے' اس پر فریضہ رسالت عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچائے اور یہ بھی سمجھ لے کہ اس پہنچانے کے نتیجے میں یہ کچھ ہوگا جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ کشمکش ہر دور میں جاری رہے گی۔ یہ کسی خاص دور' کسی خاص شخصیت' خاص جماعت تک محدود نہیں ہے۔ جہاں بھی آپ اس قسم کے جو مدہوش ہوتے ہیں' جو قوت کے نشے میں مست ہوتے ہیں' ان کے خلاف کوئی حق کی بات کہیں گے' وہ یقیناً آپ کو اذیتیں پہنچائیں گے۔ وہاں کہا ہے کہ استقامت سے اس کو برداشت کرنے والی جو جماعت ہے' وہی آخر الامر کامیاب ہو کر رہے گی۔ پیغام پہنچانے کا یہ فریضہ قیامت تک کے لیے ہے' اب نبی تو خدا کی طرف سے آنا نہیں ہے' کوئی تو یہ فریضہ ادا کرے گا۔ یہ فریضہ اس امت کے ذمے تھا جسے اس کتاب کا وارث بنایا گیا ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ یہ نبوت تو ختم ہوگئی' اب خدا کی طرف سے کوئی وحی نہیں مل سکتی لیکن اس کا آگے پہنچانا ہے' یہ فریضہ اس امت کے سر ہے جو وارثِ کتاب ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ معنوی لحاظ سے رسول کے معنی پیغامبر ہے' پیغام پہنچانے والا ہے۔

ہمیں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے لیے تبلیغ کہہ لیجیے لیکن ان پیغامات کو آگے پہنچانے کا یہ فریضہ اس امت کا ہے جو وارثِ کتاب ہے اور جسے کتاب میں سے کچھ بات سمجھ میں آئے اس کا فریضہ ہے کہ وہ اسے آگے پہنچائے۔ قرآن میں یہ چیز ہے کہ رسول سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے اس کو نہ پہنچایا تو تم سے پہلے جن قوموں کا جو حشر ہوا تھا وہی تمہارا ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ درس سن جانا' یا درس سنا لینا تو وہ چارہ نہیں ہے کہ داد مل جائے اور داد دیدیں۔ یہ تو بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جس نے سن اور سمجھ لیا اس پہ آگے پہنچانے کی ذمہ داری ہے' اور پھر اس کے لیے بھی تیار رہیے کہ پھر اس کے خلاف یہ جو قوتیں کچھ کیا کرتی ہیں وہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔ یہ بات آگے پہنچانے کی ہے اور اگر نہیں پہنچائی جائے گی تو وہ مرتکب جرم ہو جائے گا:

لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا [1]

سرکشی کا نشہ انسان کو مدہوش کر دیتا ہے

قرآنِ کریم نے سچ کہا تھا کہ اس وقت ان مجرمین سے پوچھا جائے گا قَالَ كَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِى الۡاَرۡضِ عَدَدَ سِنِيۡنَ (23:112) ذرا گن کر بتاؤ تو سہی کہ اقتدار میں' اس قسم کی سرکشی میں' مدہوشی کے نشے میں کتنا عرصہ رہے؟ یہاں عجیب بات کہی ہے۔ نشے میں مدہوش کو یہ یاد ہی نہیں ہوتا کہ کتنے بجے ہیں' کتنا وقت ہو گیا ہے۔ اُسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہ جو ٹائم کا Concept (تصور) ہے یعنی وقت کا تصور ہے' اس کا تعلق ہوش کے ساتھ یا شعور کے ساتھ ہے۔ جب اس کا شعور نہیں ہوتا' ٹائم یعنی زمان کا Concept (تصور) نہیں ہوتا۔ آپ سو جاتے ہیں تو پوری رات میں آپ کو ٹائم (زمان) کا کوئی Concept (تصور) نہیں ہوتا۔ اگر آدھی رات کے وقت بھی آنکھ کھل جائے تو اِدھر اُدھر کچھ دیکھ کر'' کرلوندے او تسی کہ کنا اک وقت ہویا اے۔ اوجیہڑا نال ستا ہوندا دوسرا پرلے پاسے' اووی کہندا اکہ کوئی دو اک دا عمل ہووے گا جناب! دو اک دا عمل ہونا اے۔ سمجھے نا کچھ پنجابی والے کہ عمل کیا ہوندا اے؟ دو اک دا عمل ہونا اے۔ [2] '' یعنی یہ جو Concept of time (تصور زمان) ہے' یہ شعور کی اس سطح کے حساب سے ہے۔ جب یہ بات آگے آئے گی تو پھر میں عرض کروں گا۔ اگر اب کہا تو ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔

---

1. یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا (اقبالؒ)
2. تو آپ اِدھر اُدھر دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں کہ بتانا کتنے بجے ہیں؟ وہ جو دوسرا پاس ہی سویا ہوا ہوتا ہے وہ بھی یہ کہتا ہے کہ جناب کوئی دو ایک کا وقت ہوگا۔ یہ جو دو ایک کا عمل (وقت) ہونا ہے آپ پنجابی سمجھتے ہیں کہ یہ ''عمل'' کیا ہوتا ہے۔

برزخ کی زندگی کا مفہوم اور اس کی کیفیت

ہم کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد زندگی ہے۔ زندگی تو مسلسل ہے' مرتا تو جسم ہے' انسان تو نہیں مرتا لیکن ٹائم کا جو Concept (تصور) ہے یعنی اس میں جو وقت کا تصور ہے' یہ جو اس کے اندر درمیانی Period (دور' وقفہ) ہوتا ہے' اسے Interim Period عبوری وقفہ کہہ لیجیے۔ یہ جو شعور کی موجودہ سطح ہے' جو ہمارے اس طبعی جسم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے' اس سے نکل کے شعور کی نئی سطح پر جو آنا ہے' جس کو برزخ کی زندگی کہتے ہیں' اس میں یہ عبوری طور پہ وہاں تک پہنچتا ہے' یہ Gradually (بتدریج) وہاں تک پہنچتا ہے۔ جو پچھلا Concept (تصور) ہے وہ بڑا مدھم سا ہوتا ہے' باقی اگلا Concept (تصور) ابھی واضح طور پہ آیا نہیں ہوتا۔ اسے برزخ کا دور کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات کے اوپر بھی بات کی ہے تو میں نے کہا ہے کہ میں یہ بات اس مقام پہ کروں گا جہاں یہ آئے گا۔ حیات بعد الممات کا قصہ بڑا سائنٹفک ہے' عزیزانِ من! آپ کا تو میں کہہ نہیں سکتا' میں تو اپنی کیفیت کا کہہ سکتا ہوں کہ میرے سامنے تو یوں یہ چیزیں محسوس شکل میں آ جاتی ہیں جس طرح قرآن نے بیان کی تھیں۔ یہ Metaphysics (مابعد الطبیعات) کی چیز رہتی نہیں۔ مابعد الطبیعاتی چیز کو سمجھایا ہی اس طرح سے ہے۔ قرآن میں تو وہ میٹا فزکس کی چیز ہے لیکن صاحب! اس کے سمجھانے پہ کوئی بات یوں محسوس طور پہ سامنے آ جاتی ہے' تو کہا یہ ہے کہ بتاؤ کتنا عرصہ وہاں رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ (23:113) کہا ہے کہ کیا بتائیں صاحب! ویسے بھی سکھ کے دن تو یونہی بیت جاتے ہیں' دکھ کی تو وہ ایک رات بھی نہیں بیتتی صاحب! جسے بیمار کی رات کہتے ہیں' بڑی لمبی رات ہوتی ہے۔ ہوتی تو وہی مثلاً کوئی دس بارہ گھنٹے کی ہے' بیمار کی رات بڑی لمبی ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ جو سکھ کے دن ہیں' وہ تو یوں چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! کچھ یاد نہیں پڑتا۔ کہا کہ اس دوران میں ہم میں سے اگر کوئی ایسا ان چیزوں کا حساب رکھنے والا تھا تو اس سے پوچھ کے دیکھیے۔ ''سانوں تے کجھ پتہ نہیں یاد رہیگا۔ سر و سر پینیدیاں ہون تے اونج ای یاد بھل جاندی ہیگی۔ ❶'' عجیب نقشہ کھینچتا ہے: قَالَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (23:114) کہا کہ وہ عرصہ گنتی میں بھی کتنا ہی لمبا کیوں نہ ہو' اگر تم کہیں علم اور شعور کی بارگاہ سے پوچھو تو یہ جو اس کے بعد کی حیاتِ جاوداں ہے' اس کے مقابلے میں تو وہ بہت ہی قلیل رہ جائے گا تو کیا حساب کرنا۔ اس کے مقابلے میں تمہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ یہ جتنی بھی مفاد پرستیاں اور منفعت کوشیاں ہیں' بہت کم قیمت کی ہیں۔ جتنا بھی یہ عرصہ ہے' بڑا قلیل ہے اور اس کے بعد جو حیاتِ جاوداں کی متاع ہے وہ بے بہا ہے۔ جسے اب اس دنیا کی زندگی کہا جاتا ہے' اس کے لیے وہ کتنا ہی لمبا عرصہ کیوں نہ ہو' در اصل وہ تھا ہی بڑا قلیل عرصہ۔ اور اب آگے ایک بات آئی ہے۔

---

❶ ہمیں تو کچھ بھی معلوم نہیں رہے گا۔ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو ویسے ہی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

قرآنی آیت کے آخر میں خدا کی دی گئی صفت کی اہمیت

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہوا ہے اور بار بار کہتا ہوں کہ قرآنِ کریم کی ہر آیت کے بعد جو آخر میں خدا کی صفت بیان ہوتی ہے وہ بڑی اہم ہوتی ہے۔ وہ یوں ہی شاعری کی طرح سے کافیہ سا نہیں ہے کہ ایک اس کو لے آیا' اور کافیہ سا رکھ لیا' پھر مضمون باندھ دیا۔ یہ صورت نہیں ہے۔ آیت کے آخر میں قرآن جو خدا کی صفت لاتا ہے وہ بڑی Appropriate (موزوں و مناسب اور برمحل) ہوتی ہے' بڑی مناسب ہوتی ہے۔ معنوی اعتبار سے وہ جو مضمون پہلی آیت میں آیا ہوا ہوتا ہے' اس کے آخر میں خدا کی صفت کا اس کے ساتھ بڑا ہی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ خدا توفیق دے تو کبھی قرآن کو اس نگاہ سے بھی پڑھیے اور پھر سورۃ کی آخری آیات کے اندر تو اس نے اس سورۃ کے تمام مضمون کو Sum-up (مجتمع) کر دیا ہوتا ہے اور اسی سے پھر وہ بات آگے چلاتا ہے۔

آج کی دنیا میں انسانوں کا نظریہ حیات

یہ جو سارا قصہ ہے وہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر نہ کرنا' ان قوانین کو نظر انداز کرنا' پھر اس کے بعد سرکشی برتنا' ان اقدار کے علی الرغم یہ کچھ کہنا' اور ان کا مذاق اڑانا ہے۔ پوچھا کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟ یہاں زندگی کے دو نظریئے بیان کیے ہیں۔ زندگی کا ایک نظریہ جو آج قریباً قریباً ساری دنیا پہ ہی عام ہو گیا ہوا ہے یہ ہے کہ یہ کائنات یونہی اتفاق سے' کسی طرح وجود میں آ گئی۔ یہ اس لیے کہ کتنے ہی بڑے بڑے سائنٹسٹ بھی کیوں نہ ہوں وہ اس کی ابتدا کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے' کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے وجود میں آ گئی۔ وہاں ان کے پاس چانس کا ایک لفظ ہے کہ By chance (اتفاقیہ) ایسا ہو گیا۔ یہ کسی طرح سے یونہی اتفاقیہ وجود میں آ گئی' پھر یہ مکینکلی' مشین کی طرح' چلی جا رہی ہے گویا اس کے اندر نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی غایت ہے' نہ کوئی Objective ہے' نہ کوئی Purpose' نہ کوئی Plan ہے۔ جو چیز اتفاقیہ وجود میں آ جائے اور اسی طرح سے یونہی مسلسل چلی جائے تو اس میں تو Purpose (مقصد) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت' یہ جسے آپ مادہ پرستی (Materialism) کہتے ہیں اور جسے سیاست میں سیکولرازم وغیرہ کہتے ہیں' وہ کیا ہیں؟ یہ ایک Concept (تصور) ہے' یہ پہلے کائنات کے متعلق ایک تصور ہے۔ جب کائنات کے متعلق یہ تصور ہو تو کائنات ہی کا تو ایک جزو انسان ہے۔ خود انسان کے متعلق بھی یہ تصور ہے کہ یہی فطرت کا Physical Law (طبعی قانون) ہے کہ کسی طرح سے یہ ایک بچہ' جنین' رحم میں آتا ہے' بچہ پیدا ہو جاتا ہے پھر وہ انسان طبعی قوانین کے مطابق' یہ انسان کا جسم یہی ہے' پرورش پاتا ہے' طبعی قانون کے مطابق آہستہ آہستہ' مشین کے پرزوں کی طرح' گھس جاتا ہے۔ اس کے بعد Disintegrate (منتشر) ہو جاتا ہے۔ اس میں انتقال واقعہ ہوتا ہے۔

صاحب! زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا۔ ❶ ٹھیک ہے' یہ موت جسم کی موت ہوگئی۔

---

❶ چیپ مین کوہن (Chapman Cohen) نے مادیت (Materialism) کے متعلق Materialism Re-stated نامی بڑی مختصر لیکن بڑی جامع کتاب لکھی ہے۔ وہ مادیت کے متنوع گوشوں کی تفصیل کے بعد کم از کم تین خصائص ایسے بتاتا ہے جو مادیت کے لیے لازمی ہیں۔ وہ دراصل فلسفہ مادیت کا ماحصل ہیں: (1) دنیا میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ کسی آزاد روحانی یا نفسی قوت کے ارادے کے ماتحت وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ قوائے فطرت کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ (2) نظریہ مادیت کی رو سے کسی ایک معین وقت پر کائنات کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس کیفیت سے پہلے کی قوتوں کے امتزاج اور تقسیم کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ عقیدہ بھی لازم آتا ہے کہ کائنات میں نہ کوئی نیا عنصر یا نئی قوت وجود میں آتی ہے (اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے) اور نہ ہی اس قسم کا کوئی عنصر یا قوت خارج سے کائنات میں داخل ہوتی ہے۔ اس لیے ہم جس چیز کا نام ایک ''نیا عنصر'' رکھتے ہیں وہ موجودہ قوتوں کی ایک نئی ترتیب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مادیت کے اس ادعا کو جبریت (Determinism) یا میکانکیت (Mechanism) یا میکانکی جبریت (Mechanistic Determinism) کہتے ہیں۔ (3) کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ اپنی اصل کے اعتبار سے مادہ (Matter) ہی ہے۔ اس کے ماورا اور کچھ نہیں۔ مادیت کے ان تین خصائص کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس تصورِ کائنات کی رو سے (1) نفسِ انسانی (Mind) کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ یہ صرف دماغ کے مادی خلیات ہی کی کرشمہ زائیاں ہیں۔ (2) کائنات میں تخلیق (Creation) کا عمل جاری ہے۔ کچھ توانائی (Energy) کسی طرح سے ظہور میں آ گئی ہے' اب وہی توانائی اپنی ترتیب بدلتی رہتی ہے اور اسی تبدیلی ترتیب کا نام ''حوادث یا تغیرات'' ہیں اور تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح ہو رہا ہے جیسے کسی نے ایک گھڑی کو کوک دیا ہو اور اس کے بعد وہ اپنے زور دروں اور پرزوں کی میکانکی حرکت سے خود بخود چلتی ہے۔ اس بحث (Discussion) سے مادیت سے مفہوم یہ رہ جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اصل کے اعتبار سے مادی ہے' مادہ ہی جو ہر حقیقی (Real Substance) ہے' اس کے سوا حقیقت (Reality) کا تصور کچھ نہیں حتیٰ کہ نفسِ انسانی بھی' مادہ ہی کے اثر کا نتیجہ ہے (حوالہ Philosophy of Religion by Brightman) اور جب نفسِ انسانی بھی مادہ ہی کے ترتیبی اثر کا پیدا کردہ ہے تو اس نظریہ کی رو سے بقائے روح یا حیات بعد الممات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک تو بس یہ رہ جاتا ہے کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا — (چک بست)

اسے فرائڈ (Sigmund Freud: 1856-1939) کے الفاظ میں یوں کہیے کہ ''زندگی کا منتہیٰ موت ہے'' اسے ہیری سلوکوور (Harry Slochower) نے اپنی کتاب No Voices is Wholly Lost میں درج (Quote) کیا ہے۔ چنانچہ ہیکل (Haeckel, Ernst) لکھتا ہے کہ روح (Soul) کا تصور سراب سے بڑھ کر کچھ نہیں اور جب اس کا تصور ہی فریبِ نفس ہے تو اس کی بقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسم انسانی کی مشین' دماغ اور اس سے متعلقہ اعصاب کے عمل سے حرکت رہتی ہے اور دماغ کے عمل کے خاتمہ پر یہ حرکت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ عناصر کی ترتیب (Integration) کا نام زندگی' شعور' روح سب کچھ ہے اور ان کے انتشار (Disintegration) کا نام فنا۔ اس سے زیادہ سب کچھ افسانہ ہے اور ذہنِ انسانی کے تراشیدہ توہمات۔ (ماخوذ از پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 2002' ص ص-29-27)

انسانی زندگی کے متعلق مغرب کے نظریہ حیات اور قرآنِ حکیم کی راہنمائی

آج کی دنیا میں یہ مفکرین اور مادیین (Materialists) یہاں تک پہنچے ہیں۔ وہ اس جسم (Physical Body) کے علاوہ کچھ اور مانتے ہی نہیں ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ جسم تو اتفاق سے ہی وجود میں آ گیا۔ اس کی کوئی Destination (منزل) نہیں، کوئی مقصد نہیں، کوئی غایت نہیں۔ جب انسان کی زندگی صرف اسی جسم سے عبارت ہے تو جسم کی پرورش کے لیے آسائش کے لیے آدمی کو جو کچھ چاہیے وہ جس طرح سے بھی جی چاہے، حاصل کر لے۔ زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قانون ہوں گے تو وہ سوسائٹی کے قوانین ہی دھاندلی پہ مبنی ہو جائیں تو وہ ٹھیک ہے جنگل کا قانون ہوتا ہے: جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے یعنی اس سے آگے تو کوئی غرض ہی نہیں کہ انسان زندہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر لے، زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر لے، یہی غایت رہ جاتی ہے اور تو زندگی کا کوئی مقصد (Purpose) نہیں رہتا۔ یہ ہے کائنات کا اور انسان کا (میکانکی) نظریہ زندگی جسے کفر کہا جاتا ہے۔ اس میں کائنات اور انسان کا بے غایت سمجھنا ہے، بے مقصد سمجھنا ہے۔ اس زندگی کو یہ سمجھ لینا کہ یہ By chance (اتفاقیہ) وجود میں آ گئی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس کائنات کو ایک حکیم مطلق ایک Plan کے تابع، ایک مقصد کے لیے، وجود میں لایا ہے۔ اس کی ایک غایت ہے، یہ حکیم مطلق اس کائنات کو اس کی طرف چلا رہا ہے، اسی میں انسان بنا ہے۔ انسان کی زندگی میں یہ جو مغرب کا Evolution (ارتقا) کا نظریہ ہے وہ کارفرما ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک جرثومے سے لے کر یہ زندگی مختلف مدارج میں سے، مراحل میں سے گزرتی ہوئی انسان کے جسم تک آئی لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان کی زندگی اس ارتقا کی آخری کڑی نہیں ہے۔ مغرب کی دنیا یہ کہتی ہے کہ یہ ارتقا کی آخری کڑی ہے یعنی جسم انسانی ختم ہوا، ارتقا کا سلسلہ ختم ہوا۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہاں سے ایک نئے ارتقا کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ ایک نئی چیز ہے جو انسان کے یا اس ارتقا کی منزل میں آئی ہے۔ وہ جسم کے علاوہ، انسان کی ایک شے ہے جو ان طبعی قوانین کے تابع نہیں ہے اور طبعی قوانین کا نتیجہ بھی نہیں ہے۔ اسے قرآن تو نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ اسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، اسے خودی کہا جاتا ہے۔ اسے کچھ کہہ لیجیے یہ کوئی ایک چیز ہے، جو جسم کے ساتھ فنا نہیں ہوتی۔ وہ کہتا یہ ہے کہ، جنہیں اقدارِ خداوندی یا Permanent Values کہا جاتا ہے اگر ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو وہ جو انسان کے اندر یہ ایک شے ہے، جو اس کی موت سے مرتی نہیں، اس کی نشوونما ہوتی ہے اور پھر وہ ارتقا کی اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک تصور ہے۔ اگر اس پہ ایمان ہوا، تو انسان کے اسی جسم کا نام زندگی نہ ہوا۔ جسم کی پرورش ضروری ہے لیکن اصل غایت اور مقصد انسان کی اس شے کی نشوونما اور پرورش ہے جس میں جسم کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا اور آگے بڑھنا ہے۔ یہ دو نظریئے ہیں۔

انسان غلط کاریوں سے، جرائم سے، سرکشیوں سے اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ اس دوسرے نظریئے پر اس کو ایمان ہو کہ سوسائٹی کی گرفت میں آ سکے یا نہ آ سکے اس کے ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہو کر رہنا ہے۔ یہ ہے دوسرا نظریہ جو آج میں نے کہا تھا دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اتنے جرائم عام ہو رہے ہیں اور کسی سے کنٹرول ہی نہیں کیا جاتا، بڑی سے بڑی ایسی سوسائٹی بھی جو Perfection کے قریب بھی پہنچی ہوئی ہو، وہ بھی اپنے ہاں احتساب اور عدل کا کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکی جو جرائم کو کسی طرح سے ختم کر سکے بلکہ روک بھی سکے۔ اس لیے کہ یہ نظریہ حیات ہے نہیں۔ جو نظریہ زندگی اس جسم کی پرورش کے لیے ہے آپ اس کے مطابق جس طریق سے بھی سامانِ عیش ونشاط حاصل کر سکتے ہیں، آپ کرتے چلے جایئے تو کون سی چیز ہے جو آپ کو روک دے گی؟ کوئی بھی نہیں۔

وحی کی بنیادی اقدار اور سوسائٹی کے قوانین کی نوعیت

عزیزانِ من! اس ابتدائی چیز کو ذہن میں رکھیے۔ اب آیئے قرآن کی طرف۔ کہا کہ ان سے پوچھیے کہ یہ جو بلند اقدار ہیں جنہیں Values کہا جاتا ہے یہ حق اور باطل میں امتیاز کرتی ہیں۔ اب پھر میں آپ کو سمجھا دوں کہ جسے ہم یہ Value (اقدار) کہتے ہیں، وہ ہوتا کیا ہے۔ کئی دفعہ میں یہ مثال دے چکا ہوں۔ وہ چونکہ بڑی عام فہم سی مثال ہے، اسی کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ بیل اپنے گاؤں سے باہر جاتا ہے، بھوکا ہوتا ہے، جو کھیت سب سے پہلے اس کے سامنے آتا ہے وہ اس میں سے چرنے لگ جاتا ہے، اس کا سارا مسئلہ اپنی بھوک اور یہ چارہ ہے۔ یہ اس کے اپنے مالک کا ہے یا کسی دوسرے کا ہے، اُسے اس سے غرض ہی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اگر کہیں اس کھیت والا ہے، وہ آیا اور اس نے اسے پانچ سات ڈنڈے مارے اور وہ بیل وہاں سے بھاگ لیا بس یہ ہے سارا کچھ۔ آج دنیا میں انسانوں کا مسئلہ اتنا ہی ہے کہ انسان نکلتا ہے اسے ہوس ہوتی ہے، جو چیز سامنے پڑی ہوئی ہے وہ اس پر جھپٹتا ہے۔ اگر مالک کہیں ہے یا وہ ڈنڈے والا سپاہی کھڑا ہے، تو اس نے دو چار ڈنڈے مار دیئے، اگر نہیں ہے تو بس بیل کی طرح، اپنی ہوس پوری کر لی۔ یہ سارا ہی یہ کچھ تصور ہے۔ انسان کا تصور یہ ہے کہ یہ اگر گھر سے نکلے، اس کو بھی بھوک لگی ہوئی ہو، باہر جائے، اب یہ جو تمیز کرنا ہے کہ یہ میرا کھیت ہے، مجھے اس میں سے لینا چاہیے، یہ غیر کا کھیت ہے، اس میں سے مجھے نہیں لینا چاہیئے، یہ جو امتیاز ہے یہ ہے جسے Value (قدر) کہتے ہیں۔ حیوانات کی زندگی میں یہ نہیں ہوتی۔ انسانوں کی زندگی کے اندر بھی اگر یہ تصور، یہ ایمان نہ ہو، یہ اندر والا Value نہ ہو تو وہ وہی کچھ کرتا ہے جو بیل کرتا ہے۔ مہذب سے مہذب سوسائٹی میں بھی Value (قدر) نہیں ہوتی، سوسائٹی کے قانون ہوتے ہیں، سوسائٹی نے قانون بنا دیا مثلاً

Keep to the left ❶ سوسائٹی کا قانون ہے' یہ Value (قدر) نہیں ہے۔ اس قانون کا اتباع کرنے والا کسی Value (قدر) کی پرورش نہیں کررہا' سوسائٹی کے ایک قانون کو مان رہا ہے۔ سوسائٹی کل کہہ دے کہ Keep to the right ❷ تو وہ Keep to the right کرنے لگ جائے گا۔ Value (قدر) یہ چیز نہیں ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ دوسرے کے کھیت سے پھل توڑنا ناجائز ہے' یہ ناجائز رہے گا۔ سوسائٹیاں بدلتی رہیں' حکومتیں آتی رہیں' حکومتیں جاتی رہیں' یہ ناجائز جائز نہیں ہوسکتا۔ اسے Permanent value (مستقل قدر) کہتے ہیں۔ یہ Value (قدر) سوسائٹی نہیں دے سکتی' سوسائٹی میں تو ہر صاحب اقتدار کے بدلنے کے ساتھ قانون بدلتے ہیں' ہر حکومت بدلنے کے ساتھ قانون بدلتے ہیں' Wills (خواہشات) کے اوپر قانون ہوتے ہیں۔ Values (اقدار) Permanent (مستقل) ہوتی ہیں' سوسائٹی کا قانون اور چیز ہے' وہ Value (قدر) نہیں ہوتا۔

انسانی زندگی اپنے اندر ایک عظیم مقصد لیے ہوئے ہے

آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم میں کس قدر ربط ہے! کہا کہ اے رسول! ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد' ان مخالفین سے پوچھو کہ **اَفَحَسِبْتُمْ** (23:115) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ **اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا** (23:115) ہم نے تمہیں بلاغرض وغایت پیدا کردیا۔ یہ ہے صاحبِ کفر اور صاحبِ ایمان میں نکتہ امتیاز۔ اگر یہ چیز ہے کہ ہم By chance (اتفاقیہ) اس دنیا میں آگئے' اب قانونِ طبعی کے مطابق ہم نے زندہ رہنا ہے' اسی کی رو سے ایک دن مرجانا ہے' زندگی کا خاتمہ ہوجانا ہے تو یہ زندگی عبث ہوگئی۔ قرآن کہتا ہے کہ زندگی عبث نہیں ہے۔

عربوں کے ہاں ''عبث'' کا مفہوم

بات یہ ہے کہ ''عبث'' کے معنی ہی ''بےغرض وغایت'' ہوتا ہے۔ یہیں سے یہ جو عرب تھے' یہ مویشیوں کے گلہ کو جس کے اوپر گڈریا نہ ہو اور ان کا راستہ متعین نہ ہو' وہ جس طرح سے اِدھر اُدھر پھرتے ہیں وہ اسے ''عبث'' کہتے ہیں۔ ❸ مگر ایک متعین نصب العین سامنے ہو اور آپ کا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہو' تو یہ ہے جسے آپ کہیں گے کہ ہم مقصد کی طرف جارہے ہیں' ایک غایت ہے۔ عربی

---

❶ بائیں طرف چلو۔

❷ دائیں طرف چلو۔

❸ تاج العروس' المفردات فی غریب القرآن اور محیط المحیط میں ہے کہ عرب عَبِيْثَةُ النَّاس مختلف قبائل کے ملے جلے لوگوں کو کہتے تھے جو ایک جدِ اعلیٰ کی اولاد نہ ہوں اور اَلْعَبِيْثَةُ ''ملی جلی بکریوں'' کو کہتے تھے۔ اس طرح اَلْعَبَثُ کے معنی ''غیر مفید کام'' کے ہیں یعنی وہ کام جس سے غرض وغایت مطلوب نہ ہو (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔1119)۔

زبان میں آخری مقام جہاں پہنچنا ہے' ہم نے متعین کیا ہو' اور قدم اس کی طرف اٹھیں تو اسے توحق کہا جائے گا اور اگر یہ چیز نہیں ہے یعنی متعین نصب العین کوئی نہیں ہے' کوئی Destination (منزل) نہیں ہے' کوئی Pupose' (مقصد) کوئی Goal (نصب العین) نہیں ہے' تو ساری عمر آپ پھرتے رہیے۔ یہ سفر نہیں ہے آوارگی ہوگا۔ سفر اور آوارگی میں تو فرق ہی یہی ہے کہ آوارہ پھرنے والا تو سفر کرنے والے سے شام تک دگنا فاصلہ طے کر لیتا ہے لیکن پوچھیے کہ وہ شام کو پہنچتا کہاں ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ عبث کے یہ معنی ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کر دیا ہے۔ **وَ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ** (23:115) اور تمہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔ یعنی پھر پھرا کے بھی جہاں تمہارا جی چاہے نکل جاؤ گے' اور تمہیں کوئی پکڑنے والا' پوچھنے والا نہیں ہے۔ کیا تم یہ سمجھ رہے تھے؟ اس لیے یہ کچھ کہا کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض وغایت اور بلا مقصد ومنزل پیدا کر دیا ہے' تم اتفاقیہ دنیا میں آ گئے' کچھ دن زندہ رہے' پھر خاک میں مل گئے اور زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا' اسی لیے جو کچھ تمہارا جی چاہے کرتے رہو' تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں؟ اور تم پر ہمارے قانونِ مکافات کی گرفت ہی نہیں؟ تمہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے ہماری طرف آنا ہی نہیں؟ میں نے قرآن کی رو سے یہ دو نظریات پیش کیے ہیں۔ اس کے متعلق تو بے شمار آیات ہیں جو پیش کی جا سکتی ہیں لیکن حوالوں کی غرض سے آپ دو دو چار چار آیتیں تو ضرور اس میں نقل کر لیجیے۔ پہلے تو خود کائنات کے متعلق دیکھو کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہا کہ **وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا** (38:27) ہم نے اس کائنات کو' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو بے غرض وغایت پیدا نہیں کیا۔ دیکھیے' یہ جسے آپ باطل کہتے ہیں وہ یہاں آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو پھر یہ Concepts (تصورات) ذہنوں میں بدل جاتے ہیں اور یہ وہ بنتا ہے جسے ہم باطل پرست کہتے ہیں اور باطل کے معنی ہی کچھ اور ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ قرآن کہہ کیا رہا ہے؟ یہ کہ ہم نے اسے بے غرض وغایت نہیں پیدا کر دیا۔ ہم نے جو پیدا کیا ہے اس کے Behind (پسِ پشت) ایک مقصد' ایک غایت' ایک Purpose رکھا ہے۔

انیسویں صدی میں عیسائیت کے خلاف یورپ کے ردِّعمل کی وجہ جواز

آگے سنیے۔ کہا کہ **ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** (38:27) ایک تو یہ بات کہ یہ سمجھنا کہ کائنات بے غرض وغایت ہے' یہ علم کی بات نہیں ہے' سیاسی بات ہے۔ علم کی بارگاہ سے پوچھیے' وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ یہ اتنی عظیم کارگہ کائنات یونہی الل ٹپ' یونہی بائی چانس وجود میں

---

❶ اپنے آپ کو فخر سے بڑا ثابت کرنا۔

آ گئی اور بائی چانس چل رہی ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ میں جب سے ردّعمل شروع ہوا ہے' وہ اصل میں ان کا ردّعمل عیسائیت کے خلاف تھا کہ جہاں قیاس ہی قیاس ہے۔ وہ تو کائنات کی ابتدا کے متعلق تاریخ بھی مقرر کرتے تھے کہ کائنات تین ہزار نو سو اتنے سال مسیح سے پہلے وجود میں آئی۔ یہ تورات میں ہے وہاں جو پادری تھے انہوں نے یہ بات کہی کہ وہ حضرت مسیح سے تین ہزار نو سو اکتالیس سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ کہا کہ ستائیس اکتوبر' تین ہزار نو سو اکتالیس کہیئے یہ بڑا ''بڑکپن''[1] تھا۔ وہیں سے انہوں نے اپنا رخ بدلا اور اس کے بعد یہ سائنس کے اوپر آئے۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ وہاں سے ان کا جو ردّعمل شروع ہوا ہے تو انہوں نے سب کچھ لپیٹ کر پھینک دیا ہے۔ جب مذہب کے خلاف ردّعمل ہوتا ہے تو اس میں پھر انسان ساری چیزیں' یہ خدا اور وحی اور رسول' سب کچھ پھینک دیتا ہے تو وہاں یہ بات ہوئی کہ کسی طرح یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ انہوں نے پوچھا پھر یہ کیسے آئے؟ انہوں نے کہا کہ یہ کیسے کا ہمیں پتہ نہیں ہے' یہ سلسلہ کسی طرح وجود میں آ گیا اور چل رہا ہے۔ اب وہی یورپ اس کے اوپر آ رہا ہے کہ نہیں اس کے Behind (پیچھے) کوئی Pupose (مقصد) ہے۔ یہ بات لمبی ہو جائے گی کہ میں ان کے سینکڑوں نظریات وتصورات پیش کردوں۔ اب ان کی یہ چیزیں ہیں' ان میں دن بدن تو پوچھو نہیں کتنا زیادہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کہا کہ ان سے کائنات کے متعلق پوچھیے کہ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (38:27) یہ ظن ہے' علم نہیں ہے' یہ کفر ہے ایمان نہیں ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کفر کس بات کو کہا گیا ہے۔ یہاں کائنات کو بے مقصد ماننا کفر ہے۔ یہاں تو نفی کی گئی اور دوسری جگہ الحق کی رو سے یہ کہا گیا کہ یاد رکھو خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ[2] (29:44)۔ وہاں کہا تھا کہ باطل پیدا نہیں کیا' یہاں کہا کہ بالحق پیدا کیا۔ اب حق کے معنی آپ کے سامنے آ گئے: متعین نصب العین' غرض اور غایت اور Purpose اور Goal۔ یہ چیز اگر متعین طور پہ ہو تو وہ تو الحق ہے اور پھر صرف حق نہیں' یہ الحق ہے۔ الحق کے معنی ہیں The Truth یعنی صرف وہی حق ہوتا ہے۔ یہ لفظ حق تو آپ کے ہاں مختلف معنی میں استعمال ہو گا لیکن جب الحق ہو گا تو یہ وہ ہو گا جسے خدا نے حق قرار دیا ہے وہ غرض وغایت کہ جسے خدا نے متعین کیا ہے۔ کہا کہ یہ ہے جس کے لیے یہ کائنات وجود میں آئی۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ یہ یونہی کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد وغایت پیدا نہیں کی گئی۔

تخلیقِ کائنات کا اصل مقصد اور اس کی غرض وغایت

اس ارض وسما کی غرض وغایت کے متعلق تو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پہ بہت کچھ کہا ہے لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے' یہ عظیم چیز ہے' عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے سائنٹسٹ کا بھی اور ریسرچ اسکالر کا بھی رخ ابھی اس طرف تو آیا ہی نہیں ہے۔ کہا تھا کہ

---

[1] اپنے آپ کو فخر سے بڑا ثابت کرنا۔

[2] خدا نے اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر پیدا کیا ہے جس کا ایک خاص مقصد ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔920)۔

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22)۔اب قرآن حق کی تشریح کی طرف آیا۔کہا کہ ہم نے اس کائنات کو اس کارگہہ ارض وسما کو اس محیر العقول مشینری کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس کارگہہ کائنات کی یہ عظیم محیر العقول مشینری کاہے کے لیے سرگرمِ عمل ہے؟ خود ہی اس کا جواب یہ دیا کہ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) اس لیے ہے کہ ہر فرد کو اس کے عمل کا نتیجہ مل کر رہے اور کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ یہ ساری کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہے۔

عزیزانِ من! سوچیے کہ یہ قرآن کیا کتاب ہے۔کہا کہ یہ سارا سلسلہ کائنات اس کے لیے سرگرمِ عمل ہے کہ کسی فرد کا کوئی عمل بغیر نتیجہ برآمد ہوئے نہ رہ سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر روٹی تیرے ہاتھ میں آئے' تو تو اقدار (Values) سے غافل ہو کر اس کو نہ کھا۔آپ اندازہ لگائیے کہ بالحق کی یہ کیا خوب تشریح ہو رہی ہے۔الحق یہ ہے کہ کائنات کی پوری مشینری اس مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہے کہ کسی فرد کا کوئی عمل بغیر نتیجہ برآمد کیے نہ رہ سکے۔ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) اور کسی پہ زیادتی نہ ہو۔ عزیزانِ من! اس کا نام ہے نظامِ خداوندی۔آپ نے دیکھا کہ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔

یہ پوری کی پوری کائنات انسانی اعمال کے نتائج کو ہی مرتب کرنے میں مصروف کار ہے

اب اس کائنات کے اندر انسان آیا۔آپ پہلے اس عظیم کائنات کو دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ یہ پوری کائنات اس مقصد کے لیے ہے کہ وہ انسان کے اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔پھر انسان سے کہا کہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (23:115) کائنات تو بالحق ہے' تمہارے اعمال کے نتیجہ خیز کرنے کے لیے عمل میں آئی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تم بلا غرض و غایت پیدا کر دیئے گئے ہو اَفَحَسِبْتُمْ (23:115) تم یہ خیال کرتے ہو۔یہاں (23:14) میں تو عبث کہا۔دوسری جگہ بڑا ہی دلچسپ لفظ آیا ہے۔کیا لفظ ہے یہ! کہا کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (75:36) کیا انسان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسے ''سدیٰ'' چھوڑ دیا جائے گا۔آپ کو معلوم ہے کہ وہ سامنے کیا بات یا کیا چیز ہے؟ وہ ہے مقصد' غرض و غایت۔

یہ جو کپڑا بنا جاتا ہے' اس میں پہلے ہی وہ جولاہا تانی تنتا ہے۔اس تانی بننے کے لیے سوت کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر لے جاتے ہیں۔ یہ تانی ہوتی ہے' اسی کا وہ تانا ہوتا ہے جو وہ پھریوں پٹی پہ لے آتے ہیں اور وہاں پھر یہ تانا کہلاتا ہے۔ یہ نہایت عمدہ تاگا ہوتا ہے۔وہ صاف ستھری پٹی پہ بڑی عمدہ شکل میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ کپڑا بن گیا؟ نہیں' اس کے اندر ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے جسے بانا کہتے ہیں۔عرب خالی تانا تنتے رہنے کو ''سدیٰ'' کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ تم یہ سمجھے ہو کہ انسان کی

سرگرمیاں یہ ہیں کہ بس وہ تانا ہی تانا تنتا رہے' اس میں بانا کبھی نہیں آئے' پھر تو اس جولاہے کی کھڈی سے کپڑا نہیں بنتا۔ ❶ یہ تانے اور بانے کا امتزاج ہے جس سے یہ مقصد (ثوب یعنی کپڑا) حاصل ہوتا ہے۔ یہ طبعی زندگی ہے جس کی مفاد پرستیوں کو' اس کے سارے اسباب وذرائع کو' بارِ خداوندی کے بانے کے اندر رکھنا ہے۔ اس سے ثوب بنتا ہے۔ ثوب سے ہی تو ثواب ہے۔ ثوب کپڑے کو کہتے ہیں۔ اب آپ سمجھے کہ ثواب کیا ہے؟ یہ بنا ہوا کپڑا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ تانا ہی سمجھے' ہمارے ہاں ساری عمر تانا ہی سمجھے ہو' تانا ہی تنا تا کہ ثوب یعنی کپڑا بن جائے۔ ❷ اپنے ہاں دیکھ لیجیے گا مختلف کھڈیاں کو' ایوانات حکومت کے اندر اور کامرس کے اندر لگی ہوئی ہیں۔ یہ تانے ہی تانے ہیں۔ مساجد اور خانقاہوں کے اندر' ان کے ذہن کے مطابق' بانا ہی بانا ہے۔ اُس سے مساجد میں یہاں کپڑا بنا جاتا ہے اور وہاں خانقاہوں میں کپڑا بنا جاتا ہے۔ ثواب کیسے ہوگا؟ ثوب کیسے بنے گا؟ اس کے لیے تو تانا اور بانا ضروری ہے۔ اس طرح سے ثواب حاصل کرنا تو اس لفظ کی توہین ہے۔ اب سوچ لیا جو کہتے ہیں کہ جی ثواب ہوندا اے ایہدا۔ ہوندا اے ثواب خالی بانے تے' خالی تانے نال؟ کسے جولاہے کولوں پوچھ کے دیکھ لوو۔ تہانوں نہیں پتہ تے سن لو ساڈے کولوں۔ اس کو قرآن کا معجزہ کہتے ہیں۔ ❸

عزیزانِ من! قرآن کا انداز یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے اس اونٹ چرانے والے بدو کو ''سدی'' سمجھ میں آجائے اور آج کے بڑے بڑے سائنٹسٹ کی سمجھ میں بات بھی آجائے۔ کہا کہ یہ سمجھتے ہو کہ کبھی خالی تانے کو زندگی سمجھ لی' کبھی بانے کو زندگی سمجھ لی۔ سنو' یہ غلط ہے' یہ عبث ہے اور پوچھا کہ یہ جو زندگی ہے اس کے متعلق تمہارا تصور کیا ہے؟ آج کا تصور یہ ہے کہ انسان اتفاق سے دنیا میں آگیا ہے اور اس میں ٹائم کا سوال ہوتا ہے' وقت گزر جاتا ہے' زمانے کی گردش یہ ہے۔ آپ کے ہاں یہ وہی اصطلاحیں ہیں۔ پھر ٹائم کی چیز آجاتی ہے۔

---

❶ اَلسَّدیٰ کپڑے کے تانے کو کہتے ہیں۔ قَدْ اَسْدَیٰ الثَّوْبَ وَسَدَّاہُ اس نے کپڑے کا تانا سیدھا کر دیا۔ اَلسُّدَیٰ وہ اونٹ جنہیں بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جدھر جی چاہے خود ہی منہ اٹھائے چرتے پھریں (تاج العروس)۔ ذَھَبَ کَلَامُہٗ سُدًی اس کی بات بیکار چلی گئی (محیط المحیط)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سُدًی کے معنی کسی چیز کو بے قید چھوڑ دینا اور جدھر اس کا منہ اٹھے اُدھر چلنے جانا ہیں۔ خلیل نے کہا ہے کہ سَدْوٌ بچوں کے گولیوں اور اخروٹوں سے کھیلنے پر بولا جاتا ہے جس میں وہ چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتے اور چھوڑ دیتے ہیں۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔864)

❷ تاریخ عالم پہ نگاہ ڈالیے۔ انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ یا تنہا تانا تھا یا تنہا بانا۔ وہ کبھی ''روحانیت'' حاصل کرنے کے لیے خانقاہوں' تجردگاہوں اور سمادھیوں کی طرف چلا گیا اور کبھی خالص دنیادار بن کر حکومت وسلطنت کی طرف آگیا۔ اس نے روح اور مادہ آتما اور پراکرتی' دین اور دنیا' مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ یا وہ تانا رہیں یا بانا' وہ ثوب (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں۔

❸ جی! اس کا ثواب ہوتا ہے۔ کیا صرف تانے یا صرف بانے سے ''ثواب'' ہوتا ہے؟ اور کسی سے نہیں تو کسی جولاہے سے ہی پوچھ لو۔ آپ کو معلوم نہیں تو ہم سے سن رکھو' اسے قرآن کا معجزہ کہتے ہیں۔

یہ ہمارے ہاں نئی بات نہیں ہے کہ زمانہ ہے یعنی وہ جسے اب عمر کہتے ہیں، وہی چیز ٹائم بھی زمانہ بھی ہوگئی کہ بالآخر آدمی پچھتر سال جی لے سو سال جی لے سوا سو سال جی لے جتنا جی چاہے لمبا وقت ہو جائے، آخر اس کے بعد پھر موت آ جاتی ہے۔ یہ جو تصور ہے کہ وہ عمر اس طرح سے ماپی جائے اور آخر میں وہ ختم ہو جائے یہ ہے جسے زمانہ یا ٹائم کا تصور کہتے ہیں کہ زمانہ انسان کو مار دیتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں ہے، بہت پرانی بات ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب میں بھی یہ تصور تھا۔ کہا کہ **وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا** (45:24) یہ کہتے یہ ہیں کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے، بس طبعی زندگی ہے۔ **نَمُوْتُ وَ نَحْیَا** (45:24) انسان پیدا ہوتا ہے، طبعی قوانین کے مطابق پیدا ہوتا ہے، اسی کے مطابق مر مرا جاتا ہے۔ **وَ مَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ** (45:24) بس یہ تو زمانہ ہے، زمانے کی گردش ہے، جس سے انسان ختم ہو جاتا ہے۔ طبعی زندگی کے علاوہ انسان کی کوئی اور زندگی نہیں۔ اس پر کہا کہ **وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ** (45:24) محض عقیدے کی رو سے بات نہیں کرتا۔ کہا کہ جب علم کی بارگاہ میں یہ لوگ آئیں گے تو یہ خود اس خیال کو چھوڑ دیں گے۔

انسان کی موجودہ زندگی نظریہ ارتقا کی ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہے

انسان صرف اس کے طبعی جسم (Physical Body) سے عبارت نہیں ہے جس کے ختم ہو جانے سے خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ محض حیوانی سطح زندگی ہے۔ سائیکولوجی انسان کے متعلق ایک سائنس ہے۔ وہ ایک ہی جنریشن [1] میں اس نتیجے پہ پہنچ گئی ہے کہ جسم انسانی کے مرنے سے انسان مرتا نہیں ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہ Survival (بقا) تک تو پہنچ گئے ہیں اور پچاس سال میں نظریہ ارتقا کے بنیادی اصولوں کے متعلق بہت مختلف اور متضاد تصورات پیش ہو چکے ہیں۔ دو شاگرد ہیں جن سے دو گروہ [2] بنے۔ جونز وغیرہ [3] Survival تک پہنچ چکے ہیں مگر وہ ابھی تک بقائے نفس تک نہیں پہنچے۔ اس بات کی تردید تو آج ہو رہی ہے کہ نہیں، باہر سے انسان مرتا

---

[1] قریباً پچاس سال کا عرصہ

[2] ایک گروہ کا نام Rationalist ہے۔ اس مکتب فکر کو عام طور پر Aristotelian-Kantian یعنی ''ارسطو کانٹ'' گروہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے گروہ کا نام Empiricists ہے۔ یہ مکتب فکر Platonic-Hegelian یعنی ''افلاطون ہیگل'' کے نام سے متعارف ہے۔ ان دونوں گروہوں میں بڑی شدید بحث چلی آتی ہے۔

[3] یہ مانچسٹر یونیورسٹی کا اناٹومی کا پروفیسر F.W. Jones ہے۔ اس کی کتاب کا نام Design and Purpose ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع پر شرح وبسط سے گفتگو کرتا ہے کہ کائنات میں کس طرح وحدت نظم (Monism of Order) موجود ہے اور یہ تمام کائنات کس طرح ایک سوچی سمجھی ہوئی تدبیر (Plan) کے تحت سرگرم عمل ہے۔ اس موضوع پر The Great Design بہت عمدہ روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات عجیب و غریب نظم وضبط کے ماتحت جاری وساری ہے۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز Design کے مطابق ہو رہا ہے جس میں کہیں کوئی سقم نہیں، کوئی جھول نہیں، کوئی دراڑ نہیں، کوئی سلوٹ نہیں۔ یہ سلسلہ ایک مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا ہے۔ پال (Leslie Paul) اپنی کتاب The Meaning of Human Exsistance میں اس پر شرح وبسط سے (Srruggle) جدوجہد، Dynamic اور ایک خاص سمت (Direction) کے حوالے سے بات کرتا ہے (ماخوذ از پرویزؒ: انسان کے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام کراچی، 1956، ص ص۔ 111 تا 113)۔

نہیں ہے۔ باہر کے متعلق برگسان [1] نے تحقیق کے بعد جو نئے نظریئے پیش کیے ہیں ان سے اس نے تو ٹائم کا تصور ہی بدل کر رکھ دیا لیکن وہ اس درس کی بات نہیں' معاف رکھیے گا وہ کلاس میں نصاب کی طرح پڑھانے کی بات ہے۔ یہ جو زندگی ہے وہ قرآن کے نظریہ حیات کی رو سے ایک نئے سلسلہ ارتقا کا آغاز ہے۔ یہاں سابقہ سلسلہ ارتقا کی کڑیاں آخری کڑی ہیں' جو محض طبعی یا فزیکل قوانین کے تابع چلتی تھی اب یہ ایک نئے سلسلہ ارتقا کی پہلی کڑی کا آغاز ہے۔ جب میں وہاں آؤں گا تو بتاؤں گا کہ لفظ آخرت کے معنی یہ ہیں کہ یہ پچھلی کڑیوں کا اختتام ہے اور نئی کڑی کا آغاز ہے۔ یہاں سے تو ایک نئی قسم کی Evolution (ارتقا) شروع ہوتی ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو Evolutionists ہیں یعنی جو مغرب کے نظریہ ارتقا کے قائل ہیں' انہوں نے ڈارون [2] کی اس کی تھیوری کی تردید کر دی ہے جو اس کو آخری کڑی کہتا تھا۔ اب وہ خود اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اس کے بعد یہ ایک نیا سلسلہ ارتقا شروع ہو رہا ہے اور وہ فزیکل لاء (طبعی قانون) کے تابع نہیں ہے۔ یہ تو ایک نئی زندگی ہے جس کا آغاز یہاں سے شروع ہو رہا ہے۔

ہماری یہ تمام تر زندگی جہانِ فردا کی زندگی کا دیباچہ ہے

عجیب عجیب انداز میں' یہ ہمارا اس دور کا قرآن کا مبصر' [3] جسے اللہ تعالیٰ نے اتنی فراست عطا کی تھی' بڑے حسین انداز میں بات سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

---

[1] برگسان کہتا ہے کہ حافظہ مادہ کی تخلیق ہے ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ روح ایک ایسی چیز کا نام ہے جو منتشر (Decompose) نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ مرکب نہیں' بسیط (Simple) ہے۔ یہ Incorruptible ہے اس لیے کہ یہ غیر منقسم (Indivisible) ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے ناقابل فنا (Immortal) ہے۔ حوالہ: The Two Sources of Morality and Religion, P.251

یاد رہے کہ انسان کے اندر جو چیز طبعی جسم سے ماورا ہے' اُسے مختلف اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً انسانی نفس (Self) یا انا (I) یا ایغو (Ego) یا انفرادیت (Individuality) یا ذات (Personality)- نام مختلف ہیں' بات ایک ہی ہے۔ انسانی جسم ہر آن بدلتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد سابقہ جسم کی جگہ ایک بالکل نیا جسم وجود میں آجاتا ہے اور یہ سلسلہ تغیر و تبدل مسلسل جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ انسان کی ''میں (I-am-ness)'' ہے۔ ''میں'' غیر متبدل رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی (Change) کے معنی یہ ہیں کہ جس شے میں تغیر واقع ہوتا ہے اس کی پہلی حالت یکسر معدوم ہو جاتی ہے یعنی It ceases to exist اور اس کے بعد وہ شے از سر نو ایک نئی حالت میں پیدا ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی خصوصیت برگسان کے الفاظ میں یہ ہے کہ

We change without ceasing (ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر) (ماخوذ از پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام کراچی' 1956' ص ص-87 تا 90)۔

[2] Darwin, Charles Robert (1809-82)

[3] یہ اشارہ مفکر قرآن سر ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

زمیں خاک در میخانہ ما

یہ زمین تو ہمارے میخانہ کے دروازے کی مٹی ہے اور

فلک یک گردش پیمانہ ما

کائنات کا یہ آسمان ہمارے پیمانے کی ایک گردش ہے۔اس کے بعد یہ ہے وہ بات' جو وہ کہہ گیا ہے:

حدیث سوز و ساز ما

جہاں دیباچہ افسانہ ما

ہمارا جو اصلی افسانہ ہے' جو اصلی زندگی کی کہانی ہے' اس دنیا کی یہ ساری زندگی تو اس کا دیباچہ ہے۔یہ بات یہی کہہ سکتا تھا۔دیباچہ ہی پڑھتے رہیے' جو کتاب ہے اس کو کہیں پھینک دیجیے تو اصلی زندگی کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔یہاں ''دیباچہ افسانہ'' بڑی عمدہ تشبیہ ہے۔یہاں کا جو مقصد بتایا گیا وہ وہی ہے جو اس نے کہا ہے جہاں ویلیوز آتی ہیں۔عزیزانِ من! وہ بات بڑی لمبی ہے لیکن دو لفظوں میں قرآن یہ بتا گیا۔آؤ تمہیں بتائیں۔مقصدِ حیات وہ شے ہے جسے میں نے کہا ہے کہ قرآن نے اسے نفس کہہ کر پکارا ہے۔یاد رکھیے گا وہ نَفس ہے' نَفَس نہیں ہے عربی زبان میں فرق ہے۔نَفَس سانس کو کہتے ہیں اور نفس وہ شے ہے جسے میں نے کہا ہے کہ وہ طبعی جسم کے ساتھ مرتا نہیں ہے۔بس یوں سمجھ لیجیے کہ اب اس زندگی میں مقصد حیات جو ہے وہ اس شے کی نشو ونما ہے۔

قرآنی الفاظ افلح اور فلاحت کی تشبیہات کا مفہوم

اب ہماری موجودہ زندگی کی غایت اس شے یعنی نفس' ذات کی نشو ونما ہوئی جس نے طبعی جسم کے مرنے کے ساتھ مرنا نہیں' اور جس نے اگلی ارتقائی منزل کی پہلی کڑی بن کر آگے چلنا ہے۔یوں سمجھ لیجیے کہ بس اس شے کی نشو ونما کرنا ہے۔یہ بات نظری یا Theoretical رہ جائے گی اور یہ پریکٹیکل خدا کی مقرر کی ہوئی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے بنے گی۔اس سے خود بخود اس کی نشو ونما ہوتی جاتی ہے۔اب یہ بات نظری نہیں رہی' عملی ہو گئی' وہ اقدار قرآن کے اندر آ گئیں اور اسی لیے یہ کہا کہ **قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا**[1] (91:9-10)۔بس یہ ہے جی ایک ایک لفظ میں سارا پروگرام۔اگر اس کی تشریح کروں تو کئی درس آ جائیں۔

تشبیہات ملاحظہ فرمائیے صاحب! ایک ہے افلح۔اس سے فلاحت ہے' فلاحت کھیتی باڑی کو کہتے ہیں۔قرآن کی تشبیہ ایک ایک

---

[1] اس کی مفصل تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص۔454 تا 465۔

لفظ میں تو ہوتی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ اس میں کس قدر غایات و معانی ہوتے ہیں جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ تشبیہ ہی وہ کھیتی سے دیتا ہے۔ آپ ساری چیز اس کے اندر دیکھیے: مٹی پانی ہوا روشنی اور اس میں ایک بیج۔ صالح بیج پہ آج کل کتنا زور دیا جا رہا ہے۔ دیکھ رہے ہیں ٹی وی کے اوپر، ریڈیو کے اوپر، اشتہارات کے اوپر، فلاں جگہ سے بیج منگایا ہے، فلاں جگہ سے بیج لیجیے۔ دار و مدار ہی سارا اس پہ ہے کہ بیج صالح ہو ورنہ یہ مٹی پانی سب کچھ آپ مہیا کر لیجیے، اس میں بیج نہ ڈالیے ''تے کردے رہو گوڈی صبح و شام، گل جاوے گا ❶ او بیج''۔ کہا کہ ساری مادی زندگی کے لیے یہ بڑا ضروری ہے یعنی یہ اس بیج کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ افلح کے معنی ہوتا ہے کھیتی پروان چڑھنا ''دانے گھر اوہدے اون گے۔ ❷'' یہ دیکھیے قرآن کہتا ہے کہ مَنۡ زَكّٰىهَا (91:9) صالح بیج کی جس نے نشوونما کر لی، اس کی کھیتی پروان چڑھے گی اور اسی تشبیہ کے مطابق آگے کہا کہ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا (91:10)۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیج بھی اس کے پاس ہے یہ دوسری چیزیں بھی ہیں لیکن ''دسہا'' ہو جاتا ہے۔ اب یہ کھیتی باڑی کرنے والے پہچانیں گے اور بتائیں گے۔ اگر موٹا سارا ڈھیلا کسی بیج کے اوپر آ جائے، وہ جو بیج اندر ہوتا ہے پوچھو تو سہی اس بیچارے کے پاس قوت کون سی ہوتی ہے جو وہ شگوفہ مٹی کے ڈھیلے کے نیچے سے نکل آئے۔ اس شگوفے نے مٹی کے اوپر آنا ہے، مٹی کو پھاڑ کر اوپر آنا ہے، اس کے لیے اس میں اتنی قوت ہونی چاہیے اور مٹی اتنی نرم ہونی چاہیے۔ یہ جو ہر چوتھے دن آ کر گوڈی کر دیتے ہیں، وہ کرتے کیا ہیں؟ اس کے اوپر سے مٹی کو نرم کرتے ہیں۔ اگر اتنا بڑا مٹی کا ڈھیلا آ جائے تو وہ نرم و نازک شگوفہ دب جاتا ہے۔ اگر مادی زندگی کے مٹی کے اتنے وزنی ڈھیلے آپ اوپر رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ اگتا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے مٹی ضروری ہے لیکن وہ اتنی نرم ہونی چاہیے کہ یہ اس میں سے سرفرازیوں سے اس کے اوپر آ جائے اور اگر یہ اس مٹی سے دب گیا تو پھر یہ جو اس کسان کی ساری محنت ہے وہ بے کار جاتی ہے۔ تو جو اس مادی زندگی کا مقصد حیات ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ یہ جو میں نے زراعت کی تشبیہ میں عرض کیا ہے: مٹی پانی ہوا روشنی، یہی مادیت، اس سب کی غایت ہے اور مقصد اس بیج کی نشوونما کرنا ہے۔ ان مٹی، پانی، ہوا، اور روشنی کو کہا کہ یہ بڑھانا اور پھر اس بیج کو فصل بنا دینا۔ اس مادی زندگی کی، اس جسمانی زندگی کی، اس طبعی زندگی کی یہ غرض و غایت ہے، یہ مقصود ہے۔ اب پھر وہی آگے آ گیا اقبالؒ (1877-1938)۔ کس کس انداز سے یہ شخص معنی بیان کر جاتا ہے! کہتا ہے کہ

---

❶ صبح شام گوڈی کرتے رہیے وہ بیج ہی گل سڑ جائے گا۔

❷ اس کے گھر اناج آئے گا۔

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

اگر کہو گے کہ صاحب! یہی زندگی ہے جس کے اندر ہم نے رہنا ہے اور یہیں ختم ہو جانا ہے۔ یہ چمن مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے۔ وہاں ''حدیث سوز وساز'' ❶ کہا تھا۔ اسی اعتبار سے یہاں ''آہ و نالہ'' کہا ہے۔ یہ ہے غرض وغایت اور جسے موت کہتے ہیں وہ کس طرح سے ہے؟ اس کے لیے کہا کہ تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ (67:1)۔ آپ دیکھیے انداز کیا ہے! ابتدا کس طرح سے ہو رہی ہے! پہلے تبارک کہا۔ اگر میں اس آیت کی تشریح میں چلا جاؤں گا تو وہ دیکھیے گھڑی تو بھاگ رہی ہے اور اِدھر سے شیخ صاحب ❷ ہیں کہ جن کا وہ ٹیپ ختم ہوتا جاتا ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ عرب ❸ برکت کے کیا معنی لیتے تھے۔ اس کے لیے دیکھیے کہ برسات کے دنوں میں جس طرح سے یہ سبزہ گھنا ہو کر سیاہ ہو جاتا ہے اُس افراط سے جب کوئی چیز اگتی ہو تو اسے برکت کہتے ہیں۔ اے جیہڑے کیندے سن کہ تل کے روٹی کھایا کرو' اللہ برکت پادیندا ہیگا۔ اے بات بڑی ہے ❹۔ کبھی بسم اللہ ❺ پہ آؤں گا تو میں عرض کروں گا۔ یہاں کہا ہے کہ تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ (67:1)۔ کائنات کا پورا کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ کہ یہ ایسے یہاں یہ چیزیں نشوونما پائیں جیسے برسات کے دنوں میں تمہاری سبزی اگتی ہے۔ یہ اس کے لیے ہے۔ یہ ملک اگی ہوئی کھیتی واسطے نہیں ہیگی۔ ❻ یہاں تو ابتدا اس کے لیے ہوتی ہے اور آگے کہا کہ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ (67:1) اس کا جو ''ملک'' ہے وہ دھاندلی کا نہیں۔ اس نے ہر شے کے لیے ایک قانون مقرر کر دیا ہے۔

---

❶ حدیث سوز وساز ما جہاں دیباچہ افسانۂ ما (اقبالؒ)

❷ یہ اشارہ شیخ عبدالحمید مرحوم کی طرف ہے جو دروس کو اس زمانے میں ٹیپ کیا کرتے تھے۔

❸ اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006' ص ص۔ 29 تا 96۔

❹ یہ جو کہا کرتے تھے کہ روٹی (چپاتی) تل کر کھایا کرو تو اللہ برکت ڈال دیتا ہے' یہ بڑی بات ہے۔

❺ اس کے لیے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ الفاتحہ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص۔ 73 تا 92)۔

❻ یہ ''ملک'' پیدا شدہ کھیتی کے لیے نہیں ہے۔

اس زندگی کے بعد موت جیسے حادثہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لیے ایک قانون مقرر کر دیا ہے حتیٰ کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ (67:2) زندگی ہے اور زندگی کے بعد موت ہے اور موت تو بڑا حادثہ گنا جاتا ہے۔ سب سے بڑا حادثہ انسان کی زندگی میں موت ہے۔ کہا کہ یہ موت کاہے کے لیے ہے؟ جواب میں کہا کہ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2) یہ دیکھنے کے لئے یہ ٹیسٹ کرنے کے لئے ہے کہ اب تم میں سے کس نے اس زندگی میں وہ اعمال کیے تھے جو اسے اگلی زندگی کے قابل بنا دیں اور اس میں اس کے لیے حسنِ عمل کی راہیں کھول دے۔ موت تو یہ دروازہ ہے اور ایک نئے راستے کا ہے ''لیبلوکم'' تا کہ تم اپنے آپ کو ٹیسٹ کر سکو کہ اس پوری زندگی میں' میں نے جو کچھ کیا تھا' اس نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ مجھ میں اگلی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ موت یہ ٹیسٹ کرنے کے لیے ہے۔ اگر اس میں اس زندگی کے اندر اتنی ارتکاز یعنی Crystalization 'سختی' جسے صلابت کہتے ہیں' پیدا ہوگئی ہے تو پھر آدمی موت سے مر نہیں سکتا۔ ٹیسٹ یہ ہے کہ موت مجھے مار دیتی ہے یا نہیں؟ اگر تمہارا جسم ہی جسم ہے اور اس شے (انسانی ذات) کی نشو و نما نہیں ہوئی تو پھر تو آپ مر گئے اور اگر اس میں یہ پختگی آ چکی ہوئی ہے تو اس کے بعد اس موت سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ (67:2) موت تو تمہارے لیے یہ دیکھنے کا ایک ٹیسٹ ہے کہ اس زندگی میں تم نے کس قسم کے کام کیے ہیں۔ روز کے مشاہدے کی تشبیہ کے لیے یہ ہے کہ اے مکھن دودھ وچ ہوندا اے یعنی مکھن دودھ کے اندر ہی تو ہوتا ہے۔ اس میں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے اندر پانی ڈالتے جایئے اور دودھ پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں چلتا۔ اب ذرا کشمکش حیات کی مدھانی سے اسے رڑھک دیجیے۔ [1] آپ کو پتہ ہے ''پھر کدی ویکھیا اے رڑکدے کس طرح دا دودھ ہوندے؟ اے تے دودھ ہی نہیں ہوندا' تے رڑکنا کی؟ اے پانی رڑکن والی گل ہیگی نا۔ رڑکدے رہو۔ ایہدے بعد پھر اے ساڈی اگلی جنریشن کدی مدھانی ای نئیں ویکھی۔ نئیں سی کدی مکھن نکلدا' او تے مدھانی اچ کڈ دے سن نا۔ چاٹی ہوندی اے نا' وہ مدھانی ہوندی اے۔ نہ اے نیں مدھانی ویکھی نہ چاٹی نہ اور رڑکدی اے ویکھیا۔ پرورش ہوندی اے ساری! وہ جو رڑکنا ہے نا زندگی کا۔'' [2]

---

[1] بلو دیجیے۔

[2] پھر کیا کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کس قسم کا دودھ بلوتے ہیں؟ یہ تو دودھ ہی نہیں ہوتا تو اس کا بلونا کیا؟ یہ تو محض پانی بلونے کی بات ہے کہ بلوتے رہو۔ اس کے بعد تو یہ ہے کہ ہماری اس اگلی نسل نے تو کبھی مدھانی ہی نہیں دیکھی۔ مکھن نہیں نکلتا تھا وہ تو بلونی سے نکالتے تھے۔ ایک ''چاٹی'' (دودھ رکھنے یا دہی بلونے کا مٹی کا بڑا برتن) ہوتی ہے' ایک ''مدھانی'' (بلونی) ہوتی ہے۔ نہ اس نسل نے ''مدھانی'' دیکھی' نہ ''چاٹی'' اور نہ ہی بلوتے دیکھا۔ وہ جو زندگی کا بلونا ہوتا ہے' وہ پرورش (Nourishment) ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ کشمکش حیات کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں ہے ''لیکن اس کشمکش حیات کا نتیجہ کی ہونداا ے؟ اوجیہڑا رڑکدی ہیگی اے' اوہدے اچ گونج پیندی ہیگی اے باہر تیکر۔'' ❶ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو پانی میں چھپا ہوا مکھن ہوتا ہے' جو کبھی نظر نہیں آتا' آپ اس کو پکڑ نہیں سکتے' اس کا اندازہ نہیں ہوتا' وہ ایک سخت چیز بن کے اوپر آجاتا ہے۔ سارا دن اس میں پانی ڈالتے چلے جاؤ' مکھن وہاں مکھن ہی رہتا ہے وہ پھر اس کے اندر گھلتا ہی نہیں۔ انسانی زندگی کے اندر جو خود گھلی ہوئی محلول ہے'' جو اس طرح سے کشمکشِ حیات دی رڑکن پیندی ہیگی نا چاٹی اچ' اس کے بعد پھر وہ آہستہ آہستہ مکھن دا پیڑا بن جاندی ہیگی اے۔ تے فیر اوہدے بعد پاویں سارا دن پانی پوندے رہو اوہدے وچ' او پیڑا او سے طراں دا رہندا اے۔'' ❷ کہا کہ **خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ** (67:2) ''اے مدھانیاں' تے اے چاٹیاں' تے ایس واسطے اسی بنایاں نیں'' ❸ تاکہ یہ نظر آجائے کہ تمہارے دودھ میں مکھن کتنا تھا اور نظر جبھی آئے گا کہ وہ پیڑا بن کر اوپر آجائے۔ اگر وہ پیڑا بن کر اوپر آ گیا ہے تو پھر موت سے بھی کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

جو صدف گوہر پیدا نہ کرے اس صدف کا کوئی فائدہ نہیں ہے

عزیزانِ من! انہی نکات کو اجاگر کرنے کے لیے مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) نے کیا ہی خوب کہا کہ

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خودگر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(ضرب کلیم: حیات ابدی)

تیرے ''دودھ اچ ملی ہوئی کریم جے مکھن دا پیڑا بن جائے' تے فیر اے پانی تے مدھانیاں تے چاٹیاں تے کجھ نہیں بگاڑ سکدیاں ایہدا۔'' ❹

کہا **اَفَحَسِبْتُمْ** (23:115) تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں **اِنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ** (23:115)

---

❶ لیکن اس کشمکش حیات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو بلونی سے بلوتی ہے تو اس سے باہر تک ایک گونج سی پیدا ہوتی ہے۔

❷ جو اس طرح سے زندگی کی ''چاٹی'' میں کشمکش حیات کی بلونی چلتی ہے تو اس کے بعد پھر زندگی آہستہ آہستہ مکھن کا پیڑا بن جاتی ہے۔ پھر اگر آپ اس میں تمام دن پانی بھی ڈالتے رہیں وہ پیڑا ویسے کا ویسے ہی رہتا ہے۔

❸ یہ بلونیاں' یہ چاٹیاں تو اسی لیے ہم نے بنائی ہیں۔

❹ تیرے دودھ میں ملی ہوئی ملائی اگر مکھن کا پیڑا بن جائے تو پھر یہ ''پانی' یہ بلونیاں' یہ چاٹیاں'' تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتیں۔

یونہی بے غرض وغایت اور بلامقصد ومنزل پیدا کر دیا ہے اور اب یہ سمجھے ہوئے ہو کہ تمہیں کوئی پکڑنے والا ہی نہیں ہے' اس لیے یہ ساری بدمستیاں اور سرکشیاں اور بدعنوانیاں اور دھاندلیاں یہ سمجھتے ہوئے کر رہے ہو کہ یہ سب کچھ بائی چانس ہو رہا ہے' کوئی پکڑنے والا ہی نہیں ہے' تم سمجھتے ہو کہ بھاگے ہوئے ہو' تم اشتہاری مجرم ہو' تم آ ہی نہیں رہے ہو لیکن سمجھ رکھو کہ تمہارا تو ہر قدم ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ راجعون عجیب چیز ہے۔ تم بھاگے ہوئے ہو' ساتڑا کے' جیل سے نکل کے کہ ہماری گرفت میں نہ آؤ۔ اپنے ذہن میں سمجھتے ہو کہ تم بھاگ کے دور جا رہے ہو۔ کہا کہ تمہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ تمہارا ہر قدم تو ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ ہے جی جسے **اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** (2:156) کہتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم بھاگ کر کہیں اور جا رہے ہو' تمہارا ہر قدم تو ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ **فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ** (23:116) خدا اس سے بہت بلند ہے کہ تم یہ سمجھو کہ اس نے کائنات کو یونہی عبث پیدا کر دیا اور تمہاری زندگی کو بھی بلامقصد رکھ دیا۔ یہ اس کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ ''وہ رب ہی نہیں بن سکتا' جیہڑا ایہو جے کم کردا ہووے۔''[1] کیا تم یہ سمجھتے ہو؟ اور پھر **لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ** (23:116) یہ بھی نہیں ہے کہ کوئی بات نہیں' یہاں نہیں وہاں اپیل کر لیں گے' اس مجسٹریٹ کے ہاں مقدمہ دائر کر دیں گے ''اور دوسرا جیہڑا اے ایہدے نال کجھ لگی ہیگی۔ اے منتقل کرا کے اس عدالت اچ لے جان۔''[2] کہا کہ یہاں عدالت ہی ایک ہے' دوسری عدالت ہی نہیں ہے۔ تمہارا ہر قدم اس عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے اور عدالت دوسری ہے نہیں۔ کیا بات ہے صاحب!

خدا تعالیٰ ایک فائنل اتھارٹی کے باوجود الکریم ہے

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ **هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ** (23:116)۔ یہاں ہمارے ہاں بھی تو جوڈیشری کے اندر ایک فائنل اتھارٹی ہے' جسے سپریم کورٹ کا چیف جسٹس کہتے ہیں۔ اس کے آگے کوئی نہیں ہوتا۔ یہ جو رب العرش الکریم ہے' اس کے یہ معنی ہیں۔ تخت جہاں بانی کا وہ جو آخری اسٹیج ہے یہ اس کی کڑی کے اوپر جو کنٹرول کرنے والا ہے وہ ہے جسے اللہ کہتے ہیں یعنی فائنل اتھارٹی ہے لیکن' عزیزانِ من! یہ فائنل اتھارٹی جھوم جایئے' چوم لیجیے' کیسا الکریم ہے! وہ قہار نہیں ہے۔ تکریم انسانیت کی پرورش کرتا ہے' سب سے بڑی چیز تکریم انسانیت ہے' عزیزانِ من! دیکھیے قرآنِ کریم الکریم کہاں لایا ہے۔ وہ رب العرش ہے لیکن الکریم ہے۔ **وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ** (23:117)۔ بڑا چیلنج ہے صاحب! جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہاں اس ایک کا قانون نہیں' کسی اور کا بھی قانون چلتا ہے' تو کہا کہ اس سے یہ نہ کہو کہ وہ مرتد ہو گیا' اس کی سزا قتل ہے۔ اس سے کہو کہ دلیل و برہان کی رو سے بات کرے۔

---

[1] وہ رب ہی نہیں بن سکتا جو اس طرح کے یہ کام کرتا ہو۔

[2] اور یہ جو دوسرا ہے اس کے ساتھ کچھ لاگ سی ہے اس لیے اس مقدمے کو منتقل کرا کر دوسری عدالت میں لے جائیں گے۔

توحید کا دوسرا نام: پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی فرمانروائی ہے

چیلنج دیا گیا ہے کہ یہ ساری دنیا کے انکار کرنے والے بھی اکٹھے ہو جائیں تو وہ اس کے حق میں دلیل نہیں لا سکیں گے کہ اس کائنات میں دو کے قانون چل رہے ہیں۔ بہرحال یہ جو کائنات ہے جس کے اندر اس وقت تک ریسرچ ہوئی ہے اس میں تو یہ ساری دنیا کے سائنٹسٹ اسی نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہاں قانون ایک ہی کا چل رہا ہے۔ توحید کے قائل اس باہر کی دنیا کے اندر جو یہ Objective کائنات ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ❶ Absolute sovereignty in the entire Universe ہے۔ یہاں تک تو دہریئے بھی پہنچے ہوئے ہیں کہ یہاں قانون ایک ہی کا چلتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ توحید کے قائل ہیں۔ اس نے کہا کہ لاؤ برہان، تم ان کو چیلنج دے دو ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین (27:64) صاحب! یہ ہے اصل چیز۔ اپنی بات کی سچائی کے اوپر Confidence (اعتماد) بھی اتنا ہے، کہ ساری دنیا کو کہتا ہے کہ ان سے کہو: ''جاؤ، لاؤ دلیل، لاؤ اپنے دعوے کے حق میں دلیل اگر سچے ہو'، اور ساتھ کہتا ہے کہ لَا بُرْهَانَ لَهٗ (23:117) تم دیکھو گے کہ دلیل نہیں لاسکیں گے، دھاندلی کی تو اور بات ہے۔

مذہب کی سطح کے اوپر تو عزیزانِ من! روز ایک دوسرے مذہب کے مناظرے ہوتے ہیں، مباحثے ہوتے ہیں۔ وہ اِدھر سے دلیل لاتا ہے وہ اُدھر سے دلیل لے آتا ہے۔ کبھی کوئی فیصلہ کن نتیجے پہ پہنچ ہی نہیں سکا۔ اگر آپ دین کے اسٹیج کے اوپر آتے ہیں جس کو آپ ❷ Purely scientific stage کہتے ہیں اس میں تو اس کے خلاف دلیل ہی نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ یہاں ایک قانون چلتا ہے، دو قانون نہیں چل سکتے۔ شرک کے حق میں کوئی کائناتی دلیل نہیں آسکتی اسی لیے کہا کہ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (23:117) جو یہ سمجھتا ہے کہ نہیں، کسی اور کا بھی قانون چلتا ہے وہ دیکھے گا کہ آخری نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا۔ آخر الامر اسے دیکھنا ہوگا کہ نہیں یہاں فیصلے اسی ایک کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں کسی دوسرے کا قانون نہیں چل سکتا اور اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو سن رکھے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (23:117) جو زراعت کے ان قوانین سے انکار کرتا ہے اس کی کھیتی کبھی بھی پنپ نہیں سکتی۔

انسانی دنیا میں وحی کے قانون کو نافذ نہ کرنے کا نتیجہ ہر سو تباہی، ہر آن تباہی ہے

یہ جو آپ کے ہاں بڑے سے بڑا ماہر زراعت ہو، جو قوانین زراعت ہیں وہ ان کی خلاف ورزی کرے اور پھر کچھ اگا کے بتائے۔ کہتا ہے وہاں تو ہتھیلی پہ سرسوں جمتی ہے۔ ساری دنیا نے Values (اقدار) سے انکار کرنے کا تماشہ دیکھ لیا۔ ساری دنیا اس وقت ایک

---

❶ اس تمام کائنات میں صاحبِ اقتدار مطلق

❷ خالصتاً سائنسی اسٹیج

جہنم کے اندر ہے۔ یہ وہ جہنم ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ جس میں نہ موت آتی ہے' نہ زندگی ملتی ہے بلکہ دوسری جگہ کہا کہ چاروں طرف سے موت آتے دکھائی دیتی ہے' وہ ہزار چاہتا ہے کہ میں مر ہی جاؤں لیکن موت بھی تو نہیں آ سکتی۔ یہ کیا ہے جو اس وقت ساری دنیا میں ہو رہا ہے؟ یہ ہے قانونِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ' یہ ہے Values (اقدار) سے کفر برتنے کا انجام۔ اور دنیا نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے کچھ نہیں بنا۔ یہ ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ❶ (23:117)۔ اس سورۃ کی آخری آیت آ گئی لہٰذا قُلْ (23:118) دل کی گہرائیوں سے یہ کہو کہ رَّبِّ اغْفِرْ (23:118) یہ آرزو دل میں رکھو اور دعا کی حیثیت سے زبان میں لاؤ کہ اے ہمارے پروردگار! یہ جو کچھ اس انکار سے یہاں ہو رہا ہے' ہمیں اس سے اپنی حفاظت میں رکھ' یہ بڑی Infection Disease (بیماری متعدی) ہوتی ہے' یہ Epidemic (وبائی) ہوتی ہے جسے وبائی مرض کہتے ہیں یعنی اڑ کے لگنے والا مرض۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ دور آتا ہے جس میں شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (67:7) ہوتا ہے کہ جس میں شر اڑ کے لگ جایا کرتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ پھر دیکھیے کہ وبائی امراض کے اندر یہ بیچارے ڈاکٹر کس قدر چلاتے ہیں اور کیا کیا تدبیریں بتاتے ہیں: یہ نہ کرنا' یہاں سے احتیاط رکھنا' وہاں سے دور رہنا' یہ ہوگا۔ وہ دہائی مچ جاتی ہے۔ یہ شر مستطیر ہو جاتا ہے۔ کہا کہ اس قسم کا شر مستطیر جب Values (اقدار) سے کفر کر کے انسانی معاشرہ میں آتا ہے تو پھر اس کے اندر یہ شر ہر وقت رہتا ہے۔ دیکھو! قُلْ (23:118)۔ کس کو پکار رہے ہو؟ رَبِّ (23:118) یہاں ربوبیت دینے والے کو کہا ہے کہ اے جس نے ہماری ربوبیت کا ذمہ لیا تھا! رَّبِّ اغْفِرْ (23:118) بارالٰہا! تو اپنے قانونِ ربوبیت کی رو سے ایسا انتظام کر دے کہ ہم تخریبی قوتوں کی ہلاکت سامانیوں سے محفوظ رہیں۔ یہ شر اڑ کے لگتا ہے' یہ شر آ رہا ہے' یہ Epidemic Disease (وبائی بیماری) پھیل گئی ہے' ہماری حفاظت ہونی چاہیے۔

دعا کا مفہوم

اس سے میں عرض کروں یہ جسے دعا کہتے ہیں' یہ شدتِ آرزو ہے جب بے ساختہ زبان کے اوپر آ جائے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

تمنا جب شدت اختیار کر جائے تو بے ساختہ لب پہ وہ جو الفاظ آتے ہیں اسے دعا کہتے ہیں تو اس کے لیے کرنا کچھ آپ ہی ہوتا ہے لیکن اگر آپ اس شدت کا احساس کریں کہ Epidemic (وبا) پھیل رہی ہے' بڑی ضرورت ہے کہ اس سے میں محفوظ رہوں تو پھر آپ ہر وقت دیکھیں گے کہ پانی ابال کے پیوں' میں باہر اس طرح سے نہ جاؤں۔ یہ جتنی بھی احتیاطی تدابیر بتائی جاتی ہیں اس کے معنی یہ ہوتے

---

❶ انکار کرنے والوں کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھتیں۔

ہیں۔اس سے آپ کے احساس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے: رَبِّ اغْفِرْ (23:118) ہماری حفاظت کرا اور اگر وہاں آپ کے ہاں ترجمے یہ ہوں کہ ایسے وقت میں کہو کہ یااللہ! بخش دے مینوں، یااللہ! بخش دے۔ میں نہ کچھ کراں تو بخش دے مینوں۔ روز سویرنوں فقیر اوندا ہیگا اے۔ ای صدا لگاندا ائے پر ہوندا ہواندہ کچھ نہیں ❶۔ یہاں دعا کی ہے کہ سامانِ حفاظت بہم پہنچاؤ۔ اب اگر سامانِ حفاظت کے لیے کام کرو گے تو محفوظ رہو گے۔ پھر ڈاکٹر یہ بھی ساتھ کہا کرتے ہیں کہ اس سے بھی وبائی امراض کے حملے کے وقت روک تھام ہوتی ہے محض ''بخش دے'' کہنے سے نہیں۔

لفظ رحم کا قرآنی مفہوم

یہ وہ چیز ہے جس سے قوت مدافعت ملتی ہے اور سامانِ نشوونما ملتا ہے۔ اس سامانِ حفاظت پہنچانے کے فوراً بعد کہا کہ وَ ارْحَمْ (23:118) رحم وہ سامانِ نشوونما ہے جو حالات کے بالکل مطابق ملے۔ رحم کو اس لیے رحم کہتے ہیں کہ وہاں بچے کو نشوونما کے لیے جو سامان ملتا ہے وہ اس کی ضرورت کے مطابق ملتا ہے۔ جے او تھے اونوں اے سامان نہ ملے ❷ تو اس کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ رحم (Womb) میں لچک اور لوچ ہوتی ہے۔ اس مسکن کے اندر وہ بچہ پہلو بدلتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت باہر نظر آتی رہتی ہے' محسوس ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی لچک اور لوچ نہ ہو تو وہاں بچہ نشوونما ہی نہیں پا سکتا۔ اندازہ لگایئے' وہاں وہ سانس لیتا ہے' اس کا خون پیدا ہوتا ہے' دل دھڑکتا ہے اور ساری نشوونما ہوتی ہے۔ سامانِ نشوونما جو اسے باہر آ کر ملتا ہے' اس قسم کا وہاں کوئی سامانِ نشوونما نہیں ہے۔

رزق کے ساتھ اگر Values (اقدار) شامل نہ کریں تو پھر رزق پورا ہی نہیں ہو سکتا

اس وَ ارْحَمْ (23:118) اور ہلاکت سامانیوں سے محفوظ رہنے کے ساتھ' ہمیں سامانِ نشوونما بھی ملتا رہے کے لیے دیکھیے کہ عرب کرتا کیا تھا؟ کیا بات تھی ان کے ہاں کی! ان کے ہاں رحم سے متعلق رحیم کا لفظ آیا۔ مادی زندگی کے اندر آیا تو پھر اس نے رازق کہا۔ اس رزق کے اندر جب Values (اقدار) شامل کیں تو اس نے رب کہا۔ تربیت یہی چیز ہے۔ ان عربوں کے ہاں بھی یہ تصور تھا کہ یہ جو سیپ کے اندر ایک قطرہ ابر بہار کا آتا ہے تو پھر وہ آہستہ آہستہ موتی بن جاتا ہے۔ وہ اس کو ربوبیت کہتے تھے۔ قرآن میں یونہی لفظ نہیں آئے ہوئے کہ کہیں اس کو رحیم کہہ دیا' کہیں رازق کہہ دیا' کہیں رب کہہ دیا' یونہی کہیں کہنے والی بات نہیں ہے۔ یہاں کہا

---

❶ اے بارِ الہا! مجھے بخش دے۔ میں کچھ نہ کروں تو مجھے بخش دے۔ روزانہ علی الصبح فقیر آتا ہے' یہ صدا لگاتا ہے مگر ہوتا ہواتا کچھ نہیں۔

❷ اگر اسے وہاں یہ سامان نہ ملے۔

کہ وَ ارۡحَمۡ ❶ (23:118)۔ٹھیک ہے اور جگہ سے بھی کسی حد تک کچھ سامانِ نشوونما مل سکتا ہے لیکن وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ (23:118) تو سامانِ نشوونما دیتا ہے' خیر کے معنی اب میں نے بتائے تھے کہ خیر اور اختیار کا ایک ہی مادہ ہے' اس سے صرف جسم کی نشوونما نہیں ہوتی' انسانی اختیارات میں بھی وسعت ہوتی چلی جاتی ہے تو تو اس قسم کا نشوونما دینے والا ہے۔اے ہمارے نشوونما دینے والے (رب)! ان حالات میں جن میں ہم گھر چکے ہیں' معاشرہ اس قسم کا بن چکا ہے کہ اس میں شر مستطیر ہو گیا ہوا ہے' تو حفاظت کا سامان بھی دے' نشوونما کا سامان بھی دے' اور ایسا دے کہ ہماری بالیدگی کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں۔

سورۃ المومنون کا درس آج اختتام پذیر ہوا۔عزیزانِ من! آئندہ ہم چوبیسویں سورۃ النور سے درس کا آغاز کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ اور اس کے ساتھ ہی ہمیں سامانِ نشوونما بھی ملتا رہے۔

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)